کلیاتِ
مُلّا رموزی
(جلد اوّل۔ حصہ دوم)
عورت ذات
مرتب
خالد محمود
قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی
کلیاتِ مُلّا رموزی
(جلد اوّل۔ حصہ دوم)
عورت ذات
مرتب: خالد محمود
₹ 140/-

کلیات مُلّا رموزی

(جلد اول- حصہ دوم)

عورت ذات

مرتب

خالد محمود

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی

وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند

فروغ اردو بھون ایف سی، 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولا، نئی دہلی۔110025

پہلی اشاعت : 2013
تعداد : 550
قیمت : -/140 روپے
سلسلۂ مطبوعات : 1797

Kulliyaat-e-Mulla Ramoozi (Vol.1-Part-2)

Aurat Zaat

Edited by: Khalid Mahmood

ISBN :978-81-7587-982-9

ناشر: ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، فروغ اردو بھون، FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی 110025، فون نمبر: 49539000، فیکس: 49539099
شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک۔8، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی۔ 110066 فون نمبر: 26109746
فیکس: 26108159 ای۔میل: ncpulsaleunit@gmail.com
ای۔میل: urducouncil@gmail.com، ویب سائٹ: www.urducouncil.nic.in
طابع: لاہوتی پرنٹ ایڈز، جامع مسجد، دہلی۔ 110006
اس کتاب کی چھپائی میں 70GSM, TNPL Maplitho کاغذ استعمال کیا گیا ہے۔

پیش لفظ

بیسویں صدی کے ربع اول میں اردو طنزیات ومضحکات کا سرمایہ جن چراغوں سے منور ہے، ملا رموزی ان میں نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ ان کا طرز خاص ''گلابی اردو'' کے نام سے جانا جاتا ہے۔ انھوں نے قدیم مذہبی اور فقہی کتب کے طرز بیان میں اپنے عہد کے حساس موضوعات اور مسائل کی ناہمواریوں کو نشانہ بنایا۔ اردو ادب میں طنز اور مزاح کو عموماً ایک اسلوب یا کم از کم لازم وملزوم خیال کیا جاتا ہے جبکہ ناقدین ادب نے دونوں کی نفسیات کو جداگانہ طور پر خود مکتفی اساس کا حامل بتایا ہے۔

ملا رموزی کی طنزیات ومضحکات کو اپنے عہد میں بہت سراہا گیا۔ عہد اور اس کے بعد بھی ان کے رنگ تحریر کی تقلید کی گئی اور اسے ایک کامیاب مزاحیہ حربے کی حیثیت حاصل رہی۔ عوامی ادب (Popular Literature) کی فراہمی قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی اشاعتی پالیسی کا ایک اہم حصہ رہی ہے۔ ملا رموزی کی کلیات کی یہ پیش کش کونسل کے اسی اشاعتی پروگرام کا حصہ ہے۔

کتابیں لفظوں کا ذخیرہ ہیں اور اسی نسبت سے مختلف علوم وفنون کا سرچشمہ بھی۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کا بنیادی مقصد اردو میں اچھی کتابیں شائع کرنا اور انھیں کم سے کم قیمت پر

علم وادب کے شائقین تک پہنچانا ہے۔ اردو پورے ملک میں سمجھی، بولی اور پڑھی جانے والی زبان ہے بلکہ اس کے سمجھنے، بولنے اور پڑھنے والے اب ساری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں۔ کونسل کی کوشش ہے کہ عوام اور خواص میں یکساں مقبول، اس ہردلعزیز زبان میں معیاری کتابیں تیار کرائی جائیں اور انھیں بہتر سے بہتر انداز میں شائع کیا جائے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے کونسل نے مختلف النوع موضوعات پر طبع زاد کتابوں کے ساتھ ساتھ انگریزی اور دوسری زبانوں کی معیاری کتابوں کے تراجم کی اشاعت پر بھی پوری توجہ صرف کی ہے۔

پروفیسر خالد محمود دنیائے ادب میں نمایاں نام رکھتے ہیں۔ ان کا ایک امتیاز یہ بھی ہے کہ وہ خود طنز ومزاح کے تخلیق کار ہیں اور اس فن کے ابعاد سے واقفیت رکھتے ہیں۔ توقع ہے کہ ملا رموزی پر ان کا یہ کام ملا رموزی کی شش پہلو شخصیت اور ان کے فکاہی کارناموں کی تفہیم میں سنگ میل کی حیثیت رکھے گا، طنزیات ومضحکات سے متعلق عمومی طور پر پائی جانے والی غلط فہمیوں کا ازالہ ہوگا اور کونسل کی دیگر مطبوعات کی طرح 'کلیات ملا رموزی' کی بھی خاطر خواہ پذیرائی ہوگی۔

ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین

فہرست

مقدمہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمده ونصلی علیٰ رسوله الکریم

اس عنوان کے تحت، تالیف وتصنیف کے عام قاعدہ کے موافق جو ''بلاغت ربودی'' فرمائی جاتی ہے اور ''سببِ تالیفِ کتاب'' کو ظاہر کرنے کے لیے جو چمن پیرا عبارت اور منطق آرا الفاظ جمع کیے جاتے ہیں ان سے ہٹ کر صرف چند سیدھی اور سادہ باتیں بیان کر دینا اس لینے مناسب ہے کہ یہ اتنی موٹی کتاب موجود تو ہے، اب اس میں جو کچھ ہے! سے خود ملاحظہ فرمالیجیے، مگر آپ فرمائیں گے کہ اگر یہ ہے تو بس اس کے آگے آپ بھی کچھ نہ لکھیے، ہم خود ہی سب کچھ سمجھ لیں گے، تو اس موقع پر آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ ملا رموزی صاحب مقدمہ کے عنوان سے جو کچھ لکھ رہے ہیں وہ کتاب میں نہیں ہے اس لیے ان کا لکھنا تو ہوا ''برحق'' اور آپ کا اسے پہلے سمجھ لینا ہوا نا،... پس امابعد یہ کہ

جب سے ہم ملا رموزی صاحب مشہور ہوئے ہیں ظاہر ہے کہ اس کے بعد سے خدا نے ہمیں ''رفتہ رفتہ'' کے عام قاعدہ سے کبھی زادلطفہ، بنایا تو کبھی دام ظلہٗ اور کبھی دام اجلالہٗ، کبھی قبلہ تو کبھی حضرت لیکن اب خدا کے فضل سے ہم دام ظلہ اور دام اقبالہٗ کے رتبۂ رفیع پر پہنچا دیے گئے

ہیں اور کہنے میں صرف یہ آتا ہے کہ بے چارے ملا صاحب بال بچوں والے آدمی ہو گئے، اس لیے خواہ مخواہ یہ خیال پیدا ہوا کہ آخر یہ اپنے بال بچوں کو کس دن کے لیے محفوظ رکھتے ہو ابھی بھی اگر زندگی میں ہی لکھ دو تو ''کارِ ثواب'' ہی ہے پس اس خیال کا پیدا ہونا تھا کہ ہندستان کی تمام ''عورت ذاتوں'' پر نظر جا پڑی، یا یہ تمام عورتیں ہماری نظر پر ''آپڑیں'' اب جو اس خیال سے ان کو دیکھا تو عالم ہی دوسرا نظر آیا یعنی ہندستان کی بنی ہوئی عورت کچھ اس درجہ بھی مجبوراً برباد، بے کس اور عجیب وغریب سی نظر آئی کہ جی چاہا کہ یا تو اسے عورت کے عوض عجائب خانہ کہہ کر پکاریں یا پھر صحیح معنے میں اسے عورت بنا کر چھوڑیں۔

پس یہ اتفاق تھا کہ 1921 میں ایشیا کی سب سے نامور و نام آور ترکی قوم کا معرکۂ جدال وقتال یونانیوں سے شروع ہو گیا، پھر اسی معرکہ میں ترکی عورتوں نے اپنے مردوں کے ساتھ مل کر انتظامی اور جنگی معاملات میں جن کاموں کو انجام دیا وہ ایشیا کے لیے عموماً اور ہندستان کے لیے خصوصاً حد سے سوا حیرت انگیز اور بیدار کن تھے اور اسی اثر سے ملا رموزی نے ان مجاہدہ وذی علم ترکی عورتوں کے حالات پر ایک کتاب اسی زمانے میں لکھی جس کا نام ''خواتینِ انگورہ'' ہے اور جو مبلغ ایک روپیہ میں مہتمم صاحب دائرۂ ادبیہ لکھنؤ سے ملتی ہے، اس کتاب کے لکھنے سے دماغ پر یہ اثر ہوا کہ ملازی رموزی صاحب اسی وقت سے ''ثلث عورت'' ہو چکے تھے اگرچہ اخباری مضامین کی کثرت اور رسالوں میں بہ مقدار کثیر مضامین لکھنے اور ''نوکری پر حاضر رہنے کے باعث'' کبھی اتنی فرصت نصیب نہیں ہوئی کہ دن رات عورتوں ہی کو دیکھتے اور سمجھتے رہتے، مگر جناب جس وقت والدہ صاحبہ محترمہ نے اپنی پسند سے ہماری شادی کرائی اور جو ہمارے ننھے میاں کی والدہ ہمارے گھر میں تشریف لائیں تو بس یوں سمجھ لیجیے کہ ملا رموزی نصف مرد اور ''نصف عورت'' ہو کر رہ گئے اور اب جو اپنی شادی اور ''نتیجۂ شادی'' پر غور کیا تو دن میں تین ہزار مرتبہ کہنا پڑا کہ ''اُفوہ، یوں ہوتی ہیں ہندستانیوں کی شادیاں'' اور ''اللہ اکبر ایسی ہوا کرتی ہیں ہم لوگوں کی بیویاں''!!!

ادھر تو یہ ہوا اور اُدھر ہندستان میں جنگ یورپ بابت 1914 تا 1918 میں یورپ امریکہ اور ایشیا میں روسی اور ترکی عورتوں کے حالات نے ہندستانی عورتوں کو نصف کے قریب مرد بنا دیا، یہاں تک کہ اس کتاب کے لکھتے وقت تو ہندستانی عورت ''رضا کار'' کا نام رکھ کر مردوں کے ساتھ

''ترکِ موالات'' مقاطعۂ جوئی، عدم تشدد، کھادی وکھدر، برطانوی مال کا مقاطعہ، پکٹنگ، ستیہ گرہ، گو بیک سائمن، انقلاب زندہ باد، ملوکیت برباد باد'' گرفتاری، قید'' رہائی اور پھر وہی کی وہی ہو کر یوں نظر آنے لگی اور یوں بڑھنے لگی کہ بس جناب اُفّوہ!

پھر ان حالات پر کوئی وجہ نہ تھی کہ ملا رموزی ایسا غریبوں اور ارباب علم کی نظر میں قابلِ قدر آدمی اور امیروں اور دفتری لوگوں کی نظر میں ناقابلِ قدر آدمی متاثر نہ ہوتا، جی میں تو آیا تھا کہ اگر ہندستانی عورتوں کے ایسے ہی کام ہندستانی عورتوں کی بیداری ترقی اور اعلیٰ تعلیم یافتہ پن ہیں، تو اپنے ننھے میاں کی والدہ سے بھی کہہ دیں کہ'' جاؤ بھائی تم بھی دکانوں کے سامنے پکٹنگ کرو اور جلسوں میں تقریریں'' مگر وہ تو خدا ہی نے روکا ہمیں اس حرکت سے اور معاً خیال ہوا کہ اس سے پہلے ہندستان کی عورتوں کی ترقی، بیداری اور تعلیم و ہنرمندی پر ایک نظر ڈال لیں، اگر ضرورت ثابت ہو جائے تو پھر ایک ننھے میاں کی والدہ کیا دس والدائیں نہ بھیجیں کہ نام تو ہو کہ ہاں بھئی مُلّا رموزی صاحب خاصے شریکِ ترقی ہوئے لیکن یہاں پہنچ کر ایک سوال تھا وہ یہ کہ صحیح معنی میں ''عورت ذات'' کسے قرار دیا جائے کیونکہ صرف ونحو کے قاعدوں سے تو عورت اسم نکرہ ہے یعنی ہر وہ آدمی نما چیز جو کرتا ہوں کے عوض'' کرتی ہوں'' کہے اور آتا ہوں کہ عوض'' آتی ہوں'' کہے ''فہوالعورت ذات'' مگر ڈر پیدا ہوا کہ اس طرح ہر'' آتی ہوں'' اور'' کرتی ہوں'' کہ عورت قرار دے دینے سے یہ''لونڈیاں''، ''لڑکیاں''، ''بچیاں''، ''پلّیاں'' اور بُڑ ھنگیاں بھی عورت قرار دے دی جائیں گی کیونکہ یہ بھی تو لڑکپن سے بڑھاپے تک یہی کہتی ہیں کہ'' آتی رہی ہوں مرے کیوں جاتے ہو'' اس لیے ضابطہ یوں بنانا پڑا کہ'' عورت ذات وہ جو کسی مرد کی بیوی ہو'' پھر یہ خیال پیدا ہوا کہ آخری بیوی فقط کوتوالوں، مجسٹریٹوں، عالموں اور رئیسوں ہی کے ہاں تو ہوتی نہیں ہے بلکہ وہ تو کسان کے ہاں بھی ہوتی ہے اور مہاجن کے ہاں بھی، دھوبی کے ہاں بھی اور چمار کے ہاں بھی، جُلاہے کے گھر میں بھی اور تمبولی کے گھر میں بھی، بھٹیارے کے گھر میں بھی اور مالی کے گھر میں بھی، پھر یہ بھی نہیں کہ وہ صرف ہندستان کے گھروں میں ملتی ہے بلکہ وہ تو یورپ میں بھی ہوتی ہے، امریکہ میں بھی، افریقہ میں بھی اور ایشیا کے دوسرے ممالک میں بھی، اس لیے ضرورت محسوس ہوئی کہ لکھو تو ان سب کو لکھو ورنہ ایک کو بھی نہ لکھو۔ اب جو یہ طے پایا تو آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے،

یہ سوچ کر کہ اے خدا کے بندے مُلّا رموزی تو اتنی دور دور کی اور اتنی زیادہ بیویوں کے ازدواجی حالات لکھنے چلا ہے تو تیری مخاطب قوم میں علم وتصنیف کا یہ ذوق کہاں کہ وہ تجھے یورپ کا ٹکٹ بھی دلا دے اور امریکہ کا بھی، افریقہ بھی بھیج دے اور ایشیا میں بھی ہر شہر دکھا دے اور تو ہندستان تک کے ہر فرقے اور ہر قبیلے کی بیوی کے حالات بچشم خود دیکھنے کے لیے اگر جانا چاہے تو یہ تیری ہی قوم کے ریلوے ٹکٹ کلکٹر تجھے بے ٹکٹ پا کر وہ کالی وردی والے ریلوے سب انسپکٹر پولیس کے حوالے کر دیں اور شرافت سے یہ بھی نہ کہیں کہ معاف کیجیے گا مُلّا صاحب یہ ہے معاملہ ضابطہ کا، اور اے بے چارے مُلّا رموزی تیرے لیے یہ بھی نہیں ہوسکتا کہ تیری قوم کے دولت مند لوگ ایک ایسا عظیم الشان کتب خانہ عطا فرما دیں جس میں تمام دنیا کی بیویوں کے حالات موجود ملیں اور انھیں ہر زبان کا ترجمان اور مترجم ترجمہ کر کے تیری میز پر رکھتا جائے اور لکھتا جائے اس لیے تو بھی بس اتنا کر کہ بیرونی ممالک کے جتنے حالات تجھے آسانی سے اخباروں، رسالوں اور کتابوں میں مل جائیں ان سے نہایت خشک اور ہلکے ہلکے خاکے بیرونی بیویوں کے اس لیے پیش کر دے تاکہ یہ تیرے ہندستان کی بیویاں ان نمونوں سے اپنے حالات کا اندازہ کر کے کسی مفید انقلاب کو اپنے لیے منتخب اور اختیار کر سکیں، لہٰذا اس کتاب کے حصۂ اول میں یورپ، امریکہ، افریقہ اور ایشیا کے جن ممالک کی بیویوں کے حالات کم یا خشک نظر آئیں تو اس کی سزا انھیں دیجیے، جو یورپ وامریکہ جاتے مُلّا رموزی ایسے بالغ نظر اہلِ قلم اور محقق مضمون نگار سے جھوٹ کو اتنا بھی نہیں کہتے کہ ارے بھئی نہر سوئز اور پیرس تک ہی تم بھی چلو اور اگر دل چاہے تو لندن تک بھی چلے چلو۔

یہی نقشہ نظر آئے گا آپ کو دھوبی، بھنگی، حلوائی، بھٹیارے، کنجڑے، تیلی، کسان، رنڈی اور تھیٹر کی بیویوں میں کہ ان میں سے ہر ایک کے مکمل حالات کے لیے ہمیں ایک گراں قدر منصب دے کر لکھنؤ میں بھی رکھا جاتا اور پنجاب میں بھی، کلکتے میں بھی اور بمبئی میں بھی تاکہ ہر صوبے اور ہر ضلعے کی ازدواجی زندگی اور میاں بیوی کے مکمل حالات خود دیکھ کر لکھتے مگر جب یہ نہ ہوا تو فیصلہ کیا کہ ان حالات کو بھی اتنا ہی لکھ دو جتنا کہ اپنے اس گھر میں رہ کر جانتے ہو جس میں تم مُلّا رموزی صاحب سے ملنے کے لیے بڑے بڑے لیڈر، ایڈیٹر اور افسر آتے ہیں اور یہ کہہ کر چلے جاتے ہیں کہ واقعی مُلّا رموزی تم بہت غریب آدمی ہو، یہ دیکھو تو تمھارا مکان کتنا شکستہ ہو رہا ہے، مگر کوئی نہیں

بنوا دیتا اس کو، خیر بھائی صبر کرو مُلا صاحب۔

پس ان حالات پر یہ نہ سمجھ لیجیے کہ تصنیف و تالیف اور تحقیق و جامعیت کے ساتھ مُلا رموزی نے یہ کتاب لکھی ہے، بلکہ یوں سمجھو کہ اس کتاب نے خود مُلا رموزی کو لکھا ہے تاکہ رہتی سہتی دنیا کو اس کتاب کے ذریعہ معلوم ہوتا رہے کہ 1931 میں ہندستان میں زبانِ اردو بولنے والوں کے لکھنے والے یوں لکھا کرتے تھے کہ ایسی اردو تک پر لعنت۔

اب تصنیفی اور ترتیبی اعتبارات و اصول سے اس کتاب کا معاملہ یوں ہے کہ ہندستان میں عورت کا جو مفہوم خود عورتوں نے اور مردوں نے سمجھا وہ یہاں کی مختلف اقوام کے میل جول اور رسم و رواج سے ہمیشہ متاثر اور منقلب ہوتا رہا۔ چنانچہ یہ بالکل صحیح ہے کہ بعض معتقدات و اعتبارات ہندو عورتوں سے مسلمان عورتوں نے اختیار کر لیے اور بعض ہندو عورتوں نے مسلمان عورتوں کی باتیں سیکھ لیں۔ اسی طرح عورت اور اس کی فضیلت کا معاملہ بھی کبھی طے نہ ہونے پایا۔ البتہ انگریز قوم کے غلبہ پانے سے اس معاملہ میں پھر ایک طرح کی جان آ گئی یہاں تک کہ تقریباً نصف صدی سے ہندستان میں یورپ کی ''تقلیدی عورت'' پیدا کرنے کا خیال محسوس ہونے لگا، لیکن اس خیال کی رفتار اتنی ہی تیز تھی جتنی کہ ایک تندرست آدمی کی رفتار افیون کھا لینے کے بعد ہو جایا کرتی ہے، لیکن جنگ یورپ بابت 1914 کے بعد سے خود ہندستان میں انگریزوں سے ہندستان آزاد کرانے کی تحریک نے جس ذہنی بیداری کو ترقی دی اس میں ''عورت کی ضرورت'' کا احساس اب اتنا ہی تیز نظر آنے لگا جتنا کہ ملک مصر میں بلوہ ہو جانے کے وقت یورپ کے ہوائی جہاز اپنی اپنی رعایا کو بٹھا کر بھاگتے ہوئے نظر آتے ہیں، مگر یہ 1914 کے بعد سے ''عورت کی ترقی'' کا معاملہ اصل میں ایک بحرانی اور پُر جوش جذبہ تھا جس نے بغیر صحیح قسم کی تعلیم و تربیت کے عورت عورت کی آواز اور مطالبہ کی صورت اختیار کر لی اور اسی لیے بعض ''شُد بُد شدہ عورتیں'' نمائش اور عمل کے ان بلند تر مقامات پر ایک دم نظر آنے لگیں، جہاں بڑے بڑے پختہ کار اور آزمودہ کار لوگ نظر آتے ہیں اس لیے یہ دکھانے کی ضرورت محسوس ہوئی کہ تم جس ترقی یافتہ عورت کو ڈھانے چلے ہو یا جو عورت ہو کر اپنی برادری کو ''حقوق طلب'' اور ''مساوات خواہ'' ثابت کرتی ہے دیکھے کہ اصل عورتیں کن حالات میں مبتلا ہیں اور کہاں پڑی ہیں؟ اور ان میں سے ہر ایک کے لیے کن کن

اسباب ترقی کی ضرورت ہے؟ اس لیے یہی کرنا پڑا کہ اپنی بیوی سے لے کر جتنی بیویاں ہوسکیں لکھ دیں اور جس طرح ہوسکا لکھ دیں تا کہ مصلحین ملک اور رہنما خواتین کو اپنے اصلاحی امور میں اس کتاب سے مدد ملے، اس لیے اس کتاب میں جتنے خاکے نظر آئیں انھیں مکمل نہ سمجھیے اور نہ 1914 سے پہلے کے، کیونکہ اس میں جو کچھ ہے وہ 1914 کے بعد سے ہے تا کہ ''تازہ بہ تازہ نو بہ نو'' کہا جا سکے جب کہ مقصود اصلاح بھی ''عورات حاضرہ'' کا ہے نہ کہ ''عورات غیر حاضرہ'' کا۔

پس اگر آپ نے آنے والے صفحات میں تفریح اور مذاق کو چھوڑ کر یہ معلوم فرمایا کہ ہندستان کی اصل عورت یہ نہیں جو یورپی اقوام کے لباس ان کی عادات واطوار، ان کی زبان اور ان کے ہر عمل کا تقلیدی ڈھانچہ بنی ہوئی ہے بلکہ ہندستان کی اصل عورت وہ ہے جو اس کتاب کے بیچ میں کسان، مزدور، دھوبی، جُلاہے، بھنگی، تمبولی، بھٹیارے، مالی، تیلی، کنجڑے، حلوائی، رنڈی، چمار، گداگر، مہاجن اور مُلّا رموزی کی بیوی بنی ہوئی ہے تو مُلّا رموزی خوش ہوگا کہ خدائے رحیم و رحمان نے اس کی نیک نیتی اور محنت کو قبول فرمالیا کیونکہ انھی عورتوں سے آپ کو ''نسوانی ہند'' کی اصلاح وترقی کے صحیح راستے ملیں گے۔

وَصَلِّ علٰی نَبِیِ اللّٰهِ تَعَالٰی وَاٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِیْنَ

مُلّا رموزی

11 اپریل 1931، مطابق 22 ذی قعدہ 1349ھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بیوی کی ضرورت

انسانیت کی تکمیل وتہذیب، عروج وترقی اور نظم وانصرام کے لیے شادی کی فرضیت اور ضرورت ہر قوم اور ملک میں مسلّم ہے۔ ہندستان میں بھی اس ضرورت سے انکار تو نہیں کیا جاتا لیکن اسے ''خوفناک'' اور ہلاکت بار، ضرور کہا جاتا ہے۔ جس کا اصل سبب آگے بیان کیا جائے گا۔

دنیائے انسانیت اور بنی نوع بشر کے مصلح اعظم اور مسلمانوں کے ہادی و مرشد رسول خدا حضور احمد مجتبیٰ محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کام کو ''عمل خیر'' کہا ہے اور ایسے اشخاص کو جن کی مالی اور جسمی مقدرت مسلم ہو چار عورتوں سے شادی کرنا جائز فرمایا ہے اور آج دنیا جہان کے حکما اور اربابِ فضل وتحقیق بھی بیک وقت چار شادیاں کرنے کے حق میں ہیں بشرطیکہ شوہران چار عورتوں کے حقوق وفرائض کو مساوی طور پر ادا کرنے کے ساتھ ہی ان میں ربط ویگانگت بھی قائم رکھ سکے۔

انسانی ضروریات کے لحاظ سے شادی اس درجہ ضروری چیز ہے کہ بغیر اس کے انسان اپنی کسی تحریک اور ضرورت کو اچھی طرح سے پورا نہیں کرسکتا یہاں تک کہ وہ خود اپنی زندگی کو سہولت، دلجمعی، سکون، نظم وجامعیت اور تنظیم وتہذیب کے ساتھ بسر نہیں کرسکتا، جماعت میں بھی اس کو کوئی وزن ووقار حاصل نہیں ہوتا اور خاندان میں بھی وہ باوصف خاصی عمر کے ''لونڈا'' اور چھچھورا ہی

بنا رہتا ہے۔

اہلِ شہر، اہلِ محلّہ اور کوتوالِ شہر کی نظر میں بھی اگر وہ رات کو اپنے گھر پر موجود نہ ملے تو مشتبہ ہی رہتا ہے اور عورت ذاتوں میں تو اس کی کوئی عزت ہی نہیں۔

مذہب محترم اسلام کی نظر میں بھی اس کا کوئی وقار اس لیے نہیں کہ وہ ایک مسنون طریق و ضابطہ سے گریز کرنے والا ہے۔

ہائی کورٹ کی نظر میں بھی وہ حقوق وراثت اور جانشینی کی مراعات سے بنی نوع بشر کو دانستہ طور پر محروم رکھنے کا مجرم ہے۔

حکیموں اور ڈاکٹروں کی نظر میں بھی اس کا دماغ ''پاگل'' ہوتا ہے یا وہ خود مجنوں ہوتا ہے، یعنی غیر شادی شدہ انسان کی صحت نہ معتدل سمجھی جا سکتی نہ قابلِ اعتبار گویا وہ ایک طرح کا گدھا بھی ہوتا ہے اور انشا پردازوں اور مدبرین وقت کی نظر میں صرف ''بے جورو آدمی'' ہی ہوسکتا ہے جو الفت و عاشقی، رحم و کرم، عدل وانصاف، عفو و درگزر، کفایت و انصاف، مساوات و رواداری، صبر و تحمل، اضطراب و اشتعال اور بین الانسانی اخلاق و روابط اور خواص و خصائل سے یکسر سمجھا جا سکتا ہے کہ بے شادی کیے ان جذبات وتاثرات کا تجربہ ناممکن ہے اور اسی لیے انسان کا احساس، عمل اور ذہنی صلاحیت قابلِ اعتماد نہیں۔

پھر اس لیے بھی شادی ضروری ہے کہ ہندستان کے انسان کو صرف علی گڑھ میں بی۔اے پاس کرنا اور انگریزوں سے اپنی حکومت بغیر لڑے چھین لینا تو باقی نہیں رہ گیا ہے بلکہ اس کے ذمہ اور دوسرے اور بے شمار کام بھی ہیں جس میں سب سے بڑا کام روزی کمانا بھی ہے جسے ملازمت بھی کہتے ہیں اور تجارت وزراعت بھی مگر تمدن یا جماعتی قاعدوں کے حساب سے انسان روزی اسی وقت کما سکتا ہے جب وہ کافی محنت اور مستعدی سے کام لے، پھر جب وہ روزانہ کافی محنت اور مستعدی سے کوئی کا کرے گا تو اسے سات بجے شام سے صبح کی اذانوں تک آرام اور کامل راحت کی بھی ضرورت ہوگی اور وہاں پکی ہوئی روٹی بھی چاہے گا، یعنی اسے یہ بھی ضرورت ہے کہ وہ انسانوں میں رہ کر ''جامۂ انسانیت'' میں بھی رہے اور جامۂ انسانیت کہتے ہیں اس کو کہ انسان کا ایک مکان ہو، اس کے صاف ستھرے کپڑے ہوں، پمپ جوتا ہو اوڑھنے بچھانے کو لحاف ہو، کمبل

ہو، چادر ہو اور روٹی پکانے کے برتن ہوں، مرغا مرغی ہوں، بکرا بکری ہوں، صندوق ہوں، الماریاں ہوں، سر کے انگریزی بال سنوارنے کے لیے آئینہ ہو، روشنی کے لیے بجلی کا ہنڈا نہیں تو ایک دیا تو ہو اور جو ذرا بڑا انسان ہو تو پھر اس کے لیے داڑھی صاف کرنے کے اُسترے، صابن، لونڈر، آئینہ، تولیہ، ٹینس کا بلا، ہاتھ کی گھڑی، پتلون، کوٹ، پان کا ڈبہ، سگریٹ کیس اور ہیٹ کے ساتھ ہی صبح سویرے انڈے، پراٹھے، چاء، کیک، بسکٹ اور حلوا بھی ہو، پس ان تمام چیزوں کی حفاظت، صفائی اور دیکھ بھال کے لیے بیوی اور فقط بیوی ہی درکار ہے اور جو آپ یہ کہیں کہ ایک ملازمہ پال لیجیے ایک لڑکی پھر رہنے دیجیے تھوڑے دن اسے اپنے گھر میں، کچھ دن بعد ہی یہ نتیجہ نکلے گا کہ کوتوالی میں رپٹ لکھاتے پھریں گے اور گواہ ڈھونڈھتے پھریں گے اور اس سب پر آپ سے یہ کبھی نہ ہوگا کہ ملازمہ کو آپ اشرفیوں، گنّیوں، نوٹوں اور روپیہ کا بکس بھی دے دیں یا اسے اپنے ساتھ دسترخوان پر بٹھا کر کھانا بھی کھلائیں یا یہ کہ آپ اپنے ہاتھ سے اس کے منہ میں انڈے، پراٹھے، کباب، قیمہ گوشت، متھرا کے پیڑے، آگرے کے دال موٹ، علی گڑھ کا مکھن، الہٰ آباد کے امرود، ملیح آباد کے آم، بھوپال کا گنکا، لکھنؤ کا خمیرہ، جبل پور کی بیڑی، پنجاب کی لسی، مصر کا سگریٹ اور لندن کا جوتا دیتے جائیں اور خوش بھی رہیں یا اپنی بھانجی کی شادی میں اسے دلہن کے کپڑے پہنا کر بھیج دیں اور ساری عورتیں اسی کا استقبال کریں اور جو آپ اس کے ساتھ ایسا برتاؤ بھی کریں تب بھی وہ ایک دن کسی محلے والے کے ساتھ بمبئی بھاگ جائے گی لہٰذا ثابت ہوا کہ بیوی ہی ہو سکتی ہے جو انسان کے گھر کے اندر رہ کر اس کی ہر طرح کی معاون اور خدمت گزار رہ سکتی ہے۔

ان سب کے سوا پھر یہ دیکھیے کہ انسان کی فطرت ذرا چور بھی واقع ہوئی ہے اور بعض معاملات و مسائل میں انسان بہت سی باتیں اپنے دل میں محفوظ رکھتا ہے، مگر وہ قدرتاً اس ذخیرہ کو ہر وقت محفوظ بھی نہیں رکھ سکتا اور ایسے حالات میں اسے ایک معاون، رازداں اور راز دار کی ضرورت بھی لاحق ہوتی ہے۔ مثلاً آپ دل میں ارادہ کریں کہ مولانا محمد علی اور مولانا ظفر علی خاں ایڈیٹر اخبار ''زمیندار'' لاہور کو اپنے ساتھ لے کر شہر کابل پر حملہ کریں اور بچہ سقا کو نکال کر غازی نادر خاں کو تخت کابل پر بادشاہ بنا کر بٹھا دیں یا بادشاہ امان اللہ خاں کو اٹلی سے لا کر پھر کابل کا بادشاہ

بنادیں یا ہندستان کی قانون بنانے والی مجلس واقع دہلی کے بھرے اجلاس میں بم کا گولا ایسے ممبروں پر پھینک ماریں جو انگریزوں کی ہاں میں ہاں ملاتے رہتے ہیں۔ یا آپ لاہور کے کسی بند مکان میں بیٹھ کر بم کے گولے بنائیں اور چاہیں کہ سی۔آئی۔ڈی کا کوئی آدمی ہمیں جھانک نہ لے۔ یا آپ اسٹیشن منماڈ پر ریل کے ڈبے میں بم کا گولا چلادیں یا نئی دہلی کے قریب آپ وائسرائے کی ریل گاڑی کو بم کے گولے سے بچا کر اُڑا دینا چاہیں یا آپ جناب سائمن کمیشن صاحب کو کالی کالی جھنڈیاں دکھا کر ڈرائیں تا کہ وہ ہندستان میں انگریزوں کی حکومت قائم رہنے کا کوئی پیچ دار قانون نہ بنائیں یا آپ رات کے وقت انگریزوں کو ڈرانے کے لیے دیواروں پر ''سرخ رنگ کے'' اشتہار چسپاں کریں یا آپ سمرقند اور شہر بخارا جا کر روسی لوگوں سے اس لیے روپیہ لانا چاہیں کہ اس روپیہ سے ہندستان میں انگریزوں کے خلاف لوگوں کو فساد اور بے چینی پھیلانے پر آمادہ کریں گے یا اس روپیہ کو اخبارات کو دے کر ان سے انگریزوں کے خلاف مضامین لکھوائیں گے یا اس روپے کو آپ ہندستان کے کسانوں میں یہ کہہ کر تقسیم فرمائیں کہ جب ہندستان پر حکومت روس کی فوجیں حملہ کریں تو تم بھی کلہاڑیاں ہاتھوں میں لے کر انگریزوں پر ٹوٹ پڑنا یا تم کلہاڑیوں سے حملہ نہ کر سکو تو روسی فوجیوں کو غلہ، چارپائیاں، لوٹے، گھی، چاول، دال، قیمہ گوشت اور حقہ دینا یا آپ چاہیں کہ شہر بمبئی کے مزدوروں کو یہ کہہ کر تاؤ دلائیں کہ تمھاری دن بھر کی مزدوری سے یہ کارخانوں کے مالک تو پیتے ہیں شراب اور موٹروں پر بیٹھے پھرتے ہیں اور تمھیں دیتے ہیں فقط چار آنے روزانہ اس لیے تم کام چھوڑ دو عرف ہڑتال کر دو تو پھر یہ لوگ تمھاری اُجرت میں اضافہ کرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ یا آپ چاہیں کہ علی گڑھ یونیورسٹی اور ہندستان کے ہر اسکول میں جا کر کہہ دیا جائے کہ تم ہندستانی طالب علم ہو کر اپنے ملک کے بنے ہوئے کپڑے اور اپنی ملکی زبان کو استعمال نہ کرو گے تو تمھارا گلا گھونٹ دیا جائے گا یا آپ شہر لاہور کی کسی رنڈی پر فریفتہ ہو کر اس کے دوسرے دوست کو قتل کر کے اس کی نعش کو ایک صندوق میں بند کر کے کسی دریا کے کنارے پھینکنا چاہیں یا چلتی ہوئی ریل میں آپ مسافروں کا سامان چرانے کے لیے رات دن ریلوں میں چڑھے پھریں، یا آپ خفیہ پولیس کی ملازمت کر کے سادھوؤں اور مولویوں کا لباس پہن کر ادھر سے اُدھر چکر لگاتے پھریں، یا افلاس سے تنگ آ کر اور تنخواہ کی کمی کے باعث

اغوا، ڈاکہ، مداخلت بیجا بخانہ بوقت شب یا بوقت دوپہر، یا استحصال بالجبر، اقدام قتل، قتل عمد، یا خودکشی کے ارادہ سے ایڈیٹر اخبار ''ہمت'' لکھنؤ مولانا جالب دہلوی کے برابر افیون کھانا چاہیں یا ان میں سے کسی ایک جرم کا ارتکاب کر گزریں یا ارتکاب کا ارادہ فرمائیں یا ارادہ کر کے باہر نکلیں کہ پولیس والے آپ کو آگے دھر لیں یا ریل میں سوتے ہوئے مسافروں کے صندوق ریل سے باہر اپنے مقرر کیے ہوئے دوستوں کے لیے پھینک دیں اور خود پولیس کے سپاہی بھی بنے رہیں، یا کانگریس کے اجلاس، اجمیر شریف کے عرس اور خواجہ حسن نظامی صاحب دہلوی کی قوالی میں آپ لوگوں کی جیب کاٹنے تشریف لے جائیں یا اپنا نام سیماب اکبر آبادی اور ساغر علی گڑھی رکھ کر رئیسوں کو قصیدے سنانے جائیں اور جب وہاں سے ناکام واپس ہوں تو مُلّا رموزی کے خلاف مضامین لکھنا چاہیں اور نہ شرمائیں تو ان تمام قسم کے اعمال اور جرائم میں راز داری کی ضرورت ہوگی اور اس راز داری کے لیے آپ کو بیوی سے زیادہ محبوب صادق، مستقل مزاج اور پابند عہد کوئی دوسرا راز دار نہ ملے گا۔ کیونکہ عورت جب کسی کی ہو جاتی ہے تو اس کی ساری زندگی اسی شخص سے متعلق ہو کر رہ جاتی ہے جس کی وہ بیوی ہو چکی ہے۔ لہٰذا کسی راز کو ظاہر کر کے وہ اپنے شوہر کو کوتوالی پہنچائے گی نہ خود کوتوالی جائے گی۔ پھر فرض کیجیے کہ آپ بچپن میں محلے کے لونڈوں کے ساتھ بیڑی اور سگریٹ پینا شروع کریں پھر آپ تھوڑی سی چرس بھی پینا شروع فرما دیں، پھر ذرا سی شراب بھی کہ اتنے میں آپ کی شادی ہو جائے اور اب آپ گانجا اور چانڈو بھی پینا شروع کر دیں تو اس سے آپ کے جسم کی تمام بجلی ایک دم ٹھنڈی ہو جائے گی اب نہ آپ ملازمت کے قابل رہیں گے نہ تجارت کے۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ آپ فاقہ کشی کی حد پر پہنچ جائیں گے اس وقت بس ایک آپ کی بیوی یوں کام آئے گی کہ آپ اگر اس کا زیور جہیز کے برتن اور کپڑے فروخت کر کے کھاتے رہیں گے تو زندگی کے بقیہ دن بغیر جیل خانے کے کٹ جائیں گے اور بیوی کی نالش سے بھی محفوظ رہیں گے کیونکہ وہ بیوی ہی نہیں سمجھی جاتی جو اپنے شوہر پر نالش کر دے۔

فرض کیجیے کہ آپ کو چلتے چلتے بخار آ جائے اور آپ گھر میں آ کر کہیں ارے لحاف تو اُڑھا دو، ارے اللہ میاں، میں تو مر گیا، پھر آپ کے لیے ڈاکٹر انصاری بلائے جائیں۔ وہ آ کر آپ کے سینہ پر ایک آلہ لگائیں اور سینہ کو خوب ٹھوکیں اور اتنے داموں کی ایک دوا دے جائیں کہ

ان سے سارا شہر خرید لیا جائے مگر آپ کو آرام نہ ہو تو آپ کے لیے پھر کوئی ''شفاء الملک'' قسم کے حکیم صاحب بلائے جائیں اور یہ آپ کو دے جائیں گل بنفشہ، تخم خطمی، گاؤزبان، عناب اور شربت سکنجبین مگر آپ اسی حالت میں کھالیں آم کا آچار تو ہو جائے آپ کو دوسری بیماری، پھر اسی حالت میں آپ کو زکام بھی اور نمونیہ بھی اور اسی حالت میں آپ الہٰ آباد کے امرود بھی کھالیں اور اب آپ کو سورۂ یٰسین سنانے میں بہت کم مدت رہ جائے تو ظاہر ہے کہ آپ رات کو خود نہ سوئیں گے نہ دوسروں کو سونے دیں گے اور جب اس طرح آپ پر کئی راتیں گزر جائیں گی تو ایک دن آپ کی والدہ صاحبہ تک تہجد کی نماز پڑھنے میں مصروف ہو جائیں گی۔ اب اس وقت اگر آپ کو معلوم ہوگی پیاس تو ایک شخص اس حالت میں خموشی سے آپ کو پانی کا گلاس دے گا اور آنسوؤں کو صاف کرتا جائے گا اور یہی آپ کی بیوی ہوگی جو آپ کی بیماری کی حالت میں کام آئے گی۔ فرض کیجیے کہ کسی دن آپ کا دل چاہے گا کہ آج مچھلی کھائیں مگر ملازمت کی حاضری کا وقت پورا ہو جانے کی وجہ سے آپ کسی راہ گیر کے ہاتھ اس مچھلی کو گھر بھیج دیں اور تاکید فرمادیں کہ اس میں خوب خوب گھی ڈال کر اسے پکانا، میں دفتر سے آ کر کھاؤں گا، مگر اتفاق سے آج ہی آپ کے دفتر کا افسر بدل جائے اور اس کی جگہ کوئی علی گڑھ کا پڑھا ہوا افسر ہو کر آجائے اور آتے ہی اپنا رعب بٹھانے کے لیے وہ رات کے گیارہ بجے تک کام کرتا رہے تو یاد رکھیے کہ اس عرصہ میں اس مچھلی کو آپ کے والد صاحب، والدہ صاحبہ، بہن اور بھائیوں نے چٹ کر لیا ہوگا اور آپ بارہ بجے رات کو اس خوشی میں گھر پہنچیں گے کہ مچھلی کھاؤں گا پھر گھر پہنچ کر علی گڑھ کے پڑھے ہوئے افسروں کی فرعونیت، غرور اور کرشتانی خواص پر آپ تاؤ بھی کھاتے جائیں گے اور مچھلی کھانے کے لیے ہاتھ بھی دھوتے جائیں گے کہ کوئی آہستہ سے کہے گا کہ ارے لاحول ولا وہ مچھلی تو ہم نے کھالی ورنہ خراب ہو جاتی، اس وقت اس خبر سے آپ اس قدر کھول جائیں گے کہ اپنے تمام خاندان کو یہ کہہ کر گورنمنٹ کے حوالے کر دیں کہ انھیں پھانسی پر لٹکا دیا جائے یا کالے پانی بھیج دیا جائے کہ بس اسی تاؤ کی حالت میں اُسی مچھلی کا ایک نہایت نظر نواز پیالہ آپ کے دسترخوان پر آجائے گا اور یہ پیالہ وہ ہوگا جو آپ کی بیوی نے سارے خاندان کی نظر بچا کر پہلے ہی کسی طاق میں رکھ دیا ہوگا کہ ایسی محبت اور ہمدردی قدرت نے بیوی ہی کو عطا فرمائی ہے علی گڑھ کے لونڈوں کو نہیں۔ فرض کیجیے کہ

آپ مُلّا رموزی کی طرح دن بھر نوکری کی پابندی اور افسروں کی خوشامد سے تھک کر رات کو مضمون نگاری کے لیے تازہ دماغ ہونے کے واسطے قوالی کی محفلوں سے تہجد کی نماز کے وقت گھر واپس آنے کے عادی ہوں لہٰذا جب اس قدر رات گزر جانے پر آپ آ کر دروازہ کھٹکھٹائیں گے تو آپ کے والد صاحب چار پائی پر ہی سے آپ کو نالائق، مردود، خبیث اور آوارہ کہیں گے۔ والدہ صاحبہ اگر بیدار ہو جائیں گی تو بد دعا فرمائیں گی یا اتنا ضرور کہیں گی کہ یہ روزانہ کہاں جا کر مر جاتے ہو۔ بہن بھائی آپ کی آواز سن کر لحافوں میں منہ چھپا کر فرضی سونا سو جائیں گے، مگر ایک اور ذات ہوگی جو اپنے بچہ کو روتا چھوڑ کر کچھ گنگناتی ہوئی آئے گی اور آپ کے لیے دروازہ کھول دے گی اور یہ وہ ذات ہوگی جسے بیوی کہتے ہیں۔

فرض کیجیے آپ کبھی علی گرھ میں پیدا ہو گئے تھے مگر آپ تھے رنڈی کے پیٹ سے، اس لیے آپ کی اعلیٰ تعلیم و تربیت پر کسی نے توجہ نہ کی کہ اتنے میں کسی اکبر آبادی شاعر کی نظر آپ پر پڑی اور اس نے راتوں رات آپ کو گانا سکھایا اور لے کر گیا امیروں کے پاس اور آپ کے گانے سے خوب روپیہ کمایا۔ اتنے میں ہو گئی آپ کی آواز خراب۔ جاہل تو پہلے ہی تھے اس لیے اب آپ بجز چوری کے اور کیا کرتے لہٰذا آپ نے چوراور کوتوالی میں مار کھائی اور جیل خانے گئے پھر جیل خانے میں کسی پٹھان قیدی کی امداد سے آپ رات کے وقت جیل خانے کو پھاند کر بھاگ گئے اور پھر دہلی یا آگرہ میں پکڑے گئے اور جیل خانے بھیجے گئے اور اسی طرح آپ کو گزر گئے تیس برس تو اب آپ ساری دنیا میں بجائے شاعر اور ایڈیٹر کے ''نمبری بدمعاش'' مشہور ہو جائیں گے اور کوئی نہ ہوگا جو آپ کے سلام کا جواب تک دے کہ اسی حالت میں آپ اپنے پچھلے گناہوں سے توبہ کر کے کسی مسجد میں جا بیٹھیں گے اور محلے کے لوگ کسی یتیم خانہ کی لڑکی سے آپ کی شادی کرا دیں گے، تو یہ لڑکی آپ کی ''نمبری بدمعاشی'' کو کبھی خاطر میں نہ لائے گی اور عمر بھر آپ کی عزت اور خدمت میں اپنا سب کچھ خرچ کر دے گی کہ ایسی ہی محبت ہوا کرتی ہے بیوی کو اپنے شوہر سے خواہ وہ آگرہ کا بھانڈ ہو یا علی گرھ کا قوال۔

فرض کیجیے کہ آپ دنیا کے زبردست اور لاجواب ادیب اور علامہ ہوں۔ لیکن غلامی کی ماؤف ذہنیت کی وجہ سے آپ کے کمال اور ہنر کی قدر باہر کے لوگ تو کریں مگر شہر والے آپ کو کوئی

خاص وقعت نہ دیں۔ آپ حکمت وموعظت کے لاکھوں سبق دیں اور اپنے کمال کی بنا پر سارے ہندستان کی آنکھ کے تارے بن جائیں لیکن دفتر کے افسر لوگ "پائنیر" اخبار کے سوا کبھی آپ کے جواہر ریزوں پر نظر بھی نہ ڈالیں تو آپ اس صدمہ سے دل تنگ ہو کر گھر میں آئیں اور گھر والے بھی آپ کو گھر کی مرغیں سمجھیں تو اس سے آپ کا صدمہ دو چند ہو جائے گا، مگر ایک آپ کی بیوی ہوگی جو آپ کی نیک شہرت، بلند قابلیت اور اعلیٰ ذہانت پر یوں فخر کرے گی کہ آپ کی فضیلت کی دھاک وہ اپنی ساری سہیلیوں پر بٹھا دے گی اور آپ کی شہرت کی اطلاع پا کر وہ آپ پر خود کو نثار کرتی رہے گی۔

پس یہ اور اسی قسم کے بے شمار و بے قیاس اسباب ہیں جو شادی کی ضرورت، اس کی فرضیت اور فوائد کو ثابت کرتے ہیں اور انہی اسباب کے تحت دنیا کی ہر قوم اور ہر فرد کے نزدیک شادی ایک ضروری کام ہے۔

◆◆◆

بیوی کی تعریف

آپ یہ نہ سمجھ لیجیے کہ "بیوی کی تعریف" سے یہ مطلب ہے کہ مُلا رموزی اپنی بیوی کی اس طرح تعریف کرنے چلے ہیں کہ ہماری بیوی بے حد حسین ہے، بے حد جمیل ہے، بے حد موٹی تازی ہے، بے حد تیز ہے اور بے حد دلیر اور جفاکش ہے، بے حد وفادار ہے، بے حد خدمت گزار ہے، بے حد سلیقہ مند ہے، بے حد کفایت شعار اور سب سے بڑی خوب صورتی یہ کہ بے حد صاحبِ اولاد ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ تمام دنیا کو بتادیا جائے کہ جب بیوی خریدی جائے تو کس قسم کی؟ چنانچہ بیوی کے اندر جن چیزوں کی ضرورت ہے وہ مع فوائد واثرات یہ ہیں:

1۔ نہایت درجہ صحیح نسب اور خاندان کی لڑکی ہو۔نسب اور خاندان کے صحیح ہونے کا یہ فائدہ ہے کہ اُس کی تمام عادتیں حد سے زیادہ قابلِ تعریف اور لائقِ اطمینان ہوتی ہیں جیسی کہ ماشاء اللہ چشم بددور ہماری بیوی صاحبہ کی ہیں کہ بس جس رنگ میں دیکھو سبحان اللہ ہی سبحان اللہ۔

2۔ بیس برس کی عمر ہو کہ یہی وقت عقلی اور ذہنی قوئی کی پختگی اور ترقی کا ہوتا ہے اور شوہر جس قسم کی تعلیم دینا چاہے اُس کو قبول کرنے اور سمجھ لینے کی صلاحیت کافی ہوتی ہے۔اس سے سوا عمر کی عورت سے شادی کرنے کے یہ معنی ہیں کہ ایک شوہر نے دوسرے شوہر سے شادی کر لی۔

3۔ قوئ میں حد سے سوا اعتدال ہو اس سے بیوی آئے دن کی کھانسی، زکام، بخار، انفلوانزا، ہیضے، طاعون، سل، دق اور درد سر سے محفوظ رہتی ہے اور ایسی بیوی کا شوہر کنین، مکچر نمبر ٹو، کلورافارم، ٹنچر، انجکشن، آپریشن، گل بنفشہ، تخم خطمی، گاؤ زباں، عناب، سپستاں، شربت انار اور عرق نیلوفر کی خریداری سے محفوظ رہتا ہے۔ ایسی ہی بیوی ہوتی ہے جو معتدل مزاج بھی رہ سکتی ہے اور جب معتدل مزاج ہے تو وہ کبھی شوہر سے نہ کہے گی کہ:

حق میں اچھا نہ ہوگا اگر آج تم نے مجھے پمپ جوتا لا کر نہ دیا اور حق میں اچھا نہ ہوگا جواب تم نے کبھی ننھے کے معاملہ میں مجھ سے ایک لفظ بھی کہا ہے۔

اور حق میں اچھا نہ ہوگا جو تم آج میری بالیاں خرید کر نہ لائے اور سنتے بھی ہو کہ نہیں کہ وہ جو تم نے مجھ سے کمخواب کی شلوار کا وعدہ کیا تھا، وہ کہاں ہے؟

بس تو مجھے میرے میکے جانے دو اور

بس تو مجھے بھی تمھاری پروا نہیں ہے اور

بس تو سنبھالو تمھاری اولاد کو، اور

بس جواب ایک حرف بھی زبان سے کہا ہے، اور

بس رکھ دو میرا مہر، اور

لاؤ میرے جہیز کا زیور جو تم فروخت کر کے کھا گئے ہو، اور

بس اس پر گھمنڈ نہ کرنا کہ میں ڈپٹی کلکٹر ہوں، اللہ میرے باپ کو رکھے وہ بھی پٹھان ہے اور جاگیردار بھی، اور میں بھی کلب کی ممبر ہوں، اور

بس منہ سنبھال کر بولنا، میں پانچ بھائیوں کی ایک بہن ہوں میری روٹی کسی پر بھاری نہیں ہے۔

تو لو یہ چلی میں بھی اب دیکھوں رکھ تو لو میری اولاد کو تم اپنے قبضہ میں!

کیا کہا ذرا پھر کہنا؟

4۔ حد سے سوا خوبصورت ہو اور بے حد حسین مگر نہ اس قدر کہ پھر شوہر کو دفتر جانا بھی محال نظر آئے۔ اس سے یہ فائدہ ہے کہ شوہر صاحب مغرب کے بعد ہی گھر میں آجاتے ہیں اور صبح

بھی خدا خدا کر کے گھر سے نکلتے ہیں، ہماری طرح نہیں کہ:

جیسے پیا گھر رہے ویسے رہے بدلیس

حسن بے حد سے آپس میں اتفاق اور محبت بڑھتی رہتی ہے اور ایسے میاں بیوی عمر بھر فارخطی اور طلاق سے محفوظ رہتے ہیں۔ بیوی کے بے حد حسین ہونے سے خوبصورت اور تندرست انسانوں میں اضافہ ہوتا ہے۔ خوبصورت عورت قدرتاً مزاج کی صفائی پسند اور سلیقہ مند ہوتی ہے یہ نہیں کہ ایک ایک ماہ تک بیوی بھی بدھو بھٹیارہ بنی ہوئی ہیں اور ان کی اولاد بھی افیونی۔

خوبصورت بیوی سے شوہر کی تعریف میں محلے اور شہر کی ہر قسم کی خالہ بی اور نانی امّاں سرگرم رہتی ہیں اور برادری میں عزت بڑھتی ہے اور خوبصورتی کے باعث خود بیوی شوہر کے اکثر مظالم سے محفوظ رہتی ہے، مثلاً پھر شوہر عمر بھر دوسرا نکاح نہیں کرتا جس طرح مُلّا رموزی فکر میں ہیں۔

خوبصورت بیوی کے لیے زیادہ بھاری زیور کی ضرورت کم ہوتی ہے ورنہ اپنی بدصورت حالت کا بدلہ وہ شوہر سے قیمتی لباس اور زیور بنوا کر لیتی ہے۔

خوبصورت بیوی اپنی آرائش میں بہت کم وقت صرف کرتی ہے کیونکہ اُسے اپنی قدرتی خوبصورتی پر خود ہی گھمنڈ ہوتا ہے۔

خوبصورت بیوی کا بدصورت شوہر بھی کبھی غلیظ میلا گندہ اور سست نہیں رہ سکتا کیونکہ وہ بیوی کی خوبصورتی اور صفائی سے ہر وقت مرعوب اور شرمندہ رہتا ہے اس لیے اپنے اندر بھی نفاست اور خوبصورتی پیدا کرنے پر مائل ہوتا ہے۔ مُلّا رموزی صاحب کی طرح نہیں کہ خود ہی دل گھبرایا تو کپڑے بدل لیے اور خود ہی کپڑوں کو پسند کر لیا۔ جب چاہا گھر میں آئے اور جب چاہا نکل گئے، جب چاہا سو گئے اور جب چاہا بیدار ہوئے۔ خوبصورت بیوی سے نہ ساس لڑتی نہ نند، ان سے بیوی کو اُس کی ساس ہر محفل اور ہر تقریب میں لے جاتی ہے اور عورتوں کو دکھا دکھا کر فخر کرتی ہے اور نند صاحبہ بھی ''بھابی جان'' کہہ کر پروانہ بنی رہتی ہیں۔ ہمارے ہاں کی طرح نہیں کہ ساس کے طعنے صبح سے شام تک جاری اور بھوپال کا طنز شام سے صبح تک موجود، جس سے سارے گھر کا امن برباد اور خوشحالی رفوچکر۔

5۔ بیوی مالدار آدمی کی بیٹی ہو اور صاحبِ مال۔ اس سے شوہر مالی افکار اور مشکلات سے محفوظ

رہتا ہے مگر نہ اس درجہ مالدار کہ شوہر صاحب اُس کے موٹر ڈرائیور معلوم ہوں۔ مالدار بیوی شوہر کی مالی مشکلات کی بہترین مددگار ہے۔ اس سے خود بیوی شوہر کے مظالم سے محفوظ رہتی ہے۔ تنگ دست اور غریب نہ شوہر کی نظر میں ذی اثر نہ ساس سسر کی نظر میں اچھی۔ بس پڑی رہو اور روکھی سوکھی کھاتی رہو۔

مالدار بیوی سے غیرت دار شوہر میں بہت زیادہ روزی کمانے کی حیا پیدا ہوتی ہے اور کاروباری قوتیں اس لیے بیدار و مشتعل رہتی ہیں کہ کہیں بیوی کی نظر میں شوہر ذلیل اور محتاج نہ سمجھا جائے۔

مالدار بیوی سے شوہر اپنے سسرال کی مشکلات سے محفوظ رہتا ہے ورنہ غریب بیوی کے باوا کو بھی عمر بھر روٹی دیجیے اور بیوی کی والدہ کو بھی۔

مالدار بیوی سے لڑائی بھی کم ہوتی ہے، اس لیے کہ نا اتفاقی اور باہم آویزی تنگ دستی اور افلاس کی پریشانیوں سے پیدا ہوتی ہے۔

مالدار بیوی محلے کی عورتوں میں بھی ذی عزت اور خاندان کی عورتوں میں بھی ذی عزت رہتی ہے۔ اُس پر شوہر بھی فخر کرتا ہے اور اولاد بھی۔

مالدار بیوی گھر کے انتظام سے لے کر اولاد کی پرورش میں کامیاب رہتی ہے۔

مالدار بیوی کے بعض نقصانات یہ ہیں:

(1) وہ شوہر سے آزاد اور بےخوف رہتی ہے۔

(2) وہ شوہر کے تمام خاندان کو حقیر سمجھتی ہے۔

(3) وہ جب چاہتی ہے کلب چلی جاتی ہے اور جب چاہتی ہے ٹھنڈی سڑک اور تھیٹر کا تماشہ دیکھنے۔

(4) مالدار بیوی کا شوہر سست، کاہل اور اکثر افیونی ہو کر رہ جاتا ہے، مگر مُلّا رموزی کے خیال میں ان نقصانات پر بھی بیوی کا مالدار ہونا نہایت درجہ مفید اور ضروری ہے کیونکہ یہ تمام نقصانات شوہر کی دماغی قابلیت سے دور ہو سکتی ہیں اور محتاج بیوی کی تکلیفوں سے بہت کم ہیں۔

6۔ جہاں تک ہو بیوی کا دنیا میں کوئی نہ ہو اور اگر ہو تو ایک دو رشتہ دار کیونکہ بیوی کے بڑے

خاندان کے باعث شوہر آئے دن سسرالی جھگڑوں اور رسوم میں مبتلا رہتا ہے۔ اُس کا گھر ساس، سسرا، سالہ، سالی، پھر دادا سسر، چچا سسر، ماموں سسر، پھوپھا سسر، خالو سسر، نانا سسر اور نانی ساس، دادی ساس، خالہ ساس، چچی ساس، پھوپی ساس اور خدا جانے کتنی ساسوں سے بھرا رہتا ہے۔ آج سسر کے سلام کو جایئے تو کل ساس کے۔ پرسوں خالو سسر کو جھک کر آداب عرض کرنی چاہیے۔ تو پھر پھوپا سسر کا نسخہ بازار سے لا کر دیجیے۔ کبھی سالوں کی تعلیمی نگرانی اپنے سر لیجیے تو کبھی سالی کے بچوں کو کھلونے دلانے جایئے۔ پھر سالی کے لڑکے کی شادی میں بھی شرکت کیجیے اور سالے کے لڑکے کے عقیقے میں بھی، پھر عید پر سالوں کو بھی روپے دیجیے اور سالیوں کو بھی اور اگر سسر کی دو بیویاں ہوں تو لگا لیجیے حساب پندرہ سولہ سالوں اور سالیوں کے مصارف کا۔ پھر اتنے ہی سسرال والوں کا علاج بھی کیجیے اور معالجہ بھی۔ پھر اتنوں ہی کے کفن کے لیے بھی چندہ دیجیے اور دفن کے لیے بھی۔ پس اتنے زیادہ رشتہ داروں والی بیوی سے تو آدمی بکریاں چراتا پھرے جنھیں سنبھالنے اور چرانے سے دودھ بھی کھائے اور دولت بھی کمائے۔

کم رشتہ داروں والی بیوی مجبوراً وفادار بھی ہوتی ہے اور متحمل مزاج بھی، جفاکش بھی اور مہربان بھی۔ ورنہ بات بات پر برقعہ اور ڈولی موجود اور لیجیے وہ چلیں اماں بی کے گھر۔

7۔ اپنے ہی گاؤں، قصبے اور شہر کی بیوی ہو۔ اس سے شوہر مالی اور دماغی پریشانیوں سے محفوظ رہتا ہے اور اگر اپنی ہی برادری کی ہو تو سب سے بہتر ورنہ پھر لندن سے بیاہ لانا تو آسان ہے مگر رکھنا جیسا کچھ مشکل ہے وہ ہندستانی ڈپٹی کلکٹروں کے لڑکوں سے دریافت کر لیجیے۔

پردیسی بیوی کے ساتھ ہر ماہ اور ہر سال ریل کے ٹکٹ اور بدمعاش ٹکٹ کلکٹروں کے مصارف اور جھگڑوں سے نجات نہیں۔ جس اسٹیشن پر دیکھو کوئی ہندستانی ٹکٹ کلکٹر قینچی بجاتا ہوا آپ کے سر پر یوں سوار ہے کہ:

اور کیوں صاحب یہ آپ کے گھر کے لوگ ہیں نا؟

اور کیوں صاحب یہ ان کے برقعہ کے اندر کوئی بچہ ہے یا صندوق؟

تو بس پھر لایئے اس بچے کے نصف ٹکٹ کے دام۔

اور کیوں صاحب وہ جو سرخ برقعہ اوڑھے بیٹھی ہیں وہ آپ کے ساتھ جا رہی ہیں یا کسی اور صاحب کی سواری ہیں؟ تو پھر ان کا ٹکٹ کہاں ہے؟ یہ تو آپ نے فقط دو ٹکٹ دیے ہیں، تو بس تو پھر اتار دیے انھیں ریل سے یا ڈبل کرایہ ادا کیجیے ورنہ چلیے مع اہلیہ محترمہ اسٹیشن ماسٹر صاحب کی، انگریزی روبکاری میں یا پھر آپ ہیں کہ ٹکٹ کلکٹر کا گریبان پکڑے اُس سے کہہ رہے ہیں کہ ابے تو حرامزادے تو زنانہ ڈبے کے اندر کیوں گیا؟

تو مردود لعین تو نے مجھ سے پہلے ٹکٹ کیوں نہ مانگا۔

پھر بتاؤں تجھ کو ٹکٹ مانگنا۔

ابے ہاں ہم نے خود دیکھا کہ تو ڈبے کے اندر جھانک رہا تھا، تو پھر یوں کیوں نہیں کہتا اندھے کے بچے۔ لے یہ دیکھ اُن کا ٹکٹ اور یہ لے میرا ٹکٹ پس ظاہر ہے کہ بیوی کے ایسے سفر کا نتیجہ یا ریلوے کے تھانے میں پہنچتا ہے یا عدالت میں۔

پھر پردیسی بیوی کو آج کل جو سب سے بڑا خطرہ ہے وہ ان اللہ کے بندوں کا ہے جو دہلی کے اسٹیشن سے اُڑا کر یوں لے بھاگتے ہیں کہ آپ لاہور پہنچ جایئے اور بیوی دہلی میں ہندو سے مسلمان کر لی جاتی ہیں یا مسلمان سے ہندو۔ پھر لڑتے پھریے پردیسی عدالتوں اور چندے، کرایئے انجمن ہائے تبلیغ و شدھی سے پھر یہ اخبارات دوڑیں تو لاکھوں آدمیوں کے سامنے آپ کو آپ کی بیوی کو مع عدالتی کارروائی کے یوں چھاپ کر رکھ دیں کہ پھر چھپائے نہ چھپے اور مٹائے نہ مٹے۔ پھر اگر بیوی کے ساتھ اُن کے دس بھائی آئیں تو کرایہ دیجیے اور دس بہنیں آئیں تو آپ کرایہ دیجیے، روحانی اور دماغی اذیت یہ کہ بیوی پردیس کے سسرال میں وفات پا رہی ہیں اور آپ کو ملازمت سے نہ رخصت علالت ملتی نہ رخصت مرگِ ناگہانی۔ نتیجہ یہ کہ وہ پردیس میں وفات پا گئیں اور آپ اپنے دفتر میں اور بچے گھر میں چہلم تک روتے رہیں تو نہ یہ گورنمنٹ پروا کرے نہ کوئی حاکم عدالت دعویٰ قبول کرے۔ پھر کرتے پھریے دوسرے اور تیسرے پھر اگر پردیسی بیوی کے علیٰ ہٰذا القیاس قسم کے نقصانات بھی جمع کر لیجیے تو ایسی بیوی سے تو یہ بہتر ہے کہ آدمی ہر سال ایک حج کر آئے۔

8۔ آدمی خواہ کسی حیثیت کا ہو مگر بیوی جب انتخاب کرے تو اعلیٰ تعلیم یافتہ۔ مقصد یہ نہیں ہے کہ تمام کاشتکار بھی بی۔ اے پاس بیویاں تلاش کرنے پر مستعد ہو جائیں مگر ہاں یہ ضرور ہے کہ

اگر شوہر سے بیوی زیادہ ہوش مند ہو تو نفع ہی نفع ہے۔ تعلیم یافتہ سے مراد یہی نہیں کہ بیوی ہر حال میں اسکول ہی کی پڑھی ہوئی ہو اور پھر وہ بھی انگریزی ہی پڑھی ہوئی ہو۔ منشا تو یہ ہے کہ وہ اپنی ہی زبان اور اپنے ہی علوم کی ماہر ہو کیونکہ تعلیم یافتہ بیوی ہر حال میں مفید اور راحت بخش ہوتی ہے۔ اس کے باعث گھر کی انتظامی حالت میں سلیقہ احتیاط، کفایت، سکون، آسودگی اور ترقی نظر آتی ہے۔ خصوصاً ایسے شوہر کے لیے تو تعلیم یافتہ بیوی نعمت ہی نعمت ہے جو خود بھی صاحبِ عقل و ہوش ہو اور موجودہ زمانے میں غیر تعلیم یافتہ بیوی کا ہونا ایسا ہی ہے جیسے وہ مجنوں صاحب کی لیلیٰ مرحومہ سے کوئی شخص آج شادی کرنا چاہے۔

تعلیم یافتہ بیوی سے جس طرح گھر کی رونق حاصل ہوتی ہے اسی طرح اولاد اور خاندان کی اصلاح و خدمت میں اس سے وہ امداد ملتی ہے جو حکومت فرانس نے مراکش کے مسلمانوں سے تلوار کے زور سے حاصل کی تھی۔ تعلیم یافتہ بیوی شوہر کی حد سے سوا وفادار، خیر خواہ اور خدمت گزار ہوتی ہے اور شوہر اس کی عقلی شائستگی سے ہر آن اور ہر لحظہ آرام پاتا ہے۔ جاہل بیوی کے مقابل اس میں ضبط و تحمل اور مآل اندیشی کی قوت زیادہ بیدار ہوتی ہے اور بڑی راحت یہ کہ ہر کام شوہر کی مرضی کا کرتی ہے بے علم بیوی سے نااتفاقی، فرار، اغوا، چھپت ہو جانے اور شوہر کی ہلاکت اور ذلت کا ہر کام یقینی ہے اس لیے کہ وہ تعلیم نہ ہونے کے باعث کسی ذمہ داری اور اہمیت کو پہچان ہی نہیں سکتی۔ بے علم بیوی میں خوفِ خدا، نہ جماعت کے آداب کا لحاظ نہ اسے آمد و خرچ کا سلیقہ نہ لباس اور زیور کی تمیز، جتنا چاہتی ہے دوسروں کو کھلاتی ہے۔ بڑی مصیبت یہ ہے کہ شوہر کا بھیجا ہوا خط دروازہ پر کھڑے ہو کر راہگیر سے پڑھواتی ہے اور اُسی سے جواب لکھواتی ہے۔ اگر اس کا شوہر سیدھا چلتا ہے تو یہ ہمیشہ اُلٹی چلتی ہے۔ اگر اس کا شوہر میٹھی بات کرتا ہے تو یہ ہمیشہ جوتا مارتی ہے۔ غرض جاہل بیوی شوہر کے لیے اتنی ہی تکلیف دینے والی ہوتی ہے جتنے یہ کانگریس والے انگریزی حکومت کے لیے۔ اس لیے ہر مرد کے لیے تعلیم یافتہ بیوی ہی مفید ہے خواہ وہ مرد کسی برادری اور کسی حیثیت کا ہو۔

9۔ بیوی کی سب سے آخری تعریف یہ ہے کہ شوہر نے شادی سے پہلے اُسے اپنی دونوں آنکھوں سے دیکھا بھی ہو اور پسند بھی کیا ہو، یعنی جو بیوی بھی کی جائے بغیر دیکھے اور پسند

کیے نہ کی جائے۔ بغیر دیکھے کسی عورت سے شادی کر لینا ایسا ہی ہے جیسے کوئی اندھے حافظ جی دوسرے اندھے حافظ جی سے شادی کر لیں۔ ناپسندیدہ اور بے دیکھی بیوی شوہر کے لیے آخرت کا عذاب بھی اور دنیا کا بھی۔ ہندستانی مسلمانوں میں بیوی کے انتخاب کے جو طریقے رائج ہیں وہ خلافِ اسلام اور خلافِ عقل ہیں اس لیے اُنھیں پوری شدت اور جرأت سے توڑ دینا چاہیے، لیکن جو لوگ ان جاہلانہ قیود کو توڑنے کے مخالف ہیں سمجھو کہ یہی لوگ انسانیت اور مذہب کے دشمن ہیں۔

10۔ ہمیشہ کم سے کم مہر اور کم سے کم داموں کی بیوی خریدنا چاہیے۔ خریدنا اس لیے لکھا ہے کہ مسلمانانِ ہند میں جو دولت بیوی کے حصول پر خرچ کی جاتی ہے وہ صحیح معنی کی تجارت اور معاوضہ ہوتا ہے اس لیے ایسی ہی بیوی مفید ہوتی ہے جس پر روپیہ کم خرچ ہو۔ وہ بیوی ہی نہیں جس کے حاصل ہونے کے بعد شوہر مہاجنوں کا قرضہ ادا کرتے ہوئے مر جائے مگر ادا نہ ہو۔

یہ دس چیزیں ہیں جن کا ہونا ایک بیوی کے اندر ضروری ہے۔ پس جب ایک عورت میں یہ دس کی دس خوبیاں ہوں اُسے بیوی بنایا جائے۔ یہ نہیں کہ اگر ایک خوبی ہے تو کر لیا اور دو ہیں تو بیوی بنا لیا اور باقی کمزوریوں کو خدا کا حوالہ کہہ کر قبول کر لیا۔

◆◆◆

دوسری قوموں کی بیوی

دوسری قوموں کی بیوی سے مراد ہے یورپ، امریکہ اور افریقہ کی بیوی۔ یہ تینوں علاقے تین براعظم ہیں یعنی خشکی کے وہ حصے جہاں انسان آباد ہیں۔ ان کے بعد ایشیا کا براعظم ہے جس کے ایک حصے میں ہندستان آباد ہے۔ پس مذکورہ بالا تینوں براعظموں کی بیوی کے حالات بیان کرنے سے مقصد یہ ہے کہ ہندستانی باشندوں کی بیویوں کے تفصیلی حالات بیان کرنے سے پہلے دوسری قوموں کی بیویوں کے حالات کا ایک دھندلا سا خاکہ بھی سامنے رہے۔ لہٰذا معلوم کیجیے کہ یورپ، امریکہ اور افریقہ کے اکثر علاقے سرد برفانی اور آب و ہوا کے لحاظ سے نہایت درجہ معتدل اور خوشگوار واقع ہوئے ہیں اور انہی اثرات سے وہاں کے باشندے ایشیا کے باشندوں سے بہ لحاظ دماغ وقویٰ اور جسم کے نہایت افضل اور قابلِ تعریف ہوتے ہیں۔ پھر آب و ہوا کے بہترین اثرات کے بعد یورپ، امریکہ اور افریقہ کے اکثر باشندوں کو 'آزادی' کی نعمت حاصل ہے یعنی ان باشندوں کو کسی قوم کی غلامی اور رعایا ہونے کی ذلت نصیب نہیں ہوئی ہے اور کچھ شک نہیں کہ غلامی کے باعث انسان کے دماغ میں ہمیشہ فکر، پریشانی اور حوف کا غلبہ رہتا ہے جس کے باعث اُس کی فطری قوتیں ہمیشہ برباد اور ضعیف رہتی ہیں۔

تیسری دولت جو یورپ، امریکہ اور افریقہ والوں کو حاصل ہے وہ ان کی دولت مندی اور

ہنر مندی ہے۔ یعنی یورپ اور امریکہ والے خصوصیت سے دنیا کے تمام باشندوں سے علم و ہنر اور حکمرانی میں آگے ہیں مگر اس کی یہ وجہ نہیں ہے کہ ان کی یہ ترقی کسی تعویذ یا گنڈے، کے اثر سے ہے۔ بلکہ یہ سب کچھ اس لیے ہے کہ اُس طرف کے باشندوں نے سب سے پہلے اپنی قدرتی اور فطرتی بہادری، مردانگی، ہمت، حوصلے اور عمل سے کام لے کر دور دراز ملکوں اور شہروں کو فتح کیا۔ کروڑوں باشندوں کو پہلے خون میں نہلایا اور پھر ملک فتح کیا مگر حوصلہ نہ ہارا۔ اس کے بعد انھوں نے علم و ہنر کی قدر پہچانی اور پھر علم و ہنر کے حاصل کرنے میں مصروف ہوئے۔

پھر دنیا میں دولت کا دروازہ کھولنے والی چیز یعنی تجارت کے لیے خطرناک سے خطرناک مقامات کا سفر کیا اور اپنے وطن اپنے رشتہ داروں اور اپنے ساتھیوں کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر ان مقامات میں جا کر آباد ہو گئے جہاں ان کو تجارت سے فائدہ پہنچتا تھا۔

پھر یہ تمام باتیں بھی ایک دن میں حاصل نہیں ہوئیں بلکہ موجودہ یورپ، امریکہ اور افریقہ کی ترقی کم سے کم چھ سو برس اور زیادہ سے زیادہ ایک ہزار برس کی مسلسل کوششوں کا نتیجہ ہے اور یہی وجہ ہے کہ ان ممالک کی بیوی ایشیا کی تمام بیویوں سے آگے اور ترقی یافتہ نظر آتی ہیں۔

مثلاً ان ممالک کی بیوی اپنے شوہر کے برابر تعلیم یافتہ اور ہنر مند ہوتی ہے۔ ذی حوصلہ، خودمختار، ملازم اور صناع ہوتی ہے۔ وہ اپنے شوہر کی طرح تنہا سفر بھی کرتی ہے اور تجارت بھی۔ صنعت و حرفت، ایجاد و اختراع، سیاست و انتظام اور امورِ خانہ داری میں یوں طاق کہ دس شوہر ایک طرف اور وہ اکیلی ایک طرف۔ اسے شوہر کی اصلاح و نگرانی اور ہدایت کی کوئی ضرورت نہیں۔ وہ ملکوں اور شہروں کے فتح کرنے اور اپنے وطن کو دشمن سے بچانے کے لیے میدانِ جنگ میں مردوں کے ساتھ توپ اور تلوار سے بھی مقابلہ کرتی ہے اور اندرونِ ملک بھی وہ کسی کام سے محتاج اور عاجز نہیں رہتی۔

یہی حالت کسی وقت عرب کے مسلمان عورتوں کی تھی جنھوں نے ملکی لڑائیوں اور انتظامی معاملات میں مردوں کے برابر حصہ لے کر دوسرے مسلمانوں کو سبق دیا تھا کہ وہ بھی ان کی طرح کام کر کے دنیا میں ناموری کی زندگی حاصل کریں۔

الغرض مذکورہ بالا ممالک کی بیوی کی ترقی آج حدِ ادب تک پہنچ چکی ہے اور یہ انتہائی ترقی کا

نتیجہ ہے کہ اب ان تمام ممالک میں بیوی اپنے شوہر کے حق میں بجائے راحت کے مصیبت بنتی جارہی ہے مثلاً آج کل یہ بیوی اپنے شوہر سے جو آگے نہیں تو بالکل برابر رہنے کے لیے شدید مقابلہ کررہی ہے۔ اس کے ہاں آئے دن طلاق اور شوہر پر مقدمہ چلادینے کی عادت کوئی شرمناک بات نہیں رہی۔ وہ ملازمت میں بھی شوہر کے برابر حق طلب کرتی ہے۔ وہ شادی کے مسئلہ میں بھی مرد کے برابر آزاد ہوچکی ہے۔ وہ پردے اور کھیل تماشوں کی قید سے بھی آزاد ہوچکی ہے۔ وہ موٹر بھی چلاتی ہے اور ہوائی جہاز بھی۔ وہ تار گھر میں بھی کام کرتی ہے اور عدالت میں بھی۔ وہ لیڈی ڈاکٹر بھی ہے اور سپرنٹنڈنٹ پولیس بھی۔ وہ تاجر اعظم بھی ہوتی ہے اور تھیٹر کی مالک بھی۔ وہ گھوڑ دوڑ میں شریک ہوتی ہے اور دنگل میں بھی۔ غرض دنیا کا کوئی کام اور کوئی میدان نہیں ہے جس میں وہ اپنے مرد کے برابر شریک نہ ہوتی ہو۔

اگرچہ ہندستان بھی عورتوں کی ترقی سے بالکل ہی محروم نہیں بلکہ ہندستانی خواتین میں سے بعض نے اپنی دماغی اور عملی فضیلت کے لحاظ سے ان ممالک کی عورتوں پر غلبہ حاصل کیا ہے جس کے لیے ہم علیا حضرت نواب سلطان جہاں بیگم صاحبہ فرماں روائے ریاست بھوپال کا نام پیش کرسکتے ہیں جن کی سیاست دانی اور اعلیٰ بیدار مغزی کا اعتراف یورپ تک کے مدبرین اور اصحابِ فضیلت نے کیا ہے۔ یہی حال ہندستان کی دوسری خواتین کا ہے جن میں اب وکیل، مجسٹریٹ اور صاحبِ ایجاد خواتین پیدا ہورہی ہیں۔ فرق یہ ہے کہ یورپ اور امریکہ کی دماغی ترقی وہاں کی دیرینہ اور کئی صدی قبل کی کوششوں کا نتیجہ ہے اور ہندستان میں عورتوں کی ترقی کی کوشش کا اب آغاز ہوا ہے جسے پچیس سال کا مشکوک زمانہ کہہ سکتے ہیں پس اس سبب کے تحت اب آپ مذکورہ بالا ممالک کی بیویوں کے چند خانے ملاحظہ فرمایئے، تاکہ پھر ہندستانی بیوی کے حالات کے فرق کو سمجھ لینا آپ کے لیے آسان ہوجائے۔

یورپ کی بیوی:

یورپ کی بیوی کے حالات سے پہلے چند سطروں میں یورپ کو سمجھ لیجیے تاکہ یورپی بیوی کے حالات سمجھنے میں آسانی ہو۔ چنانچہ یورپ نام ہے خشکی کے اُس حصہ کا جو دنیا کے تمام دوسرے خشک حصوں میں سے صرف ایک حصہ کو چھوڑ کر باقی تمام حصوں سے چھوٹا ہے۔ یہ 13 لاکھ مربع

میل زمین کا خشک حصہ ہے جس پر ذیل کی مشہور حکومتیں یا قومیں آباد ہیں۔ انگریز، فرانسیسی، جرمن، آسٹروی، بلقانی، اطالوی، ترکی۔ ان کے سوا اور بھی چھوٹی حکومتیں اور ریاستیں ہیں۔ اس قطعہ زمین کی عقلی اور عملی ترقی دنیا کے تمام حصوں سے زیادہ ہے جس کے اسباب یہ ہیں کہ:

1۔ یہ قطعہ زمین منطقۂ معتدلہ میں واقع ہے اس لیے یہاں نہ گرمی کی شدت ہوتی ہے نہ سردی کی، نہ بارش کی زیادتی ہوتی ہے نہ قلت۔

2۔ یہ حصۂ زمین روئے زمین کی خشکی کے مرکز پر واقع ہے اس لیے یہاں کے باشندوں کو تجارت کی خاص سہولتیں حاصل ہیں۔

3۔ اس کا ساحل اس کے رقبے کے مقابلے میں ہر خشکی کے حصہ سے بڑا ہے۔

4۔ یہاں بارش کی زیادتی نہیں، مگر کافی ہوتی ہے۔ جنوب ومغرب سے منقلب تجارتی ہوائیں مینہ برساتی ہیں۔

5۔ معدنیات خصوصاً لوہے اور کوئلے کی زیادتی ہے۔ ان قدرتی اسباب کے باعث یہاں کے باشندوں کا خون ہندستانیوں کی طرح پسینہ بن کر ایک مرتبہ بھی نہیں بہتا بلکہ ان کی صحت نہایت عمدہ ہوتی ہے۔ ان کی عملی اور عقلی قوتیں صحت کے عمدہ ہونے کے باعث ہندستانیوں سے بہت زیادہ اچھی اور طاقت ور ہوتی ہیں اور اسی لیے ان میں سے ہر ایک کے حوصلہ، استقلال اور بہادری کا معاملہ ہندستانیوں سے بلند ہوتا ہے اور یہ انہی قدرتی اسباب کا اثر ہے کہ یورپ کے باشندے ایک عرصہ تک بے علم اور بے ہنر رہنے پر جب علم حاصل کرنے اور دنیا کمانے پر آئے تو انھوں نے ایسے انوکھے علوم وفنون حاصل کیے کہ اپنے ہندستان کی موٹی موٹی کتابیں چاٹنے والے آج بھی ان کے سامنے ذلیل اور شرمندہ نظر آتے ہیں۔ اسی طرح جب ان باشندوں نے تلوار سنبھالی تو دنیا کا ہر حصہ فتح کر کے رکھ دیا اور ہم آپ آج تک یہی کہے جاتے ہیں کہ ایسے تمھارے باوا فتح کر نہیں سکتے وہ کھوکہ دھوکہ دے کر تم نے فتح کر لیا۔

الغرض یورپ کے تمام باشندے اقوامِ عالم کی ابتدائی ترقی کی طرح خود نہایت پست اور جاہل تھے لیکن آج ان کی یہ رفتہ رفتہ ترقی اس حد کمال کو پہنچ چکی ہے جسے شباب کہا جاسکتا ہے۔

چنانچہ عقلی ترقی کی انتہا ہے کہ یورپ میں اس وقت 99 فیصدی مرد اور عورتیں تعلیم یافتہ ہیں۔ چونکہ ذہنی اور فکری اصلاح و ترقی کا قدرتی لازمی یہ ہے کہ انسان ایجاد و اختراع پر متوجہ ہوتا ہے اس لیے یورپ کے باشندے ہوائی جہاز، دریائی جہاز، ریلیں، مشین گنیں، شیل کے گولے، بم اور 75 میل تک مارنے والی توپ بنانے کے بعد اپنی تہذیبی، جماعتی، سیاسی اور اخلاقی حالت میں ایجاد و ترمیم پر متوجہ ہوئے جو ذہنی کمال اور ترقی کا فطری نتیجہ ہے۔ لہٰذا ان کی اس جماعتی اور اخلاقی ترقی اور ترمیم و اصلاح سے آج کل جو بیوی پیدا ہوئی ہے یا پیدا ہوتی ہے وہ یہ ہے۔

ماں باپ اور خاندان کی اعلیٰ دماغی صلاحیت کے باعث اس کے پیدا ہونے پر نہ اس کی والدہ مارے خوشی کے اپنے دوپٹے سے باہر ہوتی نہ اس کے والد صاحب کوٹ پتلون سے باہر۔ گو اس کے ہاں بھی اظہارِ مسرت اور فضول رسموں کا کافی وجود ہے مگر نہ اتنا جتنا کہ ہندستانیوں میں پایا جاتا ہے۔ اسی لیے اس کی پیدائش کی تقاریب اول تو یکسر ندارد اور جو ہوئیں بھی تو نہایت باوقار طریقے پر۔ یہ نہیں کہ پیدائش سے لے کر دس بارہ دن تک مارے بندوقوں کے فیر اور باجوں کی آواز کے محلے کی مسجد میں نماز پڑھنا مشکل اور گھر میں سکون سے گفتگو کرنا حرام۔ پھر پیدائش کے وقت اس کی بھی ضرورت نہیں ہوتی کہ لڑکی کی نانی صاحبہ کو ایک مہینے کے لیے مہمان بلایا جائے اور نانا میاں کو بھی خالو میاں کو بھی اور خالہ بی کو بھی۔ پھوپی صاحبہ کو بھی اور پھوپا صاحب کو بھی۔ اسی طرح زچہ کے لیے جو دایا آئے وہ تمام گھر سے انعامات وصول کرتی پھرے، بلکہ یورپ کا ہر شہر اور آدمی تجارت پیشہ اور ملازمت پیشہ ہوتا ہے اور اس درجہ حریص اور لالچی کہ اگر اسے تجارت اور ملازمت کے لیے یورپ سے نکال کر کوہ قاف لے جایئے تو وہ مع بیوی کے بڑی خوشی سے کوہ قاف میں جا کر آباد ہو جاتا ہے اس لیے یورپ کی بیوی کی پیدائش اکثر غیر ممالک میں اور وطن سے دور واقع ہوتی ہے اس لیے قدرتاً پیدائش کے وقت اس کے ہاں مہمان کا طوفانِ بدتمیزی نظر نہیں آتا۔ بس ایک حسبِ ضابطہ دایا ہوتی ہے جسے یہ لوگ ''لیڈی'' ڈاکٹر کہتے ہیں اور بس۔ البتہ وطن میں پیدائش کے وقت چند عزیز ضرور آتے ہیں سو وہ بھی حد سے سوا باضابطہ طریقے پر۔

اب دولت اور علم کے باعث پیدائش کے وقت ہی سے اس کی پرورش کے لیے نہایت بہتر اور اعلیٰ درجہ کے قاعدے اختیار کیے جاتے ہیں اور انتہائی صفائی اور اصول کی پابندی سے اس کی

پرورش کا آغاز ہوتا ہے۔ اس کی پرورش کے لیے نہایت سلیقہ مند اور تعلیم یافتہ ملازمہ رکھی جاتی ہے اور آٹھ دس سال کی عمر تک اسے گھر پر تعلیم دینے کے بعد فوراً کسی اسکول میں داخل کر دیا جاتا ہے۔ تعلیم اور ہنر مندی کے بعد اس کی شادی اُسی کے اختیار میں اس طرح دے دی جاتی ہے کہ وہ جس مرد سے راضی ہو اس کے ساتھ بیاہ دی جائے۔ چنانچہ شادی کے لیے میاں بیوی کو قبل شادی ایک دوسرے کو دیکھنے اور آپس میں تبادلۂ خیالات کرنے کے جملہ مواقع نہایت آزادی سے دیے جاتے ہیں اور چند اصول کے سوا باقی تمام معاملات میں وہی آمادگی اور ذاتی پسند جائز ہے جسے اسلام نے مسلمانوں کی شادی بیاہ کے لیے مفید بتایا تھا اور بواب چند خودغرض اور بے مغز مولویوں کے باعث مسلمانوں سے چھین لی گئی ہے اور یہ ایسی ہی خلاف عقل دشرع پابندیوں کا نتیجہ ہے کہ مسلمانوں میں 99 فیصدی شادیاں میاں بیوی کی مرضی کے خلاف ہوتی ہیں اور میاں بیوی عمر بھر ایک دوسرے کے مخالف رہتے ہیں جس طرح آپ کے مُلّا رموزی صاحب کی شادی ہوئی ہے مگر یورپ کی بیوی کسی کی بیوی ہونے سے قبل اپنے شوہر کے جملہ حالات کو پسند کر کے شادی کی اجازت دیتی ہے، جو محض اعلیٰ تعلیم و تربیت کا اثر ہے۔

شادی میں اگرچہ بظاہر فضول رسموں کی کمی نظر آتی ہے۔ پھر اس کی شادی کے مصارف کم نہیں ہوتے، البتہ وہ شوہر کے گھر پہنچ کر شرم وحجاب کی مریضہ نہیں بن جاتی جس طرح ہندستانی دُلہن مارے فرضی حجاب کے سال بھر تک نہ ساس سے بات کرتی نہ سسرے سے اور گھر کا کام کرنا تو ہندستان کی نئی دُلہن کے لیے نہایت درجہ معجوب سی بات ہے، مگر یورپ کی بیوی جہاں اپنے شوہر کے گھر پہنچی کہ اب وہ سارے گھر کی کمانڈر ران چیف نظر آنے لگی۔ تمام حساب و کتاب اور آمد و خرچ اس کے اختیار میں دے دیا جاتا ہے۔ البتہ دولت کی کثرت کے باعث وہ گھر کا تمام کام خود نہیں کرتی بلکہ ملازمہ اور خدام کے ذریعہ وہ انتظام کرتی ہے اور کافی توجہ سے ہر کام کی نگرانی کرتی ہے۔ یہ نہیں کہ ہندستانی بیوی کی طرح گھر کے ہزاروں کام کرنے کے بعد شام اور صبح کو دس سیر گیہوں لے کر اس طرح چکی چلائے کہ قوالی کی تانیں بھی بلند ہوتی رہیں اور گیہوں بھی پستے رہیں۔ اگرچہ یورپ کی غریب بیوی بھی گھر کا تمام کام کرتی ہے اور بددل نہیں ہوتی، مگر فرق یہ ہے کہ ہندستان کی بیوی گھر کا کام دن رات کر کے بھی شوہر ساس اور سسر کے طعنے اور گالیاں سنتی رہتی

ہے اور یورپ کی غریب سے غریب بیوی بھی گھر کا کام کر کے تھیٹر اور سنیما کے تماشہ کی تفریح میں جا کر شریک ہو سکتی ہے۔ وہ ٹھنڈی سڑک پر بھی گھومتی ہے اور ہوٹلوں میں بیٹھ کر سوڈا واٹر اور فالودہ پینے سے تو کبھی چوکتی ہی نہیں۔

یورپ کی بیوی کا لباس نہایت قیمتی ہوتا ہے بلکہ لباس کے حساب سے وہ ہندستان کی جاہل عورتوں سے کہیں زیادہ حریص اور شائق ہوتی ہے۔ اسی طرح گو وہ زیور مقدار میں کم پہنتی ہے مگر قیمت کے لحاظ سے وہ ہندستانی عورتوں کے زیور سے کہیں سوا ہوتا ہے۔ کانوں میں نفیس سے بُندے، گلے میں بیش قیمت ہار، ہاتھ میں ایک دو چوڑیاں، انگلی میں یاقوت اور جواہر کی انگوٹھی اور پاؤں زیور سے خالی۔ یہ نہیں کہ پاؤں میں بھی ڈھائی سیر کی جھانجیں، توڑے، پازیب اور دوسرے قسم کے زیور اتنا کہ چلیں تو چھم چھم، بیٹھیں تو چھم۔ وہ تو ہندستان کی عورتوں کے بس کی بات نہیں ورنہ یہ اپنے پاؤں پر سرکاری بینڈ باجہ تک باندھ کر چلنا بہت زیادہ پسند کریں۔

یورپ کی تمام قومیں چونکہ آزاد ہیں، اُنھیں قومی حکومت حاصل ہے اور تعلیم میں بھی وہ سب سے آگے ہیں، اس لیے اُنھیں سب سے بڑی دولت جو حاصل ہے وہ ''وحدتِ قومی'' یعنی یورپ کی ہر قوم کے جو آداب وضوابط، تمدن ومعاشرت اور مذہب واخلاق سے متعلق ہیں اُن میں ہمیشہ یکسانیت ہوتی ہے اور پوری پوری پابندی، مثلاً جس وقت اُن کا بادشاہ چائے پیتا ہے، اُسی وقت وہاں کا فقیر اور کسان بھی چائے پیتا ہے، اسی طرح سیاں بیوی کے لیے بھی جو فرائض اور ذمہ داریاں ہیں اُنھیں بلند اور پست طبقات میں پوری یکسانیت کے ساتھ انجام دیا جاتا ہے اِلّا بعض حالات میں فرق ہوگا مگر کثرت میں وحدت اور یکسانیت کے اصول برتے جاتے ہیں۔ اسی لیے جو حقوق کہ یورپ کی عورت کے لیے خاص کر دیے گئے ہیں اُن میں مرد دخیل نہیں ہو سکتا۔ نتیجہ یہ ہے کہ یورپ کی بیوی اگر چہ بہت زیادہ آزاد اور خطرناک ہے لیکن وہ اپنے شوہر کے لیے شفیق و مہربان بھی ہے۔ سب سے بڑی خوبی فرائض کی بجا آوری میں ان لوگوں کی پابندی اور مستعدی ہے، لیکن علوم اور دولت کی کثرت نے ان کے پچھلے قومی آداب ورسوم میں بھی دخل دیا ہے اور اب یورپ کی بیوی شوہر کے لیے خود شوہر ہو چکی ہے۔ مثلاً یورپ کی بیوی اپنے شوہر کے لیے اُسی وقت تک مہربان اور شفیق ہے جب تک اُس کا شوہر اُس کے ساتھ فرماں بردار اور خادم کی حیثیت سے

برتاؤ کرتا ہے لیکن اگر شوہر صاحب کسی دن تاؤ کے ساتھ اپنی بیوی کو ایک آدھ چانٹا رسید کر دیں تو صبح ہوتے ہوتے اُن کی بیوی اُن کے اوپر ''ایک عدد دعویٰ داغ دیتی ہے'' اور جب تک شوہر صاحب بھری عدالت میں بیوی صاحبہ کے قدموں پر اپنی ٹوپی رکھ کر معافی نہ مانگ لیں، بیوی صاحبہ مقدمہ واپس نہیں لیتی ہیں اور یہ حالت اصل میں علم و احساس کی زیادتی کا قدرتی نتیجہ ہے۔ مثلاً جب ایک ہندستانی عورت اپنی زندگی کی ضروریات ہی کو سمجھنے کی اہلیت نہیں رکھتی تو وہ اپنی عزت اور حقوق کے متعلق کیا خاک اندازہ کر سکتی ہے۔

یورپ کی بیوی کو روپیہ کمانے کا اُتنا ہی شوق ہوتا ہے جتنا ہندستانی بیوی کو خرچ کرنے کا۔ فرق یہ ہے کہ ہندستانی بیوی بے ہنر اور بے تعلیم ہونے کے باعث شوہر کے باوا تک کی جایداد فروخت کر کے اپنے لیے زیور بنانے پر حاوی ہوتی ہے اور ریشم کی ساڑی اور پمپ کے جوتے کے بغیر اُسے چین نصیب نہیں ہوتا اور یورپ کی بیوی شوہر کی طرح ملازمت اور تجارت کر کے خود روپیہ کماتی ہے اور بینک میں جمع کرتی ہے، پھر وہ اپنی اس دولت کا زیادہ حصہ اپنے بچوں کی اعلیٰ تعلیم پر خرچ کرتی ہے یا اسے تجارت میں لگا کر مزید آمدنی کے مواقع پیدا کرتی ہے اور اسی حیثیت سے وہ تجارت اور ملازمت کے لیے زیادہ مستعد، زیادہ جفاکش اور زیادہ صاحبِ حوصلہ ہوتی ہے اور اسی آزاد عملی زندگی کے باعث وہ شوہر کے لیے خطرناک مواقع پر بھی نہایت درجہ شفیق رفیق زندگی ثابت ہوتی ہے۔ مثلاً قومی اور ملکی جنگ کے مواقع پر یورپ کی ہر بیوی اپنے شوہر کے ساتھ میدانِ جنگ اور اندرونِ ملک غنیم کے مقابلہ کے لیے ہر امکانی خدمت بجالاتی ہے۔ چنانچہ جنگ یورپ بابت 1914 تا 1918 یورپ کی ہر قسم کی بیوی نے اپنے شوہر کو میدانِ جنگ میں اور اندرونِ ملک امدام بہم پہنچائی اگر چہ جنگ میں یورپ کی بیوی اُس کمال بے جگری اور کثرت تعداد کے ساتھ اپنے شوہر کے کام نہ آئی جیسی کہ مراکش ریف اور ترکی کی مسلمان عورتیں اپنے مردوں کی معاون ثابت ہوئیں پھر بھی یورپ کی بیوی شجاعت و شہامت اور دلیری کے لحاظ سے اپنی فطری نزاکت کے اعتبار سے زیادہ قابلِ تعریف ہوتی ہے اور اب تو اُس کی ترقی کا یہ عالم ہے کہ وہ ہوائی جہاز چلاتی ہے اور نہیں ڈرتی۔ اگر چہ ہندستان کی ایک رانی صاحبہ بھی 1930 میں ہوائی جہاز پر سوار ہو چکی ہیں مگر ہندستانی عورتوں کے مقابل یورپ کی عورت بیوی بن کر بہت زیادہ شجاع اور

کارآمد ہوجاتی ہے۔

یورپ کی بیوی کا شوہر گھر کے انتظامات اور مصارف میں بیوی کو مختارِکل بناتا ہے۔ یہ ہندستانیوں کی طرح نہیں کہ خود تو ہوٹل میں بریان اور پلاؤ کھا آئے اور بیوی سے کہہ دیا کہ بس جوار کی روٹی کھاتی ہو تو کھاؤ ورنہ اپنے باوا کے گھر جاؤ۔ اسی لیے یورپ کا شوہر شام کے وقت کلب میں جاتا ہے اور بیوی سودا سلف لینے بازار میں چمکتی ہوئی نظر آتی ہے۔ پھر بازار میں بھی اپنے ہاں کی بوڑھی خالہ بی کی طرح نہیں کہ جو ایک آنے کی ترکاری لینے جائیں تو دس جگہ راستہ میں بیٹھ کر کھانستی رہیں اور گھر اُس وقت واپس آئیں جب آپ دوسری ترکاری خود لاکر اور پکا کر کھالیں بلکہ ہندستان میں جتنی یورپی بیویاں سودا لیتے دیکھی گئی ہیں اس طرح کہ یہ آئی، یہ دُکان میں، یہ چیز اٹھائی وہ چیز دیکھی، اُسے جانچا، اُسے سونگھا اور یہ لیا اور وہ گئی۔

عباداتی حساب سے یورپ کی بیوی "بقدرِ ضرورت" پابند ہے اور اسی لیے ہندستان کے مقابل یورپ کی بیوی کے اخلاق قابلِ اعتراض قرار پائے ہیں۔

معاشرتی حیثیت سے یورپ کی بیوی نہایت درجہ محتاط، صاف ستھری، چاق و چوبند ہوتی ہے۔ وہ بچوں سے لے کر گھر کی ادنیٰ ضرورت کا بوجھ بھی شوہر پر نہیں ڈالتی اسی لیے شوہر دکان یا ملازمت سے گھر آکر نہایت شان سے کھانا کھاتا ہے اور آرام کرسی پر لیٹ کر اخبار پڑھا اور تاش کھیل کر سو جاتا ہے۔ یہ نہیں کہ بیوی روٹی پکائے تو شوہر صاحب بچے کو کھلاتے رہیں، یا بیوی بچے کو کھلائے تو شوہر صاحب لکڑی پھاڑیں تب روٹی تیار ہو ورنہ جایئے اور ہوٹل میں کھانا کھا کر بچے والی بیوی کے لیے روٹی لیتے آیئے۔

یورپ کی بیوی تعلیم کی وجہ سے نیز قومی آداب و اصول تربیت کے اثر سے شوہر سے اندھی محبت نہیں کرتی بلکہ اُس کی محبت شوہر سے نہایت "قانونی" ہوتی ہے، اسی لیے شوہر میدانِ جنگ جائے، تجارت کے لیے وطن سے جہنم تک کے سفر پر جائے، نوکری کے لیے یورپ سے ہندستان آئے غرض کہیں جائے، اس کی بیوی پر ہراس و ناامیدی، مایوسی و وحشت اور گھبراہٹ طاری نہیں ہوتی بس وہ جہاز یا ریل پر شوہر کو رخصت کرتے وقت اپنے ہاتھ کا رومال اُس وقت تک اُڑاتی رہتی ہے جب تک شوہر کا جہاز یا ریل نظر آتی ہے مگر یہ نہیں کرتی کہ شوہر سے جھوم کر یا چمٹ کر یا لپٹ کر یا

لٹک کراتنی زور سے رونے لگے کہ شوہر بھی گھر واپس آجائے۔اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ یورپ کی بیوی شوہر سے زیادہ روپیہ کو عزیز رکھتی ہے اور اسی لیے وہ شوہر کے باہر چلے جانے کے بعد بچوں، ہارمونیم باجوں اور اخباروں سے دل بہلاتی رہتی ہے۔ بڑے ہی عشق کا اظہار کرتی ہے تو پردیس گئے ہوئے شوہر کے لیے عید بقرعید پر میوے وغیرہ کا ایک آدھ پارسل بھیج دیتی ہے۔سو یہ بھی اُس وقت جب وہ شوہر کے ساتھ پردیس نہیں جاتی ورنہ ہندستان میں دیکھتے نہیں ہو کہ یورپ سے کس طرح وہ شوہر سے چمٹی ہوئی آتی ہے کہ پھر شوہر کو ہندستانی خزانے سے پنشن دلا کر ہی واپس جاتی ہے۔ پردیس کے تمام خطرات اور مصائب کے مقابلہ میں یہ نہایت دلیر اور شجاع ہوتی ہے۔

وہ شوہر کے گھر آکر اپنے ماں باپ کو یوں بھول جاتی ہے گویا وہ اُن کے ہاں پیدا ہی نہیں ہوئی تھی۔ وہ پردیس میں برسوں شوہر کے ساتھ رہتی ہے مگر اپنی اماں جان کو دیکھنے کے لیے شوہر کو چھوڑ کر نہیں جاتی یہ نہیں کہ ہر جمعہ کے دن دروازہ پر ڈولی رکھی ہوئی ہے اور بیوی صاحبہ اپنی اماں بی کے گھر جارہی ہیں۔

مذکورہ بالا حالات و اسباب کے لحاظ سے یورپ کی بیوی ہندستانی بیوی کے نقطۂ نظر سے نہایت شوخ، بے حیا، غیر مہذب اور نقصان رساں ہے مگر یورپ والوں کے خیال میں وہ بڑی قیمتی چیز ہے اور ہونا بھی چاہیے جب کہ ہر ملک اور ہر قوم کے آدابِ زندگی علاحدہ علاحدہ ہوا کرتے ہیں اس لیے اگر یورپ کی بیوی سے کوئی کام کی بات کی جائے تو سب سے پہلے یہ کہ ہندستانی عورت کو بیوی بن کر اپنے شوہر کا ایسا ہی رفیق بننا چاہیے جتنا کہ یورپ کی بیوی ہوا کرتی ہے یعنی کام اور کسبِ دولت کے لحاظ سے اور یہ اُسی وقت ہوگا جب ہندستانی عورت ذات اعلیٰ درجہ کی تعلیم یافتہ ہوگی اور ہندستانی عورت کے لیے تعلیم اُس وقت ممکن ہوگی جب ہندستانی گھرانوں اور خاندانوں کے تمام مرد تعلیم یافتہ اور ہنرمند ہو کر قومی اور خاندانی دولت مندی میں اضافہ کریں۔

یورپ کی بیوی اپنے شوہر کی اُس محبت سے محروم رہتی ہے جو ہندستانی بیوی کو حاصل ہوتی ہے، یعنی یورپ کے شوہر کو دولت کمانے سے کبھی فرصت حاصل نہیں ہوتی اس لیے بیوی اُس سے لطف حاصل نہیں کرسکتی اور اسی لیے یورپ کی بیوی کی زندگی ایک طرح کی افسردہ اور حسرت نصیب زندگی ہوتی ہے۔ یورپ کی بیوی مزاج کی نہایت درجہ تیز ہوتی ہے لہٰذا ہر ہفتہ شوہر سے

لڑائی کے لیے تیار رہتی ہے۔ چنانچہ یورپ میں طلاقوں کی جو کثرت پائی جاتی ہے وہ دنیا کی کسی دوسری قوم میں نہیں۔ رنگ کی حد سے زیادہ سفید اعضا میں اعتدال، قد میں کہیں کہیں شوہر سے دو میل اونچی۔

عملی اعتبار سے بے پردہ ہونے کے باعث یورپ کی بیوی آج کل زندگی کے ہر شعبہ میں مردوں کے برابر شریک ہے یعنی وہ فوجی سپاہی سے لے کر پارلیمنٹ کی رُکن، وزیر، جج، مجسٹریٹ، وکیل اور ہر دفتر میں منشی جی صاحب بنی نظر آتی ہے۔ صرف یہ نہیں سنا کہ وہ کوتوال صاحب بھی ہوتی ہے مگر ہاں وہ محکمہ جاسوسی اور سی۔ آئی۔ ڈی کے کاموں میں بڑی مفید ثابت ہوئی ہے۔ غرض ہر چیز میں وہ کامل تعلیم اور تجربہ حاصل کرتی ہے اور ہندستانی بیوی کو اگر اردو کا اخبار غلط سلط طریقہ پر پڑھنا آجائے یا وہ شوہر کو غلط املا کے ساتھ ایک آدھ خط لکھ دے تو شوہر صاحب بڑے فخر سے اُسے ''تعلیم یافتہ بیوی'' کہتے ہیں اور بڑی مصیبت یہ کہ ایسی نیم خواندہ بیوی خود بھی تعلیم یافتہ سمجھتی ہے اور کلب میں جانے اور شوہر کی لکھی ہوئی تقریر پڑھنے پر مرتی ہے، مگر شرماتی نہیں ہے باقی خیریت ہے۔

یہ ہے یورپ کی بیوی کے متعلق مُلّا رموزی کا نقطۂ خیال لیکن اسی بیوی کو ہندستان کے شعری نقطۂ خیال یا ایک نکتہ رس شاعر کی نظر سے دیکھنا ہو تو حضرت جوش ملیح آبادی کی ذیل کی نظم پڑھیے جو ہندستان کے سب سے بلند نظر شاعر ہیں۔ واضح ہو کہ ہندستان میں ''مغرب'' یا مغربی سے مراد یورپ اور یورپ والا ہے جیسا کہ اس نظم میں کہا گیا ہے۔ نظم یہ ہے:

خاتونِ مغرب

جب ضمیرِ حق میں انساں کا ہیولیٰ بن چکا ۔۔۔ مرد کو فصل خزاں کی دھوپ سے پیدا کیا
اور عورت کو بنایا اک سبک رو نہر سے ۔۔۔ موسمِ گل کی معطر چاندنی کی لہر سے
مرد کو تحفے میں دی شمشیر و تدبیرِ حیات ۔۔۔ اور عورت کو چراغ و بربط و قند و نبات
راستے میں مرد کے ڈالے گئے تیر و تبر ۔۔۔ اور عورت کی طرف پھینکے گئے گلبرگ تر
مرد کے اعضا کو بخشا سنگ و آہن کا جلال ۔۔۔ اور عورت کو صبا کا لوچ شبنم کا جمال
مرد کو بخشا لہو، افسردۂ میدانِ جنگ ۔۔۔ اور عورت کو ملا پگھلے ہوئے سونے کا رنگ

اُس کو بخشی سنگ کی تعمیر، صرصر کا جلال　　اور اسے طبعِ حریر و مستیٔ بادِ شمال
اُس نے صولت پائی، اِس نے جلوہ محفل طراز　　اُس کو محنت دی گئی اِس کو محبت کا گداز
اُس کو طبلِ جنگ کا ہنگامۂ دہشت فزا　　اِس کو ہلکی نرم کلیوں کے چٹکنے کی صدا
اُس کو طوفان گاہِ بیداری، اِسے خواب وخیال　　اُس کو چشمِ ضیغم و شاہیں اِسے چشمِ غزال
اُس کو شانِ مہر، اِس کو جلوۂ ماہِ منیر　　اُس کو سنگ آشوب تیشہ، اِس کو رقصِ جوئے شیر
اُس کو تاجِ غزنوی، اِس کو خمِ زلفِ ایاز　　اُس کو ماتھے کو شکن، اِس کے لبوں کو موجِ ناز
اُس کو شورِ حرب، اِس کو شوخیٔ گفتار دی　　تیغ کی اُس کو، اِسے پازیب کی جھنکار دی
اُس کو چھانٹا زخمِ دندان کے تلاطم کے لیے　　اِس کو رکھا پاک بچوں کے تبسم کے لیے

مرد کے زانو کی جنت بن گیا عورت کا سر
چند دن چلتی رہی دنیا اسی انداز پر

لیکن اک شب دفعتاً تاریکیوں کے درمیاں　　جب فرازِ چرخ پر منڈلا رہی تھیں بدلیاں
تنگ تھا دنیا کے ننھے سے کرے کا عرض وطول　　ہو رہا تھا چرخ سے اوہامِ باطل کا نزول
رات یوں تاریک تھی جس طرح مجرم کا ضمیر　　سر کیا شیطان نے عورت کی جانب ایک تیر
سرخ تیر، افسردہ تاریکی میں سناتا ہوا　　آتے ہی عورت کے سینے میں ترازو ہو گیا

تیر کھانا تھا کہ روحِ ناز بل کھانے لگی
مرد بننے کی تمنا دل کو تڑپانے لگی

دی صدا عورت نے اس نرمی کو کھونا چاہیے　　مرد کا مدِ مقابل مجھ کو ہونا چاہیے
نازکی ہے اک اہانت آفریں افتادگی　　مسکراتی ہوگی میرے حال پر مردانگی
مرد و عورت، دو ہیں رخ، اور اک ہی تصویر ہے　　یہ لچک دراصل میری ذات کی تحقیر ہے
ابنِ آدم کی مٹادیں نامشِ تاب و تواں　　مرد بن جائیں اگر حوا کی نازک بیٹیاں
مادرِ انساں کے غنچوں کو بھی کھلنا چاہیے　　ہم کو بھی حق مرد کے مانند ملنا چاہیے

روح پر عورت کے یہ دیوانگی جب چھا گئی
لو سحر ہوتے ہی وہ مردوں کی صف میں آ گئی

آئی اور خم ٹھونک کر آئی مثالِ پہلواں　　پنڈلیاں ہیں گاؤدم شانوں پر ابھری مچھلیاں

ترک کر بیٹھی اداؤ ناز کا شغلِ رکیک　　اب ہے وہ دنیا کی ہر مردانہ ورزش میں شریک

باک پر ہے بات اور ترشی ہوئی زلفوں پر گرد　　تن کے کہتی ہے کہ دیکھو زن سے یوں بنتے ہیں مرد

لیکن اس دریا میں ہے زہر آب کی بھی ایک موج

کس گراں قیمت پہ عورت نے خریدا ہے یہ اوج

اپنے سینے کا خزانہ، اپنی فطرت کا جمال　　مرد بننے کی ہوس میں کردیا ہے پائمال

کرچکی ہے بے طرح محرومِ چشم التفات　　اپنے اُس شیریں تبسم کو کہ تھا اک کائنات

یوں بغاوت پر ہوا آمادۂ فطرت سے شباب　　پڑ گئے رخسار پھیکے، جل گئی چہرے کی آب

زلف چھوٹی ہوگئی اور دست و پا کھنچ کر طویل　　بجھ گئی برنائی، روڑھا ہوگیا روئے جمیل

ہوگئی مردانگی کے ولولوں سے دردمند　　جنبشِ مژگاں کی موسیقی تبسم کی کمند

جلد کی سختی کے اندر لوچ پنہاں ہوگیا　　ایک سیٹھا پن سا ہونٹوں پر نمایاں ہوگیا

خستہ چینی کی کھنک کم ہوگئی گفتار سے　　ابر کی سی شوخیاں جاتی رہیں رفتار سے

ہوگیا سنگِ خرد سے شیشہ بھولے پن کا چور　　ڈھل گیا آنکھوں کا پانی، اُڑ گیا چہرے کا نور

جنتِ ارضی کو دوزخ کا نمونہ کردیا　　چشمکِ بے باک نے آنکھوں کو سونا کردیا

بن گئی القہ اب ایسا سوالِ ناصواب　　عشق کے ہونٹوں سے حل سکتا نہیں جس کا جواب

نازکی، عزت، محبت، آرزو کچھ بھی نہیں

نام تو ہے پھول، لیکن رنگ و بو کچھ بھی نہیں

امریکہ کی بیوی:

دنیا میں زمین کے جن حصوں پر انسانوں کی آبادی مانی گئی ہے اُن میں ایک حصہ کا نام ''نئی دنیا'' ہے جسے امریکہ بھی کہتے ہیں۔ اس حصۂ زمین کو یورپ کے لوگوں نے 1492 میں ایک شخص ''کولمبس'' نامی کے ذریعہ معلوم کیا اور اُسی وقت سے اس انسانی آبادی سے دنیا کے دوسرے انسانوں کے تعلقات بڑھے۔

اس حساب سے اس کے باشندوں کی موجودہ ترقی دنیا کی قدیم ترین آبادکاروں سے کہیں

زیادہ تیز اور حد سے سوا حیرت انگیز ہے۔

یہ قطعہ زمین یا ملک بحر الکاہل اور بحر اوقیانوس کے درمیان واقع ہے اور شمال سے جنوب کو اس کا پھیلاؤ نو ہزار میل سے زیادہ ہی ہے۔ طول کے مقابلہ میں عرض بہت ہی کم ہے۔ خشکی شمال سے جنوب کو پھیلی ہوئی ہے۔ پہاڑوں کے بڑے سلسلے شمالاً جنوباً پھیلے ہوئے ہیں۔ یہ وسیع میدانوں والا حصۂ زمین ہے اس کے میدانوں پر سمندری ہواؤں کا اثر ہوتا ہے۔ اس کے دریاؤں کے کنارے ہموار ہیں، کوئی بڑا صحرا نہیں ہے یہ نصف کرۂ شمالی و جنوبی میں پھیلا ہوا ہے۔

انتظامی اور مالکانہ حیثیت سے پھر اس کے کئی ٹکڑے ہیں جنھیں شمالی امریکہ، گرین لینڈ، برٹش شمالی امریکہ کہتے ہیں۔ گرین لینڈ ہی کو لے لیجیے جو رقبہ میں نصف ہندستان کے برابر ہے اور حکومت ڈنمارک کے قبضے میں ہے۔ اسی طرح خود امریکہ پر غیر امریکی باشندوں کا قبضہ رہا ہے جن میں انگریز لوگ خاص ہیں اسے ''اضلاعِ متحدہ'' بھی کہتے ہیں یعنی ''مرکزی حکومت'' اس لیے کہ امریکہ مختلف جزیروں اور ریاستوں وغیرہ پر منقسم ہے اس لیے اس کی انتظامی جماعت کا مرکزی نام ''دولت متحدہ امریکہ'' ہے۔ یہ دنیا کی سب سے بڑی اور زبردست جمہوری حکومت ہے یعنی یہاں کے باشندوں کا تمام انتظام انھی کے نمائندوں کے ذریعہ کیا جاتا ہے۔ کوئی بادشاہ نہیں بلکہ پنچایتی طریقہ سے انتظام کرنے والے پنچوں کا ''سرپنچ'' ہوتا ہے جو امریکہ کے باشندوں میں سب سے زیادہ قابل اور فاضل ہوتا ہے اور پانچ سال کے لیے امریکہ کے تمام باشندوں کے اتفاق اور انتخاب پر مقرر کیا جاتا ہے اور اسی کی آخری منظوری سے امریکہ کے باشندوں کے انتظامات سرکاری حیثیت سے کیے جاتے ہیں۔ اس کے ماتحت نمائندوں کی جو مجلس ہوتی ہے اُسے انگریزوں کے ہاں ''پارلیمنٹ'' اور امریکہ میں ''سینٹ'' کہتے ہیں۔ اس کے بعد وزیٹروں کی جماعت ہوتی ہے۔ اضلاع متحدہ خصوصاً اُس حصہ کو کہتے ہیں جس میں شمالی امریکہ کا وہ حصہ بھی شامل ہے جو حکومت کنیڈا اور ریاست ہائے میکسیکو کے درمیان واقع ہے۔

الغرض ان حدود کے باشندے علم و حکمت، ایجاد و اختراع، تجارت و زراعت، تہذیب و تمدن، سیاست و حکمرانی اور بین الاقوامی حالات اور کاموں کی حیثیت سے گو یورپ کے باشندوں کے بعد ہیں مگر ان تمام چیزوں میں اکثر چیزوں میں وہ یورپ والوں سے اس درجہ بھی آگے ہیں کہ

یورپ والے اُنھیں مُلّا رموزی صاحب کے تیز سے تیز موٹر کار پر سوار ہو کر بھی نہیں پا سکتے۔ خصوصاً دولت مندی میں امریکہ کے برابر دنیا کے تمام حصوں کے باشندے مقابلے نہیں کر سکتے جس کا یہ مطلب ہے کہ امریکہ کے باشندے دماغی اور عملی قابلیت میں تمام دنیا کے باشندوں سے بجز ملا رموزی کے آگے اور سربلند ہیں۔ الغرض اب ایک نظر امریکہ کی بیوی پر ڈالیے جو یوں واقع ہوتی ہے کہ امریکہ میں ایک دلہن جس وقت اپنے گھر میں پہنچتی ہے علم و فضل سے آراستہ ان تمام طریقوں سے اچھی طرح واقف ہوتی ہے، جو اسے گھر چلانے کے لیے جاننے ضروری ہیں۔ وہاں گھروں میں بہت زیادہ کام مشینوں سے کیا جاتا ہے جس سے ایک تو محنت کم پڑتی ہے۔ دوسرے وقت بہت بچتا ہے۔ گھر میں مشکل کام برتن صاف کرنا اور کپڑے دھونا اور کھانا پکانا ہیں، جو مشینوں کی مدد سے آسان ہو گئے ہیں۔ وہ ان سے بہت جلد فارغ ہو جاتی ہیں اور اگر گھر میں بچے نہیں تو اس کے سوا کہ دستکاری یا لکھنے پڑھنے کے مشغلوں سے اپنا دل بہلا کے اور کوئی مصروفیت اس کو نہیں ہوتی۔ کبھی اخبار پڑھتی ہے کبھی رسالے دیکھتی ہے۔ کتابوں کا مطالعہ کرتی ہے، مگر آخر کب تک؟ تھک جاتی ہے ،سوچتی ہے اب کیا کروں۔ اس سوال کا اسے کوئی جواب نہیں ملتا۔ جمائیاں لیتی ہے۔ اونگھنے لگتی ہے، سو جاتی ہے، مگر جاگنے پر پھر وہی خیال اس کے سامنے آموجود ہوتا ہے اور وہ کوئی جواب نہیں پاتی۔

آہ میری مسرت! وہ ٹھنڈی سانس لے کر کہتی ہے۔ میری شادی تو ہو گئی، مگر میری مسرت کہاں ہے۔ وہ اپنے شوہر کا خیال کرتی ہے۔ وہ اس کی نظر کے سامنے نہیں۔ بیوی کی طرف سے بالکل غافل۔ تجارتی حساب میں مستغرق ہے۔ وہ سوچتی ہے کبھی میرے شوہر کو مجھ سے محبت تھی۔ ممکن ہے کبھی ہو مگر اب اسے محبت پر غور کرنے کی مہلت ہی کہاں ہے۔ اس کی تجارتی کامیابی نے اس کے دل میں بیوی کی جگہ ڈالر کی محبت پیدا کر دی ہے۔ ہفتے کے چھ دن تجارت میں منہمک رہتا ہے۔ گھر میں آتا ضرور ہے مگر اس قدر متفکر، پریشان اور تھکا ہارا کہ اطمینان سے بیٹھ کر دو باتیں بھی نہیں کر سکتا۔ اس کا جسم گھر میں ہوتا ہے، دماغ دفتر میں۔ بات بیوی سے کرتا ہے، خیال حساب میں ہوتا ہے۔

بیوی اتوار کا انتظار کرتی ہے۔ اتوار آتا ہے لیکن شوہر آج بھی گھر میں نظر نہیں آتا۔ وہ کسی میدان میں گولف یا فٹ بال کھیل رہا ہے۔ چھ دن سخت دماغی کام کیا ہے۔ آج اپنی تندرستی کا حق

ادا کر رہا ہے۔ مگر اس کی بدنصیب بیوی کا حق ڈالر، تجارت اور صحت کی چکی میں پڑ کر پس گیا ہے۔ بیوی کا دل گھر سے اُچاٹ ہو جاتا ہے۔ میدانوں، تماشہ گاہوں اور کلب کے گھروں کی راہ لیتی ہے مگر بالکل بے فائدہ۔ جب گھر میں تسلی نہیں تو دوسری جگہ کیا خاک ہو گی۔

امریکہ کی سب سے زیادہ قابلِ فخر درسگاہیں مشترک یونیورسٹیاں ہیں۔ یہاں عورت اپنی زندگی کے بہترین تین چار سال گزارتی ہے۔ وہ کیا سیکھتی ہے اعلیٰ دقیق علوم فلسفہ، علم النفس، علم الحیات وغیرہ وغیرہ جو اس کی خانگی زندگی میں کچھ کام نہیں دیتے۔ ایک دن میں نے نوجوان لڑکی سے سوال کیا تم یہ علوم کیوں پڑھتی ہو؟ اس نے فوراً جواب دیا حقائق اشیا معلوم کرنے کے لیے، لیکن اب حقائقِ اشیا کا یہ قیمتی علم بلائے جان ہو گیا ہے۔ آج کل امریکہ کے مرد عورت سب اسی کے جنون میں مبتلا ہیں۔ وہ زندگی کی ہر بات علمی مسئلہ کی صورت میں دیکھنے کے عادی ہو گئے ہیں۔ محبت، شادی، اولاد، محنت، خانہ داری، کھیل یہ سب اپنی اپنی جگہ پر حقیقتیں ہیں۔ علمی مسائل میں علم الحیات اور علم الاقتصاد کے اصول پر انھیں حل ہونا چاہیے۔ پھر وہ حل بھی ہر اعتبار سے علمی و منطقی ہو۔ یہی سبب ہے کہ امریکہ میں جرأت کی مثالیں بہت کم ملتی ہیں۔ امریکن نوجوان اس بات میں جرأت دکھاتا ہے جو اقتصادی حیثیت سے مفید ہو۔

امریکہ کی مشترک یونیورسٹیاں اس لیے قائم کی گئی ہیں کہ مرد عورت کی تقسیم مٹ جائے۔ یہ قول ایک یونیورسٹی کی پرنسپل کا ہے۔ میں نے اسے ایک مشہور فرانسیسی پروفیسر کے سامنے نقل کیا تو وہ چلا اٹھا ''اُف نا قابلِ تصور سنگدلی ہے۔ زندگی کے قدرتی جذبات کی لطافت کی جگہ اب ایک سر سے پیر تک بناوٹی اور اصولی زندگی ہے جس میں امریکہ کا ہر فرد مبتلا ہو گیا ہے''۔

ناول اور افسانے۔ میں نے بہت سی یونیورسٹیوں کے کتب خانوں کی سیر کی اور مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ ان کی فہرستیں ناولوں سے تقریباً خالی ہیں۔ اقتصادیات، طبعیات، فلسفہ و نفسیات۔ غرضیکہ تمام دقیق علوم کی کتابیں بھری ہوئی ہیں۔ امریکن نوجوان زیادہ تر یہی خشک کتابیں پڑھتے ہیں یہی وجہ ہے کہ رقیق جذبات ان میں بہت کم ہو گئے ہیں۔ وہ مادی اور فلسفی ہو کر رہ گئے ہیں۔ روح اور قلب کی قوتیں دب گئی ہیں۔ ایک فن میں مہارت کی دُھن۔

امریکہ کی گھریلو زندگی کو بدمزہ کرنے والی ایک چیز اور بھی ہے۔ مردوں کی تعلیم عام طور پر

کسی ایک علم یا فن کی ہوتی ہے کہ وہ ایک پیشہ میں خاص درجہ حاصل کر سکیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اگر بیوی اس فن میں ماہر نہیں تو دونوں کی زندگی میں بے لطفی بلکہ تلخی پیدا ہو جاتی ہے۔ شوہر کا دماغی رجحان کچھ اور ہوتا ہے بیوی کا اور۔ دونوں اپنی بات چیت کے لیے کوئی دلچسپ موضوع نہیں پاتے۔ معمولی اور رسمی باتوں کے بعد اپنے اپنے خیالات میں غرق ہو جاتے ہیں۔ اس وقت عورت کو محسوس ہوتا ہے کہ اس نے جو تعلیم یونیورسٹی میں حاصل کی تھی وہ بے فائدہ نکلی۔

ان مشترک تعلیم گاہوں نے ایک اور سخت مضرت بھی پیدا کر دی ہے۔ نوجوان مرد اور عورتیں ایک ساتھ تعلیم حاصل کرتے ہیں جن سے ان میں بتدریج دوستی پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ دوستی محبت کی شکل اختیار کرتی ہے اور اس کا نتیجہ شادی ہوتا ہے۔ یہ کچھ برا نہ تھا۔ اگر مناسب عمر میں ہوتا، لیکن حالت یہ ہے کہ اکثر شادیاں 19 اور 21 برس کی عمر میں ہو جاتی ہیں (جو یورپ میں عام طور پر تعلیم پانے کی عمر ہے) اور اس سے سخت مشکلات پیش آتی ہیں۔ مرد و عورت دونوں شادی کے بعد کی ذمہ داریوں سے بے خبر ہوتے ہیں۔ بلکہ ابھی دونوں طالب علم ہی ہوتے ہیں۔ گھر میں چار چار بچے کھیلتے ہیں اور ماں باپ یونیورسٹی کے کمروں میں استادوں کے سامنے بیٹھے ہوتے ہیں۔ اس طریقۂ زندگی سے جو خرابیاں اور پریشانیاں پیدا ہو سکتی ہیں وہ ظاہر ہیں لیکن تعجب ہے کہ امریکہ کے عقلمند اس کی روک تھام نہیں کرتے بلکہ اسے پسند کرتے ہیں۔

یہاں مردوں کی طرح عورتوں کی زندگی بھی روپیہ کمانے اور خرچ کرنے میں بسر ہوتی ہے۔ بازاروں میں کپڑوں کی اکثر دکانوں پر یہ عبارت نظر آتی ہے کہ یہاں عورتوں کو کپڑے سینے کی تعلیم مفت دی جاتی ہے۔ کہیں سائن بورڈ پر لکھا ہے ''یہاں علم خانہ داری پر لکچر مفت سنائے جاتے ہیں''۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ امریکن عورت بالکل بے کار نہیں رہتی۔ وہ اپنی خانگی زندگی میں تو ضرور بدنصیب ہوتی ہے مگر علمی اور صنعتی ترقی برابر کر رہی ہے، لیکن دراصل اس ترقی نے اسے مسرت سے محروم بھی کر رکھا ہے۔ وہ بہت مصروف ہوتی ہے۔ اس کا ثبوت بازار میں ملتا ہے۔ دکانیں عورتوں سے بھری رہتی ہیں۔ دکاندار اپنے اعلانوں میں عموماً عورتوں ہی سے خطاب کرتے ہیں کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ مردوں کو خرید فروخت کی مہلت نہیں وہ روپیہ کمانا جانتے ہیں، خرچ کرنا نہیں جانتے۔ عورتیں ان کی ہفتہ بھر یا مہینہ بھر کی آمدنی پر قابض ہو جاتی ہیں اور بازاروں

میں آ کر بے دریغ خرچ کر ڈالتی ہیں۔عورتوں کے اسراف کا اندازہ صرف اتنی بات سے کیا جا سکتا ہے کہ گزشتہ دس سال کے اندر منہ پر ملنے والے روغنوں کی تعداد کی فروخت میں فیصدی دو ہزار کا اضافہ ہو گیا ہے۔

امریکہ کے زنانہ کلب دنیا میں اپنی نظیر آپ ہی ہیں۔ بڑے ہی شاندار خوبصورت اور جدید ترین سامان سے آراستہ ہوتے ہیں۔ عورتیں چونکہ شوہر کو گھر میں نہیں پاتیں اور دلچسپی سے محروم رہتی ہیں، اس لیے اپنا زیادہ وقت کلب ہی میں گزارتی ہیں۔ عام طور پر عورتیں ہی شوہر کو موٹر میں بٹھا کر دفتر لے جاتی ہیں اور اسے وہاں چھوڑ کر خود سارا دن کلب میں صرف کرتی ہیں۔ شام کو پھر موٹر لے کر دفتر گئیں اور لے آئیں۔ رات کا کھانا عموماً میاں بیوی مل کر ہوٹل میں کھاتے ہیں اور پھر گھر آ کر سو رہتے ہیں۔

سب سے زیادہ کلب مڈل ویسٹ میں ہیں۔ یہ کلب بہت ہی دلچسپ اور مفید ہیں لیکن ایک عیب ان میں یہ بہت برا ہے کہ غور و فکر کی ساری قوت سلب کر لیتے ہیں اور دماغ میں اس قدر معلومات بھر دیتے ہیں کہ وہ اسے ہضم نہیں کر سکتا۔ دن بھر کلب گھروں میں علمی تقریریں ہوتی رہتی ہیں۔ ایک دن میں نے شکاگو کے ایک زنانہ کلب میں چار مختلف مضمون پر لکچر سنے۔ مضمون یہ تھے:

(1) مرد کا کام گھر میں (2) غذا کی تاثیر جسم انسانی پر (3) موجودہ ادبیات اور خوارق عادت، سحر و ساحری کی حقیقت۔

میں نے بڑے غور سے لکچر سنے تھے، لیکن جب آخر میں سوچا کہ میں نے کیا سنا تھا تو باوجود سخت کوشش کے اس کا کوئی جواب نہ دے سکا کیونکہ دماغ مختل ہو چکا تھا صرف دو باتیں حافظے میں محفوظ رہ گئی تھیں ایک یہ کہ دوپہر کو کھانا نہیں کھانا چاہیے۔ دوسرے یہ کہ دنیا کی اقتصادی حالت ایسی ہو گئی ہے کہ انسان دولت جمع کرنے کا آلہ بن گیا ہے۔ صرف ایک دن میں میرا یہ حال ہوا، لیکن ان عورتوں کا کیا حال ہو گا جن کی ساری زندگی انھیں کلب گھروں میں گزرتی ہے۔

امریکہ میں بے شمار انجمنیں اس غرض سے موجود ہیں کہ ماؤں کو مفت مشورے دیا کریں۔ ان میں ہمیشہ لکچروں کا سلسلہ جاری رہتا ہے اور ماؤں کو بتایا جاتا ہے کہ وہ کون کون سی کتابیں پڑھیں۔ کس قسم کا کھانا کھائیں۔ کیا سوچیں کیا دیکھیں۔ غرض کہ ہر معاملے میں باقاعدہ علمی مشورہ

دیا جاتا ہے۔ اس کے صاف یہ معنی ہیں کہ امریکہ میں جس طرح سب معاملات اصول وقواعد کے تحت رکھے گئے ہیں، اسی طرح نسوانیت بھی علمی اصول کے تحت لائی جارہی ہے اور یہی خبط کہ ہر چیز کو علم کے سانچے میں ڈھال لیا جائے۔ انسانیت اور مرد وعورت کی جنسیت اور فطرت کا خاتمہ کیے دیتا ہے۔

دنیا میں امریکہ کی نوجوان عورت سے بڑھ کر کوئی چیز باقاعدہ نہیں۔ وہ الھڑ نہیں ہوتی۔ اپنے شوہر کی طرح کسی نہ کسی علم یا ہنر میں ماہر ہوتی ہے۔ اپنے گھر کو ترتیب وانتظام سے رکھ سکتی ہے۔ امریکن عورت انگلستان کی عورت سے کہیں زیادہ سلیقہ منداور منتظم ہوتی ہے۔ وہ اپنے بچوں سے بے حد محبت کرتی ہے۔ ہندستان کی طرح امریکہ میں بھی اولاد اپنے ماں باپ کی ملکیت سمجھی جاتی ہے۔ گھروں میں بچوں کے لیے علیحدہ کمرے نہیں ہوتے۔ پورا گھر بچوں کے لیے کھلا ہوتا ہے اور وہ دن بھر اودھم مچاتے رہتے ہیں۔ اسی طرح دائیاں اور کھلائیاں رکھنے کا رواج بھی کم ہے۔ خود ماں ہی دائی ہوتی ہے اور اپنے بچوں میں کسی کی مداخلت گوارا نہیں کرتی خود ان کا مستقبل اپنے مستقبل سے وابستہ سمجھتی ہے۔ ان کی تعلیم وتربیت میں وہی اصول مدنظر رکھتی ہے جو لکچروں میں سنتی اور کتابوں میں پڑھتی ہے۔

لیکن اس کے باوجود بھی اس کی زندگی ایک بڑی حد تک مسرت سے خالی ہوتی ہے کیونکہ جیسا اوپر بیان ہو چکا ہے۔ علم اور تجارت کی ترقی نے ازدواجی مسرتوں کا دائرہ اس پر تنگ کر رکھا ہے۔ امریکہ کی عورت علم اور مادی ترقی سے اب نالاں ہے اور چونکہ امریکہ کی عورت خوش نہیں ہے اس لیے باوجود بے شمار دولت رکھنے کے امریکہ بھی خوش نہیں ہے۔ وہ تمدن کی شدت سے اُکتا گیا ہے اور پیچھے کی طرف دیکھ رہا ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ موجودہ صورت حال کا آئندہ پلٹا کیا ہوگا۔

(تہذیب نسواں، لاہور، اگست 1929)

ان حالات کے بعد ہندستانی کی حیثیت سے یہ دعا ملا رموزی صاحب کے لیے واجب ہو جاتی ہے کہ ''خدا ہمیں امریکہ کی بیوی سے بچائے'' مگر جن لوگوں کے آدابِ زندگی اور عادات ہی یہ ہوں ان کے نقطۂ نظر سے بھی بیوی ساری دنیا کی بیویوں سے زیادہ بہتر ہوگی پھر بھی خدا کی پناہ''۔

افریقہ کی بیوی:

انسانی آبادی کا یہ علاقہ مختلف ناموں سے مشہور ہے۔ کوئی اسے ''تاریک براعظم'' کہتا ہے تو کوئی اسے ''گرم براعظم'' اور کوئی اسے ''بلند ترین براعظم'' کے نام سے پکارتا ہے۔ تاریک حصۂ زمین ہونے کی مختلف وجوہ ہیں۔ مثلاً۔

ایک یہ کہ یہاں حبشی یعنی کالی نسل کے لوگ آباد ہیں۔

دوسرے یہ کہ اس کے حالات سے دوسری انسانی آبادیاں عرصہ دراز تک ناواقف رہیں۔

تیسرے یہ کہ اس کے اکثر باشندے جاہل، وہمی اور غیر مہذب تھے۔

چوتھے یہ کہ اس حصۂ زمین کی سطح کا 7/10 حصہ منطقۂ حارہ میں واقع ہے۔

پانچویں یہ کہ گو اس میں کوہ ہمالیہ کی طرح بلند ترین پہاڑ تو نہیں ہیں مگر اکثر مقامات پر اس کی سطح مرتفع ہے اور اس کی اوسط بلندی تمام براعظموں کی نسبت زیادہ ہے۔ اس کا شمالی حصہ چوکور ہے اور جنوبی حصہ مثلث۔

شمال میں ایک زبردست پہاڑی سلسلہ ہے۔

مشرقی حصہ کو ایک دریا سیراب کرتا ہے جس کی طغیانی آس پاس کے علاقہ کو زرخیز اور پیداوار کے قابل بنائے رہتی ہے۔

اس کے مغربی حصے میں دنیا کا مشہور ''خشک علاقہ'' ہے جسے صحرائے اعظم کہتے ہیں۔ جنوبی حصہ ایک مثلث نما سطح مرتفع ہے جو پہاڑی سلسلوں سے گھری ہوئی ہے۔

انسانی آبادی کا یہ زبردست حصۂ زمین یورپ کے جنوب اور ایشیا کے جنوب مغرب میں واقع ہے۔ اس کو بحیرہ روم اور آبنائے جبرالٹر براعظم یورپ سے اور خلیج عدن اور بحیرہ قلزم ایشیا سے جدا کرتا ہے۔ خاکنائے سوئز میں سے جہازوں کی آمد و رفت کے لیے نہر کاٹی گئی ہے اس لیے افریقہ کو جزیرہ بھی کہہ سکتے ہیں۔

یہ علاقہ وسعت میں ایشیا سے دوسرے درجے پر ہے۔ اس کا رقبہ تقریباً ایک کروڑ پندرہ لاکھ مربع میل ہے۔ یعنی ایشیا کے تقریباً تہائی حصہ کے برابر اور ہندستان سے آٹھ گنا۔

آج سے 30 برس پہلے اس کی آبادی کا تخمینہ 16 کروڑ تھا۔ اس علاقے کے باشندوں کی

جہالت اور بے ہنری دیکھ کر یورپ کے بہادر، جری، ذی حوصلہ، عالی ہمت، جنگ جو، جفاکش، محنتی، ذی علم اور ہنر مند باشندوں نے اس علاقے پر چڑھائی کی، نتیجہ یہ ہوا کہ 16 کروڑ افریقی باشندے ان کے غلام بن گئے اور یورپ کی ہر قوم نے اس کا کوئی نہ کوئی علاقہ اپنے قبضے میں کرلیا، پھر اس علاقے سے یورپ والوں نے بے شمار دولت، سونے کی کانوں، کوئلے کی کانوں، جواہر غرض ہر قسم کے مال وزر کی چیزیں حاصل کیں۔ اس علاقے میں یورپ کی جن قوموں نے فتح پائی اور علاقے کے علاقے اپنے قبضے میں کرلیے اُن میں انگریز، فرانسیسی، جرمن، اطالوی، پُرتگالی اور بلجیمی خاص ہیں۔

کہنے کو اس علاقے کے چند حصے خود مختار اور آزاد علاقے کہے جاتے ہیں مگر ایسی آزادی پر لاحول ولاقوۃ پس ایسے لاحول ولا قسم کے آزاد علاقوں میں صوبہ جات بربر تھے جنھیں ''مراکو'' مراکش اور مراقش بھی کہتے ہیں۔ اس علاقے کے تمام باشندے عرب مسلمان ہیں لیکن اس آزاد علاقے کے باشندوں کا اب یہ حال ہے کہ حکومت فرانس نے مار مار کران کا کچومر نکال دیا ہے۔ چنانچہ ہندستان کے تمام مسلمان علما کی مرکزی جمعیۃ العلماء ہند کے اخبار ''الجمعیۃ'' دہلی نے اپنی اشاعت مورخہ 13 مارچ 1931 کے صفحہ نمبر 2، کالم نمبر 3 و نمبر 4 پر ان باشندوں کے حق میں حکومت فرانس کے تازہ مظالم کو ان الفاظ میں چھاپا ہے:

> ''الجزائر کے اسلامی مدارس اور تعلیم گاہوں میں قرآنی تعلیم بالکل بند ہے، شرعی کچہریوں کو مٹادیا گیا ہے۔ مدرسین اور اُستاد عیسائی ہیں عیسائیوں کی تبلیغی جماعتیں تیزی سے کام کر رہی ہیں۔''

> ''مئی 1930 میں حکومت فرانس نے اس علاقے کے برائے نام سلطان سے ایک اعلان جاری کرادیا جس کی رو سے ساری سلطنت کے مسلمان باشندوں پر یہ لازم ہوگیا کہ وہ اپنے تمام جھگڑوں کا فیصلہ اسلامی قانون کے عوض فرانس کے بنائے ہوئے نئے قانون کے موافق کرائیں''۔

> ''ان کی عربی زبان مٹائی جارہی ہے۔ اسلامی بادشاہوں نے جو اوقاف کی رقمیں کعبۃ اللہ کے نام پر وقف کی تھیں اُن کو حکومتِ فرانس اپنے فائدے پر خرچ کر رہی

ہے۔ مسلمان علما اور دوسرے اصلاح کرنے والے بغیر حکومت کی اجازت کے اس علاقے میں نہیں جاسکتے بربر قبائل میں تبلیغ اسلام کا کام قطعاً بند ہے۔ پندونصیحت سے یہ باشندے محروم ہیں اسلامی مدرسے بند ہیں، مساجد برباد ہیں، قرآن شریف کی تعلیم کو حکماً بند کر دیا ہے وغیرہ''۔

بغرض محال اگر اتنے مظالم نہیں تو اس سے آدھے تو ضرور ہیں اور اسی لیے یہاں کے بعض علاقوں کے باشندوں نے 21-1922 میں غازی عبدالکریم ریفی کی کمانڈ میں حکومت فرانس اور حکومت اسپین سے شدید تر لڑائی لڑی تھی جس میں حکومتِ فرانس کی بے شمار فوجوں سے مقابلہ کی تاب نہ لاکر بالآخر ان مسلمانوں نے ہتھیار ڈال دیے اور غازی عبدالکریم کو حکومت فرانس نے اپنے ایک جزیرہ میں مع اُس کے خاندان کے بند کر دیا جو آج 1931 تک نظر بند ہیں۔

افریقہ کے جو علاقے ہندستانی مسلمانوں میں زیادہ مشہور ہیں ان میں مصر، بیروت، مراقش خاص ہیں اور اسلامی تہذیب وتمدن اور اسلامی برادری کے لحاظ سے بھی علاقے دنیا کی بلند تر تاریخ میں بھی نہایت عزت کی جگہ حاصل کر چکے ہیں۔ خاص کر ملک مصر دنیا کی قدیم تاریخ میں نہایت مہذب، ترقی یافتہ اور شائستہ ملک مانا گیا ہے۔ اسی طرح علاقہ مراقش بھی اسلامی حکمرانی، اسلامی تمدن اور اسلامی تعلیمات کا بہت زیادہ بلند علاقہ تسلیم کیا گیا ہے اور اب تو تقریباً تمام افریقہ کے باشندے اعلیٰ تعلیم یافتہ، بہترین تجارت پیشہ اور ہنرمند ہوگئے ہیں۔ اگرچہ یہاں کا تعلیم یافتہ طبقہ بھی ہندستان کے جدید تعلیم یافتہ طبقے سے مشابہ ہے یعنی فاتح قوموں کا ''نقال'' باقی سب طرح خیریت ہے پھر بھی اس کے زیادہ باشندوں نے ابھی تک ہندستانیوں کی طرح اپنا قومی لباس، قومی عادات، قومی رسوم اور قومی زبان کو ترک نہیں کیا ہے۔ البتہ جن مقامات کے باشندے یورپ کے باشندوں سے زیادہ قریب ہیں بدقسمتی سے ان کے اندر غیر قومی آداب، غیر قومی لباس اور غیر قومی زبان وعادات کو خاص غلبہ حاصل ہوگیا ہے۔

اب ہم براعظم افریقہ کے ایسے علاقوں کی بیوی سے بحث کریں گے جو ہندستان میں زیادہ مشہور و معروف ہیں یعنی ملک مصر اور مراقش۔ سو واضح ہو کہ اگرچہ ملک مصر کی تہذیب ''اسلامی حکمرانی'' اور اس کے باشندوں کی دماغی فضیلت ہمیشہ سے مسلم اور قابلِ تعریف مانی گئی ہے، لیکن

اس علاقے پر غیر ملکی قوموں کے طویل تر قبضے سے یہاں کے اصل باشندوں کے خواص بہت زیادہ بدل گئے اور مسلسل غلامی کی زندگی سے یہ حد سے سوا عاجز، درماندہ اور ضعیف ہو گئے، مگر ان کی عالی دماغی اور بلند ہمت میں فرق نہ آیا اور گویہ حوصلہ اور عالی دماغی ان کی قدرتی اور آبائی چیز ہے پھر بھی انھیں زیادہ ترقی کرنے، آزاد رہنے اور ہر کام میں بلند حوصلہ رہنے میں نہر سوئز نے بہت زیادہ اثر کیا یعنی اس جدید دریائی راستہ کے کھل جانے کے باعث ملک مصر ایک ایسی جگہ بن گیا جہاں ہر وقت تمام دنیا کے باشندے آنے جانے لگے اور تمام دنیا کے جہازوں کے آنے جانے سے دوسری قوموں کے علوم وفنون، تمدن اور تمام حالات بھی مصری باشندوں تک پہنچ گئے۔

خصوصاً پچھلی صدی میں جو قوم مصری باشندوں پر حکمراں تھی یعنی ترک، اس نے ان باشندوں کو بہت زیادہ ہوشیار اور ہنر مند بنایا، اس لیے کہ ترک لوگ خود یورپ کے باشندے ہیں اور وہ ترقی کے لحاظ سے یورپ کی قوم سے پیچھے نہیں ہیں۔ صرف تعداد کے لحاظ سے وہ یورپ کی دوسری قوموں سے کم نہیں، اس لیے بھی نیز اس لیے کہ مصر اور ترکی کے لوگ آپس میں ہم مذہب بھی تھے۔ مگر 1919 سے اس ملک پر انگریزوں کا قبضہ نما دخل ہے اور کہنے کو مصر کا سلطان بھی مصری ہے اور وزیر لوگ بھی مصری۔

الغرض یہاں کی بیوی بھی کچھ عجیب قسم کی ''ملی جلی ہوئی'' ہوتی ہے۔ ملی جلی کے یہ معنی ہیں کہ یہاں کی جو عورتیں ترقی کے لحاظ سے مثال بنا کر پیش کی جا سکتی ہیں ان کی ترقی میں بھی وہی بربادی شامل ہے جو ہندستان کی ترقی یافتہ عورتوں میں موجود ہے اور ہر غلام ملک کے باشندوں میں ہوتی ہے۔

اگرچہ لفظی یا مشہور عام ترقی کے لحاظ سے یہاں بھی زندگی کے ہر حصہ میں عورتوں نے خاصی ترقی کی ہے مثلاً ملکی آزادی کی کوشش میں انھوں نے مردوں کے برابر کام کیا۔ علمی حیثیت سے ان میں مصنف، ایڈیٹر، وکیل، شاعر وغیرہ سب ہی موجود ہیں جن میں سے بعض مشہور اور اعلیٰ ترقی یافتہ عورتوں کے نام یہ ہیں۔ آنسہ می، بیگم زغلول پاشا، زکیہ سلیمان اور سیدہ ہدیٰ شعرادیہ خانم مگر اس قسم کی تمام عورتیں جدید قسم کی عورتیں ہیں اور اسی لیے ان کا ہر کام جدید رنگ کا ہے مثلاً وہ 1922 میں ملک اٹلی کی اُس مجلس میں شریک ہوئی تھیں جو تمام دنیا کی عورتوں کی مجلس تھی اور جس

کے صدر حکومت اٹلی کے مشہور وزیراعظم سائنور مسولینی تھے اس مجلس میں ان مصری عورتوں نے جو کام کیا اور جو تقریریں کی تھیں ان پر اٹلی کے وزیراعظم اور تمام دوسری عورتیں آنکھیں پھاڑ کر اور منہ کھول کر رہ گئے تھے اور کچھ شک نہیں کہ مصری عورتوں میں تعلیم جدید اور مردوں کے برابر ترقی کرنے کا خیال اور کام نہایت تیزی سے بڑھ رہا ہے لیکن بیوی ہونے کے حساب سے مصری عورتوں کا عام حال ہندستان کی عورتوں سے کچھ زیادہ اور خاص نہیں ہے اور اسی لیے ہم مصری بیوی کے متعلق خود کچھ لکھنے کے عوض ہندستان ہی کی ایک ایسی محترم ''عورت ذات'' کے ''ذاتی آنکھوں'' سے دیکھے ہوئے اور ذاتی قلم سے لکھے ہوئے حالات کو نقل کر دینا مناسب سمجھتے ہیں۔ یہ محترم خاتون ہندستانی ہیں جو اپنے شوہر کے ساتھ شہر اسکندریہ واقع مصر میں مقیم رہی ہیں اور تعلیم یافتہ ہونے کے اثر سے مصری عورتوں کے حالات کو نہایت غور سے دیکھا ہے۔ ان کے لکھے ہوئے حالات کو نقل کرنے سے یہ مطلب ہے کہ ہندستانی عورتیں معلوم کر سکیں کہ مصری عورتوں کو ہندستانی عورتیں کس نظر سے دیکھتی ہیں؟ چنانچہ خاتون موصوفہ کا لکھا ہوا مضمون یہ ہے جو انھوں نے مصری بیوی اور شوہر کے متعلق لکھا ہے:

''مصر میں تحریک آزادی نسواں نے ترقی تو بے حد کر لی ہے، لیکن افسوس کہ اس کے نتائج دوسرے اسلامی ممالک کی خواتین کے لیے قابلِ تقلید نہیں ہیں۔ اس میں کچھ شبہ نہیں کہ مصری خواتین نے قابلیت، صحت اور مرتبہ میں بہت ترقی حاصل کر لی ہے، لیکن افسوس کہ وہ صحیح معنوں میں مصری اور مسلمان خواتین کہلانے کی مستحق نہیں رہیں۔

آزاد خیال عورتوں نے تعلیم پانے کے بعد اپنے قدیم تمدن کی اصلاح کر کے ایک جدید تہذیب کی بنیاد نہیں ڈالی بلکہ جو کچھ انھیں مغرب سے ملا آنکھیں بند کر کے اس سب کو قبول کر لیا ہے۔ چنانچہ اب یہاں یورپین طرزِ زندگی بے حد مقبول ہے اور تمام لکھی پڑھی ترقی یافتہ خواتین یورپین انداز پر زندگی بسر کر رہی ہیں۔

اس کے علاوہ گو مدارس میں عربی زبان کی تعلیم باقاعدہ دی جاتی ہے، لیکن خواتین اس شوق سے عربی زبان کو استعمال نہیں کرتیں جس شوق سے مدارس میں انگریزی اور فرانسیسی زبان سیکھتی اور بولتی ہیں۔ مذہبی تعلیم کا انتظام بھی خاطر خواہ ہے، لیکن اس

میں بھی عام طور پر دلچسپی نہیں لی جاتی۔ یہاں کی بہت نامور خاتون محترمہ ہُدیٰ خانم شعراوی ہیں۔ ان کی بدولت زنانہ اسکولوں میں لڑکیاں صنعت اور دست کاری کی تعلیم حاصل کرتی ہیں۔

تعلیم یافتہ مصری خواتین کی معاشرتی زندگی بھی ان تمام بدمزگیوں کا شکار ہے جو مغرب میں عام طور پر پائی جاتی ہیں۔ شاید ہی کوئی خوش نصیب ایسا گھرانا ہوگا جس میں ہر روز میاں بیوی کا جھگڑا نہ ہوتا ہو۔ میاں نے جہاں کوئی بات بیوی کی مرضی کے خلاف کی بیوی جھٹ خلع لینے پر آمادہ ہوجاتی ہے۔ ادھر سے خلع لیا، دوسری جگہ نکاح کرلیا۔ اس بات کی کچھ پروانہیں کی جاتی کہ بچے موجود ہیں اور ان کے حقوق کا بھی کچھ تقاضا ہے۔ جہاں میاں بیوی کی علاحدگی ہوئی بیوی نے میاں کو گھر سے نکال باہر کیا اور گھر کو اپنے مہر میں ضبط کرلیا۔ یہاں جب شادی ہوتی ہے تو والدین لڑکے کے متعلق جن باتوں کا خاص خیال رکھتے ہیں ان میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ وہ مہر زیادہ ادا کرسکے۔ اگر کسی معمولی قوم یا پیشہ کا آدمی بھی مہر زیادہ ادا کرنے کا وعدہ کرلیتا ہے تو والدین اس کی ترجیح دیتے ہیں۔ اسی وجہ سے عورت کو یہ سہولت رہتی ہے کہ لڑائی جھگڑے کے موقع پر خاوند سے خلع لے کر اسے گھر سے نکال دیتی ہے۔ افسوس ہے کہ عورتوں کے خلع کے حق نے مصر کے اکثر گھرانوں میں بہت افسوسناک صورتِ حال پیدا کردی ہے۔ طلاق اور خلع کی یہ حالت ہے کہ ہر روز کئی شوہر بیویوں سے اور بیویاں شوہروں سے علاحدہ ہوتی رہتی ہیں۔ پختہ عمر عورتوں میں شاید چند ہی ایسی عورتیں ہوں جو تین یا چار دفعہ خلع حاصل نہ کرچکی ہوں۔

یورپین لباس اور فیشن عام ہے۔ عورتیں یورپین لباس پہن کر اور پاؤڈر لگاکر بازاروں میں سودا خریدنے جاتی ہیں۔ اب بال بھی ترشوانے لگی ہیں۔ امیر گھروں کی عورتوں کا تو بہت ہی برا حال ہے۔ میر سپاٹے کے سوا کوئی کام نہیں اور یہ شوق اس حد تک ہے کہ اس بات کا بھی خیال نہیں کہ خاوند ساتھ جاسکتا ہے یا نہیں۔ قہوہ خانوں میں، سنیما اور تھیٹروں میں آمدرفت رہتی ہے۔

مصری عورتیں اپنے دین اسلام کی طرف بہت کم توجہ کرتی ہیں۔ صوم وصلوٰۃ کی عادی ہی نہیں۔ زیادہ سے زیادہ سو میں سے پانچ عورتیں نماز پڑھتی ہوں گی۔ مجھ کو یہاں آئے قریباً دس سال ہو گئے ہیں۔ میں نے آج تک کوئی ایسی عورت نہیں دیکھی جو باقاعدہ نماز پڑھتی ہو۔ روزہ بھی بعض عورتیں ہی رکھتی ہیں۔ میری رائے میں مصر کے مقابلے ہندستان میں اللہ پاک کا بڑا احساس ہے۔ وہاں پھر بھی مذہب اور اسلامی معاشرت کا خیال بہت زیادہ رکھا جاتا ہے۔ لوگ نماز روزے کے بہت پابند ہیں۔ بڑے یا چھوٹے، بہت ہی کم ایسے لوگ ہیں جو مذہب کے پابند نہ ہوں۔ حیات ملی کے لیے اس قسم کی پابندی نہایت ضروری ہے۔

یورپین عورتوں کے لباس میں مصری عورتوں کا لباس محض اتنی بات میں مختلف ہے کہ بعض مصری عورتیں برقعہ بھی اوڑھتی ہیں۔ عام طور پر کنواری لڑکیاں جن کی عمر چودہ پندرہ سال کی ہوتی ہے وہ ہیٹ پہن کر بازار اور اسکول جاتی ہیں۔

مصری برقعہ بہت ہی آزاد اور بے پردہ ہے جس میں عورت کے چہرہ اور ہاتھوں کے علاوہ ٹانگیں بھی گھٹنوں سے اوپر تک دکھائی دیتی ہیں جو اسلام کی رو سے ناجائز ہے۔ میں اس مراسلت کے ساتھ مصری عورتوں کی دو تصویریں بھی ارسال خدمت کرتی ہوں۔ ان میں سے پہلی تصویر قدیم برقعہ کی ہے اور دوسری موجودہ برقعہ کی ہے۔ اگرچہ پورے برقعے کی تصاویر حاصل نہیں کر سکی لیکن امید ہے کہ بہنیں اتنے حصے کو دیکھ کر اور میرا مضمون پڑھ کر پورے برقعہ کے متعلق اندازہ لگالیں گی"۔

(رسالہ تہذیب نسواں، لاہور، 2 جون 1928)

مذکورہ بالا اقتباس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہندستانی بہن نے مصری عورتوں کے حالات کو خالص ہندستانی نقطۂ نظر سے دیکھا ہے اس لیے انھیں مصری بیوی کے لیے یہ فیصلہ کرنا پڑا کہ وہ شوہر کے حق میں تکلیف دہ ہے۔ حالانکہ ایسا نہیں۔ چنانچہ 1923 کے رسالہ "نگار" میں "زنانِ مصر" کے عنوان سے ہمارے دو مضمون شائع ہوئے ہیں۔ اس وقت خود مُلّا رموزی سے اور مصری انجمن خواتین مصری کی صدر محترمہ ہُدیٰ شعراویہ خانم سے جو خط و کتابت ہوئی تھی اور موصوفہ نے

مصری عورتوں کے متعلق جو ذخیرہ عنایت فرمادیا تھا اُس سے پتہ چلتا ہے کہ مصری بیوی اپنے شوہر کے حق میں ہندستانی بیوی سے کہیں زیادہ مفید ہے۔ مثلاً۔

وہ تعلیم یافتہ ہوتی ہے یا ہنر مند، اس لیے وہ کسبِ معاش میں اپنے شوہر کے لیے ہندستانی بیوی کی طرح مصیبت نہیں بن جاتی ہے کہ بیوی کے لیے بھی کما کر لائے اور بیوی کے والد صاحب اور والدہ صاحبہ کی امداد کیجیے کیونکہ سسر اور ساس کا رتبہ ہندستان میں حقیقی ماں باپ کے برابر قرار دیا گیا ہے۔

مصری بیوی ایک ترقی یافتہ ملک کی پیداوار ہونے کے باعث ہندستانی بیوی سے کہیں زیادہ گھر میں خوش رہتی ہے۔

وہ حد سے سوا اولوالعزم اور جفا کش ہوتی ہے اس لیے وہ مردوں کی طرح زندگی کے ہر شعبہ میں کام کرتی ہوئی نظر آتی ہے اور یوں تو جلاہوں کی تعداد ہر قوم میں ہوا ہی کرتی ہے۔

سب سے آخری خوبی یہ ہے کہ مصری بیوی ہندستانی بیوی کی طرح صورت کی بھونڈی کالی اور گندی نہیں ہوتی، بلکہ بہت زیادہ حسین ہوتی ہے۔

مذہب میں بھی اتنی گئی گزری نہیں جتنا کہ اوپر کے مضمون میں دکھایا گیا ہے حد سے سوا غیور، بلند اور خوش اخلاق اور صاحبِ حوصلہ۔

مراقشی بیوی:

مراقش بھی براعظم افریقہ ہی کا ایک علاقہ ہے جو اسلامی حکمرانی، اسلامی تہذیب اور اسلامی تمدن کا کبھی عظیم الشان مرکز تھا اور اس کی تاریخ تواریخ عالم میں بڑی ممتاز تاریخ ہے، لیکن اس علاقہ میں اسپین اور فرانس کی حکومتوں نے اپنی فوجی قوتوں سے غلبہ پا کر یہاں کی دنیا بدل کر رکھ دی اور آج یہاں کے قدیم باشندے وہ نہ رہے جو کبھی پہلے تھے۔

الغرض 23-1922 میں اسی جنگ ریف کے باعث جس کا اوپر تذکرہ کیا ہے، اس علاقہ کے حالات سے ہندستانیوں کی واقفیت کافی حد تک بڑھ گئی، اس لیے معلوم کیجیے کہ یہاں کے باشندوں پر اجنبی قوموں کے تسلط کے باعث افلاس، بے علمی اور بے ہنری کا عذاب طاری ہو گیا

ہے اور اکثر علاقہ کثیر التعداد گرا گردن اور مزدوروں سے بھرا ہوا ہے۔ آمد و رفت کے ذرائع اور پہاڑی دشواریوں کے باعث بعض مقامات کے باشندے آج بھی قدیم رسوم و عادات کے پابند ہیں یہاں تک کہ اب بھی بعض ایسی خانقاہیں ملتی ہیں جن کے اندر ایسی بے بیاہی لڑکیاں معتکف ہو جاتی ہیں جنھیں اُن کی مرضی کے موافق شوہر نہیں ملتا۔

شادی بیاہ کی رسوم میں عربی اور اسلامی رسوم کے ساتھ ساتھ جاہلانہ رسوم کی کثرت ہے۔ بعض شہروں کے سوا اکثر بیویاں آدابِ زندگی تک سے بے خبر ہیں پھر بھی یہاں کی بے بیاہی لڑکی ''اسکول'' نہیں بھیجی جاتی اور یہاں کے غیور اور بہادر باشندے ''اسکولی زندگی'' کو خدا کی بدترین لعنت قرار دیتے ہیں اور اسی لیے یہاں کے دیہات تک کی لڑکی کبھی تنہا باہر نہیں نکلتی اور کبھی مجبوراً نکلتی بھی ہے تو اس درجہ حجاب و احتیاط کے ساتھ کہ راہ گیر اپنے کو ظاہر نہیں ہونے دیتی۔ البتہ یورپ کی قوموں کی آمد و رفت والے شہروں کی عورتیں ہندستانی عورتوں کی طرح روشن خیال ہوتی جاتی ہیں جنھیں پہاڑی باشندے قومی وقار اور اسلامی حمیت کے لیے لعنت سمجھتے ہیں البتہ معاشرت کے لحاظ سے یہاں کی بیوی ایک طرح کی ''لکھنوی'' ہوا کرتی ہے یعنی ذرا چمکدار مگر صورت میں نہیں بلکہ لباس اور آرائش کے لحاظ سے۔ چنانچہ ہندستان کی عجیب وغریب قسم کی تعلیم یافتہ عورت کی طرح وہ بھی جوڑا باندھتی ہے۔ پشواز نما سایہ پہنے کانوں میں بجلیاں گلے میں طوق اور ہاتھوں میں چوڑیاں پہنے ایک ہلکا سا پنکھا ہلاتی محوِ خرام نظر آتی ہے۔

ناچ گانے کا اسے بڑا شوق ہے اور یہ شغل ان کی رسوم میں داخل ہے اسی لیے اس علاقے میں ناچ کی دولت بکثرت ہے۔ عمدہ بات یہ ہے کہ شوہر صاحب بیوی کے ساتھ تھرکتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

مراقش کے دوسرے علاقوں کے مقابل ریف کی بیوی اپنے شوہر کے حق میں صحیح معنی کی بیوی ہے۔ یہ نہایت ناقابل گزر پہاڑی علاقہ میں پیدا ہوتی ہے۔ معمولی اور حد سے سوا سادہ رسوم کے ساتھ اس کی پرورش اور شادی ہوتی ہے۔ اسلامی آداب کا اس پر غلبہ ہوتا ہے۔ نہایت شدید محنت اور جفاکشی سے وہ خوش ہوتی ہے۔ تجارت، کھیتی اور امورِ خانہ داری میں وہ شوہر کی برابر کی شریک ہوتی ہے۔ حد سے سوا غیور، خوددار، بہادر اور سلیم الطبع، کفایت شعار اور اولاد پر فدا۔ شوہر

کی حد سے سوا فرماں بردار، مگر جاہلانہ رسوم میں جکڑی ہوئی۔ بہت زیادہ محنت کرنے والی مگر بیحد سلیقہ مند، صاف لباس کی عادی مگر ذرائع معاش کی کمی سے مفلس، شادی کے بعد زندگی کا تمام حصہ شوہر کی خدمت و وفاداری میں صرف ہوتا ہے اور سسرال سے علاقہ بہت کم رہتا ہے اس لیے شوہر بھی ساس سسر اور سالا سالی کی خدمت گزاری سے محفوظ رہتا ہے۔

شادی کے لیے قومیت اور قبیلے کی شرط نہایت سخت ہے۔ غیر قبیلے میں بیاہی نہیں جاتی۔ اس نے جنگ ریف و فرانس بابت 1922 میں میدانِ جنگ میں خدمات جنگ ادا کر کے شوہری خدمت گزاری میں بڑا نام پیدا کیا، جو تاریخ میں ہمیشہ عزت کے ساتھ محفوظ رہے گا۔

یہ ایک نہایت مختصر سا خاکہ ہے افریقی بیوی کا جس سے اُس کے خواص کا اندازہ ہوسکتا ہے۔

◆◆◆

ایشیا کی بیوی

ایشیا انسانی آبادی یا خشکی کا سب سے بڑا حصہ ہے۔ اس کے تین جانب بڑے بڑے دریا ہیں۔ شمال میں ''بحر شمالی'' مشرق میں ''بحر الکاہل''، جنوب میں ''بحر ہند'' اور مغرب میں ''براعظم'' اور افریقہ ہے۔ اس کے شمال میں ایک بڑا نشیبی میدان بھی ہے۔ دوسرے چھوٹے چھوٹے میدان بھی بہ کثرت ہیں۔ ایشیا کے بیچ میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک ایک پٹی پہاڑوں کی ہے۔ یہ پہاڑ مشرق میں بہت چوڑے ہیں اور بیچ میں تنگ ہیں اور پھر مغرب میں پھیل گئے ہیں۔ اس کے آس پاس سمندر اور جزیرے بھی ہیں۔ سب سے زیادہ مشہور جزیرے ملک جاپان میں ہیں۔ اس میں آتش فشاں پہاڑ بھی ہیں۔ یہ اس قدر بڑا حصہ زمین ہے کہ اس کا وسط حصہ سمندر سے بہت دور ہے اس لیے اس میں جاڑے کے موسم میں زیادہ سردی اور گرمی کے موسم میں زیادہ گرمی ہوتی ہے اور بارش کم ہوتی ہے۔ ایشیا کے صحیح موسمی اثرات کو آسانی سے بیان نہیں کیا جا سکتا، اس کے جنوب مشرق میں تیز، خشک اور تر موسمی ہوائیں چلتی ہیں، مگر کل ایشیا کی آب و ہوا غیر معتدل اور مختلف ہے اسی لیے اس کے کل باشندوں کی صحت اور جسمی کیفیت میں خاصا فرق ہے۔ اس کی کل آبادی پچاسی کروڑ ہے (850000000) اور رقبہ ایک کروڑ ستر لاکھ مربع میل (17000000) ہے۔ زمین کے اس حصہ کو انسانی آبادی کی کثرت کے لحاظ سے ''انسانوں

کا جنگل'' بھی کہہ سکتے ہیں۔ عام باشندے زیادہ تعداد میں جاہل، سست، وہمی، ضعیف الاعتقاد، بے ہنر اور عیش پسند ہیں۔ اسی لیے یورپ کے ذی علم، ذی حوصلہ اور بہادر باشندوں نے اُن میں سے اکثر کو اپنا غلام بنالیا اور ان کے ملکوں اور شہروں پر قبضہ کرلیا۔

اس کے مشہور ملک یہ ہیں چین، روس، عرب، جاپان، ایشیا کوچک، ترکستان، بخارا، افغانستان، ایران اور ہندستان۔

گو یہ تمام ممالک علاحدہ علاحدہ اور مختلف باشنوں سے آباد ہیں لیکن ان میں سے ایک بھی ایسا نہیں جس میں یورپ کے بہادر باشندے کسی نہ کسی طرح غالب نہ رہے ہوں۔ چنانچہ چین، ایران، افغانستان اور عربستان خصوصیت کے ساتھ اب تک ان باشندوں کے اثر میں دبے ہوئے ہیں اور ہندستان تو دوسو برس سے کل کا کل انگریزوں کے قبضہ میں ہے۔

1914 سے پہلے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان تمام ممالک کے باشندے آسانوں پر کسی کام کے لیے چلے گئے ہیں اور دنیا میں ان کا ہونا نہ ہونے کے برابر ہے، مگر جب 1914 میں یورپ والوں کی آپس ہی میں عظیم الشان جنگ شروع ہوئی اور جو کامل پانچ سال تک مسلسل جاری رہی تو اس جنگ کے آسانوں کو سر پر اٹھا لینے والے اثرات سے ایشیا والے بھی کچھ ہوشیار ہوئے اور انھوں نے یورپ والوں کے حالات کو بغور دیکھ کر سوچا کہ ہمیں بھی آزادی اور ترقی کے لیے کوشش کرنا چاہیے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سب سے پہلے ملک روس کے باشندوں نے اپنے بادشاہ اور اس کے کل خاندان کو قتل کر کے اپنی پنچایتی حکومت قائم کی اور یورپ کے باشندوں کے اثرات کو اپنے ملک سے بری طرح دور کر دیا اور اس میں اتنی سختی کی کہ اب روسی حدود میں یورپ کے باشندوں کو جاتے ہوئے لرزے والا بخار آتا ہے یا کالی کھانسی ہوجاتی ہے۔ اس کے بعد ایشیا کوچک کے باشندوں نے یورپ والوں کو تلوار کے گھاٹ اتار کر نکال باہر کیا اور اب ان کی حد میں بھی قدم دھرتے ہوئے یورپ والوں کو کپکپی محسوس ہوتی ہے اور جمائیاں آنے لگتی ہیں۔ اس کے بعد ایران کے باشندوں نے اپنے عیش پسند بادشاہ کو بغیر طمانچے رسید کیے تخت سے اتار کر اپنے ہاں کے وزیر جنگ مارشل رضا خان کو اپنا بادشاہ قرار دیا پھر 1919 میں غازی امان اللہ خاں نے افغانستان کا بادشاہ ہوکر افغانستان کو تمام یورپ والوں سے آزاد منوایا اور دس برس تک اس ملک کی ترقی انتہائی تیزی سے

جاری رہی، مگر 1928 میں جب امان اللہ خاں غازی بحیثیت آزاد بادشاہ افغانستان کے یورپ کی سیر کو گئے تو ان کے خلاف افغانستان کے جاہل باشندوں نے سازش کی اور جب وہ واپس آئے تو ان کے خلاف بغاوت کی اور وہ تخت و تاج چھوڑ کر یورپ کے ملک اٹلی میں چلے گئے۔ اب انھی کے ایک جرنیل صاحب افغانستان کے بادشاہ ہیں اور افغانی باشندوں نے جو ترقی کی تھی وہ اب سو سال کے لیے پیچھے رہ گئی اور نام صرف اتنا ہوا کہ ''افغانستان میں بغاوت ہوگئی تھی'' عرب میں بھی یورپ کے باشندوں کو نکالنے کے لیے کوشش ہو رہی ہے، مگر ملک چین نے ایک خوں ریز جنگ کے بعد 1929 میں یورپ کے باشندوں سے آزادی حاصل کر لی۔

اب ہندستان میں بھی اسی قسم کی کوشش جاری ہے۔

چونکہ ایشیا میں مذکورہ بالا ممالک ہیں جن کے بے شمار و بے قیاس باشندوں کی بیویوں کے تفصیلی حالات سے یہ کتاب ''طلسم ہوشربا'' کے برابر طویل ہو جائے گی اس لیے ہم ان ممالک کی بیوی کے عام حالات کے نہایت مختصر نمونے پیش کرتے ہیں جو یہ ہیں:

روسی بیوی:

یہ بیوی ایشیا کی تمام بیویوں سے تعلیم، تمدن اور عام حالات میں آگے ہے۔ خصوصاً جنگی حالات کے لحاظ سے اس کا مرتبہ ایشیا کی دوسری عورتوں سے بہت بلند ہے۔

عام طور پر روسی بیوی نہایت معمولی رسوم کے ساتھ حاصل ہو جاتی ہے۔ موجودہ حکومت نے عیش و عشرت اور فضول خرچی کے ہر کام پر قانون کی بندش عائد کر دی ہے۔ ان عورتوں کا ماحول جنگی ہے، اس لیے جنگی قوموں میں ویسے بھی عیش پسندی کم ہوتی ہے الّا دولت مند قومیں جنگی قومیں ہو کر بھی عیش پسند اور فضول خرچ ہو جاتی ہیں۔ لیکن روسی باشندے دولت مند نہیں بلکہ جنگی اور انتظامی حالات کے جلد جلد بدلتے رہنے سے ان میں کوئی عام اطمینان اور عیش کا جذبہ طاقتور نہیں ہوتا۔ روسی عورت بیوی بن کر امورِ خانہ داری کے لیے نہایت منتظم اور کفایت شعار ہوتی ہے اگرچہ روس میں بھی کلب، تھیٹر، سینما، رقص خانے، قہوہ خانے، ہوٹل اور دوسرے مواقع ایسے ہیں جن میں روسی عورت شریک ہو کر فضول خرچ بن سکتی ہے، لیکن یورپ میں رہنے اور یورپ سے

قریب ہونے کے باعث وہ زیادہ تعداد میں تعلیم یافتہ ہے۔ ادھر نظامِ حکومت نہایت سخت ''سادہ'' ہے جس کے باعث گو وہ شوہر کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر بڑے نخرے سے ہوٹلوں، کلبوں اور عام تفریح گاہوں میں چمکتی پھرتی ہے پھر بھی اس میں اپنے فرائض کو وقت اور مستعدی سے بجالانے کی عادت عام ہوتی ہے۔ اس میں اپنے بچوں، اپنے عزیزوں اور انے شوہر سے زیادہ اپنے ہم قوموں کی خدمت کا جذبہ عام ہے کیونکہ وہ تعلیم یافتہ ہوتی ہے اور اس کی پرورش ہی ایسے اصول پر کی جاتی ہے۔ وہ شوہر کے گھر صرف شوہر کی تنخواہ پر اکڑ کر دن بھر جھولا نہیں جھولتی بلکہ شفاخانوں، ہوٹلوں، دفاتر اور دکانوں میں ملازمت کرتی ہے اور بغیر گھونگھٹ کے شام تک سوداسلف بیچتی ہے، گھر میں رہتی ہے تو وہ صنعت وحرفت کے کاموں کو اختیار کرتی ہے۔ وہ بچوں کی بہترین تعلیم و تربیت میں طاق ہوتی ہے البتہ شراب اور ناچ کے معاملہ میں وہ ذرا بے ڈھنگی اور بے ہنگم معلوم ہوتی ہے، جنگی ذہنیت اور ہنرمندی کے باعث شوہر کے لیے اس لیے مصیبت ہوتی ہے کہ فوراً ''طلاق تک پہنچ جاتی ہے'' مگر وقت آنے پر وہ اپنے ملک وقوم کی اور اپنے شوہر کی عزت کے لیے میدانِ جنگ میں خون بہاتی ہے اور کبھی ''اوئی بہن بھاگو'' نہیں کہتی، اسی لیے 1917 کے انقلاب میں اس نے میدانِ جنگ میں اور اُس سے پہلے 1514 اور 1916 تک جرمنی کی جنگ میں میدانِ شجاعت میں جس حوصلے، صبر واستقامت، جفاکشی اور دلیری سے کام کیا اسے سنکر ہمارے ننھے میاں کی والدہ اب تک کانپ جاتی ہیں۔

قد میں لم ڈھنگ، رنگ کہیں سفید اور زیادہ سرخ، لباس اعلیٰ، کام میں حد سے سوا تیز، زیور معمولی مگر خاصا۔

ترکی بیوی:

یہ مسلمان ہونے کے لحاظ سے روسی بیویوں سے مختلف ہوتی ہے ورنہ عام حالات میں وہ روسی بیوی سے بہت زیادہ ملتی جلتی ہے۔ اس کی زیادہ تعداد یورپ میں ہوتی ہے اور کم ایشیا کو چک میں کیونکہ ترکوں کی حکومت ایشیا کو چک سے لے کر یورپ میں تھریس تک چلی گئی ہے۔ یورپین ہونے کے لحاظ سے اس کے اندر وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جو یورپ کی ترقی یافتہ عورتوں میں

موجود ہیں۔ البتہ یورپ والوں سے مسلسل اور ناقابلِ برداشت لڑائیوں کے باعث اس کی قوم کی اندرونی حالت ہمیشہ سے ابتر رہی ہے، اس لیے یہ اکثر حالات میں مفلس گھرانے میں پیدا ہوتی ہے، پھر ہوش سنبھالتے ہی وہ اعلیٰ تعلیم و تربیت کے لیے وقف کر دی جاتی ہے۔ چنانچہ زیادہ تعداد تعلیم یافتہ اور ہنرمند ہے، اس لیے خیالات میں حد سے سوا بلندی اور صفائی ہوتی ہے۔

عام اسلامی رسوم کے ساتھ بیاہ کر شوہر کے گھر آئی اور اس کا پہلا فرض شوہر سے حد سے سوا محبت کرنا ہوتا ہے۔ تعلیم یافتہ ہونے اور تعلیم یافتہ جماعت میں رہنے کے باعث وہ امورِ خانہ داری میں حد سے سوا مستعد اور ہوشیار ہوتی ہے البتہ یورپ کی عورتوں کی طرح وہ شوہر سے برابری کا دعویٰ اس لیے نہیں کرتی کہ اس کی اسلامی یا مذہبی تعلیم اس کے مخالف ہے اور صدیوں سے اس کے ہاں اسلامی آداب و رسوم کے اثرات ورثہ میں چلے آرہے ہیں اور ایک کافی عرصہ تک وہ ''پردہ'' میں رہی ہے۔

البتہ پچھلی ثلث صدی میں وہ ضرور آگے بڑھی ہے، خصوصاً یورپ والوں کے مسلسل حملوں نے اسے خواہ مخواہ میدان میں نکل کر کام کرنے کے تجربات ہوئے ہیں۔ اسی ایک چیز نے اسے ان تمام چیزوں کے اختیار کر لینے پر مجبور کر دیا جو یورپ کی عورتیں اختیار کیے ہوئے ہیں۔ پھر بھی وہ بے ضرورت اپنے گھر اور شوہر سے زیادہ کچھ نہیں چاہتی۔ وہ صدیوں سے حکمران اور فاتح ماں باپ کی گود میں پلی ہے اس لیے مزاج میں حد سے سوا شرافت، مہربانی، حلم و فیاضی، محبت اور وفاداری کے جذبات بیدار ہیں۔ اسی لیے وہ بیوی کی حیثیت سے اپنے شوہر اور بچوں کے لیے حد سے سوا مفید ثابت ہوتی ہے۔ جنگی قوم کے رکن ہونے کے لحاظ سے اُس میں صبر و قناعت اور محنت و جفاکشی کے حوصلے بیدار ہیں۔ ان پر اسلامی تعلیمات اور آداب نے سونے پر سہاگے کا کام کیا ہے، اس لیے وہ شوہر کی صحیح معنی کی ''رفیقِ زندگی'' اور ''اولاد کے حق میں'' ''سایۂ عاطفت'' ہوتی ہے۔

اولوالعزمی، بہادری، دلیری اور غیرت و خودداری میں وہ اپنا جواب نہیں رکھتی۔ شوہر کی ہر مصیبت میں برابر کی شریک۔ اسی لیے وہ قومی جنگ کے ہر دور میں میدانِ جنگ میں جس شجاعت سے لڑی ہے، دنیا کی بہت کم عورتیں اس شدت سے لڑی ہوں گی۔ کیونکہ اس کے ہر مقابلہ میں

اسے پر جوش بنانے والے قومی جذبہ کے ساتھ ساتھ مذہبی جذبہ بھی مشتعل کرتا رہا ہے اور مسلمانوں کے سوا کسی دوسری قوم میں یہ بات نہیں کہ اُس کے ہاں غیر قومی دشمن سے ہر حال میں لڑنا ''تجارت بخش'' اور ''خدا کی رضامندی'' مانا گیا ہو۔ چنانچہ از 21 تا 1925 اس نے اپنے مردوں کے ساتھ میدانِ جنگ میں جس بے جگری اور بہادری سے یونانی فوجوں کا مقابلہ کر کے انھیں شکست دی ہے اس نے تمام قوموں میں اُس کی عزت و سر بلندی کو منوالیا ہے۔ وہ بچوں کی اعلیٰ تربیت میں نہایت ممتاز حیثیت کی بیوی مانی گئی ہے۔ یہی راز ہے کہ ترکی قوم دنیا کی دوسری قوموں میں نہایت سر بلند اور بلند مرتبہ قوم مانی گئی ہے اور آج تک کسی دوسری قوم کی غلام نہ بن سکی۔ البتہ 1923 کے بعد سے انھیں مردوں کے برابر حقوق طلب کرنے کا جذبہ اس لیے نمایاں ہوا ہے کہ اب اسے اندرونی حالات کے درستی کا موقع ملا ہے ورنہ یہ جذبہ اس کے لیے نیا نہیں۔ اُدھر اس کا نظامِ حکومت بھی قائم اسلامی نظام نہیں رہا بلکہ موجودہ حکومت نے ایسی تمام کمزوریوں کو دور کر دیا ہے جو اسلام کے فرضی نام سے اس کی زندگی کو تلخ بنائے ہوئے تھیں اور اسی لیے، اب ترکی بیوی اپنے شوہر کے برابر ملازمت، تجارت، صنعت و حرفت کے محکموں اور اداروں میں روزی کماتی نظر آتی ہے۔ پھر بھی وہ اپنے گھر، اپنے شوہر اور رضا کارانہ خدمات پر زیادہ حریص ہے۔ یہ شرف اسی بیوی کو حاصل ہوا ہے کہ وہ موجودہ قوموں کی بیوی کے ساتھ اپنے شوہر کے برابر عہدہ کی مالک رہی۔ اس طرح کہ ڈاکٹر عذمان بے جب وزیر داخلہ تھے تو ان کی بیوی خالدہ ادیب خانم وزیر تعلیمات تھیں۔ پھر بھی اس کی عام زندگی افلاس کے ہاتھوں نہایت افسردہ زندگی ہے اور یورپ میں رہنے اور یورپ کی فارغ البال اور دولت مند قوموں سے میل جول کے باعث اب وہ بھی ان چیزوں کی طالب بن رہی ہے جو یورپ کی عورتوں کو حاصل ہو چکی ہیں اس لیے اندیشہ ہے کہ وہ چند سال کے بعد کہیں اپنے شوہر کے لیے ویسی ہی مصیبت نہ بن جائے جیسی کہ یہ اپنے مُلا رموزی صاحب کی بیوی صاحبہ۔

فی الجملہ وہ شوہر کی حد سے سوا اطاعت کرنے والی، منتظم، کفایت شعار، غیور، خوددار اور وفادار ہوتی ہے چاہے وہ گاؤں کی رہنے والی ہو یا شہر کی۔ قد و قامت نہایت درجہ لائق تعریف، بے حد حسین اور نفیس لباس کی شائق مگر زیور کم، جاہلانہ رسوم سے کافی حد تک دور اور مذہب کی لفظ

بہ لفظ تابع۔

جاپانی بیوی:

جاپانی قوم جزیروں میں آباد ہے جن کی عام آب و ہوا صحت کے لیے معتدل ہے۔ یورپ والوں سے زیادہ میل جول اور دریائی رشتہ کے باعث اس کے باشندوں کی عام حالت ایشیا کے تمام باشندوں سے بہتر اور نمبر اول ہے۔ خصوصاً ان کی تجارتی زندگی نہایت شاندار اور کامیاب ہے۔ اسی طرح صنعتی انقلاب نے جاپان کو ایشیا کے تمام ممالک سے آگے بڑھا دیا ہے۔

الغرض اس کی بیوی کے عام حالات یہ ہیں کہ یہاں کی عورتیں وہاں کے کھیتوں میں کام کرتی ہیں۔ لکڑیاں کاٹتی ہیں۔ اچھی خاصی بوجھل گاڑیاں کھینچ کر ایک سے دوسری جگہ لے جاتی ہیں اور اس کے علاوہ اکثر ایسے کام کرتی نظر آتی ہیں جنھیں سرانجام دینے کے لیے عموماً مردانہ عقل اور قوت کی ضرورت سمجھی جاتی ہے۔ انھوں نے مردوں کی طرح پاجامے پہن رکھے ہیں تاکہ کسی قسم کی رکاوٹ کے بغیر چستی اور پھرتی سے کام کرسکیں۔ یہ پاجامے اس قسم کے ہوتے ہیں کہ انگلستان کے کھیتوں میں کام کرنے والی لڑکیاں بھی انھیں بالکل نئے زمانہ کی اُپج خیال کرتیں۔ تجارتی کاروبار میں اکثر عورتیں کمیشن ایجنٹوں کے فرائض انجام دیتی ہیں۔ اگر کوئی کاروباری آدمی کسی جاپانی ہم پیشہ کے ہاں جا کر محاصل اور انکم ٹیکس وغیرہ کے متعلق سوال کرے تو اسے یہ جواب سن کر سخت حیرت ہوتی ہے کہ میں اپنی بیوی سے پوچھتا ہوں اسے ان معاملات کے متعلق مکمل واقفیت حاصل ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ شمالی جاپان میں مشہور و معروف لکھے پڑھے آدمی بھی اپنی عورتوں سے اس قدر مرعوب ہیں جس قدر آکسفورڈ کے بڑے بڑے پروفیسر یا امریکہ کے کروڑ پتی۔

خاوند کے اخراجات کی فہرست بھی گھر والی ہی تیار کرتی ہے۔ یہی شخص جب صبح کو گھر سے کام پر جانے لگتا ہے تو گھر والی اسے دروازہ تک پہنچانے جاتی ہے۔ اسے اوور کوٹ پہناتی ہے، سگریٹ، دیا سلائی لا کے دیتی ہے پھر بڑے ادب سے جھک کر گھٹنوں کے بل بیٹھ جاتی ہے اور جب تک شوہر دروازے سے باہر نہ نکل جائے یونہی بیٹھی رہتی ہے۔

جاپان میں اولیت کا حق خاوند کو حاصل ہے۔ کمرے میں داخل ہوتے یا وہاں سے نکلتے وقت آگے آگے خاوند ہوتا ہے۔ اسی طرح بازار میں چلتے وقت خاوند دو ایک قدم آگے رہتا ہے اور

بیوی چپ چاپ اور عموماً صبر وشکر سے پیچھے پیچھے چلتی ہے۔

اسی طرح چند اور باتوں سے بھی اس خیال کی تائید ہوتی ہے کہ جاپان میں میاں بیوی کی مساوات کا خیال ایک خاص مقام پر پہنچ کر رُک جاتا ہے۔ عام جاپانی گھرانوں میں مردوں کو کھانا کھلانے کی خدمت عورتیں ہی بجالاتی ہیں اور میاں کو کھانا پیش کرتے وقت گھر والی گھٹنوں کے بل بیٹھ جاتی ہے۔ مزید براں ان گھرانوں کے سوا جن میں موجودہ گھرانے کے اثرات نے پورا دخل حاصل کر لیا ہو مردوں اور عورتوں کے تفریحی اشغال بالکل الگ تھلگ ہوتے ہیں۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ تمام کنبے کے لیے تفریح وتفنن کا پروگرام گھر کا سردار مرد ہی تیار کرتا ہے۔ قانونی نقطۂ نظر سے بھی عورت کی حیثیت مرد سے کمتر ہے۔ اسی طرح شادی بھی عورت کی حیثیت میں اضافہ کا موجب نہیں ہوتی بلکہ اس کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ عورت اپنے خاوند کے کنبے میں نہ صرف خاوند بلکہ اس کے والدین کی اطاعت وفرمان برادری کے لیے شامل ہو رہی ہے۔ چند سال ادھر تک عورت کی تعلیم کا مقصد محض یہ ہوتا تھا کہ وہ فرماں بردار بیوی اور بہو بننے کے قابل ہو جائے۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود جاپان کی گھریلو زندگی کا مطالعہ اس خیال کو تقویت پہنچاتا ہے کہ جاپانی خواتین کا درجہ مغربی عورتوں سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ جاپانی عورتیں عموماً گھر کے تمام معاملات کا خود انصرام کرتی ہیں اور اکثر ایسی باتوں میں تمام ذمہ داری اپنے اوپر لینے کے لیے تیار رہتی ہیں جن میں مغربی عورتیں ننھے بچوں کی طرح مردوں کے پختہ تر عقل پر بھروسہ کرنے کے عادی ہیں۔ پھر یہی نہیں بلکہ ان کے دلکش اطوار اور خدمت گزاری کے لیے ہر وقت کمربستہ رہنے سے انھیں اپنے خاوند بچوں اور اجنبیوں کی نظر میں ایک ایسی اہمیت اور وقعت حاصل ہو جاتی ہے جو انھیں کا حصہ ہے۔

عورتوں کی عقل ناقص ہو یا کامل، لیکن اس امر سے انکار نہیں ہو سکتا کہ جاپان میں اس ''نسوانی فراست'' کے رسم ورواج کی زنجیروں میں جکڑے رہنے سے عورتوں کو نقصان کی بجائے فائدہ ہی پہنچا ہے اور نسوانی زندگی ان بندھنوں کے باعث ویسی ہی دلکش بن گئی ہے جس طرح نثر کے جملے اور الفاظ منظوم ہو کر بن جایا کرتے ہیں۔ تاہم مغربی خیالات اور خصوصاً ان خیالات کا جو اثر تعلیم پر ہوا ہے اس سے جاپانی عورتوں کی مجلسی حیثیت میں بہت کچھ تغیر وتبدل رونما ہو گیا ہے۔

اب جاپانی لڑکیاں اسکولوں میں جاتی ہیں۔ ان کا لباس اور نصابِ تعلیم قریباً ویسا ہی ہے جیسا مغربی طالبات کا۔ وہ علوم وفنون میں بھی مہارت حاصل کر رہی ہیں۔ مزید برآں اب جاپانی عورتیں گھر کی چار دیواری سے نکل کر مردوں کے دوش بدوش کام کرنے لگی ہیں۔

ایشیا میں روس، ترکی اور جاپان ہی ایسے ممالک ہیں جن کی نہ فقط تاریخی سربلندی مسلّم ہے بلکہ موجودہ زمانے میں بھی جن حالات واعمال وآثار واثرات کو ترقی کہا جاتا ہے ان کے لحاظ سے انھیں ممالک نے ایک حد تک یورپ کی ترقی کا مقابلہ کیا ہے اور اسی لیے ان ممالک کی عام عورتوں اور بیویوں کا تذکرہ کیا گیا۔

ان کے بعد چین، بخارا، افغانستان، ایران اور عرب کے متعلق جو کچھ نہیں لکھتے سو اس کا سبب یہ ہے کہ ان ممالک کی گو قدیم تاریخ اور ان کی عورتوں کی روایات نہایت درجہ تابناک ہیں مگر موجودہ زمانے کے لحاظ سے ان کے حالات کافی حد تک تاریکی میں ہیں اور اگرچہ موجودہ زمانے کی تمام تحریکات سے ان ممالک کی عورتیں متاثر ہو رہی ہیں مگر بہ لحاظ اختیار اور عمل یہاں بھی بہت پیچھے ہیں اور چونکہ ہم نے اس کتاب میں اسی ایک بات کا اہتمام کیا ہے کہ ہم 1914 کے پہلے کے حالات سے بحث نہیں کریں گے لہٰذا ان چند سالوں میں عرب کی بیوی، افغانستان کی بیوی، بخارا کی بیوی اور ایران کی بیوی نے جو ترقی کی ہے وہ بہ منزلہ صفر کے ہے اس لیے اس کی تفصیلات ضروری نہیں۔ پھر بھی اتنا بتاتے ہیں کہ ان میں عملی اور ذہنی اعتبار سے ''عرب کی بیوی'' آج بھی سب سے آگے ہے۔ اگرچہ اس کی تمام تر تربیت خالص اسلامی اصول اور روایات قدیمہ پر ہوئی ہے مگر موجودہ زمانے نے اسے بھی کام کے لیے تیار کر دیا ہے اور گو اس کے ملکی اور مذہبی حالات وآداب اسے شاید دیر تک یورپ کی بیوی کا نمونہ نہ بننے دیں پھر بھی اس نے جدید تعلیم وتربیت کی طرف قدم بڑھایا ہے اور بغداد میں ''تعلیم نسواں'' کے لیے خاص جوش پایا جاتا ہے۔

کچھ شک نہیں کہ عرب کی عورت نے مسلمانانِ ہند کی عورتوں کو ہمیشہ اپنی طرف متوجہ رکھا ہے لیکن عہدِ حاضر میں عربی عورتوں نے کوئی خاص کام نہیں کیا۔ الّا یہ کہ جو عربی خواتین موجودہ زمانے کی تحریکات سے فائدہ بھی اٹھانا چاہتی ہیں وہ اپنے شوہروں کے اعتقادی اثر

سے مجبور ہیں پھر بھی عرب کی بیوی شوہر کے حق میں اس لیے مفید ہے کہ اس کا آخری مرکز خیال و مرکز امید صرف شوہر ہوتا ہے اور اس کی تمام قربانیاں شوہر کے لیے وقف ہوتی ہیں، اسی لیے اکثر حالات میں اس نے میدانِ جنگ میں مردوں کے ساتھ بھی خوں ریز کاموں میں شرکت کی ہے۔ وہ نہایت بلند اور پاکیزہ خیالات کی بیوی ہوتی ہے۔ حد سے سوا خلیق، مہربان، حلیم، صابر و شاکر، جفاکش، اوالوالعزم اور وفادار مگر افلاس اور بے ہنری کے باعث پریشان رہنے والی ہوتی ہے۔ کم علم، کفایت شعار، محنتی اور اولاد سے حد سے سوا محبت کرنے والی کہیں کالی اور اکثر گوری، بے حد صاف ستھری اور پرہیزگار جاہلانہ رسوم سے کافی حد تک پاک اور مذہب کی حد سے سوا مطیع۔

افغان بیوی تقریباً تمام بیویوں سے بہ لحاظ ترقی پیچھے ہے مگر اس کا یہ جوہرا سے عزت کی بلند تر بام پر پہنچاتا ہے کہ وہ بے حد غیور، خوددار اور شوہر کی پرستش کرنے والی ہوتی ہے اور اس درجہ پرستار اور محبت کرنے والی کہ میدانِ جنگ میں وہ ہمیشہ شوہر کے دوش بدوش رہتی ہے۔ البتہ اس کی گھریلو زندگی نہایت تاریک اور قابلِ رحم ہے۔ اس پر ''مذہبی اشخاص'' کا خاصا دباؤ ہے اور مذہب کے مقابل دنیا میں کسی دوسری چیز کو طاقت ور اور قابلِ احترام نہیں سمجھتی۔ اس کے شوہر کی ذہنی اور فکری فضا حد سے سوا ست ہونے کے باعث وہ تمام ترقیوں سے محروم اور کوری ہوتی ہے پھر بھی اس کی اولوالعزمی اور جفا پیشگی ہندستان کی عورت ذاتوں کو کافی متاثر کرتی ہے۔

بادشاہ امان اللہ خاں نے 1924 میں چند لڑکیوں کو ڈاکٹری اور طبابت کی تعلیم کے لیے ترکی بھیج دیا تھا، جس پر افغانستان کے پرانے کارخانوں میں بنے ہوئے مولویوں نے شدید اعتراضات کیے تھے اور امان اللہ خاں کے اس کام کو دینی دیانت اور قومی وقار کے خلاف ٹھہرایا تھا۔

خاصی توانا تندرست، رنگ میں سرخ وسفید، بہادر، مجاہد اور صابر، سادے سے سادہ لباس کی عادی، شوہر کے حق میں وفا پیشہ اور اولاد کے لیے ''مادر مہربان'' معمولی سی غذا، معمولی سا مکان اور معمولی سے لباس میں خوش رہنے والی مولویانہ صوفیانہ اور جاہلانہ رسوم میں گرفتار مگر شوہر کے حق میں سراپا رحمت اسلامی اصول کی معتقد اور اسلامی تہذیب قدیم کا نمونہ۔

چینی بیوی کے حالات بہت زیادہ تاریک ہونے پر بھی موجودہ زمانے میں وہ نئی ترقی کی کوششوں میں خاصا حصہ لے رہی ہے۔ اب وہ بھی اسکول، کلب، تھیٹر اور میدانِ جنگ کے اندر جاتی ہوئی نظر آتی ہے۔ مگر حد سے سوا سست رفتار البتہ اس کی جن چیزوں نے ہندستانی عورتوں کو متاثر کیا ہے وہ اس کی حد سے سوا اولوالعزی اور بہادری ہے۔ وہ اس درجہ جفاکش ہوتی ہے کہ شوہر کو وطن میں چھوڑ کر ہندستان آجاتی ہے اور شوہر کے ہمراہ بھی۔ اس کی عام معاشرت، شادی بیاہ کے طریقے اور اخلاقی حالت خالص قدیم ہے اور اسی لیے وہ ہندستان میں آج بھی پچھلی اور تاریک رسوم واصول زندگی کے ساتھ نظر آتی ہے۔ وہ تجارتی ذوق کی بیوی ہوتی ہے اس لیے شوہر سے ہمیشہ مستغنی رہتی ہے یہ نہیں کہ بس ملا رموزی صاحب ہی کے بھروسہ پر بیٹھی ہوئی ہیں۔ بھلا یہ حوصلہ کیا کم ہے کہ تین تین انچ کے پاؤں سے وہ چین سے ہندستان اور دور دراز مقامات کا سفر کرتی ہے مگر گھبراتی نہیں۔ لباس اور عام معاشرت کے حساب سے وہ بڑی جفاکش اور دولت جمع کرنے والی ہوتی ہے۔ شوہر کی فرماں بردار مگر افیون کھا لینے کے بعد بیوی کا بھی خدا حافظ اور شوہر کی بھی پولیس محافظ۔

یہ ہندستان میں جب اپنے گھروں میں کاغذ کے کھلونے فروخت کرنے آتی ہے تو اس کے اندر ادنیٰ جھجک نہیں ہوتی مگر اپنے ننھے میاں کی والدائیں اس سے ڈرتی بھی ہیں اور اُسے غور سے دیکھ کر کبھی حیران رہ جاتی ہیں اور کبھی بیوی اور اس کے ''بیویانہ حالات'' کی تفصیلات سے پہلے دنیا کی تمام بیویوں کے موجودہ حالات کا ایک دھندلا سا خاکہ آپ کے سامنے آجائے تاکہ آپ سمجھ سکیں کہ دنیا کے تمام انسانوں کی بیویاں زیادہ تعداد میں کس حیثیت اور کن حالات کی بیویاں ہیں اور عورت کی حیثیت کے ساتھ ہی وہ بیوی کی حیثیت سے کیا کچھ کر رہی ہیں؟ اور یہ جو آج دنیا میں عورتوں کی ترقی، عورتوں کی اصلاح عورتوں کے حقوق اور عورتوں کی تعلیم وغیرہ کے متعلق تمام دنیا میں ہنگامے ہو رہے ہیں اس میں ان ممالک کی عورت نے بیوی کی حیثیت سے کون سے اور کتنے تیر مارے ہیں تاکہ اگر ان سب کے تیروں ہی کو انسانی خطرات کے دفع کرنے کا ضامن قرار دے دیا جائے تو پھر اس اپنے ہندستان کی بیوی کو بھی وہی تیر مارنا چاہیے۔ اور اسی سے یہ بھی معلوم ہوگا کہ اچھا اگر دنیا کی دوسری عورتیں بیوی کی حیثیت سے آئندہ زندگی اور ترقی کا یہی وطیرہ اختیار

کریں گی جو اوپر بیان ہوا تو پھر لائیے اور بتائیے کہ ہندستانی بیوی ان حالات کے لحاظ سے آج کل کن حالات میں مبتلا ہے اور کیا کر رہی ہے؟ تاکہ آسانی سے فیصلہ کیا جاسکے کہ اب ہمیں اپنی اپنی بیویوں کو طلاق دے دینا چاہیے، یا انھیں دنیا کی مذکورہ بالا قسم کی بیویاں بنانا چاہیے یا موجودہ حالت ہی میں چھوڑ دینا چاہیے یا خود اپنے ملک اور اپنے حالات کے موافق انھیں آگے بڑھانا چاہیے۔ پس ان تمام حالات کے سمجھنے کے لیے آپ کو ہندستان کی آنے والی بیویوں کے حالات کو ملاحظہ فرمانا ہوگا اس لیے معلوم کیجیے کہ ہندستان ایشیا کا وہ عظیم الشان حصۂ آبادی ہے جس کے اوپر یا جس کے اندر ایک نہ دو پورے 35 کروڑ انسان آباد ہیں اور مردم شماری کے فیض سے ہر دس سال کے بعد کچھ نہ کچھ بڑھتے ہی جاتے ہیں۔ اب یہ کل ہندستان یا یہ کل 35 کروڑ باشندے کوئی دوسو برس سے انگریز نام کی ایک قوم کے ماتحت ہیں جو یورپ کے ملک انگلستان میں آباد ہے۔ ہندستان کی سب سے زیادہ تعداد والی قوموں میں پہلے ہندو پھر مسلمان پھر سکھ اور ایرے غیرے نتھو خیرے مانے جاتے ہیں۔

ہندستان کا زیادہ حصہ گرم ہے اور آب و ہوا زیادہ مقدار میں غیر معتدل، اس لیے یا اور کسی سبب سے یہاں کے باشندوں میں افلاس، تنگدستی، بے ہنری، جہالت، طاعون، انفلوانزا، تپ دق، نمونیا، ہیضہ، کالی کھانسی، ملیریا، درد گردہ، درد قولنج، درد سر، درد ریح، پسلی کا درد، مالیخولیا، مراق، جنون، ہول، وحشت، قبض دائمی، کھٹی ڈکار آنا، سوء ہضمی، سینہ جلنا، طحال، اسہال، پیچش، بواسیر ریحی، بواسیر خونی، نفخ، گٹھیا، فساد خون، فالج، اختلاج قلب، ذیابطیس، سل، تپ کہنہ، جذام، غشی، مرگی، دمہ، استفراغ، پت، امتلا، سدّہ، پتھری، جلندھر، چیچک، ضیق النفس، خناق، خنازیر، ذات الجنب، رسولی، ذات الصدر، یرقان، سلسل بول، پھورا، دنبل، لقوہ، وجع مفاصل، نقرس، رعشہ، سکتہ، عرق النساء، استسقا، گنج، خارش، آشوب چشم، ضعف بصارت، جالا، غبار، سرخی، پانی بھنا، سرطان، نزول الماء اور خدا جانے کتنے امراض ہر وقت پائے جاتے ہیں، پھر ان پر کتے کا کاٹا ہوا، سانپ کا کاٹا ہوا، بچھو کا کاٹا ہوا، مسلمان کا کاٹا ہوا، ہندو کا کاٹا ہوا، افسر کا کاٹا ہوا، خفیہ پولیس کا کاٹا ہوا، تھانیدار کا کاٹا ہوا، حلقے کے داروغہ کا کاٹا ہوا، فرض اور برطرفی کا کاٹا ہوا اور جو یہ کچھ بھی نہیں تو بیوی بچوں کا کاٹا ہوا اور ان سب کے بعد افیون، گانجا، چرس، بھنگ، حقہ، بیڑی، سگریٹ، شراب

اور قمار بازی کا کاٹا ہوا، مریض بھی یہاں بکثرت موجود ہے۔ ورنہ صبح وشام اوکھانسی وزکام اور اگر بالکل ہی نہیں تو اعضا شکنی اور جمائیوں سے تو یہاں کے رئیس امیر اور عہدہ دار بھی محفوظ نہیں، غرض ہندستانی عورت اور مرد کے بھی وہ موانع اور محالات ہیں جن کے باعث وہ آج کل کی سی ترقی سے محروم ہے۔

البتہ اس کی بیداری اور غفلت سے چونکا دینے والی حرکت اصل میں انگریز قوم کا غلبہ ہے، جس کے باعث وہ ان کے تمدن، ان کی تہذیب، ان کی ایجادات، ان کی سیاست، ان کی تعلیم، اور ان کے عام طریقوں سے ایک عرصہ سے دوچار ہو رہی ہے، مگر ہندستانی مردوں کی حد سے گزری ہوئی جہالت، قناعت پسندی اور تاریک ترین اعتقادی ذہنیت نے کبھی اپنی عورتوں کو آگے بڑھانے پر آمادہ نہیں کیا اور اس کے قوی ترین اسباب میں سے ایک تو ان کا یہ عقیدہ ہے کہ عورت ''صرف مرد کی خدمت گزاری'' اور ''اطاعت'' کے لیے پیدا ہوئی ہے اور مذہباً وہ مرد سے کسی حیثیت سے بھی آگے نہیں بڑھ سکتی، دوسرے خود یہاں کے مردوں کی بے ہنر اور بے علم زندگی نے انھیں کبھی فراغت سے اتنا بھی دوچار نہیں ہونے دیا کہ وہ اپنی اولاد کی تعلیم وتربیت میں وقت اور دولت سے کام لیتے۔

ان معنی میں گزشتہ سلاطین ہند اور اس کے بعد سے اس وقت تک کے شعرا نے بھی ہندستانی عورت کو مرد سے پیچھے رکھنے میں خاصا کام کیا اور اپنی تمام شعری قوتیں اسی ایک خیال اور عقیدے کو طاقت بنانے پر صرف کرتے رہے کہ عورت صرف محبت کرنے اور گھر کی رونق کے لیے پیدا کی گئی ہے اور وہ ایک ایسی ہی نازک سی چیز ہے جو ادنیٰ سی محنت کرنے سے تھک کر بیکار ہو جائے گی۔ پس ان خیالات اور حالات کا نتیجہ یہی ہونا چاہیے تھا کہ ہندستانی عورت گھر کی چار دیواری کے اندر تباہ ہو جائے، مگر انگلستان سے آنے والے مردوں اور عورتوں نے کوشش کی کہ ہندستانی عورت بھی مرد کے برابر کام کرے اور مرد کی تمام ذمہ داریوں میں برابر کی شریک نظر آئے۔ یہ ایک ایسی کوشش تھی جس کی رفتار بہت کم اور سست تھی اور اسی لیے ہندستانی عورت کو مرد کے برابر کام کا بنانے کے لیے کافی عرصہ گزر گیا۔

لیکن پچھلی نصف صدی میں جب ہندستانی مرد انگریزوں کی زندگی سے تعلیم کے باعث

ایک حد تک واقف ہوئے تو ان کے سامنے انگریز عورتوں کی زندگی آئی اور وہ نہایت دھیمی رفتار سے اپنی عورتوں کی اصلاح کی طرف بڑھے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اب یہ مسئلہ دماغ اور خیال سے بڑھ کر عمل میں نظر آنے لگا اور ہندستانیوں کی یہ ''گھریلو زینت'' اب اسکول میں نظر آنے لگی، مگر عجیب و غریب مشکلات کے ساتھ مثلاً پہلی مرتبہ جب یہ بغرض تعلیم اسکول میں آئی ہے تو مذہبی معتقدات نے اسے سختی سے روکا اور جگہ جگہ سے اس کے خلاف مذہبی آوازیں پیدا ہونے لگیں، اس کے بعد اس کی مالی مشکلات نے اسے روکا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ اسکول پہنچ کر بھی ناکام واپس لوٹنے پر مجبور ہوگئی۔

مسلمان عورت کے بڑھنے میں اگر مذہبی رنگ کی قیود سخت تھیں تو ہندو عورت کے لیے ہندستان کا یہ خیال زبردست مانع تھا کہ عورت مذہباً اس قدر مقدس چیز ہے کہ بس اسے گھر میں بٹھا کر پوجا جائے۔

غرض دونوں قوموں کے خیالات یہی رہے کہ عورت ہر حال میں نازک، نفیس، پاکیزہ تر اور کچھ بڑی ہی لوچ دار چیز ہے جو تعلیم و تمدن اور ترقی میں مردوں کی طرح محنت برداشت نہیں کر سکتی بلکہ بے عمل اور سست فطرت شعرا کے لیے ایک طرح کا مصرع طرح ہے جس پر بس خیالی اور طرحی طبع آزمائی تو کی جا سکتی ہے مگر اس کو کام پر مجبور نہیں کیا جا سکتا، لیکن طبعی ارتقا کے قدرتی اثر نے اور انگلستان کی عورتوں کو بھی کام کے لیے پر جوش بنایا پھر بھی کافی سست رفتاری کے ساتھ مگر 1914 کی جنگ یورپ نے جب ہندستان کے سترہ لاکھ مردوں کو میدان قتل و قتال میں کھینچ لیا اور زندگی کی ہر چیز میں حرکت اور تبدیلی پیدا ہوگئی تو ہندستانی عورت کی آنکھیں کھل گئیں۔ اس جنگ کے بعد جنگ روس یا انقلابِ روس اور جنگ ترکی و یونان بابت 1917 و 1921 میں جب روسی اور ترکی عورتوں نے میدانِ جنگ میں مردوں کے برابر خدمات انجام دیں، اِدھر اطلاعات اور اخبارات کے ذرائع عام ہوگئے تو ہندستانی عورت یکا یک گھر سے باہر نکل آئی اور اس قدر جوش کے ساتھ بڑھی کہ اب اس کا پیچھے دھکیل دینا کسی کے بس کی بات نہ رہی اور اب وہ بازار، اسکول، شفاخانے، وکالت، ہائی کورٹ، اخبار نویسی، لیڈری، تجارت اور تھیٹر اور سینما تک میں نظر آنے لگی۔ جب یہ ہوا تو پھر کیا تھا مردوں نے بھی سوچا کہ عورت ذات کو اپنا احسان جتانے کا بھی موقع

ہےاس لیے انھوں نے بھی عورت کوترقی دینے کا وعظ شروع کردیا۔

اب ایک نازک سوال یہ ہے کہ آیا ہندستانی عورت کی ''موجودہ کارگزاری'' یورپ کی اقوام سے متعلق ہونے کا نتیجہ ہے یا اس کا طبعی انقلاب ہے؟ پھر یہ کہ اب وہ جس رنگ میں آگے بڑھی ہے وہ اس کا قدرتی رنگ ہے یا غیروں کا؟ پہلے دونوں سوالوں کا جواب اثبات میں ہے یعنی ہندستانی عورت واقعی سب سے پہلے انگریزی عورت سے متاثر ہوئی ہے پھر اس کے ذہنی قویٰ عرصہ کے جمود کے بعد اب قدرتاً بیدار ہوئے ہیں اور اس میں ترقی اور تبدیلی کا احساس اس کے طبعی ارتقا کا اثر ہے جو درختوں میں بھی ہوتا ہے اور ہر نشو ونما پانے والی چیزیں البتہ آخر کا مسئلہ مشکوک ہے مثلاً یہ کہ ہندستانی عورت کے لیے موجودہ رنگ کی ترقی اس کی اصلی وطبعی ترقی وتبدیلی ہے یا نقلی؟ سو اکثر حالات کے لحاظ سے اس کی موجودہ تبدیلی نقلی ہے اور بعض حالات میں طبعی اور ذاتی جس کے زیادہ صاف معنی یہ ہیں کہ ہندستانی عورت کے لیے انگریزی عورتوں کی نقل نہ مفید ہے نہ پائیدار۔ اسی طرح اس کی ملکی اور طبعی تبدیلی دنیا کی عام زندگی کے مقابل کبھی مفید اور سودمند نہیں ہوسکتی۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ ایک صدی کے اندر ہندستانی عورت یورپی اور ہندستانی اثرات سے مل جل کر ایک بالکل ہی ''جدید زندگی کی مالک ہوجائے گی'' اور کچھ شک نہیں کہ اب ہندستانی عورت اپنے پچھلے حالات کی طرح کبھی واپس نہ جائے گی۔ پس جب یہ خیال نہایت صحیح ہے کہ اب ہندستانی عورت آگے بڑھے گی اور بڑھ کر رہے گی اور بڑھتی ہی چلی جائے گی اور بڑھتی ہی رہے گی اور جب بڑھی تو پھر بڑھی ہی بڑھی تو پھر ضرورت ہے کہ ہم بھی یہ کہہ کر کھڑے ہوجائیں اور اس کی مدد کریں کہ آ بھئی بڑھ کر اگر تو بڑھتی ہے تو ہم بھی تیری امداد کو موجود ہیں۔ لہٰذا جب ہم یہ کہنے کے لیے مجبور ہیں تو پھر اصولاً ہمیں سب سے پہلے یہ دیکھنا ہوگا کہ وہ آج کل کن حالات واثرات میں ہے۔ خصوصاً اس حیثیت سے کہ وہ بیوی ہوکر اپنے مردوں کے لیے آج کل کیا کررہی ہے اس لیے ذیل کی بیویاں ملاحظہ ہوں تا کہ آئندہ انھیں آگے بڑھاتے اور اپنے حق میں مفید بنانے اور خود ان کے لیے مفید بننے میں آسانی ہو۔

واضح ہو کہ آئندہ آنے والی بیویوں میں اس بات کا خاص طور پر لحاظ رکھا گیا ہے کہ ہندستان کے ایسے فرقوں اور طبقوں کی بیویاں لی جائیں جو مل جل کر ہندستانیوں کی اجتماعی اور قومی زندگی کی سب سے زیادہ ذمہ دار بھی ہیں، مگر سب سے زیادہ پست، پستی کے یہ معنی نہیں کہ

ذات پات کے لحاظ سے پست بلکہ پستی کے معنی یہاں ان کی اور ان کے مردوں کی یکسر جہالت ہے۔ چنانچہ آنے والا باب صرف ایسی ہی بیویوں سے متعلق ہے جن کے تقریباً پورے خاندان کو بھی علم چھو کر نہیں گزرا ہے درآنحال یہ کہ یہی تمام جاہل مرد اور عورتیں مل کر ہندستانی آبادی کا غالب ترین حصہ ہیں۔ کیونکہ صرف ملّا رموزی صاحب اور ان کی مبلغ ایک بیوی تو ہندستان کی کل آبادی نہیں ہوسکتی ہیں اس لیے ملاحظہ فرمائیے کہ ہندستان کی غالب آبادی کس حال میں ہے؟۔

◆◆◆

بیوہ بیوی

بیوہ اس عورت کو کہتے ہیں جس کا شوہر مر جائے یا قتل کر دیا جائے۔ اس قسم کی عورت ہندستان میں بکثرت ملتی ہے۔ ہندوؤں میں ایسی عورتوں کی تعداد کا صحیح اندازہ بہت مشکل ہے کیونکہ ان کے ہاں ایک گروہ کے خیال میں بیوہ عورت کو دوسرا نکاح کرنا مذہبی لحاظ سے مناسب نہیں، مگر اب علم و تعلیم کی ترقی کے باعث ایسے ہندو پیدا ہو گئے ہیں جو بیوہ عورت کے لیے دوسرا نکاح جائز قرار دینے کے لیے زبردست کوشش کر رہے ہیں۔ مسلمانوں کے تاریک خیال گھرانوں اور جاہل مزاج خاندانوں میں بھی بیوہ عورت کے لیے دوسرا نکاح حرام سمجھا جاتا ہے۔ بعض بیوہ عورتیں مزاج کی جہالت اور حماقت کے باعث خود بھی دوسرے نکاح کو حرام سمجھتی ہیں اور اسے مردہ شوہر کی توہین قرار دیتی ہیں۔ بعض بیوہ عورتیں اس خوف سے دوسری شادی نہیں کرتیں کہ مرے ہوئے شوہر کی طرح نیا شوہر آرام نہ پہنچائے گا۔ بہر حال سبب کچھ بھی ہو مگر اس میں شک نہیں کہ ہندستانیوں کی آدھی زندگی بیوہ عورتوں کی دوسری شادی نہ کرنے سے برباد ہو رہی ہے۔

چونکہ ہندستان میں صرف شوہر کماتا ہے اور بیوی بے ہنر ہوتی ہے اور گھر میں بیٹھے بیٹھے شوہر کی کمائی کھاتی ہے، اس لیے شوہر کے مر جانے کے بعد اس کی زندگی حد سے زیادہ تکلیف دہ

اور نا قابلِ دید اور نا قابلِ سماعت ہوتی ہے اور جب ایک نوجوان عورت شروع زندگی میں شوہر اور دولت سے محروم ہو جائے تو اس کی تکالیف اور مصیبتوں میں کیا شک ہو سکتا ہے۔ اکثر بیوہ عورتیں ایسی بھی ہوتی ہیں جن کے ساتھ ایک سے لے کر دس بارہ بچے بھی شوہر چھوڑ مرتا ہے اور ایسے ہی بچوں والی بیوہ سب سے زیادہ مظلوم، بے کس، پریشان اور قابلِ ہمدردی ہوتی ہے۔ بدنصیبی سے ایسی کثیرالاولاد بیوہ عورتیں بھی ہندستان میں بکثرت موجود ہیں۔

اب علم و تعلیم اور دماغی ترقی کا اثر تو یہ ہونا چاہیے تھا کہ ذمہ دار لوگ ایسی عورتوں کو فوراً دوسرے نکاح کے لیے طرح طرح سے آمادہ کرتے، انھیں بیوہ رہنے کے خراب اثرات سے واقف کرتے، انھیں سمجھاتے کہ بیوہ رہنے سے طبّی قاعدہ سے عورت بیماریوں کا یونانی اسپتال بن جاتی ہے۔ جس خاندان میں بیوہ عورت ہوتی ہے اس خاندان میں کبھی خوشی و مسرت اور برکت داخل نہیں ہوتی اور اسی لیے مذہب اسلام نے بیوہ عورت کے لیے دوسری شادی کو نہایت مفید اور ضروری قرار دیا ہے، مگر غلام ملک ہونے کے باعث یہاں کا ہر کام اوندھا اور اُلٹا ہوا کرتا ہے۔ چنانچہ یہاں کے شعرا، صاحبانِ تصنیف، ایڈیٹروں اور لیڈروں نے بیوہ عورت سے ہمدردی کے لیے جتنا زور صرف کیا ہے اتنا دوسرے نکاح کے لیے نہ کیا اور بیوہ عورت کو ہمیشہ انتہا سے زیادہ مظلوم ثابت کرنے کے لیے پوری قوت صرف فرمائی ہے اور بیوہ عورت کے نہایت درجہ غم افزا حالات کو ہزاروں رنگ دے کر پیش کیا ہے جس سے خیالات میں عام افسردگی اور سردہ دلی پیدا ہوتی ہے اور حیرت ہے کہ بیوہ عورت سے اس قسم کی ہمدردی بڑھانے میں ہندستان کے بعض ذی علم اور نکتہ رس حضرات بھی شریک ہیں۔ چنانچہ شاعرانہ عظمت و سربلندی کے ایک بہت بڑے مدعی اور صوبہ جات متحدہ دارالحکومت اکبرآباد کے ایک لمبے چوڑے شاعر جناب سیماب کی ایک نظم ملاحظہ ہو جس کی سطر سطر اور لفظ لفظ میں موت کو یاد دلانے والی افسردگی اور بے کسی بھری ہوئی ہے۔ نظم یہ ہے جو رسالہ ''صوفی'' گجرات کے مارچ 1930 نمبر میں شائع ہوئی تھی:

(1)

ابھی تھا عنوفانِ ہستی، ابھی تو تمہید زندگی تھی
ابھی بہ عنوانِ شادمانی، مجھے نئی زندگی ملی تھی

ابھی تو میرے دراز بالوں میں، سنبلِ خلد کی تھی خوشبو
ابھی تو میرے جواں خیالوں میں صبح سدرہ کی تازگی تھی
شباب کی تھی کہاں میسّر ابھی مری عمر کو متانت
ابھی تو میں کمسنی کی معصومیت سے ہنس بول رہی تھی
ابھی تو دیکھی تھی صرف باغِ حیات کی سترہ بہاریں
ابھی جوانی کے گلستاں کی میں تو شگفتہ سی اک کلی تھی
ابھی شبِ ماہ ولطفِ ساحل سے میری نظریں کہاں تھیں واقف
ابھی تو خلوت کدہ میں میرے محیط میری ہی چاندنی تھی
ابھی تو میرے لباس سے جلوہ گر تھے آثارِ نوعروسی
ابھی تو میرے بدن میں عطرِ سہاگ کی بو بسی ہوئی تھی
ابھی تبسم دوشیزگی کے کنارِ رعنا میں کھیلتا تھا
ابھی تھی معصوم میری چتون، میری نگاہوں میں سادگی تھی
ابھی سے کیوں کردیا فلک؟ تیرے دور نے سوگوار مجھ کو
بنا دیا کیوں ابھی سے تقدیر نے مری بےقرار مجھ کو

(2)

کہاں گیا وہ رفیق میرا، جو ضامنِ لطفِ زندگی تھا
کہاں گیا وہ شفیق میرا، جو میری خلوت کی روشنی تھا
کیا تھا مجھ سے کسی نے وعدہ کہ عمر بھر میں نباہ دوں گا
یہ کیا خبر تھی کہ ''عمر بھر'' ایک مختصر لحۂ خوشی تھا
وہ حسرتیں کیا ہوئیں جو میرے وفا بھرے دل میں پل رہی تھیں
وہ آرزوئیں کہاں گئیں جن سے مجھ کو ارمانِ سرخوشی تھا
وہ میرے عشرت کدے کی شمعوں کا نور کیا ہوگیا الٰہی
جو میرے عشرت کدے کے دیوار و در سے بیدار ہر گھڑی تھا

نہ وہ اُمنگیں ، نہ وہ ترنگیں، نہ وہ تبسّم ، نہ وہ ترنّم
تو کیا فریبِ نشاط میرے لیے زمانہ میں عارضی تھا؟
وہ ہی ہوں میں اور وہ وہی ہے گھر بھی، مگر وہ آسودگی نہیں ہے
ہوا وہ دل کا سکون رخصت جو باعثِ عیش دائمی تھا
یہ میری تنہائیاں الٰہی، کہ بیکسی میں تڑپ رہی ہوں
فقط ہے اب اک خیال باقی، کوئی مرا دلنواز بھی تھا
جہانِ فانی کی وسعتوں میں نہیں کوئی غم گسار میرا
تباہیاں میری زندگی کی بنی ہوئی ہیں مزار میرا

(3)

میں درد اپنا کسے سناؤں، وہ میرا درد آشنا نہیں ہے
نصیب نے درد وہ دیا ہے کہ جس کی کوئی دوا نہیں ہے
مجھے تباہی میں چھوڑ کر تم، اکیلے دنیا سے کیوں سدھارے
نہیں ہے یہ اقتضائے الفت، یہ شرطِ مہر و وفا نہیں ہے
میں کس کی ہو کر رہوں جہاں میں بتا خفا ہو کے جانے والے
یہ اور کیا ہے جو میرے دل پر ستم نہیں ہے وفا نہیں ہے
کہاں گئیں وہ لطیف راتیں جو میرا سامانِ زندگی تھیں
جو خوابِ عشرت میں دیکھتی تھی اب اس کا کوسوں پتہ نہیں ہے
جہاں میں ہونے کو یوں تو سب کچھ ہے، مجھ کو ان سب سے واسطہ کیا
کہ جس سے تھی زندگی عبارت، وہ زیست کا آسرا نہیں ہے
زمانہ کہتا تھا مجھ کو دُلہن ، اور اب ہوں میں بدنصیب بیوہ
یہ انقلاب اور تغیر، ٹھکانہ اس ظلم کا نہیں ہے
جہاں ہو مجھ کو وہیں بلالو، تم اپنی ہی قبر میں سلالو
کشاکشِ ہجر سے نکالو، کہ زندگی میں مزا نہیں ہے

مرے ہی سر پر بصورتِ قہر آج ٹوٹا سہاگ میرا
تمھارا داغِ جدائی دے کر اجل نے لوٹا سہاگ میرا

(4)

میں سن رہی ہوں کہ بزمِ عالم میں عشرتِ عید آ رہی ہے
خدائی میں عید کی مسرت، خوشی کا پیغام لا رہی ہے
مگر مجھے کیا میں تو اپنے الم کدے میں تڑپ رہی ہوں
تمھاری رحلت کی سوگواری شریکِ ماتم بنا رہی ہے
تصورِ دوش سے ہوں محزوں، کہ دل کو تم یاد آ رہے ہو
وہ عید کی عشرتِ گزشتہ مجھے بہت اب ستا رہی ہے
نظر میں قوت کہاں جو دیکھوں میں عید کی دلفریبیوں کو
کہ عیشِ رفتہ کی ایک مستی سی اب تک آنکھوں میں چھا رہی ہے
یہ عید جو کل ہے آنے والی مرے لیے ہے مہِ محرم
پیامِ ماتم کا دے رہی ہے، اجل کا نوحہ سنا رہی ہے
خوشی تمھارے ہی دم سے تھی، اب خوشی کہاں ہے خوشی کا ماتم
نہ پھول میں وہ مہک ہے باقی، نہ شمع میں وہ ضیا رہی ہے
تھی عید جن کی تجلیوں سے وہ آج قبروں میں سو رہی ہے
فریبِ عشرت میں ہے یہ دنیا کہ عید اب بھی منا رہی ہے
نہ ہو رفیقِ حیات باقی کوئی تو پھر داد و دید کیسی؟
کہ دل ہی جب خوش نہ ہو کسی کا تو پھر خوشی کیا اور عید کیسی

(5)

ہمارا دُکھ کون پوچھتا ہے پڑی ہے اپنی ہی ہر کسی کو
سب اپنے اپنے خیال میں ہیں، نہیں ہماری خبر کسی کو
ہمارے غم پر جو رحم کھائیں، تو کچھ نئی ہمتیں دکھائیں
اٹھا کے تربت سے کیوں نہ لے آئیں پھر یہاں چارہ گر کسی کو

یہ سوگ اور مہیب باتیں، یہ ہم نفس کی فضول باتیں
جو خواب ہم آج دیکھتے ہیں وہ آئے گا کیوں نظر کسی کو
سکونِ دل میں کہاں رہا ہے، الم ہے اور جان مبتلا ہے
ہمیں یہ معلوم ہو چکا ہے کہ روئیں گے عمر بھر کسی کو
اگر سمجھتی کہ وہ خفا ہیں تو منتیں کرکے روک لیتی
نہ جانے دیتی میں اپنے پہلو سے اس طرح روٹھ کر کسی کو
مکان کی تیرہ خلوتوں میں، خیال کی تنگ وسعتوں میں
نگاہ میری تلاش کرتی ہے شام سے تا سحر کسی کو
بلا سے بچپن میں موت دینا، بلا سے ہر عیش چھین لینا
بھری جوانی میں یا الٰہی نہ کرنا بیوہ مگر کسی کو
یہ ہجر مرحوم سوگوارم، امید صبر و قرار تا کے
بیا بیا اے اجل کہ ہستی ہلاکِ صد انتظار تا کے

اب اس نظم کو دیکھنے کے بعد بتایئے کہ جس قوم کے شعرا اپنی شعری قوتوں سے بیوہ عورتوں کے ایسے افسردہ اور مایوس کن نمونے پیش کریں گے اس قوم کی اجتماعی زندگی برباد نہ ہوگی تو کیا انگریزوں کی زندگی برباد ہوگی۔ اس شاعر کے بعد ایک دوسرے شاعر جناب افسر میرٹھی نے بیوہ عورت کی عید کا جو نمونہ پیش کیا ہے وہ بھی ملاحظہ ہو جو رسالہ ''سہیلی'' لاہور بابت عید نمبر 1929 کے صفحہ 38 سے لی جاتی ہے۔ نظم یہ ہے:

عید کے دن سب تو ہنستے ہیں مجھے اندوہ ہے
میرے دل پر کاہشوں کا آج ایک انبوہ ہے
غم کی ماری ہوں پڑی ہے آفتوں میں میری جاں
دل کی جو حالت ہے مجھ سے ہو نہیں سکتی بیاں
ناک میں دم آ گیا غم کھاتے کھاتے اے خدا
مر گئی جانے کہاں، موت آتے آتے اے خدا
عید سب کو عید ہے لیکن محرم ہے مجھے

6

کیا کہوں کیسی جوانی میں لُٹا میرا سہاگ
ہائے عشرت کے زمانے میں ہی پھوٹے میرے بھاگ
جب نہیں "وہ" دیکھنے والا تو بن کر کیا کروں
ہوں اگر کپڑے تو میں ان کو پہن کر کیا کروں
پان بھی چھوٹا، مسّی کا منہ بھی کالا ہو چکا
اب کہاں "سورج" میرے گھر میں اُجالا ہو چکا
عید ہے لیکن خوشی کا آج ماتم ہے مجھے
یاد بھی مجھ کو نہیں ہوتا ہے کیسا عیش اب
نام عشرت کا مجھے آتا ہے سن کر طیش اب
جب کوئی آتا ہے موقع شاد ہوں جس میں سبھی
عام جب کوئی خوشی دنیا میں ہوتی ہے کبھی
تازہ ہوجاتے ہیں غم "وہ" یاد آجاتے ہیں پھر
سین وحشت کے اِن آنکھوں میں سماجاتے ہیں پھر
عید کے دن کی خوشی سب کو فقط غم ہے مجھے
ہائے میرے بھولے بچّے تکتے ہیں منہ غیر کا
سیر کون ان کو کرائے آج ہے دن سیر کا
"وہ" نہیں تو عیدگاہ اب کون لے جائے انھیں
کون لے جاکر کھلونے آج دلوائے انھیں
اپنے پہلو میں بٹھائے کون ان کو پیار سے
بیکسی ہَے ہَے! ٹپکتی ہے در و دیوار سے
عید اور میں جل رہی ہوں گھر جہنم ہے مجھے
ہائے سنتا ہی نہیں کوئی میری فریاد کو
موت بھی آئی نہیں افسوس مجھ ناشاد کو
درد سے بیتاب ہے دل چوٹ سے زخمی جگر

بیکسوں کی کون بگڑے وقت لیتا ہے خبر
کیا دکھاؤں تم کو "افسر" دل میں جو ناسور ہے
غم میری قسمت میں ہے اور عیش مجھ سے دور ہے
عید کی کیسی سوئیاں ہر غدا سم ہے مجھے

کاش ان نظموں کے عوض ایسی نظمیں کہی جاتیں جن کے اندر بیوہ عورت کو عقدِ ثانی کے بغیر زندہ رہنے پر شرم دلائی جاتی۔ اس کی عملی قوتوں کو بیدار کرنے والے خیالات اور جذباتِ ہمت میں جوشِ عمل پیدا کرنے والے اثرات کو پیش کیا جاتا تو مسلمانوں سے بیوہ عورتوں کی سرپرستی کی لعنت کم ہوتی۔ برخلاف اس کے اس قسم کے خیالات سے نہ فقط بیوہ عورت ہی کا دل سرد ہو جاتا ہے بلکہ دوسری عورتیں بھی ان خیالات سے متاثر ہو کر بے عمل ہو جاتی ہیں۔ ایک عورت کو بیوہ رکھ کر اس کی اعانت کرنا اس حد تک تو نہایت درجہ مفید و ضروری ہے جب تک کہ اس کے دوسرے نکاح کا بندوبست نہ ہو جائے، لیکن اس خیال سے کسی بیوہ عورت کی دائمی سرپرستی اور مدد کرنا جماعت میں بداخلاقی، بے عملی اور اقتصادی بیماری اور تباہی پھیلانے کا باعث ہے۔ کیا یہ صحیح نہیں ہے کہ جب ایک بیوہ عورت اپنے ساتھ دو چار یتیم بچوں کو لے کر اپنے ماں باپ کے گھر واپس آتی ہے تو اس سے ماں باپ کی مالی زندگی متاثر ہوتی ہے۔ بعض اوقات یہی مالی تنگدستی گداگری اور دوسرے اقسام کے بربادکن حالات پر ختم ہوتی ہے۔ مسلمانانِ ہند کی عورتیں عموماً پردہ میں رہتی ہیں اور کثرت سے بے ہنر ہیں۔ اِدھر مسلمانانِ ہند اپنے ساتھ کی دوسری قوموں سے یقیناً مفلس واقع ہوئے ہیں۔ پس اس لحاظ سے ایسی تمام مسلمان بیوہ عورتوں اور ان کے یتیم بچوں کو اگر جمع کیا جائے تو اسلامی جماعت کی مزید تنگدستی اور افلاس کے اعداد میں کافی اضافہ نظر آئے گا، مگر ہندستان میں مسلمان بیوہ عورت سے شادی کرنے یا اس کی دوسری شادی میں رکاوٹ ڈالنے والے اسباب میں سے بعض یہ ہیں:

1۔ بیوہ عورت کے خاندان کی اس کے ساتھ اندھی محبت اور ہمدردی جب کہ اس کے دوسرے رشتہ دار محض اس خیال سے اس کی دوسری شادی نہیں کرتے کہ کہیں بیوہ عورت یہ خیال نہ کرے کہ میرے شوہر کے مر جانے سے میرے عزیزوں پر میرا گزارہ اور صرفہ بھاری ہو گیا اور کچھ شک نہیں کہ محض اس خیال سے متعدد خاندان بیوہ عورتوں کی پرورش کا بوجھ اپنے سر

لیے بیٹھے ہیں۔

2۔ بیوہ عورت کے خیال میں دوسری شادی کرنا مرحوم شوہر کے حق میں بیوفائی کرنا ہوگا۔

3۔ یہ اندیشہ کرنا کہ اب پہلا ایسا شوہر نہ ملے گا اور ممکن ہے کہ دوسرے شوہر سے تکلیفیں پہنچیں۔

4۔ یہ خوف کہ دوسرے شوہر سے سابقہ شوہر کی اولاد کو نقصان پہنچے گا اور جہالت کے عام ہونے کے باعث بیوہ عورت کا یہ خوف ایک حد تک صحیح بھی ہے جب کہ حالات نے ثابت کر دیا ہے کہ دوسرے شوہر کو بیوہ عورت کی پہلی اولاد سے یا تو یکسر نفرت ہوتی ہے یا پھر وہ صحیح معنی کی محبت نہیں کرتا اور یہ بات قرینِ عقل و فطرت بھی ہے۔

ان حالات کے بعد بھی مسلمانوں میں بیوہ عورت سے شادی کی جاتی ہے لیکن عموماً وہی لوگ بیوہ بیوی اختیار کرتے ہیں جن کی داڑھی اور سر کے بال خضاب لا جواب لگانے کے قابل ہو جاتے ہیں، جن کی کمر کو اگر سپاہی میاں کی پیٹی سے نہ باندھا جائے تو وہ حرکت کے قابل بھی نہیں ہوتے، جو ملازمت اور کمانے کی عمر سے نکل کر پنشن اور شفاخانے میں پڑے رہنے والی عمر میں داخل ہو جاتے ہیں، جنھیں اپنی مرحوم بیوی کی اولاد کی پرورش کے لیے ایک عورت کی ضرورت ہوتی ہے، جنھیں عورت کے نہ ہونے سے اپنے گھر کے انتظام اور امور خانہ داری میں ایک سلیقہ مند عورت کی ضرورت ہوتی ہے۔

اب چونکہ بیوہ عورت سے دوسری شادی انہی وجوہ کی بنا پر کی جاتی ہے اس لیے مرد کو ایسی بیوہ بیوی سے طبعی اور غیر معمولی محبت نہیں ہوتی۔ اس کے بعد بیوہ عورت جن وجوہ کے باعث دوسری شادی کرتی ہے ان میں سے بعض یہ ہیں:

1۔ یا وہ بالکل جوان ہوتی ہے اور بے شوہر کے وہ پوری عمر رہنا گوارا نہیں کر سکتی۔

2۔ یا اُس کی سرپرستی اور گزارہ کے لیے اس کا کوئی عزیز نہیں ہوتا۔

3۔ یا اُسے اولاد کی آرزو ہوتی ہے۔

4۔ یا وہ غیرت مند ہوتی ہے اس لیے اپنی بیوگی کا بوجھ وہ اپنے خاندان پر ڈالنا نہیں چاہتی۔

5۔ یا اسے اپنے بے ذریعہ بچوں کی پرورش مقصود ہوتی ہے۔

ان وجوہ کے ساتھ چونکہ بیوہ عورت دوسری شادی منظور کرتی ہے اس لیے اسے بھی دوسرے شوہر سے طبعی محبت نہیں ہوتی۔

بیوہ بیوی عام طور پر اپنے پہلے شوہر کے زمانہ کو نہیں بھولتی اور نئے شوہر کے حالات کو پہلے شوہر کے حالات سے مقابلہ کرتی رہتی ہے اس لیے اس کا دھیان نئے شوہر کے حق میں زیادہ مفید ثابت نہیں ہوتا۔ اس کا اثر نئے شوہر کے خانگی امور پر پڑتا ہے۔ البتہ بیوہ بیوی اخلاقی حیثیت سے بہت قیمتی بیوی ہوتی ہے اس طرح کہ اب اس کے مزاج اور اخلاق میں کافی پختگی، سنجیدگی، سلیقہ مندی اور ضبط مصائب وحالات کا وزن پیدا ہو جاتا ہے جو ہر آئینِ ازدواجی زندگی کے لیے بیش قیمت دولت ہے۔ نئے شوہر کے حق میں بیوہ بیوی ہر طرح مفید ہے۔ مثلاً بیوہ بیوی کے اندر نہ تو تھیٹر اور سنیما جانے کا شوق باقی رہتا ہے نہ کلب اور ٹھنڈی سڑک کی تفریح پر وہ مجبور کرتی۔ ایسی بیوی کے اخلاق کا ایک اثر نئے شوہر پر بھی پڑتا ہے۔ مثلاً اب وہ بھی پہلے کی طرح فضول خرچ نہیں رہ سکتا کہ بیوہ بیوی اس قسم کے معاملات میں سختی سے احتساب کرتی ہے۔ اس میں عباداتی اعمال کا اضافہ ہوتا ہے اور ان سے شوہر صاحب ''بے نمازی سے'' نمازی بن جاتے ہیں۔ اس قسم کی بیوی بہت ارزاں اور کم داموں میں ملتی ہے مثلاً اس سے شادی کرتے وقت جانکی بائی الہٰ آباد والی کے ناچ کا انتظام نہیں کرنا پڑتا، نہ حیدر آباد اور خواجہ حسن نظامی صاحب دہلوی کے ہاں سے قوال بلائے جاتے، نہ اذن کے فیشن ایبل کارڈ اور لفافے تقسیم کرنا پڑتا، نہ ولیمہ میں ہاتھی اور اونٹ کا پلاؤ پکانا پڑتا نہ بارات میں پھلجھڑیاں چھوڑنا پڑتا، بس چند کھانسی میں مبتلا بوڑھے جمع ہو جاتے ہیں اور بغیر باجے اور رنڈی کے بیوہ بیوی گھر آجاتی ہے۔ اسی طرح بیوہ عورت کے عزیزوں کو اب اس کے جہیز میں نہ سات ولایتوں کے بنے ہوئے برتن دینا ہوتا نہ مہر کی ایک لاکھ تعداد پر جھگڑا کرنا پڑتا، نہ باراتیوں کے لیے قنوج اور احمد حسین دلدار حسین لکھنوی کے ہاں کا عطر درکار نہ سنہری ورق کے پان، بس ایک جوڑا بڈھے میاں کو اور ایک بیوہ عورت کو۔ اس قسم کی بیوی بے حد صلح پسند، نرم مزاج اور خدمت گزار ہوتی ہے۔ وہ دولت بھی جمع کرتی ہے اور بڈھے میاں کے اخلاق کی اصلاح بھی۔ پس مبارک ہیں وہ خاندان جن کے اندر بیوہ عورت کی دوسری شادی ضروری سمجھی جاتی ہے جو ہر طرح خیر و برکت کا کام ہے۔ کاش ہندستان میں بیوہ عورتوں کی شادی قانوناً ضروری قرار دے دی جائے جس سے ملک وقوم کی اخلاقی اور مالی زندگانی کی ترقی یقینی ہو سکے۔ اسی لیے وہ ماں بہنیں خدا اور رسولؐ کے نزدیک بھی محبوب و عزیز ہیں جو بیوہ عورت کی دوسری شادی کو پسند کرتی ہیں اور اسی لیے اسلامی شریعت میں بیوہ کی دوسری شادی کو مبارک اور محمود کہا گیا ہے۔ ◆◆◆

کسان کی بیوی

آپ کے اور ہمارے دادا میاں مرحوم کے زمانہ میں تو کسان صرف اُسی شخص کو کہتے تھے جو کھیتی باڑی کا کام کرتا تھا اور اس کا مطلب بھی اتنا ہی سمجھا جاتا تھا کہ یہ وہ آدمی ہے جو گیہوں، چنا، چاول اور ماش کی دال بوتا ہے اور بازار میں لاکر فروخت کر جاتا ہے۔ اس کے گھر جاکر پولیس کے سپاہی میاں اسے بارہ بجے رات کو بھی جوتا مار سکتے ہیں اور دن کے تیرہ بجے بھی۔ بالکل یہی حال چھ سو برس پہلے یورپ کے کسانوں کا تھا۔ مگر یورپ میں تعلیم جتنی ترقی کرتی گئی اس شخص کی عزت اور توقیر میں اتنا ہی اضافہ ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ 1917 میں ملک روس میں بادشاہ کے خلاف وہاں کی رعایا نے تلوار اٹھائی اور اس کو مع اس کے خاندان کے ٹکڑے کر کے پھینک دیا۔ جس جماعت نے اس کے بادشاہ صاحب کا قیمہ قیمہ کر کے رکھ دیا اس کو عام طور پر بالشویک کہتے ہیں جس میں روس کے ہر قوم اور قبیلے کے لوگ شریک ہیں۔ پس جب یہ بغاوت ختم ہوگئی اور بادشاہت پر قبضہ کر لیا گیا تو پتہ چلا کہ یہ باغی لوگ اصل میں روس کے کسان اور مزدور تھے جنھیں ایک شخص ایم لینن نے بھڑکا کر بادشاہ روس کے خلاف لڑایا اور یہ ہی وہ شخص تھا جس نے ایشیا میں کسان کی عزت بڑھانے میں کافی سے زیادہ خدمات انجام دیں۔ اِدھر جب اس کے ساتھ روسی کسانوں نے میدانِ جنگ میں خاصی جاں نثاری سے کام لیا تب کہیں جا کر ہم ہندستانیوں کی

آنکھیں کھلیں اور ہم نے سمجھا کہ افوہ یہ کسان خاں صاحب بڑے مرتبے کے آدمی ہیں بس اسی وقت سے ہندستان کے بے دماغ اور نقال لیڈروں نے بھی شور مچانا شروع کر دیا کہ اے غافل ہندستانیو! اٹھواور اپنے کسانوں کی قدر پہچانو۔ حالانکہ اس سے پہلے بھی ہندستان میں کسان موجود تھے مگر ان کے متعلق کبھی کبھار کوئی بات سن لی جاتی تھی اور ایک آدھ دفعہ گاندھی صاحب نے ان کے ساتھ ہمدردی کا اظہار فرمایا تھا۔

بس اب جو یورپ والوں نے اپنے ہاں کے کسانوں کی اس طرح عزت کی تو ہندستان میں اب نہ پوچھیے بس جو اٹھتا ہے وہ کسان ہی کسان پکارتا نظر آتا ہے، یہاں تک کہ اب ہندستان کے ایڈیٹر، مقرر اور شاعروں تک نے کسان کی تعریف اور ہمدردی میں لکھنا اور کہنا شروع فرمادیا۔ لہٰذا مُلّا رموزی بھی کسان کی تعریف کرتا ہے کہ:

کسان وہ جو شہر کی صاف اور ستھری آبادی کو چھوڑ کر جنگل، پہاڑ، غار اور چٹیل میدانوں میں مع اپنے خاندان کے جا کر آباد ہوتا ہے۔ نرم گرم ہوا، سرد و گرم موسم کی تکلیفیں اٹھاتا ہے۔ خطرناک درندوں، ڈاکوؤں اور خوفناک تنہائی کا مقابلہ کرتا ہے، بے یار و مددگار زندگی بسر کرتا ہے، تھیٹر، سنیما، دنگل، رام لیلا، عید، بقرعید، موٹر کار، ریل اور بائیسکل کی راحت اور لطف سے محروم رہتا ہے۔ سپاہی، تھانیدار، تحصیلدار اور کلکٹر صاحب کے جوتے کھاتا ہے مگر ہزاروں قسم کی ترکاریاں اور غلہ تیار کر کے شہر کی آبادی کا گزارہ فراہم کرتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ ایسے مظلوم انسان سے ہمیں ہمدردی کرنا چاہیے یا نہیں؟ تو مُلّا رموزی صاحب کا جواب یہ ہے کہ ہرگز نہیں اور یہ اس لیے کہ اگر کوئی شخص کسان بن کر اتنی مصیبتیں اٹھاتا ہے تو اس لیے نہیں کہ اسے شہر کی آبادی کی بھوک پیاس کا بہت زیادہ خیال ہے، اس لیے بے چارہ شہر والوں کی پرورش کے لیے اتنی مصیبتیں اٹھاتا ہے بلکہ یہ تمام مصیبتیں وہ محض اپنے نفع کے لیے اٹھاتا ہے یعنی کھیتی کی آمدنی اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ ایک سال کی آمدنی سے وہ تین ڈپٹی کلکٹروں کو تنخواہ دے سکتا ہے پھر بعض لوگ اس لیے کسان بن جاتے ہیں کہ وہ کسان ہی کے گھر پیدا ہوتے ہیں اس لیے قدرتاً وہ اسی پیشہ کو اختیار کرتے ہیں اور انھیں شہر میں آ کر آباد ہونے کی عادت ہی نہیں ہوتی لہٰذا جب ثابت ہے کہ کسان اپنی کھیتی قوم اور ملک کی امداد کے لیے نہیں کرتا بلکہ اپنے اور اپنے خاندان کی بھلائی کے لیے کرتا ہے تو پھر ہمیں کیا

ضرورت جو ہم اس کا احسان مانیں؟

مگر ہاں ایک بات ضرور ہے اور وہ یہ کہ اگر کسان لوگ تاؤ میں آ کر کھیتی کا کام ہی چھوڑ دیں تو ہم لوگ بھوکے مرنا شروع ہو جائیں اور اتنے مریں کہ دفن ہونے کی جگہ بھی نہ ملے۔ دوسرے یہ کہ اگر کسانوں کی ہمتیں اور حوصلے کھیتی کی مشکلات سے پست ہو جائیں تو پھر ہمارا آپ کا مارے فاقوں کے جو حال ہو وہ ظاہر ہے۔ اس لیے اس جماعت کی اگر عزت کی جا سکتی ہے تو وہ صرف اس کی اولوالعزمی اور ہمت کی یا پھر وہ از روئے قاعدۂ انسانیت اس لیے ہمدردی کا مستحق ہے کہ وہ جتنی مصیبتیں برداشت کرتا ہے اتنا روپیہ اسے نہیں ملتا۔ مثلاً زمین کا محصول ہی اتنا ادا کرتا ہے جتنا کہ اس کا اور اس کے بال بچوں کا دل نہیں چاہتا۔ بیگار، رشوت، بیماریوں اور شہر سے دوری کی اتنی اذیتیں برداشت کرتا ہے مگر روپیہ اتنا نہیں پاتا اور جس کے ولیمہ میں جاتا ہے سب سے آخر کی صف میں بٹھایا جاتا ہے۔ انگریز لوگوں کے بنگلہ کے سامنے اگر کھڑا ہوا بھی نظر آ جائے تو اتنے دھپ رسید کیے جائیں کہ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ میں ہوش میں آئے۔ ہمارے آپ کے ہوٹل میں اگر کھانا کھانے گھس آئے تو مارے رکابیوں کے دماغ درست کر دیا جائے۔ اگر وہ علی گڑھ والوں کے برابر دوسو روپیہ کا سوٹ پہن لے تو مارے ہنسی کے تمام دنیا اسے ذلیل کر کے چھوڑے۔ اگر وہ عینک لگا کر کسی جگہ کھڑا ہوا اخبار ''پانیر'' پڑھ رہا ہو تو انگریزوں کی عورتیں اتنی تالیاں بجائیں کہ بے چارہ اخبار پھینک کر بھاگ جائے تو ان باتوں کی وجہ سے اس پر قدرتاً ترس آتا ہے پھر ہمیں اس لیے بھی ہمدردی کرنا پڑتا ہے کہ اس کی کھیتی سے خود ہم لاکھوں قسم کی تجارت کرتے ہیں اور کروڑوں روپیہ کماتے ہیں۔ اگر وہ روئی کی کھیتی ترک کر دے تو ہم آپ ننگ دھڑنگ پھرنے پر مجبور ہو جائیں۔ اگر وہ چاول کی کھیتی ترک کر دے تو پلاؤ، بریان اور مزعفر کو ترس جائیں۔

حکومت کو اس کے ساتھ اس لیے ہمدردی ہوتی ہے کہ یہی سب سے زیادہ روپیہ حکومت کو دیتا ہے۔ لڑائی کے زمانہ میں یہ خود وردی پہن کر سپاہی بن جاتا ہے۔ تمام فوج کے لیے غلہ دیتا ہے۔ جانور دیتا ہے، گھاس اور لکڑی دیتا ہے اور کبھی کبھی اپنے ہی کھیتوں کو توپ سے اُڑا کر میدانِ جنگ بنا دیتا ہے مگر لڑنے سے منہ نہیں پھیرتا۔ اس کے کھیت میں سے اگر ریل کی سڑک نکالو تو یہ چپ ہو جاتا ہے۔ اس کی گائے کے لیے سایہ دار عمارت تجویز نہیں کی گئی بلکہ گھاس کے چھپّر تلے

درخت کے نیچے تاریک غار میں کھلے میدان میں اور درندوں کے منہ میں۔ غرض جہاں وقت آ جائے یہ پیدا ہو جاتی ہے پھر اس کی پیدائش پر نہ سرکاری اخباروں میں کوئی اعلان ہوتا نہ غیر سرکاری اخباروں میں۔ نہ نقارے بجائے جاتے نہ شادیانے۔ اصول پرورش میں نہ حفظانِ صحت کا خیال نہ اصولِ تربیت کا انتظام۔ عہدِ طفلی میں نہ اس کے لیے لچکدار جھولے کا بندوبست، نہ نرم و نازک بستر کی ضرورت نہ آرام دہ تکیے نہ پھول پھول کے کپڑے نصیب بلکہ بچوں کی پرورش کے لیے افلاطون و سقراط و بقراط سے لے کر ڈاکٹر انصاری صاحب نے آج تک جتنے قواعد بنائے ہیں ان میں سے ایک بھی اس کے ہاں استعمال نہیں ہوتا، مگر یہ درختوں کے سایہ تلے ہی پل کر یوں جوان ہو جاتی ہے کہ شاعر لوگ تک اس پر عاشق ہونے کے لیے دیہات میں چلے جاتے ہیں۔ تو پھر آپ کہیں کہ اس کی پرورش کے لیے قدرت کے قاعدوں کا استعمال ہوتا ہوگا تو یہ بھی صحیح نہیں بلکہ ان قدرتی قاعدوں کو اس طرح توڑا جاتا ہے کہ فطرت کا دل ہی کچھ خوب جانتا ہوگا۔ مثلاً اگر پرورش کے لیے فطرت کا یہ عام دستور ہے کہ بچے کو تمام خطرات سے محفوظ رکھا جائے تو آپ دیکھیں گے کہ اسے بچپن میں گرمی کے شدید موسم میں میدان میں سلایا جاتا ہے مگر گرم ہوا کے انفلوانزا پیدا کرنے والے جھونکے اس کا کچھ نہیں بگاڑتے۔ اماں اور تو اور اسے جنگل کے درندے رات کے وقت اپنے منہ میں دبا کر لے بھاگتے ہیں مگر جہاں اس کے کسان والد صاحب نے شور کیا کہ یہ درندے اسی جگہ پر پٹک کر بھاگ جاتے ہیں اور یہ زندہ و سلامت رہ جاتی ہے مگر مرتی نہیں اور ڈرتی نہیں۔ پھر بچپن میں جسم کی نرمی اور نزاکت کے لیے جس درجہ نرم و نازک لباس کی ضرورت ہوتی ہے ظاہر ہے مگر اس کے جسم کے لیے نہ ریشمی بنیانیں ہوتیں نہ قیمتی اور فینسی موزے، نہ کارخانہ لال املی کانپور کے بنے ہوئے گلوبند، نہ بنارس کی ساری بلکہ اس کی والدہ صاحبہ اسے یوں ننگ دھڑنگ کھیت پر ڈال دیتی ہیں کہ دیکھیے اور حیران رہ جائیے۔ پھر چند دن کی دھوپ اور کھیتوں کی سخت زمین سے اس کا ننگ دھڑنگ جسم ایک طرح کا پالش کیا ہوا، واٹر پروف بنجاتا ہے پھر اس پر گرم ہوا اثر کرتی نہ ٹھنڈی ہوا اور اسی لیے یہ بچپن میں کھیلتے وقت جنگل کی کانٹوں والی جھاڑیوں میں یوں چھپ جاتی ہے جیسے ہمارے آپ کے بچے کوٹھریوں اور کمروں میں چھپتے ہیں گویا جھاڑیوں کے تیز اور نوک دار کانٹے اس کے جسم کے اندر چبھ جانے سے خود ڈرتے ہیں نہ

اس کا عقیدہ شاندار ہوتا نہ بسم اللہ کی تقریب ہوتی ہے بس بڑی شان دکھائی تو یہ کہ پیدا ہونے سے دو چار دن بعد تک گاؤں کی چار چھ عورتوں نے اس کے پاس بے تکا سا گانا فرمالیا اور بس۔ والد صاحب کو اگر اس پر کچھ بہت ہی زیادہ پیار ہوا تو انھوں نے چاندی، پیتل یا تانبے کے سیر سیر بھر وزن کے کڑے چوڑیاں یا گلے کے طوق بنوا کر پہنا دیے اور بس۔

اسی طرح اس عورت کی جوانی شروع ہوتی ہے۔ اب جوان ہونے پر نہ اسے اسکول جانے کا غم، نہ کلب کی ممبری کا شوق، نہ ٹھنڈی سڑک کی تفریح کا خیال، نہ پیانو بجانے کا شوق، نہ ڈانس میں شرکت کا دھیان نہ پمپ جوتے کی یاد، نہ پاؤڈر کے ڈبے کی طالب نہ کشیدہ کاڑھنے پر پابند، نہ آدابِ گفتگو کی تابع نہ عباداتی امور کی تعلیم، نہ شوہرانہ حقوق کی باضابطہ تعلیم، نہ امورِ خانہ داری کی کتاب پڑھے نہ وہ تربیتِ اولاد کے قواعد سیکھے نہ حسن وعشق کے افسانوں سے ہاتھ لگائے نہ اپنے ملازم کے ذریعہ کسی غیر شخص کو خط اور تصویر بھیجے، نہ کلائی پر نازک سی گھڑی باندھے، نہ ولایتی انگوٹھی پر وہ دم دے، نہ بنارس کی ساری کے لیے بے چین، مگر جوانی کی امنگوں سے اس معصومیت سے سرشار کہ ضبط و جفاکشی قسم کھائے اور پاکدامنی نثار، شعری حساب سے ایک حسنِ مستقل مگر باوقار اور جمال صدرنگ مگر متین۔

کسان برادری میں شادی بیاہ کے لیے "خاندان اور قومیت" کی تحقیق وتخصیص ایک حد تک ضروری ہے لیکن حسن وتربیت کے لیے کسان اکبر آبادی مرحوم کے اس مصرع پر عمل کرتا ہے کہ:

حسن کی قید نہیں بس ہے مساۃ سے کام

اس کے پیام وپیغام کے لیے نہ رنگین خطوط کی ضرورت نہ چالاک مشاطہ کی حاجت۔ ایک دور رشتہ دار یا پڑوس کے کسان جہاں کسی چبوترہ پر بیٹھ گئے کہ منگنی منظور، اکثر شادیاں بہت کم عمری کی ہوتی ہیں اور چار پانچ برس کی عمر ہی میں کسان زادی دولہا میاں کے گھر عمر بھر کے لیے تشریف لے آتی ہیں۔ اب خواہ وہ چھوٹی عمر میں آئے یا بڑی عمر میں مگر ڈھائی ہاتھ لمبا گھونگھٹ ضرور فرمائے رہتی ہیں اور موٹا موٹا زیور بھی۔ ان کی بارات میں دیہات کے وہ باجے ہوتے ہیں جو کسی متمول ہندو بھائی کے جنازہ کے ساتھ ہوا کرتے ہیں۔ باراتیوں کی تعداد شاید ہی کبھی پندرہ بیس سے زیادہ ہوتی ہو، البتہ بارات کی سب سے زیادہ رونق بارات کی وہ عورتیں ہوتی ہیں جو باراتی مردوں کے

پیچھے قطار قطار نہایت مستی کے ساتھ جھوم جھوم کر گاتی جاتی ہیں۔ ان کے آس پاس اور کہیں باراتیوں کی گود میں یا ماؤں کی انگلی پکڑے ہوئے وہ ننگ دھڑنگ اور کالے کالے بچے بھی ہوتے ہیں جن کے چمکدار پیٹ ہمیشہ سینہ سے اونچے نظر آتے ہیں۔ باراتیوں کے بیچ میں عجیب وغریب قسم کے لباس اور زیور سے لدے ہوئے دولہا میاں ہمیشہ ایسے ٹٹو پر سوار ہوتے ہیں جو دنیا میں مہینے سوا مہینے کا اور مہمان ہوتا ہے مگر اس ٹھِلکدار طریقے سے سوار ہوتے ہیں گویا سامنے آنے والوں سے کہہ رہے ہوں کہ میں ہوں اس بارات کا دولہا۔ باراتیوں کے آگے پیچھے دیہاتی کتے بھی ہوتے ہیں جو راستے کے نئے کتوں کے خوف سے دُم کو ٹانگوں میں دبائے ہوئے چلتے ہیں اور کہیں کہیں مالک کو بارات چھوڑ کر اپنے کتے کو راستے کے حملہ آور کتوں سے بچانا پڑتا ہے۔ باراتیوں میں چلتے چلتے چلم پینا ضروری چیز ہے اور پنجاب وصوبہ سرحد میں شاید لمبے لمبے حقے بھی ہمراہ ہوتے ہیں۔ غلامی کی بے کسی یہ کہ اگر راستے میں کسی ہندستانی افسر کا موٹر بھی نظر آجائے تو پوری بارات مع دولہا کے نالی کے اس پار نظر آتی ہے اور دولہا میاں تک جھک کر موٹر کو سلام عرض کرتے ہیں۔

دُلہن کے گھر پہنچ کر ضروری نہیں کہ باراتیوں کو زرّیں شامیانے کے نیچے اور قیمتی قالینوں کے اوپر بٹھایا جائے بلکہ بارات کے یہ تمام شرکا خود بخود یوں ہو جاتے ہیں کہ:

حضرتِ داغ جہاں بیٹھ گئے بیٹھ گئے

اب نہ برقی روشنی درکار نہ قوالی کی فکر نہ وہ لکھنؤ کی ملکہ جان اور نہ الہ آباد کی جانکی بائی کا گانا، نہ تواضع کے لیے لندن پیرس کے سگریٹ اور سگار درکار نہ برف اور لمنیڈ کی بوتلیں، بس ایک طرف ڈھائی سیر تمبا کو اور ایک طرف اُپلوں کا دھواں دھار الاؤ۔ اب اپنا اپنا ہاتھ اور اپنی اپنی چلم یا دُلہن کی جانب کا ایک آدھ حقہ۔ اب جو اس سے بھی زیادہ پُر جوش بارات ہوئی تو تھوڑی دیر بعد معزز و محترم باراتی خود ہی اٹھے اور ناچ فرمانے لگے ورنہ گانے سے تو چوکتے ہی نہیں۔ اُدھر گھر میں دولہا اور دُلہن والیوں کے گانے کا وہ شور کہ محلے والوں کو سونا حرام اور کروٹ بدلنا محال۔ البتہ باراتیوں کی ضیافت کا انتظام دلہن والوں کے لیے اس طرح ضروری ہوتا ہے کہ دُلہن والوں کے ساتھ مل کر دولہا والے خود ہی کھانا بھی پکائیں اور خود ہی خوش ہو کر تناول بھی فرمائیں۔ پھر عین اسی حالت میں اگر کسی تحصیلدار اور تھانیدار کی گاڑی چلانے کے لیے آدمی کی ضرورت ہو تو دُلہن کا باوا بھی بیگار میں

لیا جاسکتا ہے اور دولہا کا بھائی بھی۔ اب نہ تحصیلدار کو بیگار میں لے جانے سے دریغ، نہ انھیں انکار کی مجال۔ البتہ رشوت دو تو بارات میں رہو ورنہ چلو تحصیلدار صاحب کی گاڑی لے کر۔

چند نہایت ہی سادہ رسموں کے بعد ''رخصتی'' اس طرح کہ نہ دُلہن کے ساتھ جہیز میں مسہریوں پر مسہریاں ہیں، نہ زیورات کے صندوق پر صندوق، نہ کپڑوں کے جوڑوں پر جوڑے ہیں، نہ ڈولی کے ساتھ خادم و خادمہ۔ دُلہن صاحبہ یا کسی بیل گاڑی کے اندر ورنہ دولہا میاں کے ٹٹو پر لدی ہوئی اور دولہا میاں پیادے بنے ہوئے آگے گھر پہنچتے تو ولیمہ کی بھی وہی ''دستِ خود او دہنِ خود'' والی ترکیب جو دُلہن کے گھر تھی یعنی باراتی خود ہی پکائیں خود ہی کھائیں اور تھوڑی دیر خود ہی گائیں اور جہاں سے آئے تھے اب وہیں جائیں۔

لیجیے یہ ہوگئی پوری شادی کوئی سوسوا سو روپے میں۔

اب جو دُلہن دولہا میاں کے گھر آئیں تو اس طرح کہ چار پانچ دن تک وہ ذرا دُلہن سی بنی رہیں اور وہ پھر جو اٹھیں تو آج انھوں نے خسر صاحب کے منہ دھونے کا لوٹا بھر کر رکھ دیا تو کل ساس صاحبہ کے پاؤں دبادیے۔ پرسوں نند کے ساتھ بیٹھ کر تھوڑے سے گیہوں صاف کیے اور پرسوں سے شوہر صاحب کا ناشتہ تیار کرنے بیٹھ گئیں اور وہ لیجیے وہ شوہر کی امداد کے لیے ایک ہی ہفتہ میں کھیت پر کھڑی نظر آرہی ہیں۔ یہ نہیں کہ طبقۂ متوسط کی طرح شوہر کے گھر جو آئیں تو ایک مہینے تک تو ''گوشۂ حجاب و ناز'' ہی سے باہر نہیں آتیں۔ منہ دھلائے تو خادمہ اور کمرہ سے صحن تک جائیں تو نند یا ساس سہارے دے ورنہ بیٹھی ہوئی ہیں شرم و حجاب کا ڈھیر بنی ہوئی۔ نہ مارے حجاب کے زور سے بات کرتی ہیں نہ پوری آزادی سے مسکراتی ہیں۔ مہینہ بھر کے بعد اگر آزاد ہوئیں تو صرف اس قدر کہ گھر میں اگر شوہر صاحب نہیں ہیں تو ساس یا نند سے ایک آدھ بات کرلی ورنہ دوڑیں اور اپنے والدہ کے گھر۔ آج ہیں کہ چاند دیکھنے والدہ کے گھر چلی جارہی ہیں تو کل کسی عزیز کی سلامی اور مہمانی کے لیے۔ اس طرح کوئی چھ مہینے میں وہ اس قابل ہوتی ہیں کہ شوہر کی چند خدمات آزادی سے انجام دیں سو وہ بھی اُس وقت کہ شوہر خادم و خادمہ رکھنے کے قابل ہی نہ ہو ورنہ جب دُلہن بن کر آئی ہیں تو عمر بھر جھولا ہی جھولیں گی اور زیور پہنیں گی مگر پوری جفاکشی اور محنت سے کام نہ کریں گی۔ چنانچہ خود ہمارے ننھے میاں کی والدہ نے شادی سے ڈیڑھ برس بعد کام

کرتے ہوئے ایک مرتبہ سرد آہ کے ساتھ فرمایا تھا کہ جو کام ہم نے اپنے باپ کے راج میں نہ کیے تھے وہ شوہر کے راج میں کرنا پڑے لاحول ولاقوۃ، مگر کسان کی دُلہن ہوگی کہ روز بروز شوہر کی خدمت کے لیے آزاد و مستعد ہوتی جائے گی۔ وہ ابتدا میں صبح کو سب سے پہلے بیدار ہوگی اور سب سے پہلے وہ خود ہی چولھا روشن کرے گی اور شوہر کے لیے ناشتہ تیار کر لے گی، پھر وہ شوہر کے لیے پانی بھر کر رکھ دے گی مگر ایسی جگہ کہ جہاں شوہر خود ہی دیکھ لے کہ پانی یہ رکھا ہے۔ پھر وہ ساس اور سسر کے لیے بھی اتنے ہی کام کرے گی اور قبل اس کے کہ شوہر یا ساس سسر بیدار ہوں وہ تمام کاموں سے فارغ ہو کر کسی گوشہ میں بیٹھ جائے گی۔ گویا اس نے کچھ کیا ہی نہیں۔ البتہ چور نظروں سے دیکھتی رہے گی کہ شوہر نے ناشتہ کھالیا یا نہیں۔ اگر وہ ناشتہ سے فارغ ہو گیا ہے تو ابھی حجاباً سامنے نہ آئے گی مگر جیسے ہی کہ شوہر اُٹھا اور اس نے آکر برتن اٹھالیے اور فوراً صاف کر کے قرینہ سے رکھ دیے۔ اور جو کہیں شوہر بہت ہی سویرے کھیت پر چلا جاتا ہے تو یہ ناشتہ تیار کر کے کھیت پر جائے گی اور کھیت کے کنارے ناشتہ اور پانی کا برتن رکھ کر خود کسی درخت کی اوٹ میں بیٹھ جائے گی، اس لیے کہ ابھی وہ نئی دُلہن ہے، شوہر کھانے سے فارغ ہوا کہ اس نے برتن اٹھائے اور گھر آ گئی۔ پھر چند دنوں بعد وہ صبح اٹھتے ہی پانچ سیر گیہوں لے کر چکی چلائے گی، مگر اس سلیقہ اور حجاب سے کہ گھر والوں کو بھی خبر نہ ہو کہ دُلہن چکی چلا رہی ہے۔ پھر وہ کبھی کبھی کھیت پر بھی جائے گی اور چند معمولی کام کر کے شوہر سے پہلے گھر لوٹ آئے گی، اس لیے کہ ابھی وہ نئی دُلہن ہے۔ پھر وہ دس پندرہ دن بعد ہی سے کھیت پر زیادہ دیر تک کام کرے گی اور ایک ہی مہینے کے بعد وہ شوہر کے تمام حالات اور کاموں سے واقف ہو کر اس کی صحیح معنی کی رفیقِ زندگی بن جائے گی۔ اب ساس، نند، سسر اور شوہر سے لے کر گھر کے ایک ایک فرد کی جملہ خدمات وہ انجام دے گی مگر نہ شرمائے گی اور نہ گھبرائے گی اور نہ دوڑ دوڑ اپنی ماں کے گھر جائے گی۔ اب وہ چوبیس گھنٹے شوہر کے گھر خوش ہے اور اس اعتماد کے ساتھ کہ اب اس کا اصل گھر شوہر ہی کا گھر ہے اور چھ مہینے کے بعد کسان کی بیوی کام کے لحاظ سے بجائے بیوی کے شوہر ہو جاتی ہے اور ہر وہ کام کر گزرتی ہے جو اس کا شوہر کرتا تھا۔ اب اگر اس کی کوئی تفریح ہے تو کھیت پر دبی آواز سے کوئی کسانی غزل گا لینا یا چکی چلاتے وقت ایک آدھ ٹھمری یا دادرے کی تان اُڑا لینا۔ وہ دن میں دس مرتبہ نہ سنگار میں مصروف

ہوتی ہے نہ ہفتہ کے ایک ہزار جوڑے بدلتی ہے، نہ شوہر سے نئے زیور کی فرمائش ہے نہ عطر لونڈر کی درخواست، نہ مرغ مسلّم اور نہ کباب اور مٹھائی کی طالب۔ اب تو وہ ہل بھی چلاتی ہے اور گاڑی بھی، بیلوں کو پانی بھی پلاتی ہے اور کھیت کی نگرانی بھی کرتی ہے۔ غرض ایک سال کے اندر ہی اندر وہ سب کچھ ہوجاتی ہے۔ البتہ اب اگر اسے کوئی چیز بہت زیادہ خوش کرنے والی ہے تو اس کی اولاد۔

مگر یہ بھی اس طرح کہ اگر خدا دے تو شکر ورنہ اس کے لیے نہ کسی بزرگ سے دعا کی خواہش نہ کسی عامل کے تعویذ کی حاجت، نہ کسی مزار کے عرس میں جانا ضروری نہ کسی مسجد کا ''طاق بھرنا'' لازم۔ اسی طرح اگر خدا بیٹا دے تو احسان اور بیٹی دے تو احسان۔ نہ اولادِ نرینہ کی کسان کو فکر نہ ان کی اُون کو۔ اگر اولاد میں اب قسمت ہی میں لکھی ہے تو اس کی تعداد ایک سے لے کر نو دس تک کسی طرح کم نہیں ہوتی۔ پھر پیدائش کے دن نہ تو پیں سر کرنے کی ضرورت نہ نقارے اور شادیانے بجانے کی تمنا۔ خاندان والوں نے اگر کوئی تقریب کی، کی ورنہ یہ ہر حال میں خوش۔ زچگی کے لیے نہ لندن کی بنی ہوئی دایا کی موجودگی درکار نہ دواخانہ یونانی دہلی کی ''مقویات'' کی تلاش۔ یہ ہمارے آپ کی طرح نہیں کہ ننھے میاں کی پیدائش سے تین ماہ قبل ہی سے عقیقہ کے لیے چاول بھی خریدے جارہے ہیں اور گھی بھی۔ سسرال والے بھی جوڑے اور زیور تیار کررہے ہیں اور میکے والے بھی۔ ننھے میاں کے والد صاحب بھی ہیں کہ عقیقے میں مارے غرور کے اکڑے پھر رہے ہیں اور بیوی صاحبہ کے فخر و ناز کا تو اندازہ ہی نہیں۔ گویا زچگی کیا ہوئی طاعون آگیا کہ اب مریضہ مارے نزاکت کے نہ ہوش میں آتی ہے نہ تین مہینے تک حرکت کرسکتی ہے۔ قیمتی سے قیمتی دوائیں اور غذائیں ہیں کہ کھلائی جارہی ہیں اور بھاری سے بھاری کپڑے ہیں کہ پہنائے جارہے ہیں۔ شوہر صاحب کے ہاں لڑکا کیا پیدا ہوا کہ مارے خرچ اور قرض کے دیوالیہ ہوکر رہ گئے۔ بیوی صاحبہ ہیں کہ مارے نزاکت کے اب کسی کام میں حصہ ہی نہیں لے سکتی ہیں۔ آج پیٹ میں درد ہے تو کل سینہ میں۔ پھر سر میں ہے تو ایک دن کمر میں۔ نتیجہ یہ ہے کہ تیسرے ہی مہینے سے دق کے آثار شروع ہوئے اور حکیموں اور ڈاکٹروں نے ساری جائیداد پر قبضہ کرکے ''نازک سی زچہ'' کو قبر میں پہنچادیا اور اولاد کسی یتیم خانے میں داخل کرلی گئی۔ بہ خلاف اس کے کسان صاحب کی بیوی کے

بچہ پیدا ہوا اور وہ تین دن کے بعد ہی سے پھر سرگرمِ عمل نظر آنے لگے۔ وہ اب روٹی بھی پکاتی ہے اور کھیت کا کام بھی کرتی ہے مگر اسے نزاکت اور بیماری کی جمائی آتی نہ کھانسی ستاتی۔

ان کے ہاں بچے کی پرورش یوں ہوتی ہے کہ پانچ چھ دن بعد لیا اور ایک مضبوط سے کپڑے میں ڈال کر اپنی کمر سے باندھ لیا اور سر پر بوجھ اٹھا کر کھیت پر بھی چلی گئیں اور گھر بھی آ گئیں۔ اب جو بچہ اور بڑا ہوا تو ایک ٹوکری میں ڈالا اور کھیت پر لے گئیں اور جو بہت ہی رویا تو اسی ٹوکری کو کسی درخت پر لٹکا دیا اور کام کرتے کرتے ایک مرتبہ آئیں اور بڑے لاڈ پیار سے جھلا دیا اور یہ مصرع پڑھ دیا:

سو مورے بھیّا

سو مورے بٹیا

اور جو بہت زیادہ پیار ہوا تو جھولے سے اٹھا کر دودھ پلا دیا اور اتنی دیر بچہ کو ہلا ہلا کر کچھ باتیں کیں اور چند بار پیار اور پھر درخت پر لٹکا کر کھیت پر تشریف لے گئیں۔ اب اگر اس عرصہ میں اس بچہ کے والد صاحب کو پیار آ گیا تو وہ کھیت سے مارے محبت کے جھولے کے پاس آئیں گے اور از راہِ مرحمت کاشتکارانہ اسے جھولا دے کر پیار فرمائیں گے، مگر ساتھ ہی چلم بھی پیتے جائیں۔ جس وقت کسان صاحب اس بچے سے عشق فرما رہے ہوں گے اس وقت ان کی ''وہ'' بڑے فخر کے ساتھ کھیت میں کھڑی مسکرا کر اپنے بچے کی طرف دیکھ رہی ہوں گی۔ اسی انداز سے یہ بچہ گھر میں کھلایا جاتا ہے یہاں تک کہ چکی چلاتے وقت بھی بچہ والدہ صاحبہ کی گود میں پڑا رہتا ہے اور والدہ صاحبہ کے چکی چلانے کے تمام ہچکولے سہتا رہتا ہے مگر ان زوردار ہچکولوں سے اس کی گردن میں خم آتا نہ کمر میں درد ہوتا نہ پسلی نمبر 3 خراب ہوتی نہ پسلی نمبر 5 ٹوٹ جاتی۔ بڑا جوش ہوا تو ساس صاحبہ اسے لے کر چبوترہ پر بیٹھ گئیں اور آڑے ترچھے الفاظ اور جملے اس کی شان میں ارشاد فرما کر کھلاتی رہیں، مگر یہ کبھی نہ ہوگا کہ اس بچے کے ہر وقت رونے چلانے سے اس کی ماں چولھے اور چکی کے کام سے انکار کر دے یا کسان صاحب اپنی بیوی کی نزاکت بڑھانے کے لیے کوئی خادمہ ملازم رکھ لیں۔ تھوڑے دن بعد جب بچہ پاؤں پر کھڑا ہونے لگا تو والدہ صاحبہ اس سے بے فکر ہو کر کھیت پر چلی جائیں گی — بچہ کی بیماری پر جب دوا پلاتی ہے تو گویا کسی منہ زور گھوڑے کے منہ میں پوری

قوت سے لگام دی جارہی ہے، رات کو سوتے وقت بچہ بیدار ہو کر صبح تک چیختا رہتا ہے مگر یہ نہ بیدار ہوگی نہ اسے سنبھالے گی، نہ تھپکی دے گی نہ دودھ پلائے گی اور جو کبھی بہت زیادہ مجبور ہوگئی تو بچے کو دودھ پلانے کے عوض اس کے منہ میں دودھ ٹھونس دے گی اور بچے سے پہلے خود غافل ہو جائے گی پھر اس کی بلا سے کہ اس بچے کو اس کی بغل سے شیر اٹھا کر لے جائے یا چور۔

یہ ہمارے ننھے میاں کی والدہ کی طرح نہیں کہ جو شام سے گود میں لے کر بیٹھتی ہیں تو عشا کی نماز ندارد مگر ننھے میاں کے رونے کو برداشت ہی نہیں فرما سکتی ہیں، مگر کسان کی بیوی نے جو دودھ کو بچے کے منہ میں ٹھونسا تو پھر صبح کو بچہ ہی اسے چھوڑ دے تو اس کی مہربانی ورنہ اسے تو اپنا سینہ چھپانے کا بھی ہوش نہیں اور اسی لیے وہ کبھی کبھی اپنے چبوترے پر برہنہ سینہ ایک مست سانڈنی کی طرح چت پڑی ہوئی نظر آتی ہے۔ اسے یہ بھی پروا نہیں ہوتی کہ صبح کے وقت سوتے ہوئے اس کے بچے کی آنکھوں پر کھیاں زیادہ جمع ہوں گی یا خود اس کی آنکھوں پر۔ اس کے ہاں کوئی ضابطہ اور قانون ایسا نہیں ہے جس کی رُو سے وہ اپنے بچوں کو لڈو اور کھلونوں کے واسطے پیسے یا روپے دے۔ بس سال میں ایک آدھ مرتبہ رام لیلا کے میلہ پر اگر کچھ عنایت فرما دیا تو احسان ورنہ نہ اسے بچوں کو شکایت نہ خود اسے اس کا غم۔ البتہ وہ اپنے بچے کو خواہ وہ لڑکا ہو یا لڑکی زیور ضرور پہناتی ہے، ایسا زیور جو لڑکے کو پہنایا جاتا ہے کڑے، انگوٹھی، گلے کا طوق، کنٹھا یا ہار ہوتا ہے۔ بعض لڑکے کو پاؤں میں بھی کڑے پہناتی ہیں اور کانوں میں بالیاں جن کے مختلف نام ہوتے ہیں۔ گویا زیور کے حساب سے کسان کا لڑکا بھی لڑکی کہی جا سکتی ہے۔ تربیتِ اولاد کے مذکورہ بالا حالات سے گزر کر اب وہ جوں جوں بوڑھی ہوتی جاتی ہے اس کے مزاج میں محنت، جفاکشی اور بہادری کے حوصلے ترقی کرتے جاتے ہیں۔ مزاج میں تلخی اور جھونجھ خاصی پیدا ہو جاتی ہے۔ چنانچہ اس کے غصے اور تاؤ کے اظہار کے یوں تو بے شمار مواقع ہیں مگر جب یہ ساس، شوہر اور سسر سے لڑتی ہے اس وقت یہ بغیر مار کھائے خاموش ہونا نہیں جانتی اور اگر محلے والی سے اس کی چھڑ جائے تو یہ مارے تاؤ کے ناچتی ہوئی اپنے چبوترے سے اتر کر اس کے چبوترے تک پر چڑھ جاتی ہے۔ اس کے تاؤ کا یہی حال اس وقت ہوتا ہے جب یہ اپنے کھیت کے اندر کسی شخص کو داخل ہوتا دیکھ لیتی ہے، بس اس وقت اس کی آواز اور اس کی گالیوں کا وزن، مقدار، اقسام اور طریق استعمال کا اندازہ مردم شماری

والے ہی بتا سکتے ہیں۔اس کی گالیوں میں فحش کے ساتھ بددعا کے اجزایا جراثیم زیادہ ہوتے ہیں اور اس وقت کی آواز میں جو تسلسل ہوتا ہے وہ کھانسی چل جانے پر ہی ٹوٹے تو ٹوٹے ورنہ یہ اپنی طرف سے کبھی دم نہیں لیتی اور جب تک آپ اس کی نظر سے اوجھل نہ ہوجائیں کیا مجال جو وہ چپ ہوجائے۔

کھیت کے بعد وہ گھر میں بھی اتنی ہی تیز اور غضبناک رہتی ہے اور اکثر اوقات اس کے مقابل شوہر صاحب ہی کو دب جانا پڑتا ہے۔گھر کی لڑائی اس سے زیادہ صاف، اس سے زیادہ تیز اس سے زیادہ برہنہ اور اس سے زیادہ فیصلہ کن کوئی دوسری بیوی نہیں لڑسکتی۔اب اگر آپ اس کے مکان سے قریب والے مکان میں رہیں تو معلوم ہوجائے کہ وہ کسی نہایت ہی معمولی بات پر شوہر سے الجھی یا شوہر اس سے الجھا اور لڑائی کا آغاز ہوا، مگر ابھی آپ اس ابتدا کے اسباب ہی پر غور میں ڈوبے ہوں گے کہ وہ شوہر کے چانٹے، گھونسے، لاتیں، ڈنڈے اور جوتے کھا کر فارغ بھی ہوچکی ہوگی اور اس لاتیں کھا کر بند ہونے والی لڑائی کی علامت یہ ہوگی کہ اب اس کی گالیوں کی غیر مسلسل آواز آسمان کے برابر اونچی ہوجائے گی اور بجائے گالیوں کے وہ نہایت لاجواب لحنِ داؤدی کے ساتھ رونا شروع کردے گی اور اس رونے میں جگہ جگہ ٹھہرنا بھی پڑتا ہے اور پھر اسی بلندی سے رونا شروع ہوجاتا ہے۔اس کے رونے کی آواز میں باقاعدہ سُر اور زیر و بم کا پیدا ہونا علامت ہے اس بات کی یہ کسان کی بیوی رو رہی ہے مثلاً وہ رونے کی آواز کے شروع میں چند واقعات بیان کرتی ہے اور آخر میں بہت زور سے رو کر بہ طریق ردیف وقافیہ وہ ایک ''ہو'' ''رے'' کی آواز پر تان توڑتی ہے پھر یہی نہیں بلکہ اس کا مار کھا کر رونا اس کا بچھڑے ہوئے رشتہ داروں سے مل کر رونا اور اس کا کسی مردے کو یاد کرکے رونا تقریباً یکساں ہوتا ہے۔یعنی جس لے اور تان کے ساتھ وہ شوہر کے گھونسے کھا کر روتی ہے اُسی لے اور تان کے ساتھ وہ وطن سے آئے ہوئے عزیزوں سے مل کر روتی ہے پھر عزیزوں سے مل کر رونے کے لیے اس کی ضرورت نہیں کہ وہ گھر میں مل کر روئے بلکہ اگر اس کے عزیز رام لیلا کے کسی بڑے بھاری مجمع اور بازار میں مل جائیں تو بیچ سڑک پر جھوم کر اسی رفتار سے چلا کر روتی ہے جس رفتار سے وہ اپنے گھر میں روسکتی ہے۔البتہ مار پیٹ اور زدوکوب کے اس سلسلہ میں اس کے مزاج اور اخلاق میں ایک قابلِ قدر بات یہ ہے

کہ وہ شوہر کے سو جوتے کھا کر بھی نہ اُس کے گھر سے بھاگتی نہ میکہ میں جا کر ہمیشہ کے لیے رہ جاتی نہ محلے والیوں سے شکایت کرتی اور نہ طلاق کی درخواست دیتی۔ خدا کرے یہ عادت ہر شریف بیوی میں پیدا ہو جائے، مگر اس کے شوہر میں یہ عادت پیدا نہ ہوا اور اسی لیے وہ شروع رات میں جوتے کھاتی ہے اور صبح کے وقت چکی چلاتی ہے اور غزلیں گاتی ہے کیونکہ دہلی کے مشہور شاعر حضرتِ غالب نے کہا ہی یوں ہے کہ:

رات کو خوب سی پی صبح کو توبہ کرلی

تو کسان کی بیوی اس مصرع کو یوں استعمال کرتی ہے کہ:

رات کو خوب پٹی صبح کو توبہ کرلی

اسی طرح اس کا شوہر اسے خوب خوب ٹھونک کر یا مار کر بھی گھر سے بھاگ نہیں جاتا اور نہ وہ اس کے برابر شور کرتا ہے، بس اگر بالکل ہی ضبط نہ ہوا تو گھر سے باہر والے چبوترے پر آ کر خاموش بیٹھ جاتا ہے اور بھوک کی شدت کے وقت بغیر کسی کے منائے خود ہی جا کر کھانا تناول فرمالیتا ہے۔ کبھی کبھی یہ بھی ہوتا ہے کہ شوہر صاحب مار کر ابھی بیٹھے ہی تھے کہ یکا یک پھر اٹھے اور مارنا شروع فرمادیا۔ اب کسانوں کے قانون میں بیوی کو مارنے کے لیے یہ قید نہیں کہ وہ بیوی کو مارتے وقت اس کی صحت، اس کے جسم، اس کی عمر اور اس کی خطا کا اندازہ بھی کرلے یا وہ بیوی کو صرف چانٹے ہی سے مارے بلکہ ہر کسان آزاد کہ اپنی بیوی کو جس وقت، جس جگہ، جس طرح اور جتنا چاہے مارے کوئی جرم نہیں اور اسی لیے کسان کی بیوی کو بھی یہ حق ہے کہ اگر ہو سکے تو مار کھاتے وقت وہ بھی شوہر کو مارے جس کی شکایت صلح کے بعد شوہر کو بھی نہیں ہوتی (اسے کہتے ہیں عورت کے حقوق کی آزادی) چنانچہ دیکھا گیا ہے کہ بعض کسانوں کا لباس بیوی کو مارتے وقت تار تار ہو کر رہ جاتا ہے۔ اسی طرح مارنے کے لیے چانٹے، دھول، لات، گھونسے، جوتے، چھڑی اور قمچی کے بعد کسان کو حق ہے کہ وہ اپنی بیوی کو اب رسّی، لاٹھی اور جلانے کی کسی موٹی سی لکڑی سے بھی مارے اور اس کی ہرگز پروانہ کرے کہ اس لٹھ سے بیوی کا سر کتنی جگہ سے پراٹھا ہو کر رہ جائے گا؟ پھر کسان شوہر کے لیے یہ بھی ضروری نہیں کہ وہ اپنی بیوی کو مارنے کے لیے اسکول کے لونڈوں کی طرح باضابطہ "مرغا" بنا کر کھڑا کرے یا اسے کسی مسہری پر باندھ دے یا اس کے صرف

سیدھے گال پر چانٹا رسید کرے پھر اگر وہ بایاں گال خود ہی آگے کردے تو مارے ورنہ اِنسلٹ سے ڈرے اور مار ختم کردے بلکہ اسے حق حاصل ہے کہ جب وہ مارنے چلا ہے تو اسکول کے اُن لڑکوں سے کہیں سوا مارے جنھیں آج کل صرف ایک بید رسید کردینے پر ماسٹر صاحب استاد ہو کر بھی بغیر پنشن کے اسکول سے عمر بھر کے لیے نکال دیے جاتے ہیں کہ یہی قاعدہ وضع کیا ہے آج کل کے ماہرینِ تعلیم نے استادوں کی قدر و عزت افزائی کا۔ لہٰذا کسان کو حق ہے کہ وہ بیوی کے گال پر چانٹا بھی مارے اور جوتا بھی، پھر چاہے تو اسے رسّی سے باندھ کر لٹکا دے یا چبوترے پر سے نیچے دے مارے یا وہ بھاگتی پھرے اور یہ کوشاں رہے یا وہ گر پڑے اور یہ برابر رسید کرتا رہے۔ اس حالت کو دور کرنے کے لیے یہ ضروری نہیں کہ گھر کے یا پڑوس کے دوسرے لوگ اسے شوہر سے بچالیں بلکہ سب کے لیے خاموشی ہی بہتر ہوتی ہے اور جو کوئی اس ہنگامے سے بہت ہی زیادہ بے تاب ہو جائے تو وہ اس طرح بچاتا ہے کہ دور ہی سے کسان سے کہتا رہتا ہے یا کہتی رہتی ہے:

بس بس اب جانے دے۔

ارے اب نہ کرے گی۔

دیکھ وہ مر نہ جائے۔

اچھا تو پھر گلا ہی گھونٹ دے نا اس کا۔

اس مار پیٹ کے بعد یہ کبھی نہ ہوگا کہ ہمارے آپ کے ہاں کی طرح بیوی کے والد صاحب اور بھائی صاحب فوراً دوڑے اور ہمیں آپ کو آکر درست کر دیا یا اپنی بیٹی کو گھر لے گئے اور دوسرے دن عدالت میں طلاق یا روٹی کپڑے کا دعویٰ دائر کر کے لڑکی کو عمر بھر کے لیے شوہر سے علاحدہ کرلیا۔

امورِ خانہ داری میں یہ بیوی کسی جگہ بھی شوہر کی محتاج نہیں ہوتی۔ سودا سلف بھی خود ہی لاتی ہے اور گھر کا پانی بھی خود ہی بھرتی ہے۔ وہ خود ہی جلانے کی لکڑی پھاڑتی ہے اور خود ہی مکان کی مرمت کرتی ہے۔ اب یہ سوال کہ کھانا وہ خود زیادہ کھاتی ہے یا اس کا شوہر؟ سو اس کا جواب اس کی صحت پر موقوف ہے۔ البتہ تحقیق سے بالکل ثابت ہے کہ اکثر مواقع پر شوہر سے زیادہ بیوی کھاتی ہے۔ لباس اور زیور کو وہ شاید سال میں ایک دو مرتبہ ہی دیکھتی ہے یعنی کسی تہوار یا شادی کے موقع

پر۔اس کے مزاج میں نہ فضولی ہوتی نہ فضول خرچی اور یہ شاید اس لیے کہ اس کا ماحول ہی نہایت محدود ہوتا ہے۔ وہ نقد روپیہ جمع کرنے کی عادی ہوتی ہے اور حد سے سوا سادہ اور موٹی غذا کھانے والی۔ وہ چاندی اور سونے وغیرہ کو زمین میں دفن کر کے محفوظ رکھنے سے خوش ہوتی ہے مگر خرچ کرنے سے گھبراتی ہے اسی لیے چوروں اور ڈاکوؤں کو اس کے ہاں ڈاکہ ڈالتے وقت دولت برآمد کرنے میں بڑی شدت سے کام لینا پڑتا ہے اور جب تک چور اس کے سینہ پر بندوق نہ رکھ دیں یہ ہرگز نہیں بتاتی کہ روپیہ اور زیور کس جگہ دفن ہے۔ شوہر کی حد سے گزری ہوئی خادم، وفادار اور عزت کرنے والی، عزت اور برادری کے ضوابط کی حفاظت میں اس درجہ مضبوط کہ دوسری بیویاں جواب سے عاجز، دلیری، شجاعت، ہمت، حوصلے اور عمل کا نمونہ اور یہ انھی خواص کا اثر ہے کہ کہیں کہیں یہ تاؤ میں آ کر شوہر تک کو کلہاڑی یا زہر سے ہلاک کر دیتی ہے جیسا کہ 1930 کے آخر میں صوبۂ پنجاب میں اس قسم کے واقعات وقوع پذیر ہوئے۔ صورت کی نہایت بھونڈی، گندی، سیاہ فام، دُبلی پتلی زیادہ مگر موٹی تازی کم، اس سے زیادہ واللہ اعلم۔ تعلیم کے نام اللہ کا نام۔

◆◆◆

مزدور کی بیوی

ہندستان میں جاہلوں کی تعداد 95 فیصد بتائی جاتی ہے، لہٰذا اس حساب سے یہ اندازہ کرنا آسان ہو جاتا ہے کہ پھر اس ملک میں مزدور زیادہ ہوں گے تو کہاں ہوں گے کیونکہ مزدوی کا پیشہ اختیار کرنا اسی وقت ضروری ہو جاتا ہے جب انسان میں علم و ہنر نہ ہو۔ اب سوال صرف یہ ہے کہ ہندستان میں مزدور کی تعریف کیا ہے، اس لیے اگر یہاں مزدور کی تعریف کے لیے یورپ کے مزدور جیسی تعریف کی جائے تو غلط ہے کیونکہ یورپ اور ہندستان کے مزدور میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ لہٰذا بہترین تعریف یہ ہے کہ جو ہندستان کے کارخانوں، دکانوں، مکانوں، کانوں، میدانوں، باغوں، کھیتوں اور بازاروں میں اس طرح کام کرتے ہیں کہ اپنی محنت کا معاوضہ روزانہ وصول کرتے ہیں یا ہفتہ وار، وہ ہوئے مزدور تو یہ تعریف اس لیے کمزور رہے گی کہ بعض کارخانوں میں مزدوروں کا معاوضہ ''ماہوار'' دیا جاتا ہے اور جب مزدور کا معاوضہ ماہوار ملتا ہے تو پھر دفاتر کے تمام ملازم بھی مزدور ہوئے اس لیے کہ انھیں بھی ماہوار معاوضہ تنخواہ کے نام سے ملتا ہے۔ البتہ ملازم سرکار کا معاوضہ مزدور سے کچھ زیادہ بارونق اور شاندار ہوتا ہے البتہ سرکاری ملازم کے لیے چند رعایتیں ایسی ہیں جو عام مزدوروں کو حاصل نہیں۔ مثلاً ملازم سرکار کو رعایتی رخصت، عدالت کی رخصت، وضع تنخواہ سے رخصت لینے حقِ خاص ہے مگر مزدور چاہے بخار، کھانسی، مالیخولیا، مراق،

جنون اور انفلوانزا ہی میں مبتلا کیوں نہ ہوا سے ان رخصتوں میں سے ایک رخصت بھی نہیں ملتی۔ اسی طرح اگر ملازم سرکار کو اس کی نوکری پر کوئی شخص چانٹا، گھونسہ، دھپ، لٹھ اور جوتا مار دے تو اسے سرکار کی توہین کہتے ہیں اور مارنے والے پر سرکار کی جانب سے مقدمہ چلا کر اسے جیل خانے بھیجا جاتا ہے لیکن عام مزدور کو آپ چاہیں تو اس کی بیوی کے سامنے جوتے رسید کریں آپ چاہیں تو اسے چوک بازار میں گالیاں دیں اور گھونسے عطا فرمائیں لیکن اس کے لیے بجائے مقدمہ چلانے کے ہر قسم کا دیکھنے والا یہی کہے گا کہ:

اور ماریئے بھائی صاحب۔

واقعی بڑا ہی بدمعاش ہے۔

وہ میرا مکان جب اس نے بنایا تھا تو ایسی ہی ''حجتیں'' مجھ سے کرتا تھا۔

اور کام کرنا تو اسے آتا ہی نہیں۔

اجی بڑے بہانے کرتا ہے، آپ تو لیجائیے اسے تھانے میں، ابھی سیدھا ہو جائے گا۔

ابے جاتا کیوں نہیں ہے بھائی صاحب کے ساتھ؟

تو کیا وہ تیری مزدوری نہ دیں گے بدمعاش؟

دیکھا برابر ہے کہ زبان چلا رہا ہے۔

بس آپ تو دو چار جوتے رسید کیجیے۔

یہی حال اس کے معاوضہ کا ہے جس کے لیے نہ کوئی قانون ہے نہ ضابطہ نہ اصول اور نہ معیار بس جو کچھ آپ نے مزدور سے طے کر لیا وہی معاوضہ ہو گیا۔

ہندستان میں بڑھئی عرف نجار، لوہار، کمہار، دُھنیے، جلاہے، حجام، دھوبی اور معمار تک ''مزدور'' کہے اور سمجھے جاتے ہیں۔ حالانکہ یہ لوگ صناع اور ہنر پیشہ ہوتے ہیں اور عام یا جاہل محض مزدور کے مقابل ان کی عزت زیادہ ہونا چاہیے مگر ایسا جو نہیں ہے تو اس کا سبب خواص اور سرمایہ دار حضرات کا ''اقتدار پسند'' ہونا یا جاہل ہونا ہے، کیونکہ خواص میں جس تعلیم کا چرچا ہے یا جن لوگوں کو تعلیم یافتہ کہا جاتا ہے اصولاً وہ تعلیم یافتہ سمجھے جانے کے قابل نہیں ہیں مگر اس کو کیا کہیے کہ ایک ایسا عالم تو خاطر میں نہیں لایا جاتا جس نے عربی زبان میں تمام عقلی و عملی علوم کی تحصیل و تکمیل کی ہو،

لیکن ایسوں کو تعلیم یافتہ کہا جاتا ہے جو بی۔اے، یا ایم۔اے پاس ہوں، اس لیے اب کثرت ہے ایسے ہی عالموں کی۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہندستان میں ''مزدور'' کی تعریف ہی اب تک مقرر نہیں ہو سکی البتہ اب پچھلے پچیس سال سے یہاں کے انگریزی پڑھے ہوئے لوگوں نے یورپ کے مزدوروں کے حالات پڑھ کر ہندستانی مزدور کی اصلاح، ترقی، تعلیم اور ہمدردی کے لیے کوشش شروع کی ہے۔ اُدھر حکومتِ ہند نے بھی ہندستانیوں کی بیداری کے اندازہ پر ان کے ساتھ کچھ مراعات خاص کی ہیں۔ چنانچہ آج کل ہندستان میں بھی ''مزدور کانفرنس''، ''مزدور کلب''، ''مزدور رہنما'' اور ''مزدور اخبارات'' پیدا ہوئے ہیں۔ چنانچہ راقم الحروف نے شہر بمبئی کے دو اخبار دیکھے ہیں جن میں سے ایک کا نام ''مزدور'' اور دوسرے کا نام ''صدائے مزدور'' تھا۔ یہ دونوں اخبار اردو زبان میں جاری ہوئے تھے اور عام مزدوروں کی اصلاح و ترقی کے حامی تھے۔ صوبۂ پنجاب سے بھی اس مقصد کے لیے چار پانچ اخبار اور رسالے جاری ہوئے جن میں سے ایک پرچہ بنام ''کرتی'' بابت ماہ اگست 1928 اِس وقت راقم الحروف کے سامنے ہے۔ اس ماہوار رسالہ کا مقصد بھی کسانوں کی حمایت و ترقی، اصلاح و بیداری اور ان کے لیے مالکوں اور سرمایہ داروں سے حقوق طلبی ''سرمایہ دار'' بھی یورپی ادبیات سے ترجمہ کیا گیا ہے اور یورپ کے اخباروں اور کتابوں ہی سے اڑایا گیا ہے خصوصاً اس لفظ کا اصل مقصد ''ملک روس'' ہے جہاں 1917 میں کسانوں اور مزدوروں کو فوج میں بھرتی کر کے ایک کارآزمودہ جماعت نے بادشاہ روس اور اس کے پورے خاندان کو قتل کر کے اپنی حکومت کا اعلان کر دیا۔ اس فاتح جماعت کو عموماً ''بالشویک'' کہا جاتا ہے اور اسی نے اس خیال کو عام کیا کہ دنیا میں سب کچھ مزدور کا حق ہے اور وہ لوگ قابلِ سزا ہیں جو مزدور کی محنت سے کافی سے زیادہ دولت جمع کر کے دنیا کا لطف اٹھاتے ہیں اور انھی لوگوں کو ''سرمایہ دار'' کہا جاتا ہے مگر تھوڑے ہی دن بعد ''سرمایہ دار'' اور ''مزدور'' سیاسی مطالب کو ادا کرنے کے لیے استعمال ہونے لگا یعنی دنیا کے تمام بادشاہ، وزراء اور حکام ''سرمایہ دار'' قرار دے دیے گئے اور عام آبادی کو ''مزدور'' کے معنی میں مخاطب کیا جانے لگا اور سرمایہ دار کے خلاف نہایت خوں ریز اور نفرت انگیز خیالات کی اشاعت ہونے لگی۔ چنانچہ راقم الحروف نے جس رسالہ ''کرتی'' کا اوپر تذکرہ کیا ہے اس کے صفحہ نمبر 5، جلد نمبر 1 پر ہندستانی مزدوروں کو ''ترقی کرنے کے لیے'' ذیل کے الفاظ میں

مخاطب کیا گیا ہے:

''روس میں مزدور حاکم ہیں۔ انگلستان جیسے گئے گزرے سرمایہ دار ملک میں بھی مزدوروں نے پچھلے دنوں اپنی طاقت قائم کر لی ہے۔ جرمنی، فرانس، آسٹریا میں مزدور فرقہ دن بہ دن زوروں پر ہے۔ امید ہے کہ آئندہ بیس سال میں کوئی ایک ملک بھی مزدور فرقہ کی حکومت سے محروم نہ رہے گا۔''

''پھر یہ بھی کیوں ہو کہ آخر جو لوگ دولت پیدا کرتے ہیں دولت کا انتظام بھی انہی کے ہاتھوں میں ہونا چاہیے یعنی مزدوروں کے ہاتھ میں''۔

(ملاحظہ ہو رسالہ ''کرتی'' امرتسر پنجاب، بابت ماہ اگست 1929)

اسی مزدور سے ہمدردی کے لیے شمالی ہندستان کے سب سے بڑے اور مسلمانانِ ہند کے سب سے بلند مرتبہ شاعر ڈاکٹر سر محمد اقبال نے کہا ہے کہ:

خواجہ از خونِ رگِ مزدور ساز و لعل ناب

از جفائے وہ خدایان کشتِ دہقانان خراب

''انقلاب''

انقلاب اے انقلاب

(ملاحظہ ہو کتاب ''زبورِ عجم'' صفحہ نمبر 134، مطبوعہ مقبول عام پریس، لاہور)

لیکن افسوس اس امر پر ہے کہ ہندستان میں اصلاح و رہنمائی کے فرائض وہ لوگ انجام دے رہے ہیں جو عمر، تجربے اور تعلیم کے لحاظ سے ابھی خود محتاجِ اصلاح و ہدایت ہیں، یہی وجہ ہے کہ ہندستانی باشندے اصل ترقی سے دور ہیں۔ چنانچہ ہندستانی مزدور کی صحیح ترقی اور اصل تربیت میں بھی ان مصلحین ہی کی نااہلیت رکاوٹ بنی ہوئی ہے۔ چنانچہ جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے ہندستان میں اول تو مزدور کی تکالیف اور اس کی ترقی و اصلاح کا خیال ہی سرے سے یورپ والوں کی نقل ہے پھر ہندستان کے مزدوروں کی اصلاح کے لیے عملی حیثیت سے بھی یورپ والوں نے بہت زیادہ کام لیا، مثلاً ہندستان میں مزدوروں کی تنظیم و اصلاح کے لیے انگلستان کے بعض ذی اثر اور قابل ترین اشخاص ہندستان آئے اور انھوں نے یہاں آ کر ہندستانی باشندوں کو مزدوروں کی

اصلاح و تنظیم کے لیے آمادۂ عمل کیا، ایسے غیر ہندستانی لوگوں میں انگلستان کی پارلیمنٹ کے ممبر کرنل ویجوڈ خاص ہیں جنھوں نے 1922 میں کل ہندستان کا دورہ کر کے مزدوروں کی اصلاح و ترقی پر بے شمار تقریریں کیں۔ ان کے بعد انگلستان کے مشہور حامیٔ مزدور مسٹر اسپور ہیں جو ہندستان کی نمائندہ جماعت آل انڈیا نیشنل کانگریس کے سالانہ اجلاس منعقدہ 1929 میں شریک ہوئے، پھر انگلستان کی پارلیمنٹ کے ہندستانی ممبر مسٹر سکلات والا باشندۂ بمبئی ہیں جنھوں نے ہندستانی مزدوروں کی ہمدردی اور اصلاح کے لیے کل ہندستان کا دورہ کیا۔ مگر ہندستانی مصلحین کی جس کمزوری کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے اس نے یہ بھی نہ سمجھنے دیا کہ غیر ہندستانی اشخاص کی ہندستانی مزدوروں سے ہمدردی کا اظہار ان کی کسی سیاسی اور تجارتی خودغرضی پر تو مبنی نہیں ہے؟ حالانکہ واقعہ یہی ہے کہ جو لوگ انگلستان یا فرانس اور جرمنی کے باشندے ہو کر ہندستانی مزدوروں سے اظہارِ ہمدردی کرتے ہیں اس میں ان کی نہایت گہری تجارتی خودغرضی موجود ہے یا پھر وہ غیر ملکی لوگ ہندستانی مزدوروں سے ہمدردی کرتے ہیں جو ان کے ذریعہ ہندستان میں انگریزوں کے خلاف کام لینا چاہتے ہیں۔ غیر ملکی اشخاص کی تجارتی خودغرضی یہ ہے کہ ہندستانی مزدور کو زیادہ کارآمد بنا کر اس سے زیادہ کام لیا جائے اور بس اور ان تمام تدابیر کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندستانی مصلحین کی نظر اصل کام سے دور جا پڑی اور مزدوروں کی اصل کمزوری اپنی جگہ پر موجود رہی۔ مثلاً مصلحین نے جو کوشش سب سے پہلے شروع کی وہ مزدوروں کی دماغی یعنی تعلیمی ترقی، معاشرتی اصلاح اور اخلاقی تربیت نہ تھی جو اصل اور بنیادی ضرورت ہے انسان کی ترقی اور بیداری کی۔ بلکہ بغیر دماغی اصلاح کے بیک وقت مزدوروں کی اُجرت میں اضافے کی تحریک کو اس درجہ اہم ضروری اور فوری قرار دے دیا کہ بے علم اور غیر تربیت یافتہ مزدور بھڑک اٹھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بمبئی، پونا، احمد آباد گجرات، اور مدراس میں مزدوروں اور مالکوں کے درمیان نہایت درجہ خوں ریز تصادم اور مقابلہ ہوا اور بے شمار مزدور ہلاک اور قتل یا سزایاب ہوئے۔

یہی طریقہ ریلوے کمپنیوں اور کارخانوں میں اختیار کیا گیا اور صرف اُجرت میں اضافے اور دوسرے مطالبات پر مہینوں ہڑتالیں جاری رکھ کر بے شمار مزدوروں کو روزی سے محتاج کر دیا گیا۔ قتل و غارت گری کے ہولناک نقصانات برداشت کیے گئے۔ چنانچہ 1930 میں جی۔ آئی۔

پی ریلوے کمپنی کے مزدوروں نے جو ہڑتال کی اس میں سب سے بھاری نقصانات مزدوروں ہی کو برداشت کرنا پڑے اور ایسے نقصان رسیدہ مزدوروں کی ایک بھاری جماعت خود راقم الحروف کی نظر میں آج بھی موجود ہے جو بھوک پیاس اور بے روزگاری کے عذاب میں مبتلا ہے، مگر اب مصلحین ان کی اعانت سے بالکل معذور ہیں۔ پنجاب اور شمالی ہند کے مصلحین نے مزدوروں سے ایک دم وہ کام لینا چاہا جو یورپ کے تعلیم یافتہ مزدور برسوں کی تعلیم و تربیت کے بعد کر رہے ہیں، چنانچہ ان حضرات نے مزدوروں کی کانفرنسیں منعقد کیں، انجمنیں بنائیں، ان کے مطالبات وضع کیے اور ضوابط کی ترتیب کی مگر حصولِ مقاصد میں لغزش کی یعنی مطالبات کے حصول کا وہ طریقہ اختیار کیا جو سیاسی مطالبات کا ہوا کرتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ متعدد مصلحین بغاوت اور امن عامہ کی برہمی کے الزام میں ہمیشہ کے لیے بے روزگار کر دیے گئے اور اس طرف کے مزدور ان اعلیٰ دماغ لوگوں کی ہدایات سے محروم ہو گئے۔ حالانکہ وہ اصولی چیز جس نے یورپ کے مزدور کو آج بام حکمرانی تک پہنچا دیا، تعلیم اور صرف تعلیم ہے۔ اس کے بعد جماعتی تنظیم اگرچہ ہندوستانی مصلحین بھی اس ضرورت کو محسوس کرتے ہیں اور ایسے حضرات ضرور موجود ہیں جو ہندستانی مزدوروں کو ہنگامہ آرائی سے محفوظ رکھ کر ٹھوس اور دماغی اصلاح کی طرف لے جانا چاہتے ہیں، مگر اس تحریک کی سلامت روی میں ہندستان کی تحریک حصولِ آزادی بہت زیادہ اثر انداز ہے۔ چنانچہ حصولِ آزادیٔ ہند کی تحریک چونکہ وطنی اور قومی ہے اور اخبارات، رسائل اور تقریروں کے ذریعہ اس تحریک کو دوسری تمام تحریکات سے زیادہ مقدس اور ضروری قرار دے دیا گیا ہے اس لیے دماغوں میں جوش اور بحرانی حالت موجود ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہر دوسری تحریک کے ارکان ادنیٰ جوش پر اپنے اصول و مقاصد سے ہٹ کر فوراً غیر متعلق اثرات کو قبول کر لیتے ہیں اور اسی جذبے کے تحت مزدوروں کی بے شمار تحریکات نے بیک لحہ سیاسی رنگ قبول کر لیا۔ حالانکہ اصولاً مزدور تحریک کو سیاسی نہ ہونا چاہیے تھا مگر ماحول کے اثرات بالآخر غالب آئے اور دو سو برس کے غلام مزدوروں نے یورپ کے آزاد اور تعلیم یافتہ مزدوروں کی طرح ہنگامے، ہڑتالیں مقاطعہ عمل اور لٹھ بازی سے کام لینا شروع کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت کی جانب سے ان لوگوں کی ہنگامہ آرائی کے انسداد کے لیے جو طاقتور تدابیر اختیار کی گئیں ان کے خوف نے متعدد لوگوں کو مزدوروں کی ہمدردی سے

علاحدہ کردیا اور اسی لیے اس کتاب کے وقت یقین کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا کہ ہندستان کا مزدور کسی حیثیت سے بھی قابلِ اعتبار واعتنا ہوا یا نہیں۔

اس لیے بجا طور پر کہا جاسکتا ہے کہ ہندستانی مزدور کی ترقی دماغی سربلندی اور عملی حیثیت مستقبل میں ترقی پذیر سہی مگر موجودہ حالت میں ہندستان کا مزدور جہل، و بے خبری، ذلّت، خواری، تنگدستی و بدحالی، بے کسی ومحتاجی میں ساری دنیا کے مزدور پیشہ لوگوں سے آگے ہے۔ حالانکہ یورپ کے مزدوروں کی ترقی کا یہ عالم ہے کہ اس مضمون کے لکھتے وقت یعنی 1931 میں حکومت انگلستان کی حکمراں جماعت خالص مزدور ارکان پر مشتمل ہے جس کے صدر اعظم مسٹر ریمزے میکڈانلڈ ہیں، لہٰذا ہندستان کے مزدور کی اسی پستی اور بدحالی کے لحاظ سے اس کی زندگی کا نقشہ ملاحظہ کیجیے۔

عام طور پر ہندستانی مزدور اپنی فلاکت زدہ زندگی کے باعث فوراً پہچان لیا جاتا ہے کہ یہ مزدور ہے۔ اس کا جسم نہایت لاغر، نہایت بدنما، بھدا اور بھونڈا ہوتا ہے۔ وہ اصول حفظانِ صحت سے یکسر ناواقف ہوتا ہے۔ اس کا لباس نہایت کم بلکہ بعض کو لنگوٹی کے لیے بھی پورا کپڑا نصیب نہیں ہوتا اس لیے بے شمار مزدور ننگ دھڑنگ ہی نظر آتے ہیں۔ یہ لوگ کسی قابل اعتبار برادری قبیلے یا قوم سے متعلق نہیں ہوتے بلکہ ہر تنگ دست اور افلاس زدہ ہندستانی مزدوری کا پیشہ اختیار کر لیتا ہے اور مزدور پکارا جاتا ہے۔ ان کی تعداد کا کوئی یقینی اندازہ مرتب نہیں بلکہ کہا جاسکتا ہے کہ ہندستان کو اگر چار حصوں میں تقسیم کر دیا جائے تو تین حصہ مزدور ہوں گے اور صرف ایک حصہ غیر مزدوری پیشہ باشندوں کا ملے گا۔

ہندستانی مزدور صرف ہندستان ہی میں نہیں بلکہ وہ اپنی روزی کے لیے لنکا، برما سے نکل کر عراق، افریقہ، چین، روس اور یورپ کے ہر حصہ میں پہنچ چکا ہے۔ خصوصاً افریقہ اور عراق میں وہ بکثرت موجود ہے۔ بعض ممالک میں حکومتِ انگریزی نے اپنے مقاصد کے لیے اسے بھیجا ہے جس کے متعلق شکایت ہے کہ بڑی تکلیف کے ساتھ بھیجا گیا ہے۔ ہندستانی مزدور نے افریقہ میں خصوصیت سے بے حد مصائب برداشت کیے ہیں جن کی تفصیلات اخباراتِ ہند میں موجود ہے۔

ہندستان میں ہندستانی مزدوروں کی جس طرح کوئی نسل، کوئی قوم اور کوئی برادری نہیں۔

اسی طرح ان کے لیے کوئی خاص خطہ کوئی خاص شہر یا علاقہ بھی نہیں بلکہ وہ ہر شہر ہر قصبے اور ہر گاؤں میں نہایت آسانی سے مل سکتا ہے۔ جہالتِ محض کے اثر سے یہ طبقہ نہایت سخت اور جاہلانہ رسوم کے ہاتھوں ہلاک ہے۔ اس کے رہنے کا مکان ہرگز اس قابل نہیں ہوتا کہ اسے مکان کہا جائے بلکہ ان کی زیادہ تعداد ہمیشہ خانہ بدوش رہتی ہے۔ جس شہر میں یا جس علاقہ میں مزدوری ملتی ہے وہاں یہ مزدور اپنے بیوی بچوں کے ساتھ جا کر آباد ہو جاتا ہے اور مزدوری ختم ہونے پر پھر وہاں سے تلاشِ معاش کی فکر لے کر دوسرے شہر کا راستہ اختیار کرتا ہے۔ اس پر بھی تنگدستی اور افلاس کا یہ حال ہے کہ اگر ہندستان کی کل ریلوے کمپنیوں سے پورے اعداد و شمار طلب کر کے دیکھے جائیں تو تقریباً پچیس ہزار مزدور ہوں گے جو کل ہندستان میں مزدوری کی تلاش میں روزانہ ریلوے اسٹیشنوں پر بے ٹکٹ سفر کرتے ہوئے گرفتار ہوتے ہیں۔ اس گرفتاری کا جرمانہ ادا نہ کرنے کی بے کسی کے باعث ٹکٹ کلکٹروں اور ریلوے پولیس والوں کے طمانچے اور جوتے کھا کر بے قید بھگتے چھوڑ دیے جاتے ہیں۔ یہی حال ان کی رہائش کا ہے، مثلاً یہ صحیح معنی کے مکانات میں نہیں رہتے اور یہ اس لیے کہ ہندستان میں جس طرح مزدوری کے لیے کوئی نظام وضابطہ نہیں اسی طرح کسی ایک شہر میں ہر لحہ مزدوری کا ملنا بھی یقینی نہیں اس لیے ہندستان کے مزدور کا عمر بھر تلاشِ معاش میں ایک شہر سے دوسرے شہر میں جانا ضروری ہے اور اس صورت میں کسی مزدور کا پختہ مکان تعمیر کرنا گویا اپنے لاوارث مال سے حکومت کی امداد کرنا ہے۔ پس عام طور پر ہندستان کا مزدور کھلے میدانوں یا درختوں کے سایہ میں پورے خاندان کے ساتھ آباد نظر آتا ہے اور اگر زیادہ دن قیام کی امید ہوگئی تو گھاس اور لکڑی کا ایک تاریک سا جھونپڑا بنالیتا ہے اور اس کی اس بے بسی کی حد یہ ہے کہ خود حکومت یا ارکانِ حکومت یا سرمایہ داروں کے نزدیک بھی ہندستانی مزدور مکانوں میں رہنے کا مستحق ہی نہیں سمجھا گیا، اسی لیے جن سرمایہ داروں کی طرف سے مزدوروں کے رہائش کا انتظام کیا جاتا ہے اس میں ان کے لیے نیم پختہ مکانات کا بھی انتظام نہیں ہوتا، بلکہ یہ لوگ بھی ان کے لیے گھاس کے ویسے ہی جھونپڑے تیار کراتے ہیں جن کے اندر ہندستانی مزدور اپنی مالی محتاجی کے باعث رہنے پر مجبور ہوا کرتے ہیں۔ اگر یقین نہ ہو تو ہندستانی ریلوں میں سفر کر کے دیکھ لو، آپ کو ریلوں کے کنارے جگہ جگہ بے شمار جھونپڑے نظر آئیں گے، جو ریلوے کمپنیوں کے ٹھیکہ داروں اور اجارہ

داروں کی طرف سے اپنے مزدوروں کی رہائش کے لیے بنوائے گئے ہوں گے۔ یہی حال ان کی رسوم وعادات اور عام زندگی کی ابتری اور خرابی کا ہے کہ ان میں کفایت شعاری کے معنی سمجھے جاتے نہ دولت جمع کرنے کے اصول رائج نہ مذہبی مسائل کا علم نہ اولاد کی تربیت کا وجود، اس لیے ایسے مزدور کے ہاں جو بیوی پیدا ہوتی ہے وہ عام حالات کی نسبت سے ہندستانی کسان کی بیوی سے بہت زیادہ ملتی جلتی ہے مثلاً یہ کہ اکثر کھلے میدانوں، کانوں، جنگلوں غرض جہاں دوگز زمین مل گئی وہیں پیدا ہوجاتی ہے اور پیدائش کے وقت سے لے کر چار پانچ برس کی خدا جانے کس طرح ہوجاتی ہے، اس لیے کہ پیدائش کے دن بھی اس کے ماں باپ کے ہاں اتنی ہی دولت ہوتی ہے کہ وہ صبح وشام خشک روٹی کھا سکیں اس لیے اب اس کی زچہ ماں کے لیے وہ بادام، اخروٹ، چلغوزہ اور مقویات اور مشروباتِ لطیفہ کون لائے اور کہاں سے لائے۔ پیدائش کا مقام نہ شہر نہ قصبہ بلکہ ویران میدان کارخانہ یا جنگل نہ جہاں منتظم آبادی نہ محلے دار اور نہ پڑوسی۔ پھر ان کی پیدائش کی اطلاع ہو تو کسے اور ان کی پیدائش کا اعلان کرے تو کون۔ اکثر یہ بھی ہوتا ہے کہ والد صاحب قبلہ ہوتے ہیں اپنی ''مزدوری'' پر اور بیوی صاحبہ کسی تنہائی میں ''بچہ دے مارتی ہیں'' اور خود ہی ہوش میں آجاتی ہیں۔ شوہر صاحب بھی تشریف لاکر جب اپنے آس پاس میدان ہی میں میدان پاتے ہیں اور جیب خالی تو بیوی کے پاس بیٹھ کر یا آگ روشن کردیتے ہیں یا زچہ کے لیے روٹی پکانا شروع کردیتے ہیں۔ بڑا سہارا اگر ملا تو یہ کہ پاس والے مزدوروں کی دوچار عورتیں ''نسوانی ہمدردی'' کے اثر سے خدمت کو آ گئیں تو وہ بھی اس طرح کہ اگر ''مزدوری سے فرصت ہوتو'' ورنہ یہ عورتیں بھی اپنی مزدوری پر اور زچہ صاحبہ پھر تنہا کی تنہا۔ اب اگر بچے کو سنبھالیں تو خود زچہ صاحبہ اور خود کو ہوش میں لائیں تو خود زچہ صاحبہ۔ چنانچہ خود راقم الحروف نے مزدوروں کی ایسی بے شمار زچہ عورتیں دیکھی ہیں جن کی گود میں چار پانچ دن کا بچہ ہے اور وہ مزدوری میں مصروف ہیں۔ ضعف کا یہ عالم کہ حرکت کرنا محال مگر بھوک اور تنگدستی کا یہ تقاضا کہ مزدوری کرو۔ بڑی مصیبت یہ ہے کہ ہندستان کے امیروں، رئیسوں اور ذی مقدرت لوگوں کی حماقت اور ستم آفریں بے خبری ان بدنصیبوں کے لیے یہاں تک بڑھ گئی ہے کہ ایسے نازک اور دل ہلا دینے والے واقعات کو سن کر یہ لوگ نہایت آسانی سے کہہ دیا کرتے ہیں کہ اونہہ فکر ہی کیا ہے۔

اگر مزدور کی بیوی زچہ بن کر مزدوری کرتی ہے تو اللہ نے اس کے خواص اور عادات بھی ویسی ہی بنادی ہیں۔ حالانکہ یہ یکسر غلط ہے کہ مزدور کی بیوی کے خواص رئیس کی بیوی کے خواص سے مختلف اور الگ ہوا کرتے ہیں۔ کاش کہ کوئی دولت مند اپنی بیوی کو مزدور کی بیوی بنا کر امتحان کرے تب پتہ چلے کہ مزدور کی بیوی ہو جانے سے انسانیت کے عام اور طبعی خواص بدل نہیں سکتے۔ الغرض پیدائش کے بعد مزدور کی بیوی اپنے نورِ نظر کو زرق برق کپڑے نہیں پہنا سکتی بلکہ اپنے ہی استعمال کے بڑے کپڑوں کو پھاڑ کر اس لاڈلے بچے کو اس کے چیتھڑوں میں لپیٹ کر یا لپٹا کر گود میں لیتی ہے اور چار دن کے بعد ہی وہ اپنی تمام تکالیف کے ساتھ مزدوری کے لیے اس طرح نکل جاتی ہے کہ یہ ننھا سا بچہ اس کی ٹوکری میں ہوتا ہے جسے وہ ہوا کے گرم و سرد جھونکوں، دھوپ اور سایہ کی بے اعتدالی اور چرند و پرند کے رحم پر چھوڑ کر مزدوری میں مصروف ہو جاتی ہے۔ اب جس طرح اس کے ہاں کی پیدائش کا کوئی اعلان نہیں ہوتا اسی طرح اب اس کے ہاں عقیقے کی تقریب ہے نہ غسل زچگی کا اہتمام نہ خوشی کے شادیانے ہیں نہ مسرت کے نقارے، نہ کوئی دوست مبارکباد کے لیے نہ کوئی عورت جوڑا لاتی، نہ مہمانوں میں سسرالی رشتہ دار ہیں نہ میلے والوں کا پتہ، نہ بچے کے لیے پھول پھول کے کپڑے ہیں، نہ جرمنی کے بنے ہوئے کھلونے، یہی وجہ ہے کہ مزدور کی بیوی کے پاس یا اُس کے ساتھ جب دیکھیے ایسے ننگ دھڑنگ بچے نظر آئیں گے گویا کسی بھوت کی بیوی نے اپنے خوفناک بچے مزدورنی کے ساتھ کر دیے ہیں۔ پس اسے ہی عجیب وغریب حالات کے ساتھ جب مزدورنی کی لڑکی یا لڑکا مبلغ پانچ برس کا ہوا تو اب نہ اس کی تعلیم کے لیے کوئی بی۔ اے پاس استاد ہے نہ خدمت کے لیے ماما صاحبہ بلکہ الٹی مصیبت یہ ہے کہ پانچ برس کا بچہ اپنی روزی اب خود کمائے۔ چنانچہ مزدور کی اولاد کے اسی نقشہ سے متاثر ہو کر ہندستان کے سب سے بڑے شاعر حضرت جوش ملیح آبادی نے یہ نظم کہی ہے:

اک دوشیزہ سڑک پر دھوپ میں ہے بے قرار
چوڑیاں بجتی ہیں کنکر کوٹنے میں بار بار
نازنینوں کا یہ عالم مادرِ ہند آہ آہ
کس کی چالوں نے یہ کر دی ہے تری حالت تباہ

چوڑیوں کے ساز میں یہ درد کیسا ہے بھرا
آنکھوں میں آنسو بنی جاتی ہے جس کی ہر صدا
کیوں ترا گلزار دوزخ کا نمونہ ہوگیا
آہ کیوں تیرا یہ برّ و بحر سونا ہوگیا
گرد ہے رخسار پر زلفیں اٹی ہیں خاک میں
کمسنی سوئی ہوئی ہے دیدۂ نمناک میں
اے شبِ تاریک تیری بزم اختر کیا ہوئی
سر برہنہ کیوں ہے؟ وہ پھولوں کی چادر کیا ہوئی
کاکلِ شب رنگ اور افشاں خس و خاشاک کی
روئے زیبا اور نقاب افسوس جلتی خاک کی
آبِ زر سے جگمگاتے تھے کبھی تیرے کلس
تیری آنکھوں سے ٹپکتا تھا کبھی عشرت کا رس
اف یہ ناداری مری سینہ سے اٹھتا ہے دُھواں
آہ! اے افلاس کے مارے ہوئے ہندستان
برکتیں تھیں سایہ افگن تیری ارضِ پاک پر
ہُن برستا تھا کبھی اے ہند تیری خاک پر
حسن ہو مجبور کنکر توڑنے کے واسطے
دست نازک اور پتھر پھوڑنے کے واسطے
اے خدا ہندستان پر یہ فلاکت تا کجا
ہم پہ آخر جہل و نکبت کی حکومت تا کجا
بھیک میں وہ ہاتھ اٹھیں التجا کے واسطے
جس کو قدرت نے بنایا ہو حنا کے واسطے

گردنِ حق پر خراشِ تیغِ باطل تا بکے
بیکسوں کے واسطے طوق و سلاسل تا بکے
فرطِ خشکی سے وہ لب ترسیں تکلم کے لیے
جن کو فطرت نے تراشا ہو تبسم کے لیے
دستِ نازک کو رسن سے اب چھڑانا چاہیے
اس کلائی میں تو کنگن جگمگانا چاہیے

ان حالات کے ساتھ یہ جوان ہوتی ہے مگر اس عالم میں پہنچ کر اس کے اندر صرف ایک چیز نئی نظر آتی ہے اور وہ اس کا طبعی حجاب اور فطری شوخی۔ باقی سب طرح خیریت و خیر و عافیت، نہ جوان ہو کر اس کے لباس میں بھڑک پیدا ہوتی نہ زیور میں اضافہ ہوتا، نہ مزاج کی شوخی اور آزادی اعتدال کی حد سے سوا ہوتی اور اُمنگ اور ترنگ سے وہ بدمست ہوتی۔ البتہ فقر و فاقہ کشی اور محنت مزدوری کی تھکن سے اس کے چہرے پر حزن و ملال کے عوض ایک بااثر معصومیت اور بے چارگی نمایاں نظر آتی ہے۔ وہ پھٹے پرانے چیتھڑوں سے اپنے جسم کو یوں چھپاتی رہتی ہے گویا وہ غیر آدمی کی نظروں سے کوسوں دور رہنا چاہتی ہے، مگر غربت اور تنگدستی کی مصیبت اسے لوگوں کی نظر میں لاتی ہے۔ اسے جوانی میں اگر تفریح کی سوجھتی بھی ہے تو بس اتنی کہ وہ رات کے وقت اپنی ہمجولیوں اور سہیلیوں کے ساتھ مل کر گا لیتی ہے مگر وہ بھی اس وقت اور اس طرح کہ جب اسے یقین آ جائے کہ اس کے گانے سے اس کا باپ یا اس کی ماں ناراض نہ ہوگی، اس کے بعد یا تو اس کی شادی کم عمری ہی میں ہو جاتی ہے اور نہیں تو اب اس کی شادی کا وقت آ جاتا ہے۔ اب اگر شادی کی تفصیلات کو تلاش کیجیے تو گمان ہوتا ہے کہ مزدور زادی کی شادی کا ہونا نہ ہونے کے برابر ہوتا ہے یعنی اس کی شادی کے لیے یہ ضروری نہیں کہ لڑکی اپنے وطن اور گھر میں ہو، بلکہ اگر مزدوروں کا قافلہ مزدوی کے لیے کسی ویران میدان اور دور دراز شہر یا قصبے میں ٹھہرا ہوا ہے تو اسی جگہ شادی کا ہو جانا ضروری ہے اور اگر گھر پر ہے تو شادی کا ہو جانا ضروری ہے، مگر اکثر شادیاں بیرونِ شہر اور مزدوری کے مستقر ہی پر ہوتی دیکھی گئی ہیں اور وہ بھی اس قیامت کی بے سروسامانی کے ساتھ کہ اگر ہمارے ننھے میاں کی والدہ کی کسی لڑکی کی اس بے سروسامانی سے شادی کر دی جائے تو ہمارے

8 8

ننھے میاں کی والدہ مارے غم کے یقیناً زہر کھا کر مرجائیں۔ چنانچہ مزدور زادی کی شادی کے پیغامات کے لیے نہ کسی مشاطہ اور درمیانی عورت کی حاجت نہ کسی پیغامبر مرد کی ضرورت ہے۔ نہ رنگین لفافے نہ تار اور ٹیلیفون، بس جس قافلہ میں وہ پیدا ہو کر شادی کے قابل ہوئی ہے اسی قافلہ کے کسی لڑکے کے ساتھ بیاہ دی جائے گی۔ اسی طرح نہ اس لڑکے کے لیے بی۔ اے پاس ہونے کی شرط ہے نہ جوان صالح ہونا ضروری بس یوں سمجھیے کہ ''لڑکا'' ہو خواہ کسی رنگ و رخ اور کسی ڈیل وڈول کا ہو۔ یہی حال مزدور کے صاحبزادہ مزاجی اور دماغی حالات کا ہوگا کہ اسے بھی اس بات کی پروا نہ ہوگی کہ ہونے والی بیوی علی گڑھ کی پڑھی ہوئی ہو یا انجمن حمایت الاسلام لاہور کی، یا وہ مزدوری کے ساتھ ساتھ شیروانی سینا بھی جانتی ہو اور قمیص بھی، یا وہ صورت کی لیلیٰ ہو یا مجنوں، یا شیریں ہو یا فرہاد، یا گلروز رینہ ہو یا ملکہ مہرنا گر یا انجمن آرا بیگم۔ غرض مزدور کے لڑکے کی انتہائی خوشی کے لیے صرف یہ خبر کافی ہوگی کہ ''اب اس کی شادی ہو رہی ہے'' اور وہ اسی خیال سے مست نظر آئے گا کہ اب اس کی شادی ہو رہی ہے۔

کچھ شک نہیں کہ مزدور کی شادی اگر کسی شہر میں واقع ہو جائے تو دھوم دھام اور شان کے لحاظ سے بعض اوقات یہ شادی مُلّا رموزی کی شاندار شادی کے برابر ہو جاتی ہے، مگر ایسا بہت کم ہوتا ہے، مگر یہ زیادہ ہوتا ہے کہ شہر کا نہایت ذلیل باجا بجاتے ہوئے چند مزدور صاحبان لڑکی کے گھر تشریف لے آتے ہیں اور دولہا میاں آج بھی جو ''خلعتِ فاخرہ'' زیب تن فرماتے ہیں تو وہ کسی طرح ہمارے آپ کے ہاں کے ملازم امیرا منیرا کے روز مرہ لباس سے زیادہ صاف اور شاندار نہیں ہوتا۔ البتہ یہ جوڑا نیا ضرور ہوتا ہے۔ آتے ہی کسانوں کی طرح کسی میدان یا سڑک کے کنارے مقیم ہوئے اور چند معمولی رسوم کے بعد ہی سن لیجیے کہ نکاح بھی ہو چکا اور وداع بھی۔ لڑکی کی والدہ صاحبہ نے چند سیکنڈ نہایت باضابطہ آواز سے کچھ رونا رویا، چند عورتوں نے خدا کے واسطے کچھ گانا گا دیا کہ لڑکی ہمیشہ کے لیے رخصت۔ نہ ولیمہ کا ہنگامہ، نہ جہیز اور مہر پر جھگڑا۔ مزدور کی لڑکی اور مزدور کا لڑکا قصہ تمام۔ جہیز میں لڑکی کو پیتل، تانبے اور ایک آدھ چاندی کا زیور دے دیا گیا، جس کی تعداد ایک سے دس تک بس ہے۔ برتنوں میں ڈیڑھ دیگچی، ایک آدھ طباق، تھالی، طشت اور چولھے کے اوزار اور ہتھیار عرف دست پناہ ضرور دیا جائے گا اور ٹوکری کا ہونا بھی

ضروری ہے۔ باراتیوں کی تواضع کے لیے اگر دولہا کی طرف سے بہت ہی زیادہ فیاضی اور تکلف سے کام لیا گیا تو شراب پینے کا انتظام کر دیا گیا۔ اب جو دولہا کے ہاں باراتیوں کو شراب مل گئی تو وہ کہاں جاتے ہیں بغیر گانا گائے اور کب بیٹھتے ہیں بغیر ناچ کے چین سے، پس مزدوروں کی بارات آپ کے محلے میں جم جائے تو سمجھ لیجیے کہ اب سارے ناچ گانے کے خود باراتیوں کی نیند بھی حرام۔ ایسے موقع پر باراتیوں کا جوش، ولولہ، مستی اور بے خودی صرف پولیس والے تو روک سکتے ہیں ہم آپ نہیں۔ زیادہ پُر لطف ناچ دولہا میاں کے پچاس برس کے والد صاحب کا ہوا کرتا ہے جو مارے نشے اور بیٹے کی مسرت کے کچھ بہت ہی زیادہ بہک جاتے ہیں اور جو ان سے بھی زیادہ امیر اور دولت مند ہوئے تو ولیمہ کی تقریب بھی کی جاتی ہے، جس میں دولہا کے والد صاحب سے لے کر دولہا تک خانساماں اور بھٹیارے بنے نظر آتے ہیں۔ بہت بڑھیا قسم کا کھانا ''چاول'' ہوتے ہیں جنھیں اس درجہ گندگی کے ساتھ پکایا جاتا ہے کہ اگر ایک لقمہ بھی برطانیہ کے وزیر اعظم صاحب نوش فرمالیں تو مارے استفراغ کے ہندستان سے لے کر لندن تک بھاگتے پھریں مگر طبیعت میں سکون پیدا نہ ہو۔ مزدوروں کا ہندو طبقہ بجائے برتنوں کے درختوں کے پتوں پر کھانا رکھ کر کھاتا ہے جس سے اس کی ذہنی ذلت اور خواری کا پتہ چلتا ہے، پھر کھانا کھانے کے لیے بھی کسی شامیانے اور بہترین مکان کی ضرورت نہیں بلکہ کھلا میدان، سڑک کا کنارہ او گھر کا چبوترہ کافی ہوتا ہے اور ان تمام مقامات میں فرش کی کہیں بھی ضرورت نہیں ہوتی۔ بس خدا کی زمین اور مزدور کا فرش۔ شادی میں شرکت کی عزت کو بڑھانے والی سب سے بڑی علامت یہ ہوگی کہ ہر باراتی کے کپڑوں پر ہلدی کے پیلے رنگ کے نشانات موجود ہوں گے جنھیں بڑے فخر کے ساتھ باقی رکھا جاتا ہے۔

کچھ شک نہیں کہ مزدور کی شادی مصارف کے لحاظ سے دوسرے تمام طبقات کی شادیوں کے مصارف سے کم تر مصارف کی شادی ہوتی ہے پھر بھی رسم بد کے تحت مزدور کو ''برادری کا کھانا کھلانا'' اتنا ضروری قرار دے دیا گیا ہے کہ اسے اس موقع پر قرضدار ہونا پڑتا ہے۔ لطف یہ ہے کہ دُلہن کی طرح دولہا میاں بھی موٹا موٹا زیور پہنتے ہیں، مگر مزدور دولہا کے زیور پہننے پر مذاق اڑانے سے پہلے ہندستان کے تعلیم یافتہ لوگوں کو اپنے ہاں کے والیانِ ملک کا مذاق اڑانا چاہیے جو یورپ

جیسے سنجیدہ اور شائستہ ملک میں بھی مرد ہو کر قیمتی زیورات پہنتے ہیں اور نہیں شرماتے اور اس حماقت کو
اپنی رئیسانہ خصوصیت قرار دے کر اپنے حماقت بھرے دل میں خوش ہوتے ہیں۔ یہی حال موجودہ
زمانے کے ہندستانی طلبا کا ہے جو عورتوں کی طرح چمکدار انگوٹھیاں، گھڑیاں اور سونے کے تعویذ
زیور کی طرح استعمال کرتے ہیں اور اسے اپنی فیشن کا بانکپن سمجھتے ہیں۔

غرض جو اب مزدور کی بیوی شوہر کے گھر آئی تو زیادہ سے زیادہ ایک ہفتہ دلہن کے انداز
میں سرخ رنگ کے کپڑے پہنے نظر آجائے گی مگر ایک ہفتہ کے بعد اب اس کے لئے گھر میں رہنا
معیوب ہے اور اسی لیے وہ شوہر کے ساتھ مزدوری کے لیے ٹوکری لیے مزدوری میں مصروف نظر
آئے گی، لیکن اسی ابتدائی زمانہ میں اس کے مزاج میں ایک خاص بات نظر آئے گی اور وہ شوہر
کے لیے حد سے سوا مستعد، وفادار اور اس کا ادب کرنے والی۔ چنانچہ وہ شوہر کے ساتھ دن بھر کی
مزدوری کی تھکا دینے والی محنت سے واپس ہوتے ہی اپنے جھونپڑے کو صاف کرے گی اور
انتہائی تیزی اور مستعدی سے کھانا تیار کرے گی۔ مزدور کی بیوی کے لیے اس کے شوہر سے زیادہ
قابلِ عزت اس کی ساس ہوتی ہے لہٰذا جس بیوی کی ساس موجود ہے وہ ہرگز اب شوہر کے ساتھ
مزدوری کے لیے نہ جائے گی بلکہ ہر جگہ اور ہر کام میں آگے ساس ہوگی اور پیچھے بہو، لیکن گھر میں
بڑے بڑے کاموں میں وہ ساس کو شریک نہ ہونے دے گی بلکہ اس کی ہدایت کے موافق خود
تمام کام پورے کرے گی۔ وہ جھونپڑے میں رہے یا کسی درخت کے سایہ میں مگر جتنی جگہ میں وہ
رہے گی اسے وہ حد سے سوا صاف رکھے گی۔ اگر کسی بڑے شہر میں گزر ہو گیا یا کبھی دُلہن پن کا
جوش حد سے سوا ہو گیا تو وہ ساس یا شوہر کے ساتھ بازار جا کر آٹھ دس آنے کی نئی چوڑیاں پہن
لے گی۔ ایک ڈیڑھ کنگھی خرید لائے گی اور بس۔ اس سے سوا نہ اسے آئینہ کا شوق نہ جواہرات کی
مالا کا ارمان، بس یوں سمجھ لیجیے گویا وہ دنیا میں صرف مزدوری اور شوہر کی خدمت کے لیے بھیجی گئی
ہے۔ نہ اسے مراد آباد کا پاندان درکار نہ اُگالدان کی حاجت بس جس دن وہ حد سے سوا حسین اور
پری جمال بن جانا چاہتی ہے تو اس دن وہ سر میں تلی کا تیل ڈالتی کیا ہے بھر لیتی ہے جو پیشانی
تک بہتا ہوا صاف صاف نظر آتا ہے اور ممیرے کے سرمہ کے عوض آنکھوں کو جتنا ہو سکتا ہے
کاجل سے سیاہ کر لیتی ہے جو اس کی آرائش کی انتہائی حد ہے اور مزدور بیوی کی اتنی ہی خوبصورتی

اس کے شوہر صاحب اور خاندان کی عزت بڑھانے کے لیے کافی سے زیادہ سمجھی اور مانی گئی ہے۔

اب اگر خدا نے اسے کوئی ''کالا سا بچہ'' بھی عطا فرما دیا تو سمجھ لیجیے کہ اب وہ مکمل عورت ہو چکی مگر بچے کی پیدائش بھی اس کی عام زندگی کی طرح بے اصول ہوگی۔ یعنی اس کے لیے ضروری نہیں ہے کہ وہ پیدائش کے وقت کسی مکان میں ہو یا شہر میں بلکہ جہاں بھی ہو اور جس جگہ بھی، بس ایسے وقت میں اس کا ہمدرد صرف خدا ہوگا یا اس کا شوہر، نہ دایا ہوگی نہ محلے کی عورتیں۔ اسی طرح یہ زچگی کے زمانے میں نہ مقویات کھانے کی عادی نہ رسوم وتقریبات کی خواہش مند بس وقت پر جو مل جائے اور جو ہو سکے۔ اس کے ہاں بھی زچگی کے لیے تین چار دن کا آرام کافی سمجھا جاتا ہے اس کے بعد ہی سے پھر مع بچہ مزدوری اور کاروبار کی ذمہ داری اور بجا آوری۔ ایک خاص بات مزدور کی بیوی میں یہ ہے کہ اب جو اس کے ہاں اولاد کا سلسلہ شروع ہوا ہے تو اب وہ بند ہونے کا نام نہ لے گا۔ چنانچہ یہ بالکل صحیح ہے کہ اولاد کی جو کثرت مزدور کے ہاں نظر آتی ہے وہ انسانوں کے دوسرے طبقوں میں شاید ہی کہیں نظر آئے۔ پھر اس کے بچوں کے لیے حسن وخوبصورتی تو شاید دنیا میں پیدا ہی نہیں کی گئی، اس کے بچے جتنے زیادہ ہوتے ہیں اتنے ہی گندے، میلے چیکٹے، لنگڑے، کالے، اونچے، نیچے اور عجب عجب قسم کے ہوتے ہیں، مگر اس بیوی کی دلیری کا یہ حال کہ ایک ہی وقت میں وہ دس دس بچوں کی خدمت، نگرانی اور پرورش کے فرائض انجام دیتی ہے مگر ہمت نہیں ہارتی۔ البتہ اولاد کی کثرت سے اس کے مزاج میں سختی اور شدت ضرور پیدا ہو جاتی ہے اور اسی سے وہ بچوں کی صحیح نگرانی اور خدمت، سے بھی ایک حد تک بے پروا ہو جاتی ہے۔ چنانچہ اسے چھوٹے بچے کا حد سے زیادہ رونا چلاّنا، تڑپنا اور بے چین ہونا نہ اس کی مزدوری سے روکتا نہ اسے ان کی طرف متوجہ کرتا، نہ وہ ان میں سے ہر ایک کے لیے گوٹے کناری کے کپڑے بنانے پر دم دیتی ہے نہ ان میں سے ہر ایک کو گلے میں لٹکائے رہنے کو اپنا ''ماں پن'' سمجھتی۔ یہی حال اس کے بچوں کا ہوتا ہے کہ اگر دو بچے پھٹے پرانے چیتھڑے پہنے ہیں تو دو بالکل ہی ننگے نظر آئیں گے، دو اگر ماں کی بغل میں سو رہے ہیں تو تین کسی چٹان پر، ایک اگر کسی چارپائی پر ہے تو دو زمین پر، ایک اگر کھیل رہا ہے تو تین آپس میں لڑتے لڑتے گتھ گئے

ہیں اور چلا چلا کر ماں کو مخاطب کرتے بھی ہیں تو ماں مخاطب نہیں ہوتی اور جو آخر میں مخاطب بھی ہوئی تو اس طرح کہ جو چیز ہاتھ میں آ گئی اسی سے سب کو ٹھونک کر رکھ دیا اور فارغ ہو گئی۔ پھر اگر یہ بچے روتے روتے بے ہوش ہو جائیں تو اسے غم نہیں اور اگر سو جائیں تو اسے پروا نہیں، نہ ان کے لیے وہ کھلونے خریدے گی نہ مٹھائی کا روزانہ بندوبست کرے گی اور جو کسی دن بچوں کو مٹھائی دلانا ہی پڑے گی تو اس طرح کہ ان کے ساتھ کھانے میں یہ خود بھی شریک ہو جائے گی، مگر کھاتے وقت بھی اسے بچوں کی لڑائی سے فرصت نہ ہوگی۔ اس کے منہ میں لڈو ہوگا اور ہاتھ میں بچوں کے مارنے کے لیے لکڑی۔ اس کے ہاں بچوں کی بیماری کے لیے نہ کوئی حکیم آتا نہ ڈاکٹر نہ اس کے پاس کوئی شفاخانہ نہ عطار کی دکان۔ بس اول تو بچے خود بخود اچھے اور صحت یاب ہو جاتے ہیں یا پھر جنگل کی خدا جانے کیسی کیسی دوائیں ہیں اور اس کے بچے اور خدا کا فضل کا وہ اچھے تو ہو جاتے ہیں مگر مرتے نہیں۔ اسی تربیت کے ہاتھوں نہ اس کے بچے کسی کو جھک کر سلام کرنا جانتے نہ کسی مدرسے اور مکتب کو پہچانتے۔ بس ان کا پانچ چھ برس کی عمر میں داخل ہونا کافی ہے کہ یہ بھی والدہ صاحبہ کے ساتھ مزدوری میں شریک ہو جاتے ہیں۔ اب بچوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا جاتا ہے اور آمدنی میں کمی۔ نتیجہ یہ کہ مزدور کی بیوی روٹی اور کپڑے کے حساب سے زیادہ مشکلات میں مبتلا ہو جاتی ہے اور بچے آئے دن کی فاقہ کشی اور محنت کی تھکن سے بلحاظ صحت و اخلاق دنیا کی پست تر اور بدترین انسان ہوتے جاتے ہیں۔ اب مزدور کی اس نئی نسل میں اعلیٰ درجہ کی تندرستی، خاندانی تربیت، جماعتی اصول کی پابندی، بلند تر اخلاق، بہتر معاشرت وغیرہ یعنی آدابِ انسانیت کا وجود ہو تو کس طرح؟

اسی لیے آپ دیکھیں گے کہ جب مزدور اپنی بیوی سے ناراض ہوگا تو بس الامان۔ اب اگر ناراضی کے وقت اس کے ہاتھ میں جوتا آ جائے تو جوتا، لکڑی آ جائے تو لکڑی، لوہا آ جائے تو لوہا، پتھر آ جائے تو پتھر غرض جو کچھ وقت پر مل جائے وہ اس کے ذریعہ اپنی بیوی کو مارنا شروع کرتا ہے پھر مار کے لیے نہ کوئی حد ہے نہ انداز نہ معیار ہے نہ ضابطہ بس جب تک اس کا جی چاہے وہ اپنی بیوی کو مار سکتا ہے۔ پھر مارنے کے لیے یہ بھی نہیں کہ صرف چانٹا مار دے بلکہ وہ مارنے کے ساتھ ہی کاٹ بھی سکتا ہے اور نوچ بھی سکتا ہے، گھما بھی سکتا ہے اور لٹکا بھی سکتا ہے غرض دنیا میں

جتنے قسم کی فوجداری اور کوتوالی ہوسکتی ہے وہ سب اپنی بیوی پر صرف کرسکتا ہے۔ ایک سب سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ مزدور کی بیوی کو لڑائی کے وقت بچانے کے لیے نہ محلے والے تیار نہ پڑوس والے موجود اور یہ اس لیے کہ اکثر یہ لوگ ویرانوں میں مقیم ہوتے ہیں اسی لیے جس وقت مزدور اپنی بیوی کو مارنا شروع کرتا ہے اس وقت اس کے چھوٹے چھوٹے دس بارہ بچے اپنی ماں کے رونے میں شریک نظر آتے ہیں اور بس، مزدور کی بیوی اکثر چولہے کے پاس والی لکڑی سے مار کھاتی ہے اس لیے کہ اس کے شوہر کی ناراضگی، خفگی اور غصے کا وقت شام ہی کے کھانے کے وقت شروع ہوتا ہے۔ اُدھر بیوی نے مزدوری سے واپس آ کر چولھا روشن کیا اِدھر مزدور صاحب مزدوری سے فارغ ہوکر یا شراب پی کر آئے یا تاؤ میں بھرے ہوئے بس ابھی کہ بیوی نے ایک ہی روٹی تیار کی تھی کہ شوہر صاحب نے سیدھی سیدھی اور نہایت درجہ غلیظ گالیوں سے بیوی کو مخاطب کیا اور جنگ کا آغاز ہوا۔ اب جتنا وقت گزرتا جائے گا شوہر صاحب کی گالیوں اور غصے کا زور بڑھتا جائے گا، مگر ابھی بیوی کی آواز شوہر سے اونچی نہ ہوگی۔ اب اگر آپ اس کے محلہ دار ہیں تو یہی سمجھیے گا کہ آج مزدور کی بیوی کو کچھ یوں ہی ڈانٹ رہا ہے بس جیسے ہی کہ آپ نے یہ خیال قائم کیا کہ اُدھر مزدور صاحب نے بیوی صاحبہ پر دھاوا بول دیا۔ یہ دھاوا بول دیا اس لیے لکھا کہ مزدور صاحب کے غصے میں کوئی سلیقہ نہیں ہوتا۔ اول تو اس لیے کہ وہ مزدور ہی تو ہیں کہیں کے لکھنوی بیرسٹر تو ہیں نہیں جو بیوی سے بھی بہ وقت غضب واللہ، چنانچہ کہہ کر خاموش ہوجائیں۔ پھر یہ مزدور بھی کیسا کہ تاؤ سے بے قابو، پھر ایسے بپھرے ہوئے مزدور سے یا خدا بچائے یا پولیس۔ محلے والوں کی کیا مجال جو ''دخل درمیان بیوی'' فرماسکیں۔ نتیجہ یہ کہ جوتے، لکڑی، گھونسے، طمانچے اور چانٹوں سے بڑھ کر جب معاملہ دنگل کی صورت اختیار کر لیتا ہے تب کہیں جا کر شوہر کا غصہ کم ہوتا ہے، مگر مُلّا رموزی نے مزدور کو جب اپنی بیوی کو ٹھونکتا ہوا پایا ہے اس کے لحاظ سے یہ کہنا غلط ہے کہ مزدور کا غصہ کم ہوجاتا ہے بلکہ یوں کہیے کہ وہ مارتے مارتے بے دم ہوجاتا ہے تب کہیں بیوی صاحبہ نجات پاتی ہیں البتہ اس معاملے میں ایک خاص بات نہایت حیرت انگیز ہے وہ یہ کہ دنیا کی تمام بیویوں سے مزدور کی بیوی جتنی زیادہ مار کھاتی ہے اس کی نظیر ہی نہیں مگر اس پر بھی نہ اس کے سر سے خون بہتا نہ اس کی ٹانگ ٹوٹتی ؟ اس لیے کافی مطالعہ کے

ذریعہ مُلّا رموزی نے معلوم کرلیا کہ مزدور کے ٹھونکتے وقت مار سے زیادہ اس کا شور ہوتا ہے اور اس شور میں مار کھانے والی بیوی کا شور شامل ہو کر اصل مار کو بے حد کم کر دیتا ہے۔ یہی تو راز ہے جو رات کو چار مرتبہ مار کھانے کے بعد صبح سے پھر بیوی صاحبہ بغیر طلاق اور مقدمہ دائر کیے اسی مارنے والے شوہر کے ساتھ ٹوکری لے کر مزدوری کے لیے تشریف لے جاتی نظر آتی ہیں، ورنہ جناب ہزار کچھ ہو مار کھائی ہوئی بیوی بھی کم از کم تین دن شوہر صاحب کا کھانا تو حرام کر ہی دیتی ہے مگر مزدور کی بیوی مار کھا کر جو کچھ کرتی ہے وہ یہ کہ شوہر کو جی بھر کے سیدھی سیدھی سنا لیتی ہے اور بددعا کرتی ہے مگر کیا مجال جو وہ لڑائی کے بعد ایک ہی دن کا کھانا پکانے سے انکار تو کر دے۔ اسے دوست احباب اور رشتہ داروں کی تقریبات میں شرکت کا موقع نہیں ملتا اس لیے کہ وہ ہمیشہ شہر اور محلے سے دور رہتی ہے اور جو خدانخواستہ کبھی ایسا موقع مل گیا تو اس وقت اس کی آرائش اور تقریب میں شرکت کا بندوبست دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ بس یوں سمجھیے کہ اس کے پاس زیور اور لباس کا کوئی ذخیرہ نہ پہلے تھا نہ اب ہے۔ یہی حال بچوں کے ننگ دھڑنگ پن کا ہوتا ہے۔ بس وہ محفل میں جاتے وقت اپنے منہ پر بہت زور سے قلعی کرتی ہے۔ اگر مل گیا تو سرمہ ورنہ کاجل سے آنکھیں کالی کیں، پرانے کپڑوں کو دو تین پیسے کے دیسی صابن سے دھویا اور محفل میں اس خوشی سے پہنچ گئیں گویا وہ عیدگاہ تشریف لے گئی ہیں۔ یہ بیوی گرہستی اور امور خانہ داری کے لحاظ سے کارآمد نہیں اور اس لیے نہیں کہ وہ کچھ جانتی ہی نہیں بلکہ اس لیے کہ اسے اتنی دولت ہی حاصل نہیں ہوتی کہ وہ اپنے گھر میں کوئی قابلِ ذکر انتظام کر سکے۔ اسی لیے نہ اس کے ہاں بستر موجود نہ کپڑوں کے صندوق، نہ پورے برتن نہ چارپائی یہاں تک کہ کھانا پکانے کے لیے بھی مٹی کی ہانڈی کے سوا باقی سب طرح خیریت۔ اسی لیے دیکھا گیا ہے کہ یہ خود، اس کا شوہر اور اس کے بچے ہمیشہ ننگ دھڑنگ گندے اور غلیظ ہوا کرتے ہیں۔ خود اس کے جسم کا آدھے سے زیادہ حصہ برہنہ رہتا ہے خصوصاً علاقۂ بمبئی، مدراس، گجرات اور پونا میں۔ خود ملّا رموزی نے دیکھا ہے کہ مزدور کی بیوی صاحبہ اپنے جسم کو بقدرت ضرورت ہی چھپائے رہتی ہیں۔ چونکہ مزدور کی آمدنی اکثر یومیہ یا روزانہ ہوتی ہے اس لیے شام کو جتنے دام ملے ان کا سودا سلف شام ہی کو لائے اور کھا کر صبح کو پھر فقیر کے فقیر، اس لیے مزدور کی بیوی خانہ داری کے سلیقے کے لحاظ سے نہایت

بے کار ہوتی ہے۔ نہ اس میں کفایت شعاری کی عادت نہ سلیقے اور تمیز کا پتہ۔ اسی لیے اس کا گھر اول تو ہوتا ہی نہیں، بلکہ خانہ بدوش زندگی کے باعث اس کی ساری گرہستی درختوں کی شاخوں پر اس طرح لٹکی نظر آتی ہے کہ ایک شاخ پر اس کا بستر لٹک رہا ہے تو دوسری شاخ پر ہانڈی، تیسری پر پانی کا برتن تو چوتھی شاخ پر اس کا بچہ۔ اسی درخت کے نیچے اس کا چولھا اور خوابگاہ اور اسی کے نیچے اس کے شوہر کا بستر اور جو کسی مزدور صاحب کا مکان ہوا تو اس طرح کہ دروازہ اتنا مختصر کہ بغیر سجدہ کیے اندر داخل ہونا محال۔ پھر اندر جائیے تو مارے تاریکی کے دن کو چراغ کی ضرورت۔ اگر دو تین دیواریں اچھی تو ایک دیوار اتنی شکستہ کہ گھر میں ہاتھی بھی داخل ہو جائے اور چور بھی۔ پھر دماغی پستی یا تنگدستی کا یہ حال کہ جو دیوار شکستہ ہو جائے وہ عمر بھر شکستہ ہی رہے گی مگر مزدور اسے درست نہ کرائے گا نہ اس کی بیوی تعمیر کے لیے بے چین نظر آئے گی۔ پھر اگر اس کے مکان کا صحن کشادہ اور وسیع ہو گا تو اس میں ہمیشہ کوڑے کرکٹ کے انبار نظر آئیں گے صرف اتنا حصہ صاف ملے گا جو مزدور کے لیے اٹھنے بیٹھنے کے لیے ضروری ہے۔ مزدور کی بیوی ہی وہ بیوی ہوتی ہے جس کا مزاج کپڑے، گھر، برتن اور بستر کی ہزار ہا قسم کی گندگی کو برداشت کر کے کھانے کے معاملے میں بھی نہایت درجہ گندہ کھانے کو برداشت کر لیتا ہے۔ خالص جہالت، پست تر اور برادری اور گندہ صحبت کے باعث یا مالی مجبوری کے باعث مزدور کی بیوی کے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا ہرگز اس قابل نہیں ہوتا کہ اسے کھایا جائے۔ اس کے پکائے ہوئے کھانے میں گندگی، بدبو اور مکروہ صورت ہونے کی تمام علامتیں ہوتی ہیں مگر یہ اور اس کا شوہر اس کھانے کو بڑے مزے لے کر تناول فرماتے ہیں۔ ان میں سے بعض تو مردہ جانوروں کا پلاؤ پکانے سے بھی نہیں چوکتے۔

البتہ یہ بیوی مزاج اور عادات کے لحاظ سے نہایت درجہ قابلِ احترام ہوتی ہے۔ وہ شوہر کی حد سے سوا مطیع، فرماں بردار، خدمت گزار اور اس سے محبت کرنے والی ہوتی ہے اور یہ اس لیے کہ اس کی ذہنی حالت بے علمی کے باعث نہایت محدود ہوتی ہے، اس لیے اس کی خواہشات اور مطالبات کا کم ہونا ایک فطری نتیجہ ہے۔ مشکل تو ان ہڑ دنگیوں کے لیے ہے جنھیں شروع ہی سے بنارس کی ساریاں پہنائی جائیں، کلائی پر گھڑی باندھی جائے اور اسکول میں پڑھا کر دماغ کو ساری دنیا کے حالات سے واقف کرایا جائے اور پھر کہا جائے کہ آج کل کی بیوی دوزخ کا نمونہ ہوتی

ہے۔

مزدور کی بیوی کا حلیہ یوں واقع ہوتا ہے کہ اس کا رنگ ہمیشہ سیاہ اور سفیدی کا دشمن واقع ہوتا ہے۔ جسم کے اندر مزدوری کی مشقت سے کبھی موٹاپا پیدا نہیں ہوتا۔ صورت کے حساب سے جیسے ڈھائی مہینے کی مریضہ، قد میں ایک حد تک دراز، تبسم اور بشاشت کا چہرے پر وجود بھی نہیں، صرف بچہ کو کھلاتے وقت مسکراتی ہے۔ اتنے حالات مُلّا رموزی کے ذاتی تجربات تھے مگر خوش قسمتی سے اس مضمون کے لکھتے وقت یعنی جنوری 1931 میں شہر لاہور میں تمام ایشیا کی عورتوں کی ایک سالانہ مجلس کا اجلاس منعقد ہوا اور اس میں ہندستان کے مزدور کی بیوی کی اس مجلس کی صدر خاتون نے جو کچھ کہا وہ یہ ہے:

> ''ڈاکٹر متھولکشمی ریڈی، صدر آل انڈیا خواتین کانفرس و سابق ڈپٹی پریزیڈنٹ مدراس کونسل نے کہا کہ مدراس کی عورتیں زیادہ تر چائے کے کھیتوں اور کانوں میں کام کرتی ہیں یا رسّی بٹنے اور قلیوں کے کام پر دیکھی جاتی ہیں، اگر ہندستان بھر میں دیکھا جائے تو مرد مزدور کی بہ نسبت عورت مزدور کی تعداد کبھی کم نہیں، مگر مجھے حیرت ہے کہ ہندستان بھر میں صرف ایک عورت انسپکٹر ہے اور یہ اس لیے کہ عورتوں کی ناخواندگی کا فائدہ اٹھایا جا رہا ہے۔ اس لیے ضرورت ہے کہ عورتوں کے لیے ترقی اور کاروبار کا میدان وسیع کیا جائے کیونکہ ایک عورت کو دن بھر میں کارخانے میں کام کرنے کے بعد پھر گھر میں جا کر کام کرنا، کھانا پکانا اور بچوں کو سنبھالنا پڑتا ہے، عورت مزدور کے لیے آمدنی کا جو اندازہ میں نے کیا ہے وہ یہ ہے کہ ایک عورت مزدور کو سولہ روپیہ دو آنے چھ پائی ماہوار آمدنی ہوتی ہے اور اگر وہ ایک دن غیر حاضر ہو جائے تو اس کی تنخواہ کاٹ لی جاتی ہے، میں دیکھتی ہوں کہ ہندستان کے مزدور کی کمائی کو بے رحمی کے ساتھ لوٹا جاتا ہے، ان کے بچوں کی تعلیم کا انتظام کرنا بھی ضروری ہے۔ دیکھا جاتا ہے کہ کارخانوں میں بے حد چھوٹی عمر کے بچے کام کرتے ہیں اور قانون موجود ہے کہ 12 سال سے کم عمر کے بچوں کو فیکٹری میں نہ لیا جائے مگر

لوگ باز نہیں آتے''۔

(ملاحظہ ہو اخبار ''ملاپ'' لاہور، مورخہ 24 جنوری 1931ء ص:7)

یہ ہیں ہندستانی مزدور صاحب کی بیگم صاحبہ، اب اس بدنصیب بیوی کے لیے سب سے آخری مشکل یہ ہے کہ اسے جماعت میں قابلِ توجہ ہی نہیں سمجھا جاتا ورنہ اس کی مشکلات کا دور ہو جانا مشکل نہیں۔ خدا لیڈروں کو توفیق دے کہ وہ مزدور صاحب کی اہلیہ محترمہ کی خدمت و ترقی پر متوجہ ہوں۔ فقط۔

◆◆◆

مہاجن کی بیوی

جس طرح یورپ میں یکساں کوٹ پتلون کے باعث ایک مہاجن اور وزیر اعظم کے درمیان فرق کرنا مشکل ہے اُسی طرح ہندستان میں مہاجن کی صحیح تعریف مقرر کرنا بھی مشکل ہے۔ اگرچہ اجتماعیات، اقتصادیات اور اخلاقیات کے اعتبارات اور اس کی ہمہ گیر زندگی کے اثرات کے لحاظ سے یہ اس درجہ اہم ہستی قرار دے دی گئی ہے کہ اس پر مضمون نگاری کے ساتھ ساتھ شاعری بھی ہوتی رہتی ہے، مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ مہاجن کے اوپر ماہوار مشاعرے منعقد ہوتے ہیں بلکہ مضامین کی طرح اس کی زندگی پر شعرا نے بھی اظہارِ خیال کیا ہے۔

بظاہر تو مہاجن وہ شخص ہے جو تجارتی کاروبار کرتا ہو، اس کی ایک یا چند دُکانیں ہوں وہ جسم کے حساب سے ایسا ہو جیسے پانی کے چھڑکاؤ کی گاڑی کو کھڑا کر کے اس کے سرے پر آدمی کا سر لگا دیا جائے۔ گو متعدد اصحابِ قلم نے اس کا حلیہ اور اس کی سیرت کے متعلق اظہارِ خیال کیا ہے لیکن اصلیت کے لحاظ سے نہیں کہا جا سکتا ہے کہ کس کا لکھا ہوا صحیح اور مکمل ہے۔ فی الجملہ مہاجنوں کی جتنی قسمیں ہو سکتی ہیں ان میں سے بعض یہ ہیں:

مہاجن نمبر ایک وہ جو کئی کروڑ یا کئی لاکھ روپے کا مالک ہو اور خواہ یہ بے شمار روپے خود اس نے کمایا ہو یا اس کے والد کے والد کا ہو یا اس کے صرف والد کا ہو، یا نانا کے نانا کا ہو یا اس کے

صرف نانا نے اس کے نام لکھ دیا ہو اور مر گیا ہو یا اس کا نہ باوا ہو نہ دادا، نہ نانا ہو نہ نانی ہو بلکہ اسے کسی مہاجن نے مرنے سے پہلے اپنا بیٹا بنایا اور اپنی تمام دولت اس کے نام لکھ دی ہو کہ بعض مہاجن اس قسم کے بھی ہوا کرتے ہیں۔ پس جو مہاجن کہ لاکھ سے اوپر کا ہوگا وہ اپنے کاروبار کا صرف نگران رہے گا، اس کے پاس لاکھوں کی کوٹھیاں، گھوڑے، موٹر کاریں، خدام اور ملازم غرض سب کچھ ہوتا ہے۔ یہ بہت زیادہ صاف اور پاکیزہ لباس پہنتا ہے، عورتوں کے زیورات میں سے مرد ہو کر بھی نصف کے قریب زیور پہنتا ہے، تجارت کے حسابات اکثر گھر پر اور کبھی کبھی دُکانوں پر جا کر سمجھتا ہے اور ان میں کے بعض ''آنریری مجسٹریٹ''، ''خان بہادر''، ''رائے بہادر'' اور ''کرسی نشین'' بھی ہوتے ہیں مگر اس طبقے کی تعداد پانچ فیصدی آبادی کے برابر بلکہ اس سے بھی کم ہے۔

البتہ نمبر دو کے مہاجن کسی قدر زیادہ ہیں۔ ان کے کاروبار کا حلیہ نمبر ایک کے مہاجن سے ملتا جلتا ہے۔ بس اتنا فرق سمجھیے کہ یہ اپنے کاروبار میں خود اپنی ذات سے زیادہ حصہ لیتا ہے۔

نمبر تین کا مہاجن، مہاجن ہونے پر بھی مذکورہ بالا مہاجنوں سے کافی حد تک علاحدہ اور مختلف فیہ ہوتا ہے۔ اس کے اختلاف فیہ یہ ہے کہ اس کے کاروبار کی نوعیت نہایت درجہ ہمہ گیر اور عالمگیر ہوتی ہے۔ شراب، گانجے، افیون، چرس، بھنگ، چانڈو اور بیڑی سگریٹ سے لے کر وہ گیہوں، چنے، باجرے، جوار، گھوڑے، بیل، ہاتھی، گدھے، آلو، پیتل، تانبے، سونے، چاندی، جواہر اور بمبئی کے چور بازار کی ایک ایک چیز کی تجارت سے نہیں چوکتا۔ وہ کھیتی باڑی، قرض، روپیہ، نیلام، قُرقی، وارنٹ اور گرفتاری کی تجارت تک سے باز نہیں رہتا۔ کپڑے، زیور، بساط خانے، چمڑے، جوتے، لوہے، سوڈا واٹر، موٹر، سنیما اور تھیٹر، فوٹو گرافری، تعمیرات اور توپ وتلوار کی دکان اور ان چیزوں کے سامان کی تجارت پر حاوی ہوتا ہے۔ وہ مردہ انسانوں کو جلانے، دفن کرنے، سڑک بنانے، ریلوں کے پُل بنانے، دفتروں میں قلم دوات، کاغذ اور فرش مہیا کرنے کے ٹھیکے ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔ وہ بازار میں کھڑے ہو کر اس ٹوپی کے ساڑھے چار آنے، بولو پیارو اس ٹوپی کے ساڑھے چار آنے، ساڑے چار آنے ایک ساڑھے چار آنے دو اور یہ ساڑھے چار آنے تین، کی بولتا ہے، وہ نہیں تو اس کی چھوٹی عمر کی اولاد پان بیڑی سگریٹ اور ماچس سرِ بازار فروخت کرنے سے نہیں شرماتی۔ غرض مہاجن وہ جو نفع کی ایک کوڑی کو ہاتھ

سے نہ جانے دے۔

اس کا حلیہ یوں واقع ہوتا ہے کہ یہ ابتدائے عمر میں عام لڑکوں کی طرح لڑکا ہوتا ہے۔ جوانی تک پہنچ کر یہ تجارت کے جاہلانہ اصول کی تکمیل کر لیتا ہے یعنی اس کی تعلیم باضابطہ طور پر مکمل نہیں ہوتی بلکہ اپنے خاندان کے مروّجہ اصول گھر ہی میں سیکھ لیتا ہے البتہ وہ ہندی، گورمکھی، گجراتی، مرہٹی، مارواڑی، بنگلہ اور تامل زبانوں میں اتنی لیاقت ضرور پیدا کر لیتا ہے کہ حسابات کو لکھ سکے۔ زبانِ اردو میں حسابات لکھنے والے کو مہاجن کے عوض سیٹھ صاحب کہنا زیادہ موزوں ہوگا اور ایسے حساباتِ صرف مسلمان لکھتے ہیں جن کے پاس تجارت برائے بیت ہوتی ہے۔

اب جوانی سے اس کا آگے بڑھنا ہزاروں قیامتیں اپنے ساتھ لاتا ہے مثلاً یہی بات کیا کم قابلِ حیرت ہے کہ یہ جوانی کے بعد ہی سے موٹاپے کی طرف کچھ اس طرح دوڑتا ہے کہ اسے دیکھیے اور حیران رہ جایئے۔ اس کے موٹاپے کے متعلق صحیح تحقیق کرنے سے جرمنی کے سائنس داں بھی اس لیے ساکت نظر آتے ہیں کہ یہ ماش کی دال کھاتا ہے مگر موٹاپے میں وہ جرمنی حکومت کے صدر فیلڈ مارشل وان ہنڈن برگ کو سومرتبہ مات دیتا ہے، پھر اس قسم کا موٹاپا کیا کم سائنس پاش اور سائنس شکن ہے۔

یہ سب طرف سے تو خاصا انسان ہوتا ہے مگر شکم عرف پیٹ کو یہ اس طرح موٹا بناتا ہے کہ آپ اسے اب نہ بالکل جانور ہی کہہ سکتے ہیں نہ بالکل انسان مگر وہ ہوتا ہے کہ اسی پیٹ کے ذریعہ دن کے وقت دیو نظر آتا ہے اور رات کے وقت بھوت، مگر تحقیق کے بعد نہ وہ دیو رہتا ہے نہ بھوت بلکہ ہر حال میں انسان۔ ہاں اس کے اخلاق اور گفتگو میں زمین آسمان کا فرق ہر وقت موجود رہتا ہے یعنی وہ اخلاقی حساب سے نہایت درجہ بے رحم، ظالم، تباہ کن، بے مروت، سخت گیر اور انسانوں کا خون چوسنے والا ہوتا ہے۔ یعنی جس طرح بھی ہوسکتا ہے وہ روپیہ کماتا ہے مگر گفتگو میں قرض خواہ اور قرضدار سے اس درجہ حلیم، رحیم، کریم اور سخی ہو کر رہتا ہے کہ جتنا چاہو مال قرض لیتے جاؤ وہ دیتا جائے گا۔ اس کی دُوکان پر پہنچ جایئے پھر دیکھیے اس کی تواضع کا عالم۔ وہ آپ کی تعظیم کے لیے کھڑا بھی ہو جائے گا اور مصافحہ بھی کرے گا۔ وہ اپنے برابر آپ کو جگہ بھی دے گا اور تمام دانت منہ سے باہر نکل کر ہنستا رہے گا۔ وہ پان، سگریٹ، چائے اور برقی پنکھے سے بھی دریغ نہ کرے گا۔ غرض ہر

طرح خود کو آپ کا غلام، نوکر، جاں نثار اور خیر خواہ ثابت کرے گا۔ پھر اپنا مال آپ کو فروخت کرے گا مگر اس حسن اور سلیقے سے کہ آپ ہر حال میں ایک کے چار دے کر آئیں اور معلوم نہ کر سکیں۔ اس کے بعد اگر آپ نے اس سے قرض روپیہ یا قرض مال لے لیا تو سمجھ لیجیے کہ اب یہ مہاجن ہی کا کمال کہلائے گا کہ وہ آپ سے براہِ راست گفتگو بھی نہ کرے گا مگر آپ کے گھر، آپ کے مال، آپ کی تنخواہ اور آپ کی بیوی کے زیور سے لے کر بستر تک نیلام اور قُرق کرا دے اور جیل خانے میں ٹھونس کر بھی آپ سے ذاتی طور پر بے مروّت اور بد اخلاق نہ ہو، اسی لیے دنیا کی ہر مذہبی اور غیر مذہبی کتاب میں صاف صاف لکھا ہے کہ خدا جس سے چاہے بچائے یا نہ بچائے مگر مہاجن کے قرض سے ضرور بچا لے۔

بارے اب چند دن سے علم و تعلیم کی ترقی سے جہاں مہاجن کے حالات و اخلاق میں قدرے تبدیلی شروع ہوئی ہے وہاں عوام میں بھی اس طبقہ کے خلاف ایک اثر پیدا ہوا ہے۔ چنانچہ عوام خصوصاً کاشتکاروں کو ''مہاجنی قرض سے'' سے محفوظ رکھنے کے لیے پنجاب اور بعض دوسرے صوبوں میں ایسے اشخاص کھڑے ہو گئے ہیں جو مہاجن کے مظالم سے عوام کو آگاہ کر کے انھیں دوسرے ذرائع سے امداد بہم پہنچا رہے ہیں۔

عوام کے ساتھ کہیں کہیں اخبارات اور رسالے بھی ان لوگوں کے خلاف لکھتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اصحابِ قلم نے بھی ان پر توجہ مبذول کی ہے۔ چنانچہ ملّا رموزی کو یاد ہے کہ رسالہ ''نیرنگ خیال'' لاہور بابت 1929 یا 1930 کی کسی اشاعت میں ''مہاجن'' کے عنوان سے ایک مضمون شائع ہوا تھا جس میں ظریف پیرایۂ بیان کے ساتھ اس کے مظالم کو دکھاتے ہوئے اس کی ''توند'' پر خاص کر طبع آزمائی کی گئی ہے۔ اسی طرح اخبار ''ملاپ'' لاہور کی مختلف اشاعتوں میں ''مہاجن'' کے متعلق کارٹون شائع ہوئے تھے۔ چند بنیادی انجمنیں بھی قائم ہو چکی ہیں جو اس طبقہ کے مظالم کی روک تھام کے فرائض کرنے کی دعویدار ہیں لیکن ان تمام کوششوں کے باوصف ابھی مہاجن بدستور مہاجن ہے، اس لیے ہمیں اس کے حالات سے بحث میں کوئی اصولی تامل نہیں، لہٰذا واضح ہو کہ مہاجن کی بیوی کی پیدائش کے وقت خوشی اور مسرت کی جو تقریبات اور رسوم ادا کی جاتی ہیں ان کی شاہانہ شان کا انداز مشکل ہے، یعنی مہاجن کے گھر بچہ پیدا ہونے کی تقریب پر بے شمار

روپیہ خرچ کر کے اظہارِ مسرت کرنے کے دو ہی سبب ہو سکتے ہیں ایک یہ کہ مہاجن کے ہاں اولاد کم ہوتی ہے، اس لیے جب ہوتی ہے تو خوشی بھی زیادہ ہوتی ہے۔ دوسرے یہ کہ مہاجن کے پاس دولت بے شمار ہوتی ہے اور مصارف کم، لہٰذا جب اولاد کی پیدائش پر دولت صرف نہ کی جائے گی تو کیا مُلّا رموزی صاحب کی کتابیں چھپوانے کے لیے دولت خرچ کی جائے گی؟

پس لڑکی کا پیدا ہونا کسی دیسی رئیس کی ''تاج پوشی'' کے اناپ شناپ جشن کا ہم شکل ہوا کرتا ہے۔ چنانچہ جس طرح کوئی رئیس اپنے جشن کو شاندار سے بھی زیادہ شاندار طریقہ سے منانے میں نہ خدا سے ڈرتا نہ اپنی رعایا کے بندوں سے، اسی طرح مہاجن بھی بچے کی پیدائش سے کچھ اس درجہ بھی بے خود اور مدہوش ہو جاتا ہے کہ مہینوں دروازے پر نقارے اور شادیانے بجانے کا حکم صادر کر دیتا ہے۔ اس موقع پر اس کی فیاضی کا عالم حاتم طائی مرحوم و مغفور سے کسی طرح کم نہیں ہوتا۔ دایا، ماما، نوکر، خادمہ، چوکیدار اور چپراسی سے لے کر لیڈی ڈاکٹر صاحبہ تک کا خلعت ہائے فاخرہ بنایا جاتا ہے، مگر کمی نہیں کرتا۔

پھر پیدائش کے بعد سے جوانی تک اب اس کی بیٹی ہے اور زیور پر زیور ہے۔ چنانچہ دیکھا گیا ہے کہ جتنا بھاری، قیمتی اور کثرت سے مہاجن کی بیٹی زیور پہنتی ہے بادشاہوں کی بیٹیوں کو بھی نصیب تو ہوتا ہے مگر پہنایا نہیں جاتا۔ چونکہ اس کے ہاں تعلیم اور عقل کی ذرا کمی ہوتی ہے، اس لیے وہ ہر قسم کا لاڈ پیار اسی کو سمجھتا ہے کہ بس لڑکی کو زیور پہنائے چلا جائے۔ اسی مقدار اور انداز سے وہ ریشم، اطلس، کمخواب اور سنجاب وسمور کی پوشاکیں پہناتا ہے۔ گویا مہاجن زادی کیا ہوتی ہے گورنمنٹ کا چلتا پھرتا خزانہ اور توشک خانہ ہوتا ہے، جس میں نہ زور زیور کی کمی نہ ریشم و اطلس کے کپڑوں کا کال، مگر اس ابتدائے عمر سے انتہائے جوانی تک اس کی باضابطہ تعلیم وتربیت کا کوئی قابلِ تعریف بندوبست نہیں ہوتا، بس ''کھاؤ اور پہنو'' پر عمل ہوتا ہے۔ اسی لیے اس کے خیالات میں کوئی لائق تذکرہ تبدیلی نہیں ہوتی۔ ہاں چند دن سے اسکولوں میں بھیجا جانا منظور کر لیا ہے، ورنہ ''گھریلو تعلیم'' اور بس۔

اب اس کی دولت کی بربادی کا دوسرا زمانہ اس کی شادی سے شروع ہوتا ہے۔ شادی کے لیے خاندانی اور برادری کے سلسلے کا قائم رکھنا بہت زیادہ ضروری شرط ہے۔ یہ نہیں کہ سیّد ہو یا

پٹھان، مغل ہو یا شیخ، بس جہاں بی۔اے پاس دیکھا اورلڑکی کو دے مارا، مگر خاندانی اور برادری سلسلے کی طرح لڑکے کے اندر اعلیٰ علمی قابلیت یا آنریری مجسٹریٹی کی تلاش نہیں ہوتی، بس اتنا کافی ہے کہ یہ مہاجن زادی ہے تو وہ بھی مہاجن زادہ ہو، ادھر مہاجن زادہ بھی دولتمندی کے اعتبار سے کچھ کم نہیں ہوتا لہٰذا شادی منظور۔ البتہ مہاجن کی شادی کے مکمل اصول وضوابط سے بحث کرنا کارے دارد والا معاملہ ہے۔ہاں عام طور پر ان کے ہاں شادیاں اور یورپ کے بادشاہوں کی شادیوں میں بس اتنا فرق رہ جاتا ہے کہ بادشاہوں کی شادیوں میں دولت ذرا سلیقے سے برباد کی جاتی ہے اوران کے ہاں آنکھیں بند کرکے۔ پس جہاں اس کی شادی کا معاملہ طے ہوا کہ مہاجن کے دروازے پر یا اس کے باڑے میں یا اس کے احاطے میں یا اس کے چبوترہ پر نقار خانہ تیار ہوگیا، اب چاہے مہاجن صبح دس بجے تک سوتا رہے مگر نقارخانہ ہوگا کہ صبح چھ بجے سے شادیانوں کی آواز سے محلے والوں کی نیند تباہ کردے گا اوراسی زمانے میں اس کے دروازہ پر بھانڈ اور حجام بھی نظر آئیں گے۔ مہاجنوں کی تشریف آوری سے مکان میں جگہ نہ رہے گی، اس کی بارات کی شان کچھ شک نہیں کہ اپنی نظر آپ ہوا کرتی ہے۔ دنیا میں جتنی قسم کے باجے اب تک ایجاد ہوئے ہیں وہ سب اس کی بارات میں موجود ہوں گے۔ پھر اس کے شہر کی رنڈیوں کے ساتھ ساتھ دنیا کی ہر ملکہ جان اور جانی بائی الٰہ آباد والی بھی موجود ہوگی۔ گھوڑے ہوں گے کہ عورتوں کا زیور پہنے اس بارات میں شریک نظر آئیں گے، ہاتھی ہوں گے کہ جھول رہے ہوں گے، غرض اس کے شہر میں اگر حضور وائسرے بہادر بھی رہتے ہوں گے تو ان کی سواری کا موٹر بھی اس کی بارات میں نظر آجائے گا۔شہر کے ایسے تمام معززین بھی ہوں گے جو کبھی کبھی اس کے ''زیربار قرض'' ہو چکے ہوں گے۔ ایک شاندار اور پھولوں سے آراستہ موٹر میں دولہا ہوگا یا ایک زیور پہنے ہوئے گھوڑے پر یا ایک آراستہ بگھی میں۔ بہرحال دولہا کی سواری میں ٹٹو، خچر اوراونٹ نہ ہوگا باقی سب کچھ ہوگا۔ اس کی سواری کے پیچھے معزز مہاجن، معزز بیرسٹر، معزز مجسٹریٹ اور معزز قرضدار ہوں گے جو با قطار اندر قطار بنے ہوئے نظر آئیں گے یا دولہا بھی سوار اور یہ بھی سوار۔ اس کی بارات میں روشنی تو کیا ہوتی ہے یوں کہیے کہ تمام دنیا کے ''بجلی گھر'' ساتھ چلتے ہیں۔ یہی حال ''باغ بہاری'' کی کثرت کا ہوتا ہے اور یہی حال ''آتش بازی'' کی کثرت کا۔ اس کے باراتیوں کے لباس اور زیور کی شان کا یہ عالم

ہوتا ہے کہ دولہا اور باراتیوں میں فرق کرنا مشکل ہو جاتا ہے کیونکہ ہر باراتی آج کے دن زر و جواہر
کا زیور پہننے میں کمی نہیں کرتا۔ باراتیوں کے پیچھے سواریوں کی سواریاں ہوتی ہیں جو چلا چلا کر جو
جی چاہتا ہے گاتی جاتی ہیں اور جھانکتی بھی جاتی ہیں۔ بارات کی حفاظت اور شان کی غرض سے
پولیس کے ہیڈ صاحب بھی اکڑے ہوئے چلتے نظر آتے ہیں اور سپاہی بھی۔ کنارے کنارے شہر
کے غنڈے بھی ہوتے ہیں اور دوسرے تماشائی بھی۔ اب جو بارات دُلہن کے گھر پہنچ گئی تو ایک
دن سے لے کر چار دن تک بھی ٹھہر سکتی ہے اور پانچ دن بھی، مگر ہر وقت رنڈی تھرکتی ہی رہے گی
اور باجے بجتے رہیں گے۔ بارات کے قیام کے لیے شاندار کوٹھی یا شاندار مکان ہوتا ہے، جو آرائش
اور فرش کے لحاظ سے نہایت درجہ ممتاز ہوتا ہے۔ ورنہ پھر کوئی میدان بارونق خیموں اور شامیانوں
سے آراستہ کیا جاتا ہے، دولہا سے لے کر ہر باراتی کے لیے ضروریات اور تواضع کے جملہ اسباب
فراہم ہوتے ہیں۔ دُلہن کے والد صاحب کی طرف سے جو دعوت دی جاتی ہے اس میں کھانوں کی
تعداد ایک سے لے کر پانچ اوپر بیس تک ہو سکتی ہے، پھر یہ بھی ضروری نہیں کہ صرف ایک دن
بارات مہمان رہے اور دوسرے دن رخصت بلکہ بعض کے ہاں ایک سے لے کر تین دن تک بھی
بارات ٹھہر سکتی ہے۔ اس وقفہ میں دولہا کے والد صاحب کی طرح دُلہن کے والد صاحب بھی اپنے
خزانوں کے منہ کھول دیتے ہیں اور وہ جو سود در سود اور تجارت سے قارون کے ایک اوپر چالیس
خزانے جمع کیے گئے تھے آج وہ بے دریغ لٹا۔ یے جانے سے نہ دولہا میاں کے والد کو غم نہ دُلہن
صاحبہ کے والد کو پروا۔ یہی حال رنڈیوں کی میزبانی کا ہوتا ہے کہ جواب وہ دولہا کے ہاں آئی ہیں تو
دن رات دولہا کے گھر بھی گا رہی ہیں اور دُلہن کے گھر بھی، مگر جانے کا نام تک نہیں لیتی ہیں اور
مہاجن صاحب ہیں کہ اسی غرور میں پھولے پھرتے ہیں کہ ایک ہفتہ سے ملکہ جان اور جانکی بائی کا
گانا تو ہو رہا ہے۔ اس بارات میں کوتوال صاحب شہر بھی شریک ہوتے ہیں مگر اس طرح کہ کبھی اس
شرکت کو خود کوتوال صاحب اپنی عزت سمجھتے ہیں اور کبھی مہاجن صاحب اپنی توقیر۔ اس بارات میں
بیرسٹر لوگ بہت بھاری سوٹ پہن کر شریک ہوتے ہیں محض اس لیے کہ مہاجن سے مقدمہ کی
پیروی کر کے سود وصول کرنے والے صرف وکیل اور بیرسٹر ہی ہو سکتے ہیں ورنہ مہاجن بنا ہی اس
لیے ہے کہ ساری دنیا سے سود وصول کرے اور موٹا ہوتا رہے۔ آج دولہا کے والد بھی اپنے بیٹے کی

سسرال پر اپنی دولت مندی کے اظہار کے لیے بہت زیادہ اکڑتے ہیں اور بات بات پر نوٹ اور گنّی اور روپیہ سامنے پھینک دیتے ہیں۔ یہ لڑکی کے خسر ہو کر بھی اتنا بھڑک دار لباس اور زیور پہنتے ہیں گویا وہ اس بارات میں لڑکی کے خسر بھی ہیں اور خود ہی اس بارات کے دولہا بھی۔

ان کی بارات کی مذہبی رسوم ادا کرنے کے لیے مذہبی پیشوا بھی نہایت امیر قسم کا بلایا جاتا ہے اور معمولی حیثیت کے قاضی، مفتی اور پنڈت کا ان کی بارات میں گزر نہیں ہوتا۔ رسوم کی بھی کوئی مقدار اور تعداد نہیں بس یوں سمجھو کہ ''جو جی چاہے کر گزرو روپیہ کی کمی ہی نہیں''۔ یہی حال بارات میں شریک ہونے والی عورتوں اور لڑکوں کا ہوتا ہے۔ چنانچہ آپ کو ایک عورت بھی ایسی نظر نہ آئے گی جو ڈھائی ہزار روپیہ نقد سے کم کی پوشاک پہنے ہو۔

الغرض دولت کو پانی کی طرح بہا کر دُلہن دُلہا کے گھر آتی ہے۔ اب کیا مجال جو وہ بڑھاپے تک بھی امورِ خانہ داری میں ہماری آپ کی دیسی بیویوں کی طرح حصہ لے۔ بس اس کا خلاصہ دولہا کے گھر یہ ہے کہ عمر بھر طوطے مینا اور رنگ رنگ کے پرندے پالے اور عیش کرے۔ اس کے ہاں ایک سے لے کر تین خادمہ اور دس ملازم ہر وقت موجود رہتے ہیں۔ دوسرا کام اس کے ذمہ یہ ہے کہ جتنا ہو سکے وہ زیور پہنے مگر دوسرے کو ایک پائی نہ دے اور جو ذرا کم دولت مند ہو تو دن بھر مونگ کے پاپڑ بنائے اور قسم قسم کے اچار اور چٹنیاں تیار کرے، اس کے ولیمہ میں دُلہن کے والد کی طرح دولہا کے والد بھی تمام دنیا کے کھانے کھلا کر چھوڑتے ہیں جس میں اگر ممکن ہوتا ہے تو تمام شہر کو مدعو کیا جاتا ہے مگر جو کھانے کھلائے جاتے ہیں انھیں کھا کر صرف افسر اور دفتری ذوق کے لوگ ہی الحمدللہ کہہ سکتے ہیں اس لیے کہ ان کھانوں میں سے بعض کے نام یہ ہیں:

پوری، کچوری، میتھی کا ساگ، پالک کا ساگ، چولائی کا ساگ، چقندر کا ساگ، شلجم کا ساگ، مولی کا ساگ، اروی، بتھوا، بھنڈی، سرسوں، میتھی، خُرفہ یا کلفہ، کچنال پھلی، لوکی، کرم کلا، گانٹھ گوبھی، شکر قند، آلو، سنگھاڑا، بیگن، پرور، ترئی، کدو، کریلہ، سیم، گوبھی، مٹر پھلی، چنے کی دال، مونگ کی دال، ارد کی دال، ارہر کی دال، مسور کی دال، ماش کی دال، بڑی، بڑے، منگوڑی، دال مونٹھ، دہی بڑے، پاپڑ، چھاچھ، دہی، کھیر، چاول، شلجم کا آچار، آم کا آچار، لیموں کا آچار، لوکی کا آچار، چقندر کا آچار، جلیبی، برفی، قلاقند، پیڑا، بالوشاہی، گلاب جامن، رس گلا، امرتی، حلوا،

مال پوا۔

اُن کھانوں کو بعض جگہ برتنوں میں اور اکثر جگہ درختوں کے بڑے بڑے پتوں پر رکھ کر کھاتے ہیں مگر اس طرح کہ لوٹا الگ الگ اور حصہ الگ الگ، کھاتے وقت شور وغوغا وہی جو شام کو سبزی منڈی میں ہوا کرتا ہے۔

مہاجن کے ہاں دولت کی کثرت ہوتی ہے، شاید اس لیے اولاد کا ہمیشہ کال رہتا ہے۔ لہٰذا مہاجن کی بیوی یا عمر بھر مذکورہ بالا پرندوں سے دل بہلارتی ہے یا مُلّا رموزی کی قسم سے کسی غریب بچے کو فرضی بیٹا بنا کر تمام دولت اس کے نام عدالت سے ہبہ یا رجسٹری اور جو یہ کچھ بھی نہیں تو مہاجن کی طرح مولانا شوکت علی عرف موٹی ہو کر عمر بھر زیور پہنے کسی دروازے یا برآمدہ میں بیٹھی بھاجی ترکاری کاٹتی رہتی ہے یا پاپڑ اور اچار بنانے کے شغل میں مصروف و مبتلا نظر آتی ہے مگر مرتے وقت بھی زیور کو جسم سے دور نہیں کرتی۔ اس کی ''زیور پوشی'' سے اس کے پاؤں کے ٹخنوں سے اوپر سیاہ نشان بھی کبھی کبھی نظر آجاتے ہیں۔ لباس میں ساری، لہنگا اور کُرتی، دوپٹہ مگر موزے، بنیائن، پمپ، جوتے، گھڑی اور ہینڈ بیگ کا نام تک نہیں۔ اور جو کہیں خدا نے ایک آدھ چاند سا بیٹا دے دیا تو پیدائش سے لے کر بڑھاپے تک اس بیٹے پر خود بھی قربان اور پورا چوک بازار قربان۔ لڑکا ہی سہی مگر اسے بھی لڑکی کا تمام زیور شروع ہی سے پہناتی ہے۔ اس لاڈلے بیٹے میں ایک خاص بات یہ ضرور ہوتی ہے کہ اس کی آنکھوں سے لے کر پیشانی تک کا سُرمہ یا کاجل کبھی کم نہیں ہونے پاتا۔ ہزار ہا قسم کے تعویذ گنڈوں اور نادِعلی قسم کی چیزوں سے لڑکے کا گلا مالا مال رہتا ہے، جسے مہاجن صاحب بڑے فخر سے کچھ دیر دکان پر بھی بٹھاتے ہیں اور مارے محبت کے قابو میں نہیں رہتے۔

اس کے ہاں اولاد کی تربیت اور تعلیم کا بس اتنا ہی ضابطہ رائج ہے کہ خوب زیور پہنو اور بڑے ہو تو بہی کھاتا لکھنا سیکھ لو اور سو تک کے پہاڑے اور جوان ہو تو قرضداروں پر مقدمات دائر کرنا اور سود وصول کرنا یاد کر لو اور بس۔ کوئی قومی چندہ مانگے تو بھگا دو اور کوئی سائل آئے تو خشک جواب دے دو۔

اس کی معاشرت میں تمام زور لباس اور زیور پر صرف ہوتا ہے۔ شوہر سے قابلِ تعریف محبت کم کرتی ہے۔ عام خدمت گزاری کا اس لیے موقع ہی نہیں ملتا کہ مہاجن صاحب تجارتی

کاروبار سے فرصت ہی نہیں پاتے ۔ رات کو آتے ہیں تو دن بھر کی تھکن سے یوں بے ہوش ہو جاتے ہیں کہ صبح ہی بیدار ہوتے ہیں۔ اس قسم کی بیوی نہ تعلیم یافتہ ہوتی نہ ہنر مند۔ ادھر دولت کی کثرت سے آمدنی اور خرچ کی فکر سے دماغ بھی آزاد رہتا ہے۔ نتیجہ یہ کہ دن رات زیور پہنے بیٹھی رہتی ہے اور موٹی ہوتی جاتی ہے۔ بلغم کی کثرت سے مزاج میں نہ تیزی نہ خشکی اب معتدل مزاج کہیے یا گوشت کا ایک ڈھیر۔

دولت جمع کرنے کی عادی اور خرچ کرنے کی دشمن۔ اسی لیے عمر بھر پاپڑ بناتی ہے اور کھاتی ہے۔ میاں بیوی میں اختلاف اور لڑائی اس لیے کم کہ دونوں میں کافی بلغم۔ فقط۔

◆◆◆

کُنجڑے کی بیوی

اس غریب کی سیدھی سادی سی تعریف یہ ہے کہ جو شخص آپ کو سبز ترکاری اور اس کے ساتھ تازہ میوہ فروخت کرتا نظر آئے بس وہ کُنجڑا اور اس کی عورت ذات کنجڑی۔ اس پیشہ کو عام لوگ بہت کم اختیار کرتے ہیں مثلاً یہ نہیں ہوسکتا کہ ایک ہیڈ پولیس کانسٹبل پنشن پا کر سبزی فروشی اختیار کر لے۔ اسی لیے اس پیشہ کو کثرت کے ساتھ نسلاً بعد نسلٍ اختیار کیا جاتا ہے البتہ اسے شاذ و نادر کہتے ہیں کہ کوئی مُلّا رموزی صاحب قوم کے دولت مندوں کی زبانی تعریف اور عملی یا نقد ناقدردانی سے تنگ آ کر سبزی فروشی اختیار فرمالیں۔

الغرض کنجڑے کی بیوی ''بازاری حیثیت'' سے نہایت ذی اثر اور بلند حیثیت کی بیوی قرار دی گئی ہے اور یہ اس لیے کہ بس علی گڑھ کے فیشن زدہ لوگوں کو چھوڑ کر دیکھیے تو ڈپٹی کلکٹروں کی بیویاں تک اس کی محتاج نظر آتی ہیں اور بڑے شہروں میں شام کے وقت جب چاہو دیکھ لو کہ کسی انگریز افسر کی بیوی ہوگی اور کسی کنجڑے کی بیوی، ایک خرید رہی ہوگی اور دوسری فروخت کر رہی ہوگی۔

اس جماعت میں بھی کافی سے زیادہ جہالت موجود ہے البتہ کہیں کہیں ابتدائی مذہبی تعلیم نظر آتی ہے سو وہ بھی فقط عاقبت کے عذاب سے بچنے کے لیے نہ تجارت کی ترقی کے لیے۔ بس اس

سرتاسر جہالت کا نتیجہ یہ ہے کہ اس جماعت مین کافی سے زیادہ نقصان پہنچانے والی رسمیں موجود ملتی ہیں۔ ایسی ہی رسموں میں سے ایک رسم چھوٹی عمر کی شادی بھی ہے۔ اگر چہ مسلمانوں کے ہاں چھوٹی عمر کی شادی ناجائز نہیں لیکن کنجڑوں میں ایسی شادی کچھ زیادہ ضروری نہیں پھر جب یہ ہوتی ہے تو ہوتی ہی رہتی ہے اور خدا جانے کب تک ہوتی چلی جائے گی۔ اسی لیے کنجڑے کی دُکان پر بعض اوقات ننھی سی بیوی صاحبہ بیٹھی نظر آتی ہیں۔

بعض شہروں میں کنجڑے کی دُکان پر صرف سبز ترکاریاں ہی فروخت ہوتی ہیں اور بعض کے ہاں ترکاریوں کے ساتھ ہی تازہ میوہ بھی۔ اس کی دکان بھی وسط شہر میں ہوتی ہے۔ بعض درجہ سوم کے کنجڑے اور ان کے نیلام کے قابل بیوی صاحبہ ایک ٹوکری میں ترکاریاں لے کر گلی گلی اور کوچہ کوچہ چلا چلا کر بھی فروخت کرتے رہتے ہیں جن سے ہمیں کوئی بحث نہیں۔ پس جہالت کی عام رسم کے موافق اکثر کنجڑوں کے ہاں ادھر نئی دُلہن بیاہ کر لائے اور اُدھر اسی ہفتہ اسے دکان پر ''رکھ دیا گیا''۔ اب جس کا جی چاہے اسے نئی اور شرمیلی دُلہن سمجھے اور جو چاہے اسے سبزی کی ایک ٹوکری سمجھے کیونکہ ابتدائی دنوں میں گاہک سے ذرا کم بات کرتی ہے مگر عام لوگوں سے 75 میل فی گھنٹہ کی رفتار سے گفتگو کرنے کی عادت پیدا کرنے کے لیے اس کی ساس دکان کے اندر موجود رہتی ہے جو گاہک سے گفتگو کے طریقے سکھاتی رہتی ہے اور یہ خود بھی مجبوراً اور رسماً سیکھتی رہتی ہے۔ کہیں کہیں اسے دُلہن کے پورے لباس اور پورے زیور کے ساتھ دُکان پر بٹھا دیا جاتا ہے اور اسی لیے ابتدا میں اس کا گھونگھٹ ہر وقت سبزی کی ٹوکری تک لمبا نظر آتا ہے مگر وہ رواج کی جہالت کے باعث چند دن بعد ہی اتنی تیز اور بے باک ہوجاتی ہے کہ پھر مُلّا رموزی ایسے دس بیرسٹر اور وکیلوں کے ''ہاتھ نہیں آتی''۔ چونکہ اس کا دکان پر بٹھایا جانا کنجڑا برادری کی رسم کے موافق ہوتا ہے اسی لیے دولہا میاں اسے اپنی بے غیرتی اور بے شرمی تصور نہیں فرماتے اور نہ اس بات پر لڑکی والوں کو کوئی تاؤ آتا۔ نتیجہ یہ کہ اس کے مزاج میں شوخ چشمی، گستاخی، ہزل گوئی، بدتمیزی اور ''آزادی'' کی ہر عادت پیدا ہو کر خاصی مضبوط ہو جاتی ہے اور سودا خریدتے وقت مصیبت میں مبتلا ہو جاتے ہیں اشرافِ شہر۔

اگر چہ اس کے شوہر صاحب بھی دکان پر موجود رہتے ہیں مگر اس طرح کہ یا تو سبزی کی

ٹوکریوں کو آراستہ کرتے پھرتے ہیں یا اندر بیٹھے روٹی کھایا کرتے ہیں۔ گویا شوہر کیا ہوتے ہیں اپنی بیوی کے "انچارج آفیسر" ہوتے ہیں یعنی جب کنجڑی کسی کام کے لیے دکان سے اٹھے تو یہ بیٹھ جائیں ورنہ عموماً دوپہر کے وقت شوہر صاحب اور صبح وشام بیوی صاحبہ۔

اس زمانہ میں اس کے ہاتھوں کی مہندی کا رنگ کبھی ہلکا نہیں ہونے پاتا۔ اس کے جس قسم کے زیور کو حسن اور آرائش کا لاجواب نمونہ سمجھا جاتا ہے وہ نہایت درجہ بھونڈا ہوتا ہے۔ اس کے زیور کا زیادہ زور اس کے چہرے پر صرف ہوتا ہے مثلاً اس کے کان، اس کی ناک اور اس کا سر تک عجیب عجیب قسم کے زیور سے آراستہ تو کیا ہاں لدا ہوا نظر آتا ہے۔ باقی تمام زیور چاندی کا ہوتا ہے اور ساخت میں لوہے کا زیور معلوم ہوتا ہے یعنی نہایت بھونڈا اور موٹا مگر یہ اسے بھی اس نخرے اور گھمنڈ کے ساتھ پہن کر بیٹھتی ہے گویا جو زیور اس کے پاس ہے وہ نہ ملا رموزی صاحب کی بیوی کے پاس ہے نہ کسی رئیس کی بیوی کے پاس۔ اسی لیے وہ دکان پر فرصت کے وقت اپنے زیور کو خواہ مخواہ بھی الجھا کر یوں سلجھاتی رہتی ہے گویا وہ زیور کی کثرت سے بہت زیادہ عاجز اور تنگ ہے۔ اس کا لباس کبھی قیمتی نہیں ہوتا مگر رنگ اور بھڑک کے حساب سے وہ نصف میل سے نظر آنے والا ہوتا ہے۔ اس ٹھاٹھ سے جب وہ دکان پر بیٹھتی ہے تو اسے ہفت اقلیم فتح کر لینے کا اطمینان ہو جاتا ہے اور اسی لیے اب اس کی گفتگو کے ہر فقرے میں خاصا غرور اور گھمنڈ موجود ملتا ہے۔ اگر چہ یہ صورت شکل کی نہایت بھونڈی، کالی اور سانولی سے تو کبھی اونچی ہوتی ہی نہیں، مگر لباس کی بھڑک سے وہ خود کو اندر سبھا کی پری تصور کرتی ہے اِدھر اس کی دکان پر جانے والے خود بھی بلند ذہنیت اور اعلیٰ درجہ کے تعلیم یافتہ نہیں ہوتے لہٰذا اس کا اتنا ہی بناؤ سنگھار کافی سمجھا جاتا ہے۔ شاید ہی کوئی گاہک ہوگا جو اس کے پاس سے پندرہ منٹ سے پہلے اٹھ آنے کو گوارا کرتا ہو اور تو اور وہ بڑے مولوی صاحب کی عمر کے گاہک بھی اس کی خرافات اور ہفوات سنے بغیر سودے سے فارغ نہیں ہو سکتے۔ بڑی مصیبت یہ ہوتی ہے کہ جہاں اس سے آپ نے ترکاری کا نرخ دریافت کیا اور اس نے منہ چڑھا کر کوئی آڑا ترچھا جواب رسید کیا جس کا قدرتی نتیجہ یہ ہوگا کہ آپ اس کی دکان سے چلے جانے کے عوض تاؤ کھا کر اس سے الجھ پڑیں گے۔ بس جہاں آپ نے اسے کوئی جواب دیا کہ اس نے پھر ایک ایسا فقرہ چست کیا کہ آپ اب کھڑے رہنے کے عوض تاؤ کھا کر بیٹھ گئے اور لگے

مخبت فرمانے۔ بس اب جب آپ کے تاؤ کا پارہ بڑھنے پر آیا کہ اب یہاں سے آپ کو اس کا شوہر یا وہ اندر بیٹھی ہوئی ساس سنبھال لے گی اور فوراً کہے گی چلو جانے بھی دو میاں۔

— اس کا کیا وہ تو ہے لونڈیا، دیکھتے نہیں ہو آپ کہ ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے۔

— اور وہ آپ کو پہنچانتی بھی تو نہیں ہے۔

— ہاں ہاں سچ کہتے ہو میاں ہے نا آخر کار لونڈیا، چلیے جانے دیجیے۔

— لایئے میں دے دیتی ہوں آپ کو۔

— کیا لو گے میتھی کی بھا جی۔

— ہاں ہاں دو پیسہ سیر ہی کے حساب سے لے لو۔

— آپ ہی کی دکان ہے۔

— اچھا اچھا تو یوں ہی لے جایئے۔

— آخر برسوں کے لینے والے ہو۔

— ایک تم سے نفع نہ کیا تو کیا بھوکے مر جائیں گے۔

— ارے میاں کہا نا کہ وہ تو ہے لڑکی ابھی، ادھر وہ آپ کو پہچانتی بھی نہیں۔

— ہاں ہاں بے شک میں سُن رہی تھی اندر سے۔

— وہ تو میں نے آپ کی آواز سنی تب پہچانی آپ کو۔

— خیر تو بولو تین سیر دوں یا چار سیر۔

بس جہاں ساس نے آپ سے اتنی مہربانی کا اظہار کیا کہ آپ نے دُلہن کنجڑی کی تمام بیہودگی دل سے بھلا کر فوراً ساس کے سامنے پیسے پھینک دیے اور ترکاری لے کر گھریوں واپس آ گئے کہ کل پھر اسی دکان پر موجود نظر آنے لگے۔ اب آج یہ اس سے نہایت درجہ لطف اور مہربانی سے پیش آئے گی اور اس درمیان میں اگر کہیں تبسم سے کام لیا تو آپ کھڑے سے بیٹھ جائیں گے۔

اس کی دکان پر مولوی مزاج حضرات جاتے ہیں تو اس طرح گویا وہ اپنی اولاد سے ترکاری خرید رہے ہیں یعنی ترکاری تو خرید فرمائیں گے بہو سے اور گفتگو جاری رہے گی وہ اندروالی ساس

سے:

— تو اچھا یہ تمھاری بہو ہے۔

— ماشاءاللہ، خدا عمر دے۔

— ہاں تو یوں کہو کہ تمھارے چھوٹے بچے کی دُلہن ہے۔

— ہاں ہاں وہی پیر بخش۔

— چلو الحمد للہ، جیسا ماشاءاللہ وہ نیک بچہ ہے ویسا ہی خدا نے جوڑ ملایا۔ خدا برکت دے۔

— اچھا اب سمجھا میں تو یوں کیوں نہیں کہتی ہو کہ نبی بخش کی صاحبزادی ہیں یہ۔

— ارے بھئی نبی بخش تو بڑا ہی اللہ والا تھا، خدا بخشے اس کو وہ تو بے چارہ میرے وعظ میں آیا کرتا تھا، کبھی ناغہ نہیں کرتا تھا، ایک مرتبہ تو خود اس نے اپنے گھر پر میرا وعظ کرایا تھا۔ بڑا ہی جنتی آدمی تھا، تو اب اس کے کئی بچے اور ہیں یعنی ایک تو یہ تمھاری بہو اور؟

ساس: بس مولوی صاحب یہی ایک لڑکی تھی۔

مولوی صاحب: خیر خدا اسی کو اس کی یادگار رکھے۔

ساس: اےُ مولوی صاحب وہ خوب یاد آئی مگر خیر اب تو موقع نہیں مگر ہاں کسی دن آپ ہی کے گھر پر آ کر کہوں گی۔

مولوی صاحب: (بے چین ہو کر) تو کہو کہو آخر کیا بات ہے؟

ساس: (بہو کی طرف اشارہ کر کے) کہوں کیا کچھ بھی نہیں کوئی بڑی بات نہیں ہے آپ کے نزدیک اسی آپ کی بیٹی کے لیے ایک تعویذ لینا ہے آپ سے۔

مولوی صاحب: (خوش ہو کر) اچھا اچھا اب سمجھا میں، تو کہو تو کل لیتا آؤں تعویذ؟ وہ تو جیسے تمھاری بہو کا کام ویسا میری اولاد کا کام انشاء اللہ خدا مراد پوری کرے گا تمھاری، وہ دیکھو نا وہ تمھاری ہی برادری کے وہ کیا نام ہے اس کا لاحول ولا قوہ اس وقت بھول رہا ہوں خیر تو اسے بھی تو میں نے ہی تعویذ دیا تھا۔

— ہاں ہاں تو تمھارا گھر ہے میں تو صبح کی نماز پڑھ کر ذرا سو جاتا ہوں کیونکہ پچھلی رات کو بھی تم جانتی ہو کہ مجھے بہت زیادہ پڑھنا ہوتا ہے۔ خیر تم تو کوئی سوا دس بجے کے قریب آ جانا، بس

ایک دوآنے کی زعفران لے آتا۔

اولاد پیدا ہونے سے پہلے اس کی بیوی کو مولویوں، پیروں، صوفیوں، فقیروں اور قبروں کے آس پاس خوب گھمایا جاتا ہے مگر اس کے ہاں اولاد پیدا ہونا بازار اور گاہک کے حق میں ایسا ہی مصیبت ناک ہے جیسا کہ گورنمنٹ کے لیے یہ سوراج مانگنے والے یا دولت کے حق میں یہ بازاروں میں بھیک مانگنے والے گداگر۔

اب اگر کرنا خدا کا یوں واقع ہوگیا کہ اس کے ہاں ایک آدھ کالا سا بیٹا پیدا ہوگیا تو مان لیجیے کہ اب دکان پر اس کے نخرے اور غرور کی کوئی حد نہیں۔ مزاج میں بھی اب آزادی اور تلخی ہوگی کہ وہ پنجاب میں گولہ باری کرنے والے جنرل ڈائر کا غصہ ایک طرف اور یہ کوتوالی میں ملزموں کو اوندھا لٹکا کر مارنے والے کوتوالوں کا تاؤ ایک طرف۔ سب سے بڑی مصیبت یہ ہوگی کہ اب دکان پر اس کا یہ بیٹا دن میں ایک مرتبہ بھی اس کی گود سے علاحدہ اتر کر نہ آئے گا اور گود میں بھی کس طرح کہ لمحہ دودھ سے چمٹا ہوا یا جھوما ہوا یا لیٹا ہوا یا لٹکا ہوا۔ مگر اس بیٹے سے ان نئی والدہ صاحبہ کا عشق وہ کہ فرہاد بھی اپنے عشق سے شرمندہ اور مجنوں بھی نادم۔

ابھی لونڈا سوا مہینے کا ہوا ہے کہ اس کے گلے میں دنیا کے ایک ایک مولوی ایک ایک صوفی اور ایک ایک قطب صاحب کا تعویذ موجود ملے گا، پھر یہ اس حد سے سوا بھونڈے بیٹے کو زیور، لباس اور کاجل سے یوں آراستہ رکھے گی کہ جب دیکھیے دکان پر بیٹھی اسے سنوار رہی ہے۔ پُر لطف بات ہے کہ گاہک کو ترکاری بھی دیتی جائے گی اور بیٹے کو دودھ بھی پلاتی جائے گی۔ اس بیٹے کو وہ کھانسی ہوجانے پر بھی حکیم صاحب اور پیر صاحب کے ہاں لے جاتی ہے اور زُکام ہوجانے پر بھی۔ اس کے ہاں اولاد کی تقاریب اور نذر و نیاز کا کوئی اندازہ مقرر نہیں کیا جاسکتا بس یوں سمجھیے کہ وہ بغیر نذر و نیاز اور بدعات کے زندہ نہیں رہ سکتی، مگر اولاد پر اس حد سے سوا محبت کے باوجود بھی وہ اتنی دولت صرف نہیں کرتی کہ صاحبزادے صاحب تھیٹر بھی جاسکیں اور سنیما بھی۔ یہی حال بیٹے کی معاشرتی زندگی کا ہوتا ہے کہ نہ وہ پمپ جوتا پہن سکتا، نہ انگریزی ٹوپی، تعلیم اور تہذیب کے نام اللہ کا نام اور بائیسکل اور ہاتھ کی گھڑی کے لیے والد صاحب کا طمانچہ اور لاڈلے بیٹے صاحب کا منہ۔ بس روٹی کھاؤ اور کنجڑے بنے ہوئے دکان پر بیٹھے رہو۔ اسی لیے کنجڑوں کی اولاد ابتدا ہی سے جفاکش،

محنتی اور مستعد نظر آتی ہے اور آخر عمر میں دولت مند۔

الغرض پہلا بیٹا ہونے پر اب اس کی مزاجی آزادی اور زبانی تلخی سب سے پہلے پاس والی دکان کے لیے عذاب بن جائے گی۔ چنانچہ اس کی پہلی لڑائی پاس والی دکان والی یا دکان والے سے ہوتی ہے اور وہ بھی اتنی سی بات پر کہ اس دکاندار نے ترکاری کی ایک ٹوکری اس کی ٹوکری کے قریب رکھ کر قبضہ مخالفانہ کیوں کرلیا؟ چنانچہ دیکھا گیا ہے کہ یہ اتنی سی بات پر بازار میں اس زور شور سے لڑتی ہے کہ ایک مرتبہ مہذب سے مہذب راہ گیر کو بھی اس ہنگامہ پر متوجہ ہونا پڑتا ہے۔ اس کی زبانی لڑائی کی رفتار پنجاب میل کی رفتار سے کسی طرح کم نہیں ہوتی۔ وہ لڑائی کے وقت اپنی زبان سے جتنا کام لیتی ہے مثلاً وہ زبان سے فحش الفاظ ادا کرتے وقت ہاتھوں کو بھی اتنا مٹکاتی ہے کہ گالی کی ہلکی سی تصویر نظر کے سامنے آجاتی ہے اور سمجھنے میں تو ادنیٰ سی دشواری بھی نہیں ہوتی۔ اِدھر اس نے گالی کا پہلا حرف شروع کیا اُدھر آپ پوری گالی سمجھ گئے کیونکہ اس کی گالی حد سے سوا صاف اور تہذیب کے تمام قاعدوں سے بری ہوتی ہے۔ اس کی لڑائی میں بعض اوقات ایک سے لے کر چار چار دکانیں شریک ہوجاتی ہیں، کبھی کبھی یہ لڑنے والی کے سامنے تھر کنے بھی لگتی ہے۔ اس کی پاس والی کنجڑیاں اپنی اپنی دکانوں پر بیٹھی اس کی ہاں میں ہاں ملایا کرتی ہیں مگر مرنے اور مارنے کی حد سے یہ خود بھی دور رہتی ہے اور اس کی طرفدار بھی دور۔ اس کی لڑائی کا دور صرف اتنی دیر کے لیے دھیما پڑجاتا ہے کہ عین لڑائی میں کوئی گاہک آجائے کیونکہ انتہائی غصہ کے عالم میں بھی ترکاری فروخت کرنے سے باز نہیں رہتی لیکن جہاں ایک سودا لے کر روانہ ہوا کہ اس کی بکواس پھر شباب پر آگئی۔ کبھی کبھی یہ بے خبر گاہک کو بھی لڑائی کی تفصیل سناتی جاتی ہے۔ اس عرصہ میں اندر بیٹھی ہوئی ساس صاحبہ کبھی کبھی اتنا ارشاد فرمادیتی ہیں کہ:

چل چل سودا دے میاں کو دیکھ وہ کب سے کھڑے ہیں اور کہیں کہیں ساس بھی اس لڑائی میں حصہ لیتی ہے مگر اس طرح کہ اپنی دکان کی اندرونی حد سے باہر نہیں آتی۔ اس بیوی کا بڑھاپا تمام بازار کے لیے مصیبت ہوتا ہے۔ اب یہ گاہک کی دوست نہ اپنے بیٹے اور بہو کی دوست بلکہ جو اس کے مقابل آیا اسے سنائے بغیر نہیں رہتی۔ اچھے اچھے گاہک بوڑھی کنجڑی کی دکان پر جانے سے گھبراتے ہیں کیونکہ اس کی بکواس جتنی غیر مہذب اور بے ضابطہ ہوتی ہے اتنی ہی کوتوالی کے قانون

سے بھی آزاد۔ پھر اس کی لڑائی کا بھی کوئی ضابطہ نہیں بلکہ جہاں سے چاہتی ہے لڑائی شروع کر دیتی ہے۔ مثلاً آپ اسے پیسہ دے کر کہیے کہ ذرا نرم اور ہری ہری بھاجی دینا تو بجائے جواب دینے کے آپ کے اوپر آپ کا دیا ہوا پیسہ پھینک دے گی اور بعد میں کہے گی کہ ایسی نرم ترکاری کسی اور دکان سے لے لو میرے ہاں نہیں ہے، مگر اسی کے ساتھ جب وہ انسانیت کے پاجامے میں ہوتی ہے تو پھر گاہک کو اپنی ترکاری کا عاشقِ زار بنانے کے لیے بھی عجیب عجیب جملے اور فقرے استعمال کرتی ہے۔ ہر ترکاری کی تعریف کے لیے اس کے جملے بھی خاص ہوا کرتے ہیں مثلاً لکھنؤ میں کھیرے کی نفاست بیان کرنے کے لیے یہ جملہ بہت مشہور ہے کہ ''لیلیٰ کی انگلیاں ہیں اور مجنوں کی پسلیاں ہیں'' اسی طرح وہ گاہک کو دوسری دکان پر جانے سے روکنے کے لیے بھی چند جملے استعمال کرتی ہے اور بے وجہ بھی آپ کے گزرنے پر کہیں کہ میاں آج فلاں ترکاری لیتے جایئے آپ تو عرصہ سے کچھ خریدتے ہی نہیں، تو آخر آپ مجھ سے کیوں خفا ہیں، خیر آپ لیں یا نہ لیں مگر دیکھتے تو جایئے۔

اس کے لباس میں لہنگا اور پشواز خاص چیزیں ہوتی ہیں۔ وہ اس وقت تک استعمال کرتی ہے جب تک کہ اس کے ریزے ہوا میں اڑنے کے لیے تیار نہیں ہوتے اور زیور سے تو کسی عمر میں بھی نہیں چوکتی۔

پاک دامن، شوہر کی خدمت گزار، بے حد گرہست اور بدعات و رسوم کی حد سے زیادہ پابند، دولت جمع کرنے میں طاق اور کم خرچ کرنے میں محراب، بچوں کی تعلیم و تربیت سے اس لیے بے خبر کہ خود بھی علم و تربیت سے بے خبر اور شوہر بھی جاہل، مکان کو آراستہ اور ستھرا رکھنا نہ والد کے گھر سیکھا نہ شوہر کے ہاں ضرورت، نہایت گندہ اور تاریک گھر مگر کھانے پکانے کے کاموں میں مستعد، اس کے ہاں نہ بچہ نہ ملازم نہ دھوبی کی سخت ضرورت وہ خود ہی اپنے گھر کے لیے پانی لاتی ہے اور اکثر اوقات خود ہی کپڑے دھوتی ہے گھر میں بھی لڑاکا اور شوہر صاحب سے الجھنے کو تیار مگر نہ اتنی کہ طلاق اور مقدمہ تک معاملہ پہنچے۔

زیور کے حق میں بے حد حریص اور ایک سے لے کر پندرہ سیر وزن کا زیور استعمال کرنے کے لیے ہر وقت تیار، بڑھاپے کے باعث مزاج میں تلخی وفات سے قریب ہونے پر اور زیادہ

ہو جاتی ہے۔ اس قسم کی بوڑھی کنجڑی کو خدا دکان پر بٹھا ہوا نہ دکھائے کیونکہ اب اس کا حلیہ اس درجہ ناگوار ہوتا ہے کہ خدا کی پناہ۔ یوں سمجھیے گویا اس کے گوشت پوست کو جسم سے نکال کر اس کی ہڈیوں تک کو شکنجہ میں کس کر اس کی دکان پر خواہ مخواہ بٹھا دیا ہے، اب اس کی صورت اور لباس سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا تمام دنیا کا غصہ اور خشکی سمٹ کر کنجڑی بن گئی ہے۔ یہ دکان پر جس انداز سے بیٹھتی ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اس پورے بازار سے بیزار بیٹھی ہے، اس عمر کی کنجڑی کے شوہر صاحب بھی اب دکان پر حقہ بنے بیٹھے رہتے ہیں، گویا وہ اب دھواں ہی دھواں ہیں اور چند منٹ کے مہمان۔ بڑی جرأت کر کے اگر اٹھتے بھی ہیں تو دکان کی ایک ٹوکری سے دوسری ٹوکری تک آتے ہوئے تین چار مرتبہ کھانسی کا فرض بھی ادا کرتے ہیں اور سجدہ کرنے کا بھی۔ کبھی کسی ترکاری کو سنبھالنے کی ہمت بھی کرتے ہیں تو اس طرح کہ وہ سبزی ترکاری کو نہیں بلکہ ترکاری خود انھیں سنبھال رہی ہے مگر اس درجہ ضعیف کنجڑی کی بیوی اتنی سست اور کاہل نہیں ہوتی۔ بعض ماہرین اور محققین کا خیال ہے کہ کنجڑی اس عمر میں افیون سے بھی کام لیتی ہے مگر مُلّا رموزی کا تجربہ یہ ہے کہ افیون خور کی گفتگو میں وہ زور باقی نہیں رہتا جو اس کے مرنے پر آمادہ کنجڑی کی زبان میں پایا جاتا ہے۔ اماں کمال ہی ہے کہ جتنی زیادہ عمر کی کنجڑی کی دکان پر جائیے اتنی ہی تیز و تند گالیاں سن کر آیئے تو یہ تاثیر افیون کی کہاں جب کہ افیون والوں کو ایک آزادا اور کشادہ سی انگڑائی لینا بھی محال اور آپ کو نظر بھر کر دیکھ لینا بھی مشکل محسوس ہوتا ہے۔ اگر یقین نہ ہو تو افیون کی نصف تولہ خوراک مقرر کر کے دیکھ لیجیے۔ فقط۔

◆◆◆

تمبولی کی بیوی

تمبولی 99 فیصدی آبادی کی جان ہے۔ یہ پان سگریٹ، بیڑی اور تمبا کو فروخت کرتا ہے جو ہندستانیوں کی تفریحی غذائیں مانی گئی ہیں اور ان کے بغیر ہندستانی نہ دین کا رہتا ہے نہ دنیا کا۔ بس غنودگی اور چلا چلا کر جمائیاں لینے کے قابل رہ جاتا ہے۔ پھر پان چھالیہ، حقہ اور سگریٹ، بیڑی پینے والوں کی بھی اقسام اور نسلیں ہوتی ہیں یعنی ایک وہ ہوتا ہے جو ان میں سے ایک چیز کو اس کثرت اور زیادتی سے استعمال کرتا ہے کہ دیکھنے والا حیران رہ جاتا ہے مثلاً پنجاب وسرحد کا آدمی اس کثرت سے حقہ پیتا ہے کہ دیکھنے والا کہے کہ یہ آدمی حقہ نہیں پی رہا ہے بلکہ حقہ اس آدمی کو پی رہا ہے۔ یہی حال بیڑی پینے والوں کا ہوتا ہے۔ سگریٹ کا خرچ اس لیے کم ہوتا ہے کہ اس کی قیمت زیادہ ہوتی ہے اور 99 فیصدی ہندستانی مفلس ہوتے ہیں۔ یہی حال گٹکا کھانے والوں کا ہے۔ چنانچہ بعض لوگ اس کثرت سے گٹکا کھاتے ہیں کہ دیکھنے والا سمجھے کہ ان کے منہ پر کسی ظالم نے اس زور سے جوتا مارا ہے کہ منہ سے خون کی دھاریں نکل کر ان کے کپڑوں کو داغدار بنا گئی ہیں مگر اس بے چارے نے کوتوالی میں رپٹ تک نہ لکھائی ویسے ہی خون آلودہ کپڑے پہنے پھرتا ہے۔

ہندستان کی ''تاریخ تمدن'' سے بھی آگے جائیے تو ان چیزوں کے وجود کے ذمہ دار یعنی پان، گٹکے اور حقے کے موجدین شاہانِ مغلیہ ہی ملتے ہیں اور چونکہ یہ سب کچھ ''آوردہ شاہی'' تھا

اس لیے ہندستانیوں نے اپنی غلام فطرت اور مرعوب طبیعت کے ہاتھوں خوب ہی نوازا، پروان چڑھایا اور لطف یہ کہ شاہانِ سابق سے جو حقہ اور گٹکا عطا ہوا تھا ابھی اس کی غنودگی دور بھی نہ ہونے پائی تھی کہ انگریز بھائیوں نے سگریٹ کا تحفہ بھی عطا فرما دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ صوبہ جات متحدہ کے باشندے تو ان چیزوں کو سنبھال اور ترقی میں اپنے دماغ اور دولت کی بہترین قوتیں لے کر مصروف ہو گئے اور انگریز بھائی ہوائی جہاز، ریل اور توپ خانے بنانے کے لیے پھر یورپ واپس چلے گئے۔ چنانچہ خود ملا رموزی نے 1917 میں اپنی تعلیم کے سلسلے سے کانپور میں رہ کر دیکھا ہے کہ پان کی ایک چھوٹی سی گاڑی بازار میں پھرائی جاتی تھی جس پر ایک تختہ لگا تھا اور اس پر پان کی اقسام اور قیمت لکھی رہتی تھی۔ چنانچہ سب سے اول درجہ کے ایک پان کی قیمت خالص 10 روپیہ تھے، کچھ شک نہیں کہ پان کی ترقی میں لکھنوی باشندوں نے جو دولت صرف کی ہے وہ کسی دوسرے صوبے کے باشندوں نے نہیں کی اور اسی لیے آج جس قیمت اور جس شان کا پان لکھنؤ والے کھاتے ہیں اسے ''بادشاہ لوگ'' ہی کھا سکتے ہیں۔ اب آپ کہیں گے کہ پان تو بہر حال ایک درخت کے سبز پتے ہی کو کہتے ہیں پھر لکھنؤ والوں نے اس میں کون سا سرخاب کا پر لگا دیا ہے جو اس کی قیمت اور شان اس درجہ اونچی بتائی جاتی ہے، اس لیے صرف ایک پان کی صورت بتاتے ہیں، یعنی درخت کے اس سبز پتے کے ساتھ جو چیزیں کھائی جاتی ہیں اس کا مجوزہ نسخہ یہ ہے:

پان: ایک عدد، الا ئچی: ایک عدد، زعفران: نصف رتی، چھالیہ: ایک ماشہ، قوام عنبری: ایک رتی، بادام کا مغز: پاؤ ماشہ، کوکین: بقدرِ عادت، کتھا: نصف حصہ، چونا: نصف حصہ، ورق نقرہ یا طلائی: نصف، زردہ مدبّر یا معطّر: ایک ماشہ، لونگ: ایک عدد، معطّر گولی: ایک عدد۔ یہ اور ان سے بھی زیادہ چیزوں کا مجموعہ کہیں ایک پان، کہیں ایک گلوری اور کہیں ایک بیڑا کہا جاتا ہے اور انھیں چیزوں کا اہتمام جتنا زیادہ کیا جاتا ہے اتنی ہی قیمت زیادہ ہوتی ہے اور اسی کے فروخت کرنے والے کو تمبولی کہا جاتا ہے، لیکن آبادی سے تعلقات کا یہ عالم ہے کہ:

''درویش و غنی بندۂ تمبولی اند''

جس شہر میں تمبولی نہ ہو اس شہر کی آبادی کا جینا بھی مشکل اور مرنا بھی حرام اور اسی لیے تمبولی کی بین الجماعتی حیثیت نہایت ضروری اور قیمتی ہے۔

تمبولی کسی قوم یا نسل کو نہیں کہتے بلکہ یہ ''پان'' کی تجارت سے پیدا ہوتا ہے۔ اب خواہ قوم کا برہمن ہو یا شیخ، البتہ اس تجارت سے تعلق رکھنے والوں کی مجموعی تعداد کو ایک برادری یا ایک قوم سمجھا جاتا ہے۔ تمبولی کی حیثیت کو بلند بنانے والی بیگماتِ شاہی گزری ہیں جنھوں نے شاہانہ مقدرت کے باعث پان کو قیمتی اور پُر کیف بنانے میں بہت زیادہ حصہ لیا۔ اس وقت تمبولی کی بیوی بھی اس لیے قابلِ توجہ بن گئی تھی کہ وہ پان پہنچانے کبھی کبھی محلاتِ شاہی تک پہنچتی تھی۔ پان کو قابلِ ذکر بنانے والی دوسری جماعت شعرائے ہند کی ہے جنھوں نے پان کو ''محبوب'' کے حسن کا جزوِ اعظم قرار دے کر اس کی ثنا و صفت میں اپنی بہترین دماغی قوتیں صرف فرمائیں۔ چنانچہ بے شمار اشعار پان کی تعریف میں اردو میں موجود ملتے ہیں جن میں سے بعض یہ ہیں:

مسی مالیدہ لب پر رنگ پان ہے
تماشہ ہے تہِ آتش دھواں ہے
(ناسخ)

بوسہ کیسا کہ گلوری بھی نہیں پاتے ہیں
شعر جا جا کے انھیں روز سنا آتے ہیں
(اکبرالہ آبادی)

یاد اتنی تمھیں دلاتے جائیں
پان کل کے لیے لگاتے جائیں
(زہرِ عشق)

تمبولی کی بیوی کو قابلِ ذکر سمجھ کر اردو کے نامور مصنفین نے بھی اس پر طبع آزمائی فرمائی ہے۔ چنانچہ مشہور مصنف پنڈت رتن ناتھ سرشار نے اپنی مقبولِ عام کتاب ''فسانۂ آزاد'' میں اس بیوی کا تذکرہ متعدد اور مختلف مواقع پر کیا ہے۔ اس کا تذکرہ اردو کے بے شمار ناولوں میں بھی موجود ملتا ہے۔ گویا ان سب کا خلاصہ یہ ہے کہ تمبولی کی بیوی نہایت درجہ عالمگیر نہایت درجہ شاعرانہ اور نہایت درجہ ادبی اثرات کی مالک ہے۔

موجودہ زمانے میں بھی اس کے کاروبار نے خاصی ترقی کی ہے اور اب اس کی دکان پر پان کے ساتھ بیڑی، سگریٹ اور کہیں کہیں چند اور چیزیں بھی ملتی ہیں۔ بمبئی، کلکتے، کانپور، لکھنؤ، دہلی، لاہور اور ناگپور میں اس کی دکانیں نہایت شاندار اور قسم اول کی موجود ہیں۔ اس کی دکان کی

عام آرائش کی چیزوں میں بڑے بڑے آئینے نہایت ضروری چیز ہیں۔ان کے بعد نہایت بے معنی اور بے جوڑ تصاویر کا ہونا بھی ضروری ہے۔دکان کے پاس، سامنے یا ایک طرف لمبی میز، کرسی یا بیٹھنے کے لیے پتھر کا ہونا بھی ضروری ہے اور جو ایک آدھ بڑی سی گھڑی بھی ہے، پھر تو اس کی دکان کا جواب ہی نہیں ہوسکتا۔

تمبولی کی بیوی یکسر جاہل ہوتی ہے اس لیے کہ شوہر بھی ''خاندانی جاہل'' ہوا کرتا ہے۔ بہت زیادہ لکھا پڑھا تو بس اتنا کہ آڑے ترچھے حروف سے دکان کا حساب لکھ لیا یا کبھی کبھی دکان پر بیٹھے بیٹھے رامائن، قصہ حاتم طائی، گل بکاولی، ایسی کتابیں چلا چلا کر اور ہل ہل کر پڑھنے لگے، ان کے ہاں بھی شادی کے لیے عمر قید نہیں، اس لیے جب چاہا شادی ہوگئی اور جتنی عمر کی دلہن ملی لے آئے۔شادی معمولی قسم کی ہوتی ہے، کوئی خاص بات قابلِ ذکر نہیں، البتہ شادی کے بعد سے اس کی بیوی کو کارآمد بنایا جاتا ہے یعنی وہ کسی عمر اور کسی قسم کی ہو مگر شوہر کے گھر آتے ہی اب اسے شوہر کی دکان پر بیٹھنا ہوگا اور شوہر صاحب بیوی بن کر یا دکان کے اندر سوتے رہیں گے یا گھر میں۔اس لحاظ سے کچھ شک نہیں کہ اس بیوی کا شوہر نہایت درجہ بے غیرت اور بے حیا ہوتا ہے اور وہ اپنی نئی نویلی بیوی کو بازار میں بٹھا کر اس کی طرف متوجہ ہونے والے لوگوں کو اپنی دکان کا گاہک بناتا ہے۔اس بے حیائی کا لازمہ یہ ہوتا ہے کہ بیوی بھی معلوم کر لیتی ہے کہ دکان پر مجھے بٹھانے کا منشا ہی یہ ہے کہ میری وجہ سے خریدار زیادہ آئیں اس لیے اس کے اندر بھی قدرتاً بے حیائی کا جذبہ ترقی کرتا ہے اور اب وہ دانستہ طور پر اپنے اندر ایسے خواص واطوار پیدا کرتی ہے جو حد سے سوا بے غیرتی اور بے حیائی کے نمونے ہوتے ہیں اور فریب کے نہایت بھونڈے طریقے مثلاً وہ ہر وقت نہایت درجہ شوخ اور رنگین لباس پہن کر دکان پر بیٹھے گی، زیور بھی کافی ہوگا اور آنکھوں میں سرمہ بھی۔آپ کو راستہ سے گزرتا پا کر کبھی کبھی اس طرح مسکرائے گی گویا اس سے آپ کی کافی واقفیت ہے۔اب دکان پر آنے والے لوگوں سے وہ کبھی کبھی اس رنگ سے گفتگو کرے گی گویا وہ آپ سے گفتگو کرنا پسند ہی نہیں کرتی اور کبھی کبھی اس طرح گویا وہ آپ کی قدیم خیر خواہ اور نیاز مند ہے۔آپ سے وہ دن بھر حواہ بے پردہ بیٹھے مگر گاہک کے آنے پر وہ لمبا گھونگھٹ ''فرمالے گی'' یا پھر آپ کی طرف سے رُخ بدل کر بیٹھے گی، پھر اگر آپ اس کی دکان پر دو چار مرتبہ جائیں گے تو اب وہ آپ سے

نہایت میٹھے لہجے میں یہ بھی دریافت کرے گی کہ آپ کل کہاں رہے تھے، مجھے تو خیال تھا کہ آپ آئیں گے، بس اس کا آپ سے اتنا دریافت کرلینا آپ کو اس کی دکان کا زرخرید گاہک بنا دے گا۔ اس کی دکان پر بازاری غنڈے بڑے شوق سے جاتے ہیں۔ ان کے بعد اسکول کے لونڈوں کا اس کی دکان پر آنا نہایت ضروری ہے، جہاں اسکول کی چھٹی ہوئی اور طلبا آنا شروع ہوئے پھر یہی نہیں بلکہ اسکول جاتے وقت بھی آتے ہیں۔ درمیان میں بھی اور گھر جاتے وقت بھی۔ یہ اسکول کے لڑکوں کو قرض پان سگریٹ دیتی ہے مگر حساب صرف اس کے دل میں رہتا ہے کیونکہ اُدھر نوجوان طلبا جتنا مانگیں اتنا دینے کو تیار، اور اِدھر یہ بھی کھاتے اور حساب کی کتاب لکھنے سے معذور ہوتی ہے۔ بعض جوشیلے گاہک اسے ہمیشہ دانستہ طور پر زیادہ قیمت دیتے ہیں، بعض صاحبانِ ذوق اپنے لیے خاص قسم کا پان بنانے کا قاعدہ بھی سکھا دیتے ہیں، جسے یہ خوب یاد رکھتی ہے اور یہ خاص پان والے صاحب اپنے ساتھیوں سے فخریہ طور پر کہتے ہیں کہ دیکھیے وہ میرے لیے خاص طور پر پان بناتی ہے اور اسی لیے مجھے کسی دوسری دکان کے پان پسند ہی نہیں آتے۔ بعض اس کے ہاں پیشگی رقم جمع فرما دیتے ہیں، جس کا حساب بھی نہیں سمجھتے پس جس دن بی تمبولن صاحبہ فرما دیں کہ حساب ختم ہو گیا اسی دن یہ مزید رقم عطا فرما دیتے ہیں۔ بعض کے لیے چند پان علاحدہ اور پوشیدہ رکھ دیتی ہے اور جب یہ تشریف لاتے ہیں تو انھیں دکھا کر وہ علاحدہ رکھے ہوئے پان لا کر دیتی ہے اور یہ اسی مخصوص برتاؤ کی خوشی سے بے ہوش رہتے ہیں اور احباب سے کہتے ہیں کہ دیکھیے میرے مزاج کو کتنا پہچانتی ہے۔ اس کی دکان پر بعض اوقات عدالتوں کے وکیل، بیرسٹر اور پروفیسر بھی پتلون کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے پان سگریٹ خریدتے نظر آتے ہیں اور تمبولن صاحبہ سے مذاق، دل لگی اور جملے بازی سے بہت زیادہ لطف حاصل فرماتے ہیں۔ بعض نیم جاہل دولت مند اور امرا بھی اس کے ہاں سے ''در پردہ'' پان منگواتے ہیں اور جب ان کا ''مرسلہ آدمی'' اس کی دکان پر جاتا ہے تو تمبولن مسکرا کر پان دیتے وقت آہستہ سے کہہ دیتی ہے کہ ''ہمارا بھی سلام کہہ دینا''۔ بعض قابو سے باہر گاہک اس کے اور اس کی دکان کے لیے تحفے بھی عطا فرماتے ہیں۔

بعض اس کی دکان یا دو دکان سے قریب گزرتے وقت اس کو اشعار بھی سناتے ہیں، جس پر یہ بظاہر غصہ ہو کر آہستہ سے گالیاں بھی دیتی ہے۔ مُلّا رموزی نے اس کی دکان پر بعض انگریز اور

دیسی صاحب بہادروں کو بھی اکڑتے ہوئے دیکھا ہے اور پان کھاتے ہوئے۔ان کے شوہر صاحب چوبیس گھنٹے میں دو چار مرتبہ ہی نمودار ہوتے ہیں خاص کر اس وقت یہ صلح کے لیے آجاتے ہیں جب تمبولن کی کسی غنڈے سے ''چل جاتی ہے'' یا ''چھڑ جاتی ہے''۔گاہکوں کی کثرت کے باعث اس کے مزاج میں غرور، اکڑفوں اور نخرہ زیادہ ہوتا ہے اس لیے اگر اس سے، کسی صاحب کی چھڑ جائے تو پھر آبرو کا سلامت لے جانا محال ہو جاتا ہے، یعنی تمبولن تو جو چاہے آپ کو سنائے لیکن اگر آپ نے اس سے ایک فقرہ بھی تیز کہہ دیا تو تمام بازار مع پولیس کے سپاہی کے آپ ہی سے چمٹ جائے گا یہ کہہ کر کہ جانے بھی دیجیے حضرت وہ پھر عورت ذات ہے۔یہ بیوی نہایت درجہ پاکباز، امور خانہ داری میں بے حد مستعد، چست، چالاک، دولت کمانے اور جمع کرنے میں استاد، محتاط، گھر میں صفائی کی عادی، البتہ شوہر پر غالب رہنے والی اس وجہ سے کہ وہ کماتی ہے اور شوہر کھاتا ہے۔خود جاہل ہوتی ہے اس لیے اولاد بھی جاہل ہوتی ہے۔

◆◆◆

حلوائی کی بیوی

تجارت اور بازاری کاروبار میں اس بیوی کا رتبہ بھی کسی سے کم نہیں ہے۔ حلوائی کسی خاص قومیت اور قبیلے سے علاقہ نہیں رکھتا بلکہ ہر وہ شخص جو مٹھائی کی تجارت کرتا ہے حلوائی کہا جا سکتا ہے۔ اس میں ہر فرقے اور قوم کے لوگ شریک ہوتے ہیں۔ اس کے ہاں بھی ہر عمر اور ہر سن کی بیوی پائی جاتی ہے۔ اس کی دکان دوسری دکانوں کے مقابل شہر کے زیادہ آباد اور بڑے بازار میں ہوتی ہے۔ کچھ شک نہیں کہ حلوائی مرد زیادہ کام کرتے ہیں مگر ان کے بعد دکان پر رونق افزا ہونے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ اس کی دکان کی رونق تقریباً دوسری دکانوں سے کہیں زیادہ ہوتی ہے۔ دکان کی آرائش میں انتہائی سلیقے اور قرینے سے کام لیا جاتا ہے۔

مہاجنی دماغ ہونے کے باعث حلوائی نہایت درجہ گندے، غلیظ اور میلے کپڑے بھی استعمال کرتا ہے، مگر اس کے ننھے میاں کی والدہ ''بیگم حلوائی'' ہونے پر بھی نہایت درجہ شوخ اور بھاری لباس اور زیور استعمال فرماتی ہیں۔ عام طور پر دکان پر ان کا قیام بھی ''رونق افروزی'' سمجھا جاتا ہے اور یہ بھی ہے کہ حلوائی کو مٹھائی تیار کرنے سے بھی فرصت نہیں ملتی لہٰذا اگر یہ نہ بیٹھے تو کون بیٹھے؟ اگر چہ یہ کوئی ضروری بات نہیں کہ ہر دکان پر اس کا بیٹھنا یقینی ہے مگر ہاں یہ ایسی بھی نہیں کہ دکان پر بیٹھنے سے معذور ہو، لہٰذا وہ بیٹھتی ہے یا بٹھائی جاتی ہے اور جب وہ بیٹھتی ہے تو بیٹھی ہی رہتی ہے۔

اس بیوی کی بھی کوئی خاص برادری یا قومیت نہیں ہوتی بلکہ مٹھائی بنانا، فروخت کرنا ایک قسم کی تجارت ہے لہٰذا حلوائی کی بیوی بھی وہ جو مٹھائی بنائے یا فروخت کرے خواہ وہ کوئی پٹھان اور مغل ہو یا برہمن اور چھتری۔

بعض دکانوں پر چھوٹی عمر کی بیوی بھی نظر آتی ہے، مگر نہ اتنی کہ اسے ''ننھی منی'' کہا جائے البتہ اس کے دکان پر رونق افروز ہونے کی خصوصیات میں سے ایک خصوصیت یہ ضرور ہے کہ دکان کی حدود میں حلوائی جتنا میلا، گندا اور غلیظ نظر آتا ہے یہ اتنی ہی صاف زرق برق اور ''بھڑک دار'' ہو کر بیٹھتی ہے۔ پھر یہ بھی ضروری نہیں کہ وہ ہر وقت بے پردہ ہو کر مٹھائی فروخت کرتی رہے بلکہ اکثر اوقات وہ لمبا سا گھونگھٹ فرمائے رہتی ہے۔ دکان پر اس کا لباس اور زیور نہایت درجہ نظر کش ہوتا ہے، بعض جگہ یہ شوہر کے پیچھے کھڑی ہوئی نظر آتی ہے اور بعض جگہ شوہر دکان کے اندر اور یہ دکان کے اوپر۔ یہ گاہک سے بہت کم بات کرتی ہے، مگر مٹھائی ضرور فروخت کرتی ہے اور گاہک بھی اس سے بہت کم بات کرتے ہیں، مگر مٹھائی اسی سے خریدتے ہیں۔

یہ شروع سے لے کر آخر تک جاہل رہتی ہے، مگر دکان کے قاعدہ سے گھر کے برتن بہت زیادہ صاف رکھتی ہے، طوطے اور مینا یا دوسرے پرندے پالتی ہے، جو دکان اور مکان میں نظر آتے ہیں۔ اس کی اولاد کا کوئی خاص ضابطہ نہیں، البتہ دولت مند ہونے پر کم اور مفلس ہونے کی حالت میں زیادہ اولاد کی ماں ہوتی ہے۔ اولاد عموماً جاہل رکھی جاتی ہے، البتہ اب کہیں جبری مدارس میں بھیجی جاتی ہے ورنہ ہندی زبان میں دکان کے حساب کتاب کے قابل تعلیم دی جاتی ہے۔

شوہر سے بہت کم لڑتی ہے مگر جب لڑتی ہے تو دکان پر بھی نہیں چوکتی، مگر اس کی لڑائی کا معاملہ بھی طلاق اور سسرال تک نہیں جاتا، بس اگر صبح کو لڑی تو شام کو صلح اور شام کو لڑی تو صبح کو صلح۔

یہ اپنے گھر کے کام میں نہایت مستعد، کھانے پکانے سے لے کر نل اور کنوئیں پر سے پانی لانے میں خود کو ذلیل نہیں سمجھتی، پردہ کی بعض اوقات یہ پابندی کہ سر پر پانی کا گھڑا اور چہرہ پر ڈھائی گز کا گھونگھٹ۔ دولت جمع کرنے کی عادی، فضول خرچی سے نفرت، مگر زیور کی عاشق، نئی بات یہ ہوتی ہے کہ کھانا پکانے میں تو بیوی ہی رہتی ہے مگر مٹھائی بنانے کے معاملہ میں شوہر ہو جاتی ہے اور اس کا شوہر اس کی بیوی نظر آتا ہے، یا نظر آتی ہے، یعنی عام طور پر حلوائی مٹھائی بناتا ہے اور

بیوی فروخت کرتی ہے۔

مزاج کی نفاست اگر حد سے بڑھ جاتی ہے تو دکان اور مکان میں چند تصاویر لٹکا لیتی ہے، جو زیادہ تر بنارس کے مندروں یا مذہبی بزرگوں کی ہوتی ہیں۔ اپنے چھوٹے سے بچے سے محبت کرتی ہے اور بڑے سے نفرت۔ یہ اس طرح کہ ایک مہینے سے لے کر ایک سال تک کے ننھے میاں کو بڑے پیار سے دکان میں گود سے نیچے نہیں اتارتی اور اس کے پاؤں اور گلے کو زیور سے ہر وقت آراستہ رکھتی ہے، آنکھ اور پیشانی پر کاجل کے بے شمار نشانات سے اسے انسان کے عوض بھوت کا بچہ بنائے رہتی ہے اور دکان ہی پر گاہکوں کی نظر سے بچانے کے لیے دوپٹے کی اوٹ میں بڑے پیار سے دودھ پلاتی رہتی ہے، لیکن اس سے بڑے بچے ہر وقت دکان پر نیم برہنہ اور حد سے سوا گندے نظر آتے ہیں۔ یہ ان بچوں کو اتنا بھی مہذب نہیں بناتی کہ ہمارے آپ کے جانے پر اس کا ایک بچہ بھی ذرا جھک کر سلام تو کر لے۔ اس کے بچوں کے پاؤں چھ سات برس تک پاجامے اور دھوتی سے پاک نظر آتے ہیں، مگر کیا مجال جوان کے گلے اور سینوں پر چاندی کی لمبی زنجیریں، نادِ علی اور ایک ڈیڑھ تعویذ نہ ہو اور سرخ رنگ کے مونگے کے ہار یا کنٹھے سے تو اس کا شوہر پنشن کی عمر تک بھی باز نہیں رہتا۔

فی الجملہ اس کا وجود بازار کے لیے جس طرح ضروری اور لازمی ہے اسی طرح اس کا طرزِ زندگی "صلح کل" یا "مرنج و مرجان" ہوتا ہے۔ البتہ کہیں کہیں وہ اگر کسی گاہک سے لڑائی کی ٹھان لے تو پھر بھرے بازار میں اس کی موثر سے زیادہ تیز زبان ہوگی اور آپ کی سماعت سے محروم کان۔ یعنی اسے سب کچھ کہنا ہوگا اور آپ کو مشرقی قاعدہ سے عورت ذات کا سب کچھ خاموشی سے سننا ہوگا۔ جاہل محض، پاکدامن، شوہر کی وفادار، حد سے زیادہ کفایت شعار، کہیں کہیں حد سے سوا خوبصورت اور کہیں کہیں ذرا ذرا ناٹک کے تماشے اور کلب کی ممبری سے یکلخت ناواقف۔ پاؤں میں ڈھائی ہزار روپیہ کا زیور، مگر جوتا ہمیشہ ندارد۔ جوانی میں حد سے سوا شرمیلی اور حلیم، مگر خدا اس کے بڑھاپے سے محفوظ رکھے، کیونکہ بوڑھی ہونے پر پہلی بات تو یہ نظر آتی ہے کہ اب دکان پر اس کو اور اس کے شوہر کو دیکھ کر نہیں کہا جا سکتا کہ یہ دونوں آپس میں میاں بیوی ہیں کیونکہ اب وہ بڑھاپے کی بے باکی کے باعث دکان پر کیا بیٹھتی ہے تمام بازار کی کمانڈر ان چیف نظر آتی ہے۔ یوں سمجھیے کہ وہ شوہر صاحب تو رہتے ہیں دکان کے اندر مٹھائی کی بھٹی یا چولھے میں مصروف اور یہ دکان پر

نہایت اونچی ہوکر جب بیٹھ جاتی ہے تو اپنے برابر کی تین تین دکانوں کی خرابیاں چلا چلا کر درست کراتی رہتی ہے۔ اس دکان سے اگر تیسری دکان پر کسی گاہک کا جھگڑا ہوگیا ہے تو یہ اپنی دکان پر قابو سے باہر ہو جائے گی، کبھی اس گاہک کو بُرا بھلا کہے گی اور کبھی دکاندار کو پھر اس بات کی بھی پروا نہیں کہ اس کی بکواس کو جھگڑنے والے سنتے بھی ہیں یا نہیں۔ یہ تو ہر حال میں بڑبڑاتی اور بکتی رہے گی پھر یہ بھی ضروری نہیں کہ جب تک اس دکان پر جھگڑا ہو رہا ہے اسی وقت تک یہ بھی بکتی رہے، بلکہ اسے حق ہے کہ جھگڑنے والے اپنے مکان پر پہنچ کر کھانا بھی کھالیں، مگر یہ ہوگی کہ اسی جھگڑے کی یاد میں آپ ہی آپ بکتی رہے گی صرف آواز میں دھیما پن پیدا ہو جائے گا۔ اس حالت میں اگر اس کے پاس گاہک بھی آجائے تو یہ اسے مٹھائی دیتی جائے گی مگر بکتی جائے گی۔ خاص بات یہ ہے کہ تیسری دکان کے جھگڑا پر اسے بکتا ہوا پا کر اس کے اندر بیٹھے ہوئے شوہر صاحب بھی اسے خاموش نہیں کر سکتے بلکہ یہ ممکن ہے کہ یہ خود اس دکان کے جھگڑے کو اپنے شوہر صاحب کو اس طرح سناتی رہے کہ دکان پر آنے والا شخص یہ سمجھے کہ مجھے سنا رہی ہے کیونکہ اس وقت اس کی بکواس مجذوب کی بڑ ہو جاتی ہے، لہٰذا ضروری نہیں کہ اس بکواس کے وقت وہ اندر بیٹھے ہوئے شوہر کی طرف اپنا رُخ بدل دے۔ یہی حالت شوہر صاحب کی بے پروا مزاجی کی ہوتی ہے کہ وہ بھی دریافت نہیں کرتے کہ آخر تیسری دکان پر ہونے والے جھگڑے سے تجھے کیا واسطہ بلکہ یہ ہوتا ہے کہ جھگڑے کی بے ربط سی تفصیلات کو بیوی سے سن کر یہ بھی کچھ بڑبڑانے لگتے ہیں، مگر اس طرح کہ نہ بیوی ان سے مخاطب نہ یہ بیوی سے مخاطب بلکہ مٹھائی بناتے جاتے ہیں اور بکتے جاتے ہیں۔ کبھی کبھی اپنی کسی گزری ہوئی لڑائی کا قصہ بھی خود ہی شروع کر دیتے ہیں اور خود ہی ختم کر کے حقہ پینے میں مصروف ہو جاتے ہیں یا کھانسی میں مبتلا ہو کر رہ جاتے ہیں۔

بڑھاپے میں یہ بہت زیادہ سادہ مزاج ہو جاتی ہے۔ اسی لیے اب نہ اس کے پاس بھڑک والا لباس نظر آئے گا نہ زیور۔ اتنی عمر میں کبھی کبھی وہ شوہر کے ساتھ حقہ نوشی میں بھی شریک نظر آتی ہے۔ مزاج میں اب وہ تلخی کہ آپ مٹھائی لینے جائیں تو آپ سے لڑنے کو تیار اور وائسرائے بہادر جائیں تو ان سے لڑنے کو تیار۔ گنوار اور کسان قسم کے گاہکوں پر یوں حاوی کہ ایک دو پیسے کی مٹھائی دینے سے صاف انکار۔ باقی خیریت، خرد و کلاں کو درجہ بدرجہ سلام۔ فقط۔

◆◆◆

مالی کی بیوی

بازار سے تعلق رکھنے والی بیویوں میں مالی کی بیوی بھی قابلِ تذکرہ ہے۔ مالی کی تعریف یہ ہے کہ ''وہ آدم زاد'' جو پھولوں کی تجارت کرتا ہو اور بس، مگر خاص بات یہ ہے کہ ادبیاتِ اردو یا اشعارِ اردو میں مالی سے زیادہ اس کی بیوی کا تذکرہ پایا جاتا ہے، مگر اس کے تذکرہ کا سبب مالی کی بیوی کا حسن و جمال نہیں بلکہ پھولوں کی نسبت نے اسے ادبِ اردو میں قابلِ تذکرہ بنا دیا ہے۔ پھر یہ کہ ایک سنڈے مشٹنڈے مرد کے مقابل ایک نازک بدن عورت ہی میں لطافت اور رعنائی زیادہ اور موزوں ہوا کرتی ہے اس لیے ادبِ اردو میں بی مالن کا تذکرہ اپنے شوہر سے زیادہ پایا جاتا ہے۔ یہی راز ہے کہ ہمارے شاعروں اور ادیبوں نے اپنے اشعار اور افسانوں میں مالن کو جس درجہ حسین و جمیل دکھایا ہے وہ اصلیت میں اتنی حسین و جمیل نہیں ہوتی اِلّا شاذ۔ تو شاذ کی حیثیت سے تو کبھی کبھی افریقہ کے حبشیوں کی ایک لڑکی بھی نظر فریب نظر آ ہی جاتی ہے۔ البتہ مالن کے غرور اور نخرے کو جس خیال نے ترقی دی وہ اس کا بازار میں بیٹھ کر پھول فروخت کرنا اور بے وقوفوں کا اس کی دکان پر اس انداز سے جانا گویا بس تمام بازار میں یہی مالن ہے، جس سے بات کر لینا ہفت اقلیم کو فتح کر لینے کے برابر ہے۔

پھر مالن کے نخرے کو بڑھانے والا دوسرا سبب یہ ہے کہ وہ شادی بیاہ جیسی تقاریب کے

موقع پر پھولوں کا دلفریب زیور بنا کر لانے والی ہوتی ہے، مگر صرف پھولوں کا زیور بنانے کا کام تو مرد بھی کرسکتا ہے لیکن مالن جو زیادہ قابلِ تذکرہ بنی سو اس لیے کہ شادی ایسی انتہائی مسرت کی تقریب میں عورتوں اور بیگمات تک وہی براہِ راست پہنچ سکتی ہے، مرد نہیں جاسکتا اور اس سے بھی سوا سبب اس کی مقبولیت کا یہ ہے کہ یہ ایک مسرت بڑھانے والی تقریب سے متعلق خدمت انجام دیتی ہے۔ لہٰذا تقریب والوں کے خوشی سے بھرے ہوئے دل میں اس کے لیے کافی جگہ ہوتی ہے یا یوں سمجھو کہ ایک خوشی کی تقریب اس کے بغیر شاندار بھی نہیں ہوسکتی۔ بہرکیف! خلاصہ یہ ہے کہ مالن اپنی خدمت اور تجارت کے ذریعہ قابلِ تذکرہ قرار پائی ہے ورنہ صورت دیکھو تو کوئی پڑھے ایک مرتبہ مگر آپ سو بار لاحول ولاقوۃ نہ پڑھیں تو مُلّا رموزی کا ذمہ، مگر ہندستانیوں میں غلامی کی ذہنیت کے باعث تحقیق کی قوت فنا ہوچکی ہے لہٰذا وہ محض نقل اور تقلید کو اپنا دماغی شرف و کمال سمجھتے ہیں اسی لیے انھوں نے تحقیق کی آنکھیں بند کرکے مالن کو جس درجہ صاحبِ حسن و ادا قرار دیا ہے اس کے عجیب و غریب نمونوں سے گزرے ہوئے شعرا کے دیوان کے دیوان بھرے ہوئے ہیں اور نہ صرف یہ کہ بلکہ مالن کے عنوان اور نام سے بے شمار افسانے اور ناولیں لکھی گئی ہیں جو آج کل بھی معمولی قابلیت کے لوگ اور رنڈے پڑھتے ہیں اور بہت خوش ہوتے ہیں، لیکن اس کتاب میں ہمیں صرف تازہ ترین حالات سے بحث کرنا مقصود ہے اس لیے ہم پچھلے حالات کو یہاں نقل کرنا نہیں چاہتے۔

چنانچہ مُلّا رموزی کی نظر سے ''مالن'' کے عنوان سے بعض ایسے افسانے بھی گزرے ہیں جن کے اندر اسے حسن و جمال اور لطافت و دلفریبی کا ایک لاجواب نمونہ قرار دیا ہے لیکن اصلیت صرف اتنی ہی ہے کہ وہ ایک ''کامل جاہل'' گھر میں پیدا ہوتی ہے جو جہالت کے برابر ہی مفلس بھی ہوتا ہے اور مفلس اس لیے کہ پھولوں کی تجارت کوئی بلند تجارت نہیں مثلاً پھولوں کی خرید کے یہی مواقع ہوتے ہیں کہ یا کسی کی تقریب میں یا پھر عطاروں کے ہاں یا تیلی اور عطر فروش یا عطر ساز کے ہاں اور ظاہر ہے کہ ان چاروں کو پھولوں کی ضرورت روزانہ نہیں ہوتی اور نہ کسی شہر میں یہ رسم ہے کہ وہاں کا ایک ایک باشندہ روزانہ ایک ایک ہار خرید کر پہنے، لہٰذا جس چیز کی فروخت کے مواقع مخصوص اور معین بہ اوقات ہوں وہ تجارت ہمیشہ نفع دینے والی چیز ہوتی ہے۔ خصوصاً ایسی حالت

میں کہ ایک شہر میں ایک ہی مالن نہیں ہوتی جو ساری آبادی کی دکان سے پھول خرید کر اسے افلاس سے محفوظ کر دے۔

لہٰذا سب سے زیادہ دولت مند مالن وہی ہوتی ہے جو بازار کے وقت ایک صاف سا کپڑے کا جوڑا پہن کر بازار میں نظر آجائے ورنہ آپ بتا دیجیے کہ ایسی کتنی مالنیں ہیں جن کی بڑی بڑی کوٹھیاں کھڑی ہیں، اسی لیے یہ اپنے غریب سے باپ کے ہاں پیدا ہو کر بغیر کسی تعلیم اور خاص تربیت کے کسی اپنے ہی ایسے غریب اور جاہل مالی کو پانچ برس کی عمر میں جس وقت موقع ہاتھ آجائے بیاہ دی جاتی ہے یعنی اس کی برادری میں بھی کم عمری کی شادی جائز قرار دی گئی ہے، اس لیے نہایت جاہلانہ رسوم اور معمولی حیثیت سے بیاہ کرلائی جاتی ہے اور مالی برادری کے عام ضابطہ کے تحت یہ پھولوں کے ہار لے کر یا بازار میں بیٹھتی ہے یا اپنی دکان پر۔

ابتدا میں وہ اپنی ساس یا شوہر کے ہمراہ نظر آتی ہے اور یہ ہی دو آدمی اس کے ابتدائی حجاب کو چند دن باقی رکھتے ہیں یعنی پانچ چھ مہینے تک۔ اس کے بازار اور دکان کی مسلسل بے حجابی اسے قدرتاً یقین دلاتی ہے کہ اب وہ خود کو کچھ بڑی ہی چیز سمجھے۔ لہٰذا اب وہ رفتہ رفتہ بے باک ہوتی جاتی ہے، مگر گھر میں وہ شروع ہی سے چولھا چکی اور شوہر کی تمام خدمات انجام دینے لگتی ہے، مگر صبح کے وقت وہ ہر حال میں پھول توڑنے اور لانے کے لیے باغ جاتی ہے، مگر یہ صبح کے وقت باغ جاتے ہوئے یا باغ سے آتے ہوئے صرف انہی لوگوں کو نظر آتی ہے، جنھیں صبح سویرے اٹھ کر چہل قدمی اور تفریح کرنے کی توفیق عطا ہوئی ہے اور اسی لیے مسلمان اسے بہت کم دیکھ سکتے ہیں کیونکہ 95 فیصدی مسلمان بے نمازی اور عیش پسند ہوتے ہیں اس لیے وہ صبح 9 بجے تک سوتے ہیں، بس ان میں سے بے چارے ملا رموزی صاحب ہیں جو رات کے تین بجے تک روزی کمانے کے لیے مضامین اور کتابیں لکھتے ہیں اور تندرستی قائم رکھنے کے لیے صبح سویرے چار میل تک باغوں اور ویرانوں کی طرف ٹہلتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

اس کے بعد یہ بازار میں جب خود مختار ہو جاتی ہے تو اسے خود بخود یقین آجاتا ہے کہ بازار میں سب سے عمدہ چیز میں ہوں لہٰذا اس بھروسے پر وہ ذرا نخرے کے ساتھ بیٹھتی ہے اور گاہک سے بھی نخرے کے ساتھ گفتگو کرتی ہے۔ لباس اور زیور میں بھی بھڑک اور نخرہ پیدا کرتی رہتی ہے۔

حالانکہ اس کا لباس قیمتی ہوتا نہ زیور مگر جو ملتا ہے اسی پر اکڑتی ہے اور بڑی آن بان سے پھول فروخت کرتی رہتی ہے۔ پھر بھی ایک حد تک گفتگو میں لوچ اور نرمی باقی رہتی ہے۔ لیکن ننھے میاں کی والدہ بن کر پھر یہ بازار کے لیے مصیبت بن جاتی ہے۔ اب اس کے نخرے میں اس کے ننھے میاں بھی یوں شریک کر لیے جاتے ہیں کہ وہ سرِ بازار جہاں پھول لے کر بیٹھتی ہے وہاں اس طرح بیٹھتی ہے کہ ہر موقع پر وہ اپنے کالے اور لاغر سے ننھے میاں کو اونچا اٹھا اٹھا کر اور پہلو بدل بدل کر یوں دودھ پلاتی ہے کہ تمام بازار دیکھتا جائے کہ وہ صاحبِ اولاد ہے، اسے سمجھا جائے۔

اب اس کی زبان اور ہاتھ پاؤں میں غضب کی بجلی پیدا ہو جاتی ہے۔ اب ناممکن ہے کہ آپ اس کی دکان پر پھول خریدنے جائیں اور بغیر خریدے واپس تو آجائیں۔ جہاں آپ اس کی دکان کے سامنے گزرے اور اس نے کوئی ہار اٹھایا اور آپ کو بے وجہ بھی مخاطب کر کے اس ہار کے خریدنے کے لیے عجیب عجیب جملے اور فقرے کہنا شروع کر دیے۔ چونکہ بازار میں عام طور پر پھول فروخت کرنے والی عورتیں اور مرد پاس پاس بیٹھتے ہیں لہٰذا اس کی پہلی کوشش یہ ہوگی کہ آپ کسی طرح دوسری دکان پر نہ چلے جائیں، بس جتنے ہار بھی خریدیں اسی کی دکان سے خریدیں، اس لیے وہ اس وقت 75 میل فی گھنٹہ کے حساب سے آپ سے باتیں بھی کرتی جائے گی اور ہاتھوں سے ہار پر ہار دکھاتی چلی جائے گی اور سب سے بڑا کمال یہ ہوگا کہ اسی مصروفیت میں وہ دوپٹے کے اندر چھپے ہوئے ننھے میاں کو دودھ بھی پلاتی جائے گی مگر ہر حال میں پھول فروخت کرتی رہے گی۔ بعض اوقات وہ اتنی مصروفیت پر ایک آخری کمال اپنی مستعدی کا یہ دکھاتی ہے کہ اگر آپ کے ہاروں کے بنی ہوئی مقدار کم ہوتی ہے تو وہ اسی حال میں بقیہ ہاروں کی تعداد پوری کر کے رکھ دیتی ہے اور تیسرا کمال یہ ہے جس کا جواب ہی نہیں کہ وہ ننھے میاں کو گلے میں لٹکائے ہوئے دودھ بھی پلاتی رہے گی، آپ کے لیے نفیس و حسین ہار بھی بناتی جائے گی اور پاس والی مالن سے اگر اس کی چھڑ گئی ہے تو اس سے لڑتی بھی رہے گی۔ اس حساب سے وہ اپنے شوہر پر بھی فضیلت اور فوقیت رکھتی ہے کیونکہ ظاہر ہے کہ شوہر یہ تینوں کام ایک ساتھ نہیں کر سکتا۔

اس سے خرید و فروخت کا معاملہ کرنے میں ایک خطرہ بھی ہے اور وہ یہ کہ اگر اس سے خرید و فروخت کی ابتدائی گفتگو کر کے آپ اس سے ہار نہ خریدیں اور دوسری دکان پر چلے جائیں تو پھر

جب تک آپ اسے نظر آئیں گے وہ آپ کی شان کے موافق آپ پر آوازے کستی رہے گی، یعنی اگر آپ صورت اور لباس کے لحاظ سے کسان، گنوار، قلی، دھوبی، بھٹیارے، حجام اور بچہ سقہ نظر آتے ہیں تو وہ بلند آواز سے آپ پر آوازے کسے گی اور جو آپ صورت اور لباس کے لحاظ سے ہوئے ''مردِ معقول'' تو آپ کی طرف رُخ بدل کر اس طرح بڑبڑاتی رہے گی کہ آپ اس کی آواز کا تال اور سُر تو سنتے رہیں گے مگر یہ نہ سمجھ سکیں کہ وہ گالی دے رہی ہے یا دعا۔ کبھی کبھی وہ آپ کو اس طرح برا بھلا کہے گی گویا وہ اپنے ذاتی ننھے میاں کو دودھ پلانے سے خفا ہو رہی ہے، آپ سے کچھ نہیں کہہ رہی۔

فرصت کی حالت میں وہ اپنے آپ کو یا پھولوں کو خواہ مخواہ سنوارتی رہتی ہے اور اس کا شوہر چند ہار کسی لکڑی میں الجھا کر یا لٹکا کر بازار میں گشت کرتا رہتا ہے یا کسی چوراہے پر کھڑا ہوا ان ہاروں کی تعریف میں چند خاص جملے استعمال کرتا رہتا ہے مثلاً 1917 میں مُلّا رموزی صاحب جب شہر لکھنؤ کے بازار امین آباد پارک میں سے گزر رہے تھے تو انھوں نے ایک مالی کو ہار فروخت کرتے ہوئے یہ کہتے ہوئے سنا تھا جواب تک یاد ہے کہ ''چمیلی معطر''، ''بیلا ہے البیلا ہے'' یہ شوہر صاحب گشت فرماتے ہوئے کبھی کبھی اپنی ذاتی مالن کی دکان پر آکر چلم پینے میں مصروف ہو جاتے ہیں اور پھر اس سے تازہ ہار لے کر روانہ ہو جاتے ہیں۔

مالن کو جس کام نے بہت زیادہ قابل توجہ بنایا ہے وہ اس کا شادی بیاہ کے موقع پر پھولوں کا زیور بنانا ہے جس میں دولہا کے لیے ''سہرے'' کا تیار کرنا خاص الخاص کمال ہے جسے ''گوندھنا'' کہتے ہیں، بس اس کے اس کام نے اسے اتنا بھی بلند اور مشہور کر دیا ہے کہ ہندستان میں جب سے شاعروں کی پیدائش شروع ہوئی ہے اس وقت سے لے کر آج تک 1931 تک کا ہر شاعر سہرے کی تعریف لکھتے وقت مالن صاحبہ اور ان کے کام کی تعریف ضرور کرتا ہے۔ ''سہرا'' اس خاص قسم کے ہار کو کہتے ہیں جو پھولوں کی بے شمار لڑیوں کا مجموعہ ہوتا ہے اور اسے دولہا میاں کی پیشانی پر یوں باندھا جاتا ہے گویا پھولوں کی لڑیوں کا ایک نقاب چہرے پر پڑا ہو، اس کے باندھ دینے سے اس کے موجد کی غرض تو یہ معلوم ہوتی ہے کہ دولہا بہت زیادہ حسین اور خوبصورت نظر آنے لگے، مگر عقلمندوں کے نزدیک دولہا میاں سہرے کو چہرے پر لٹکا کر خاصے بے وقوف بلکہ ایک قسم کے جانور

نظر آتے ہیں، اس لیے ملا رموزی صاحب اس کی غرض یہ ایجاد فرماتے ہیں کہ دولہا کے چہرے پر پھولوں کی لڑیاں اس لیے لٹکائی جاتی ہیں کہ شادی کے وقت دولہا کے اندر جو قدرتی حجاب پیدا ہو جاتا ہے اس کے اثر سے وہ کسی کو نظر اٹھا کر نہیں دیکھ سکتا۔ ''دولہا لوگ'' شادی کے وقت اپنے آدھے چہرے کو اپنے ''ہاتھ کے عمامے سے'' چھپائے رہتے ہیں یعنی رومال سے، للہٰذا اس حجاب کو باقی رکھنے اور دولہا میاں کو اندھے حافظ جی بن جانے سے بچانے کے لیے، پھولوں کی لڑیوں کا یہ مجموعہ ان کے چہرے پر لٹکا دیا جاتا ہے تا کہ اس کے اندر وہ سمجھے رہیں کہ میں سب کو دیکھ رہا ہوں مگر مجھے کوئی نہیں دیکھ سکتا۔ بہرحال دونوں صورتوں میں عقلمندوں کے نزدیک اس کے استعمال سے حماقت ہی حماقت ظاہر ہوتی ہے، مگر پرانے جاہلوں میں اس سہرے کو نہایت درجہ مقدس اور محترم یا پھر مبارک چیز سمجھا جاتا ہے، اسی لیے شادی کے بعد جاہلوں میں اس سہرے کو بعض خاص رسموں کے ساتھ کسی کنوئیں یا تالاب میں ڈالا جاتا ہے اور بغیر پانی میں ڈالے ہوئے سہرے کو ضائع کرنا گناہ اور نحوست سمجھا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اسے بیوہ مالن بھی نہیں بنا سکتی کیونکہ جاہل عورتیں اور تعلیم یافتہ مردوں کی رسم پرست عورتیں اسے بھی منحوس کہتی ہیں۔

اس کے بعد سہرہ ان اشعار کو بھی کہتے ہیں جو اس پھولوں کے سہرے کی تعریف میں لکھے جاتے ہیں یا کہے جاتے ہیں۔ ان اشعار کو سہرا کہنا اس لیے جائز ہے کہ وہ اسی مخصوص چیز سے متعلق ہوتے ہیں، پس اس کے باعث مالن ذات بہت ہی قیمتی اور ضروری عورت ذات قرار دی گئی ہے۔ اسی لیے شادی شروع ہونے سے ختم ہونے تک شادی والوں کا تمام خاندان بلکہ تمام شریک ہونے والے افسر اور بادشاہ تک اس ''مالن زادی'' کے محتاج نظر آتے ہیں۔ مثلاً اگر مالن شادی کے لیے ہار کم یا خراب بنا دے اور شریک ہونے والے بادشاہ سلامت کو بھری محفل میں معمولی سا ہار پہنا دیا جائے تو اس کی توہین ہو جاتی ہے اور ویسے بھی مالن شادی بیاہ کے کاموں میں حسن پیدا کرنے والی چیز ہوتی ہے، اس لیے جاہل عورتیں اس کی عزت بھی کرتی ہیں اور اسی لیے اس کے ہاروں اور سہرے وغیرہ کی اصل قیمت کے اوپر بھی اسے انعام دیا جاتا ہے، جسے جاہلوں کی بول چال میں ''حق'' اور کہیں ''نیگ'' کہتے ہیں مگر ''سرکاری تقاریب'' میں اسی معزز اور محترم مالن سے جوتے مار کر اور ماں بہن کی گالیاں دے کر ہار تیار کرائے جاتے ہیں اور قیمت کہیں 'حسبِ ضابطہ'

اور کہیں مہینوں ندارد اور افسر لوگ اس مصیبت اور ظلم سے بنوائے ہوئے ہاروں کو پہن کر اپنے گھر تک اونچی گردن کر کے یوں جاتے ہیں گویا اس وقت دنیا میں جو کچھ ہیں صرف یہی ہار پہنے ہوئے افسر صاحب ہیں۔ بعض مغرور اور متکبر افسر اس قسم کے ہاروں کو اپنے گھر میں اس خیال سے برسوں محفوظ رکھتے ہیں کہ آنے والے سمجھ لیں کہ ہاں اس افسر کو فلاں موقع پر اس کی شان اور افسری کی وجہ سے ہی اتنا بھاری ہار پہنایا گیا تھا، مگر ایسوں کو خبر نہیں کہ ان کی اس اکڑفوں پر ملا رموزی ایسے لوگ غرور شکن قہقہہ لگایا کرتے ہیں۔ الغرض شادی کے وقت سے لے کر شادی کے خاتمہ تک مالن کا دماغ آسمان پر رہتا ہے، مگر اس طرح نہیں کہ وہ شادی والوں سے اکڑ کر بات کرتی ہے بلکہ اس کا غرور اپنے ہم پیشہ لوگوں کے مقابل ہوتا ہے اور ان معنی میں کہ دیکھو اتنے بڑے شادی کے گھر کا زیور اور سہرا میں بنا رہی ہوں۔ اگر چہ اس کی تواضع شادی کے گھر میں خاصی ہوتی ہے مگر کبھی کبھی وقت پر ہار نہ دینے یا کم مقدار بنانے یا تاخیر سے پہنچانے پر وہ اپنے اور شادی والے گھر میں سیدھی سیدھی بھی سنتی ہے، پھر بھی اس کی ضرورت کم نہیں ہوتی اور بہر حال غصہ ہونے پر بھی اسی سے پھولوں کا سودا کیا جاتا ہے۔

یہ شادی کے گھر میں بڑی آن بان سے جاتی ہے، مگر آن بان بس اتنی کہ شادی کے گھر والی ''عورت ذاتوں'' پر اپنے لباس اور زیور کا رعب ڈالتی ہے، اور بس۔ ایک خاص بات یہ ہے کہ اسے اجرت اور انعام میں اگر قارون کے خزانے بھی دے دیجیے تب بھی کم کہے گی اور جھگڑتی ہوئی گھر واپس آئے گی لیکن جس گھر سے انعام پر جھگڑتی ہوئی آئی ہے دوسرے گھر میں جا کر اسی گھر کی بے حد تعریف کرے گی تا کہ نئے گھر والے یہ سوچ کر اسے پہلے گھر سے زیادہ انعام دیں کہ یہ عورت دس گھر میں جانے والی، ہر گھر میں ہمارے انعام کی تعریف کرے گی، اسی لیے ملا رموزی صاحب نے اپنی ''ذاتی شادی کے موسم میں'' مالن کو اجرت سے زیادہ انعام میں جھنجنی کوڑی بھی نہ دینے دی۔ نہ اب دوسری شادی میں انشاءاللہ اسے انعام دیں، یقین نہ ہو تو دعا کیجیے کہ خدا جلد اپنے ملا رموزی صاحب کی دوسری شادی کسی اعلیٰ تعلیم یافتہ لڑکی سے کرادے۔ اس کی عام معاشرتی اور اخلاقی حالت نہایت درجہ معمولی ہوتی ہے۔ وہ اکثر کرایہ کے نہایت تنگ و تاریک مکان اور اکثر ایک تاریکی سی کوٹھری میں زندگی بسر کرتی ہے۔ شوہر سے ہر آن و ہر لحظہ لڑنے مرنے

کوتیار رہتی ہے، اسی لیے کہ مزاج میں بازار کی بے باک گفتگو کی عادت موجود ہوتی ہے۔

فضول خرچ اس لیے ہوتی ہے کہ کم آمدنی اور ضرورت زیادہ۔ پھر آمدنی بھی مستقل نہیں اور عادتاً اعلیٰ درجہ کے لباس اور زیور پر مرتی ہے، مذہب اور سنجیدگی سے ناواقف، جاہلانہ رسوم میں جکڑی ہوئی، زیادہ کمانے والی اور کم اولاد والی، تندرستی اس لیے اچھی کہ روزانہ صبح سویرے باغوں میں دو گھنٹہ تک ایک ایک پھول توڑنے کی ورزش کرتی رہتی ہے، مگر صورت کی بھونڈی اور نام ''بی مالن''۔

◆◆◆

بھٹیارے کی بیوی

بھٹیارہ، باورچی یا خانساماں، اس ہندستانی مرد کو کہتے ہیں جو کھانا پکاتا ہو، خواہ وہ لوگوں کے گھر جا کر پکائے یا ان کی تقاریب میں پکائے یا خود پکائے اور بازار میں فروخت کرے یا خود کہیں لندن سے وکالت پاس کر کے آئے مگر کھانے کی دکان لگا لے تو اسے بھی بھٹیارہ کہہ سکتے ہیں۔ پس اس قسم کے شوہر کی بیوی اور اس کے ہاں کی ہر عورت کو بھٹیارن یا بھٹیاری کہتے ہیں خواہ اس کے گھر کی دوسری عورتیں کھانے سے ہاتھ بھی نہ لگائیں، مگر انھیں ساری دنیا ''باورچن'' ہی کہے گی۔ بھٹیارے کا وجود یوں تو ساری دنیا میں ہے مگر اس طرح کہ ساری دنیا تعلیم کے باعث ترقی کر چکی ہے، اس لیے دوسرے ملکوں کے باورچی اور بھٹیارے اتنے خوبصورت ہو گئے ہیں کہ...ان میں اور لاٹ صاحب میں فرق کرنا مشکل ہے، مگر ہندستان میں جہالت اور افلاس کے باعث بھٹیارہ نہایت درجہ کالی صورت کا ہوتا ہے۔ جہالت اور حد سے سوا اولاد کے باعث وہ ہمیشہ نہیں تو کبھی کبھی افیون بھی کھاتا رہتا ہے، اس لیے اس کی صورت اور بھی زیادہ خراب ہو جاتی ہے۔ کھانا پکانے کے باعث اس کے کپڑے ہمیشہ سیاہ اور نہایت غلیظ، گندے اور میلے ہوتے ہیں۔ ہندستان پر قبضہ کر کے جب سے یہاں انگریز لوگوں کا آنا اور رہنا، بسنا شروع ہوا ہے اس وقت سے ہندستانی بھٹیاروں کی تعداد میں بہت زیادہ اضافہ ہو گیا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ

انگریزوں کی وجہ سے لاکھوں ہندستانیوں کی کسی مشین میں ڈال کر بھٹیارہ بنادیا ہے بلکہ ہندستان میں زیادہ انگریز نوکری اور تجارت کے لیے آتے ہیں اس لیے ان کے ملک کے آدمی کوئی ان کے باوا کی جایداد تو ہوتے نہیں ہیں جوان میں سے ہر ایک کے ساتھ ایک ایک آدمی بھٹیارہ بن کر ہندستان میں ان کے آگے پیچھے ہاتھ باندھے پھرتا رہے۔ اِدھر ہندستان میں انگریز لوگوں کو ''منشیوں'' سے اونچی نوکری ملتی ہے یعنی زیادہ تنخواہ ملتی ہے، اس لیے ان کی ننھے میاں کی والدہ ہندستان میں اپنے شوہر کے لیے کھانا پکانے سے صاف انکار کر کے دور کھڑی ہوجاتی ہے لہٰذا مجبوراً ہر انگریز کو ہندستان میں ایک بھٹیارے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اِدھر انگریز لوگ اپنے ملازم کی بے انتہا قدر کرتے ہیں، انھیں اپنے عمدہ عمدہ اور قیمتی کپڑے دیتے ہیں...اسی لیے ہم نے ہندستان کے بڑے بڑے ایم۔اے پاس لوگوں کو دیکھا ہے کہ یہ انگریز افسر کے بھٹیارے کو بہت زیادہ ہنس کر سلام کرتے ہیں، اسے خواہ مخواہ انعام دیتے ہیں، اس کی ہر قسم کی خوشامد کرتے ہیں... مگر یہ بھٹیارے کے خوشامدی ملّا رموزی صاحب کے سامنے اکڑ کر چلتے ہیں اور اپنے ماتحت ہندستانیوں کو اپنا بھٹیارہ سمجھتے ہیں۔ لیکن آج سے کوئی پچاس برس پہلے ہندستان میں عام دستور یہ تھا کہ مسافر لوگ بھٹیاروں کی دکانوں میں قیام کرتے تھے اور انھی کی دکان پر کھانا کھاتے تھے، مگر اب تعلیم کی ترقی سے ہندستانیوں کی عقل میں تھوڑی سی جو روشنی پیدا ہوئی تو انھوں نے سمجھ لیا کہ یہ بی۔اے پاس کر کے اپنے ہی ہم قوم ہندستانی افسروں کی غلامانہ اکڑفوں سے بچنے کا ایک یہی طریقہ اچھا ہے کہ تجارت کرو اور تھیٹر کا تماشہ دیکھو، نتیجہ یہ نکلا کہ اب بے شمار ہندستانیوں نے کھانے کی بڑی بڑی اور شاندار دکانیں ہر شہر میں قائم کر دی ہیں اور ان کا نام بجائے دکان کے ''ہوٹل'' رکھ دیا ہے، اِدھر ہندستانی لوگ ابھی اعلیٰ تعلیم اور تربیت تک سے دور ہیں اس لیے وہ ہر اس چیز کو بڑی وقعت دیتے ہیں جو یورپ والوں کے پاس نظر آجائے، لہٰذا لفظ ''ہوٹل'' کے استعمال سے اب بڑے بڑے نخرے والے ہندستانی بھٹیاروں کی دکانوں میں پڑے رہتے ہیں یعنی قیام کرتے ہیں، اس لیے اب ہندستان کا وہ تاریخی بھٹیارہ ہندستان سے کم ہوتا جارہا ہے، جس کی بیوی کا ہم تذکرہ کرنے والے ہیں۔ چنانچہ آج سے پچیس بلکہ پچاس برس پہلے اس بھٹیارے کی ایک تنگ و تاریک سی دکان ہوتی تھی جس کے آس پاس دو چار دُبلی پتلی سی

چار پائیاں پڑی رہتی تھیں اور دس بارہ میلے اور گندے سے کھانے کے برتن ہوتے تھے، جس کے بیچ میں ''بی بھٹیارن'' بڑے نخرے سے بیٹھی بازار کی رونق بڑھایا کرتی تھیں۔

اس قسم کی بھٹیارن کے متعلق اس زمانے کے تنگ دماغ اور معمولی قابلیت کے لوگوں نے جو قصے لکھ کر چھاپے ہیں انھیں آج بھی دھوبیوں، حجاموں، کنجڑوں، مہاجنوں اور غنڈوں میں مزے لے لے کر پڑھا اور سنا جاتا ہے، چنانچہ ان قصوں کا خلاصہ یہ ہے کہ ''بھٹیارن'' نہایت ہوشیار، عقلمند، سیاست داں اور چالاک عورت ہوتی ہے، اس لیے وہ اس زمانے میں جو خدمات انجام دیتی وہ یہ ہیں۔

1۔ حکومت کے وزیروں کو بعض نہایت مشکل سیاسی نکتے بتادیتی تھی جو خود وزیروں سے حل نہیں ہوتے تھے۔

2۔ بادشاہ زادوں اور بادشاہ زادیوں کے درمیان حسن وعشق اور عوام کے درمیان شادی بیاہ کے معاملات یہی بھٹیارن طے کراتی تھی۔

3۔ مخبری اور سراغ رسانی کی خدمات بھی انجام دیتی تھی۔

بہر کیف! یہ واقعات آج سے کئی سال پہلے کے سنے گئے ہیں، لیکن اس میں شبہ نہیں کہ اس کا وجود آج اس شائستہ زمانے میں بھی ثابت ہے اور بعض شہروں میں نہایت شان کے ساتھ ثابت ہے، اس کے وجود کو ثابت کرنے والی چیز اس کے کھانا فروخت کرنے کی دکان ہے، دکان کا نقشہ جو کثرت سے دیکھا گیا ہے یوں واقع ہوتا ہے کہ ایک مختصر سی کوٹھری کے بیرونی حصے میں چند دیگچیاں اور دیگچے، چند رکابیاں اور کٹورے، جس میں بعض خالی اور بعض میں ترکاری پاس ہی کبابوں کی نہایت معمولی سی سیخیں، ایک طشت میں فیرنی، ایک خوان میں پودینہ، پیاز اور دو چار لیموں، کبابوں کی سیخوں پر ایک آدھ ہار لٹکا ہوا، سائبان کے کنارے پر طوطے، مینا یا تیتر کا پنجرہ لٹکا ہوا، سائبان کے نیچے ایک ڈیڑھ بنچ یا کرسیاں جو صبح صاف ہوگئیں تو شام تک گندی اور شام کو صاف کی گئیں تو صبح کو مکھیوں کا گھر بنی ہوئیں۔ اندرونی حصے میں یا ایک ڈیڑھ چار پائی یا ایک آدھ کھانے کی میز، پاس ہی پانی کے مٹکے جن کی کیچڑ یا غلاظت سے کپڑے سنبھالے بغیر دکان میں جانا بھی مشکل۔ اس ساز وسامان کے ساتھ یہ دکان کبھی کبھی صبح ورنہ شام کو رونق پاتی ہے لیکن دوپہر

کے وقت اس میں نہ بھٹیارہ ملتا نہ بی بھٹیارن البتہ شام کے وقت ان برتنوں کے بیچ میں بی بھٹیارن گلاب کا پھول بن کر رونق افروز ہوتی ہیں، پھر رونق افروز بھی اس گھمنڈ اور نخرے کے ساتھ گویا ان سے کسی شخص کا بات کر لینا بھی انتہائی بہادری کا کام ہے، جس وقت یہ دکان پر تشریف فرما ہوتی ہیں اس وقت ان کے لباس کی رنگینیاں اور زیور کی چمک دمک ان کے خیال میں سارے بازار کی آبرو بڑھاتی ہے، پھر انھیں حسن و جمال کی طرف سے بھی اس درجہ اطمینان ہوتا ہے کہ کہنے کی ضرورت ہی نہیں۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ ان کے بھٹیارے شوہر صاحب صبح سے شام تک تو ان کے شوہر نظر آتے ہیں مگر دکان کے وقت وہ ان کے ملازم ہو کر رہتے ہیں، یعنی کباب سے لے کر دال روٹی اور گوشت روٹی یا پلاؤ اور فیرنی غرض جو کچھ خدا نے دیا ہے وہ سب بی بھٹیارن ہی اپنے دست حنا بستہ سے فروخت فرماتی ہیں اور شوہر صاحب یا کبابوں کی آگ کو بیٹھے ہوا دیا کرتے ہیں یا اٹھ اٹھ کر اور دوڑ دوڑ کر اس کے احکام کی تعمیل میں مبتلا نظر آتے ہیں، محض اس لیے کہ بیوی صاحبہ کو یہ اطمینان حاصل ہوتا ہے کہ دکان پر جتنے خریدار بھی آتے ہیں سب ان کی وجہ سے آتے ہیں حالانکہ پشاور سے چل کر بمبئی تک کے ایک ایک شہر میں جا کر دیکھ لیجیے کہ ان کے حسن و جمال کا کیا حال ہے بس یوں سمجھ لیجیے گویا بی بھٹیارن کی دکان کا چولھا مع کوئلوں کے ان کی صورت پر الٹ دیا گیا ہے مگر اس کو کیا کیجیے کہ وہ اس پر بھی اپنے کو سب سے زیادہ حسین و جمیل سمجھتی ہے۔ چنانچہ وہ دکان پر جس انداز سے بیٹھتی ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اس وقت خود کو قیصر جرمنی سے زیادہ باوقار اور باثر سمجھے بیٹھی ہے۔ کیا مجال جو یہ آپ سے ایک مرتبہ تو مسکرا کر بات کر لے۔ ہر فرمائش کی تعمیل کے لیے یہ نوکروں کی طرح اپنے شوہر کو آواز دے گی۔ مثلاً

— لاؤ ذرا وہ کباب کی سیخ تو اٹھا دو۔
— ذرا یہ فیرنی کے لیے وہ ترازو تو اٹھا لاؤ۔
— اور اندر کھانا کھانے والوں کو پانی بھی پہنچایا یا نہیں۔
— ذرا آگ پر پنکھا تو جھلو تم تو بیٹھے ہوئے ہو۔

اس نخرے کے ساتھ ہی وہ کبھی کبھی کسی گاہک سے مسکرا کر بات کر لے تو سمجھیے کہ زہے نصیب و سعادت اور ایسے ہی خوش نصیب گاہک ہوتے ہیں جو پھر اس کی دکان پر بجائے پانچ

روٹیاں کھانے کے دس روٹیاں کھاتے ہیں اور حقہ بھی پی کر جاتے ہیں۔ یہ شروع سے آخر تک جاہل محض ہوتی ہے مگر خود کو تمام دنیا کے مقرر اور لیکچرار بھائیوں سے زیادہ بہتر بولنے والی تصور کرتی ہے۔ اسے ضرب الامثال کا خزانہ سمجھیے اور جاہلانہ فقروں اور جملوں کی موٹی سی کتاب۔ اب چاہے اس کی گفتگو میں ایک جگہ بھی شائستگی نہ ملے مگر وہ آپ سے جب مخاطب ہوگی اس اطمینان اور اکڑ کے ساتھ گویا آپ تو جاہل اور وہ علامہ غزالی۔ موجودہ زمانے میں اس نے یا اس کے شوہر نے اتنی ترقی کی ہے کہ اس مختصر گندی اور معمولی سی دکان پر ایک تختی یا تختہ بھی لگایا جاتا ہے، جس پر شوہر صاحب کے نام کے ساتھ اس دکان کو ہوٹل لکھا جاتا ہے۔ مثلاً ''نبی بخش اسلامیہ ہوٹل''، ''محبوب ہوٹل''، ''اسلامیہ ہوٹل''، مگر اس ہوٹل میں داخل ہونے سے پہلے انسان کو اس کے دھوئیں، اس کی غلاظت اور اس کے ہاں کی مکھیوں کی کثرت سے طاعون، انفلوانزا اور تپ دق کے لیے تیار ہوجانا چاہیے۔ چنانچہ جن برتنوں میں اس کے ہاں کھانا کھلایا جاتا ہے وہ عام طور پر ایسی دھات کے بنے ہوئے ہوتے ہیں جن پر ایک سال تک قلعی کی ضرورت لاحق نہیں ہوتی، یہی حال اس کے ہوٹل کے فرش اور ان میزوں کی گندگی کا ہوتا ہے جن پر گاہک روزانہ کھانا کھاتے ہیں۔ یہ میزیں اور فرش اس طرح صاف کیے جاتے ہیں کہ ان پر ایک ''قانونی جھاڑو'' صبح یا فرصت کے وقت پھیر دی جاتی ہے یا کوئی گندہ سا کپڑا اور بس۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اوپر پڑا ہوا ذخیرہ تو صاف ہوجاتا ہے، مگر میل کچیل کی تہ برابر جمتی جاتی ہے، جس کے باعث میز کا اصل رنگ اور اصل سطح گندگی سے نوفٹ نیچے دبی رہتی ہے، مگر اس ہوٹل کی اس گندگی پر نہ گاہک احتجاج فرماتے ہیں نہ میونسپل کمشنر صاحب۔ کبھی اس کے ہاں کے کھانے کی میزوں کو چمچوں سے کھرچ کر یا چھیل کر ملاحظہ فرماتے کہ ان پر میل اور گندگی کی تہ کتنی اونچی ہے؟ یہی حال اس کے ہاں کے پانی کے برتنوں کی غلاظت کا ہوتا ہے۔ مثلاً اس کے ہاں جن مٹکوں میں پینے کے لیے پانی رکھا جاتا ہے وہ اس طرح کہ ان کے اندر بس روزانہ پانی بھر دیا جاتا ہے، مگر ان برتنوں کی تہ میں کبھی نہیں دیکھا جاتا کہ پانی کے نیچے گندگی جمع ہو چلی ہے، اسی طرح اس کے ہاں پانی نہ صاف کیا جاتا نہ ٹھنڈا کیا جاتا۔ چنانچہ آپ شدید گرمی کے موسم میں اس کے ہاں کھانا کھائیے اور پانی طلب کیجیے وہی پانی دے دیا جائے گا جو شوربے اور سالن کے برابر گرم ہوگا۔ چنانچہ دیکھا گیا ہے کہ گرمی کے موسم میں گاہک اپنے ساتھ

برف خرید کرلاتے ہیں اور بی بھٹیارن کی دکان کے پانی میں ملا کر پیتے ہیں۔

بھٹیارن صاحبہ کی دکان کی اس غلاظت اور گندگی کے ذمہ دار اصل میں اس کے ہاں کے خریدار ہیں اور پھر وہاں کی میونسپلٹی جو اس کے ہاں کی صفائی اور حفظانِ صحت کے اصول کی تکمیل پر توجہ نہیں کرتے۔ گاہک تو اس لیے توجہ نہیں کرتے کہ اس زمانے میں بھٹیارن کی اس قسم کی دکان پر صرف جاہل، غنڈے اور مزدوری پیشہ لوگ ہی جاتے ہیں جو اس کی اصلاح اور صفائی کے لیے احتجاج اور انتظام کرانے کے طریقے نہیں جانتے، مگر میونسپلٹی کے ارکان اس دکان کی بیماری اور وبا پھیلانے والی گندگی کے اس لیے ذمہ دار ہیں کہ وہ تعلیم یافتہ ہوتے ہیں، مگر پھر بھی وہ کھانے کی دکانوں میں ظاہری صفائی کے سوا اس کی مضرّت رساں گندگی کو دور کرنے پر متوجہ نہیں ہوتے مگر ان کے متوجہ نہ ہونے کا سبب بھی اس شہر کے عوام کی بے خبری ہے، ورنہ جس دن دس بارہ غنڈے میونسپلٹی کے صدر صاحب کے مکان پر پہنچ کر یہ عرض کریں کہ بس دیر نہ کیجیے اور چلیے فلاں نان بائی یا بھٹیارے کی دکان میں کافی صفائی کا بندوبست فرما دیجیے اسی دن سے اس شہر کی تمام دکانوں میں نہایت معقول صفائی نظر آنے لگے۔

الغرض بھٹیارن جوانی کی عمر سے گزر کر جب بڑھاپے کی طرف سفر کرتی ہے تو اس کی مزاجی حالت نہایت ابتر اور تکلیف دہ ہوتی جاتی ہے۔ مثلاً وہ اب لباس اور زیور کے حساب سے بھی نہایت ''واہیات سی عورت'' ہو جاتی ہے۔ چنانچہ اس کا یہ ''واہیات پن'' کیا کم ہوتا ہے، کہ اب یہ حقہ پینا شروع کر دیتی ہے اور کبھی کبھی افیون سے بھی لطف اٹھاتی ہے اور ان ''لطیف غذاؤں'' کا یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اب اس سے سیدھی طرح بات کرنا محال ہو جاتا ہے۔ جہاں آپ نے اس سے کوئی سوال کیا اور اس نے یوں جواب دیا گویا جوتا مار دیا۔ اب اس کی زبان نہ شوہر کے بس کی نہ بازار والوں کے قابو میں اور ویسے بھی اب یہ ذرا ''وسیع المعلومات'' سی ہوتی جاتی ہے۔ چنانچہ اب گاہک کا دکان پر بیٹھنا مصیبت ہے۔ جہاں آپ پہنچے اور اس نے خلافت ایجی ٹیشن اور کانگریس کے رضا کاروں کی برائی شروع کی، مگر اس درجہ بے موقع اور بے ربط کہ خدا کی پناہ اگر اسے کسی آنریری مجسٹریٹ کا نام یاد ہے، تو وہ جہاں سے چاہے گی اس کا قصہ شروع کر دے گی اور جب چاہے گی شہر کوتوال کا قصہ سنانے لگے گی۔ پھر آخری مصیبت یہ کہ نہ آپ سے مخاطب ہوگی نہ

آپ کی طرف دیکھے گی، مگر زبان ہوگی کہ قینچی کی طرح برابر چلتی رہے گی۔ اب وہ دنیا کی نہیں تو اپنے شہر کی ہر چیز اور ہر بات سے تھوڑی بہت واقفیت رکھتی ہے، اس لیے پردیسی گاہکوں کے لیے ایک حد تک وہ رہنما کا کام دیتی ہے، مثلاً آپ تلاشِ معاش میں اس شہر میں داخل ہوں تو وہ یہاں کے وزیر صاحب تک کا نام بتا دے گی، مگر ساتھ ہی یہ کہہ کر رہے گی کہ میاں وہ بڑا لالچی آدمی ہے، گرہ میں اگر کچھ ہو تو وہ آپ کے لیے سب کچھ کر دے گا ورنہ پھر کچھ بھی نہیں۔ وہ یہ بھی بتا دے گی کہ حکیم محمد احمد صاحب دہلوی کا علاج زیادہ فائدہ کرتا ہے یا حکیم نابینا صاحب کا۔ وہ یہ بھی بتا دے گی کہ جانکی بائی الٰہ آباد والی اچھا گاتی ہے یا مُشتری جان آگرہ والی۔ وہ یہ بھی بتائے گی کہ خواجہ حسن نظامی صاحب کے ہاں قوالی کس عرس میں ہوتی ہے اور مولانا احمد سعید صاحب دہلوی کے وعظ کا وقت کب سے کب تک ہے۔ وہ ہندستان میں انگریزوں کی چالاکیوں اور مظالم کو بھی بیان کرے گی اور ان سے پہلے کے زمانے کی تعریف بھی سنائے گی اور وقت آنے پر وہ مولویوں کو بھی سیدھی سیدھی سنا دے گی اور صوفیوں کو بھی اور کوتوال صاحب کے تذکرہ کو بچا کر وہ عدالت کے جج صاحب تک کی برائیاں کرنے سے باز نہ رہے گی۔ خاص کر پچھلے زمانے کے عدل و انصاف اور طریقِ حکومت کے مہمل اور بے معنی حوالے ضرور دے گی اور اسی سلسلے میں وہ ایک آدھ کہانی بھی بطریقِ مثال شروع کر دے گی پھر آپ کا جی چاہے سنیں ورنہ وہ خود اسے بیان کر لے گی اور خود ہی سن لے گی۔ چنانچہ ایسا بھی ہوا ہے کہ اس کی سابق گاہک سے شروع کی ہوئی کہانی کو تازہ گاہکوں نے سنا ہے۔

اس کی زندگی کا سب سے خطرناک حصہ اس کی وہ لڑائی ہے جو دکان پر یہ اپنے گاہک سے لڑتی ہے اور جس کے لیے آج تک دنیا کے کسی ایک قانون میں کوئی صراحت اور شرح یا دفعہ اور قاعدہ نہیں بتایا گیا کہ آخر اس لڑائی کا حق اسے کیوں کر ملا۔ پھر یہ کہ اسے کس حیثیت سے گاہک سے لڑنا چاہیے، کس وقت لڑنا چاہیے، کس قسم سے لڑنا چاہیے، کتنی دیر تک لڑنا چاہیے، کس کے سامنے لڑنا چاہیے اور پھر یہ کہ لڑنا ہی کیوں چاہیے۔ سیدھی طرح معاملہ صاف اور طے کیوں نہ کر لینا چاہیے؟ پھر یہ کہ اگر لڑتی ہے تو اپنی دکان کے گاہک سے لڑ، مگر دوسری پاس والی دکان کے گاہک کی لڑائی میں تو اپنی دکان پر بیٹھی ہوئی اس طرف منہ پھیر کر کیوں برس رہی ہے؟ پھر یہ بھی

کوئی دریافت کرے کہ اے معمولی سی بھٹیارن وہ جو تیرا ایک مرد اور شوہر ہے وہ تو اپنی ساری عمر خاموش ہی رہا اور کسی سے نہ لڑا مگر تو ہے کہ بیوی ہو کر ہر آنے اور جانے والے سے الجھنے کو اُدھار کھائے بیٹھی رہتی ہے تو آخر کیوں؟ پھر یہ کہ اگر تو لڑنے ہی کو ''کارِ خیر'' سمجھے ہوئے ہے تو خیر لڑ مگر خدا کے لیے اتنی دیر تک نہ لڑ کہ لڑنے والا گاہک اپنے گھر تک پہنچ جائے مگر تیری ٹرٹرا اور ٹرٹر کا تار ہی نہ پلٹے۔ پھر اس سے یہ بھی دریافت کیجیے کہ جب تو لڑتی ہے تو اس طرح کیوں لڑتی ہے کہ تیرا شوہر بجائے گاہک کے الٹا تجھے ڈانٹتا ہے مگر تو ہوتی ہے کہ اس پر بھی دم نہیں لیتی۔ اس کی لڑائی کا انجام ہمیشہ یہ ہوتا ہے کہ گاہک تو صبر کر کے گھر چلا جاتا ہے مگر یہ برابر ٹرٹر کرتی رہتی ہے اور آخر کار تھک کر خاموش ہو جاتی ہے۔ اس کا آغاز یوں ہوتا ہے جس کی کوئی تمہید نہیں ہوتی مثلاً جو چیز گاہک خریدنا چاہتا ہے اس کی حیثیت یا اس کی قیمت سے جھگڑے کا آغاز ہوتا ہے اور یہ کہتی ہے کہ:

— میاں تم نے کبھی پردیس کی صورت بھی دیکھی ہے؟
— کبھی عمر میں خریدا بھی تھا؟
— کس گاؤں کے رہنے والے ہیں آپ؟
— جب گرہ میں ٹکا نہ تھا تو پھر دکان پر تشریف ہی کیوں لائے؟
— میں سمجھتی ہوں کہ گھر سے نکلنے کا شاید پہلا ہی موقع ہے؟
— بس تو رکھ دیجیے یہاں ڈھائی آنے اور۔
— تو کیا مسافر خانہ سمجھا ہے میری دکان کو؟
— تو کیا ہم کوئی ''کمین ذات ہیں؟''
— تو پھر آپ سے کیوں باہر ہوئے آپ؟
— بس زبان کو قابو میں رکھیے۔
— ذرا ہوش کی لیجیے ورنہ ابھی معلوم ہو جائے گا آپ۔
— تو کس نے ہاتھ جوڑے تھے آپ کے؟
— بہت خوب بہت خوب سچ فرمایا آپ نے۔
— اچھا تو بس لائیے وہ ڈھائی آنے تو میں ہو جاؤں خاموش۔

— مال دیا ہے مال، ہیں کس خیال میں آپ؟

— اے حضرت کسی کا پیسہ رکھ لینا آسان کام نہیں ہے۔

— یہاں بڑے بڑوں کو دیکھ لیا ہے آپ ہیں کیا چیز؟

— ہاں ہاں ہم تو ڈھائی آنے ہی لیتے ہیں اس کے۔

— تو پھر آپ کی خوشامد کی تھی میں نے؟

واضح ہو کہ اس وقت بی بھٹیارن کے میاں بھٹیارے صاحب ہوٹل کے کسی گوشے میں یا دم بخود نظر آتے ہیں یا حقہ پینے میں مصروف۔ اب اگر کہیں بولتے ہیں تو اتنا کہ اپنی ہی بیوی کو چپ ہو جانے کی ہلکی سی ہدایت فرما کر پھر حقہ پینے لگتے ہیں اور جو کہیں شوہر صاحب کے ''دخل در گاہک'' سے گاہک رخصت ہو جائے تو پھر بھٹیارن اپنے شوہر پر ٹوٹ پڑتی ہے:

— تمھیں بیچ میں بولنے کی کون ضرورت تھی؟

— تو خبر بھی تھی کہ میں کیا کہہ رہی تھی اس سے؟

— تو پھر تم ہی ''چلا لو دکان''

— میں تو کہتی ہوں کہ تمھیں بیچ میں دخل دینے کی کیا ضرورت تھی۔

— تمھاری باتوں ہی سے تو میرے ڈھائی آنے گئے ضائع۔

— تمھیں خبر کیا تھی کہ معاملہ کیا ہے؟

— مگر تم سے بولے بغیر رہا جائے جب نا؟

— تم اپنا حقہ چھوڑ دو جب؟

— تو کس نے کہا تھا کہ تم میرے اور گاہک کے درمیان بولو۔

— میں تو یہ کہتی ہوں کہ معاملہ تو سمجھ لیا ہوتا پہلے تم نے۔

— وہ بھی تو مجھے سنا رہا تھا خوب خوب۔

— اچھا تو کل سے تم میری جگہ بیٹھ کر دیکھ لو۔

— مسافر تو تھا تو کیا دام چھوڑ دیتی اپنے؟

— اور وہ جو کل سے کہہ رہی ہوں کہ آٹا خراب آرہا ہے۔

— اور یہ آج کے کبابوں کا گوشت تم لائے یا وہ سدّ و؟

— وہ تو میں خیال نہ کرتی تو یہ بھی نہ ملتا اور اوپر سے ہیں کہ معاملات میں دخل دیتے ہیں آپ۔

— اچھا تو ایسا میں نے کیا کہہ دیا تھا اس سے۔

— کون سی فوجداری کی تھی میں نے؟

بھٹیارن کی لڑائی سے بعض اوقات ڈپٹی کلکٹروں اور گورنروں تک کی سواری رُک جاتی ہے، اس طرح کہ اس کی لڑائی کا شور سن کر راگیر ٹھہر جاتے ہیں اور آن کی آن میں اس کی دکان کے سامنے خاصا ہجوم ہو جاتا ہے۔ اس ہجوم کی وجہ سے آنے جانے والے تانگے رُک جاتے ہیں اور ان کے پیچھے گورنر صاحب کا موٹر کھڑا چنگھاڑتا رہتا ہے۔

اس کا مکان نہایت تاریک اور گندہ ہوتا ہے۔ یہ خود دکان کے بعد نہایت غلیظ اور گندہ رہتی ہے، مزاج کی بے حد سست اور کاہل، حکومت کرنے کی عادی اور بات بات پر لڑنے کو تیار، اس کی اولاد یکلخت جاہل، آوارہ، قمار باز اور چانڈو نوش ہوتی ہے۔ یہ مفلس اور تنگدست رہنے کی عادی ہوتی ہے۔ دولت جمع کرنا اس کے امکان میں نہیں، ہمیشہ قرضدار، اولاد کم، پھر بھی زیور کی عاشق، مذہب سے یکسر ناواقف، شوہر پر حاوی، صورت کی بھونڈی اور کالی اور زبان کی نوک پر تو تڑاق اور گالی۔ فقط۔

◆◆◆

دھوبی کی بیوی

دھوبی وہ جو ہمارے آپ کے اور ساری دنیا کے کپڑے دھوتا ہے۔ بظاہر تو لفظ ''دھوبی'' کا اطلاق اس حقیر سے انسان پر ہوتا ہے جو کپڑے دھوتا ہے لیکن بین الاقوامی اور بین الجماعتی لحاظ سے دھوبی کی ذات نہایت اثر انداز اور تہلکہ ڈالنے والی ذات ہے۔ اس کے اثرات سے نہ فقط عوام بلکہ خواص اور خواص کے بھی خواص متاثر ہوتے ہیں۔ مثلاً آپ یہی دیکھ لیجیے کہ یہ دھوبی جس طرح ہمارے آپ کے گھروں پر کپڑے لینے آجاتا ہے اسی آسانی کے ساتھ وہ وائسرے اور ملکہ معظم کے کپڑے لینے ان کے محلات پر چلا جاتا ہے اور کیا مجال جو اسے یا اس کے ننھے میاں کی والدہ کو ایک سپاہی یا پچاس سپاہی بھی مل کر روک تو لیں بلکہ ہمارا تجربہ تو یہ ہے کہ دنیا کے تمام امیروں اور رئیسوں کے ساتھ دھوبی ضرور ہوتا ہے۔ ویسے بھی یہ ہر انسانی جماعت کے لیے اس درجہ ضروری چیز ہے کہ اس سے قطع تعلق کرنا گویا اپنی شرافت، اپنی شہرت، اپنے اثر اور اپنی حیثیت پر داغ اور دھبہ لگانا ہے کیونکہ جب سے پڑھے لکھے انسانوں نے ہر شخص پر اپنے ہاتھوں سے اپنے کپڑے دھونا معیوب قرار دے دیا ہے اس وقت سے دھوبی کے اثر اور اقتدار میں بغیر موت کے پھانسی تک دے دینا شامل ہو گیا ہے اور شریفوں کے لیے اس کا پھانسی پر لٹکا دینا نہیں تو اور کیا ہے کہ آپ عین عید کی صبح کو اس کے گھر پر کھڑے ہوئے چلاتے ہیں کہ:

اے ملعون تو کیا آج عید کے دن بھی یہ میلے کپڑے پہن کر جائیں؟

اور یہ اس وقت بھی نہایت اطمینان کے لہجہ میں کہتا ہے کہ دے تو رہا ہوں میاں آپ کے کپڑے بس یہ ذرا عبداللہ خاں کے کپڑے اور تیار کرلوں، پھر اس کی یہ شان کیا کم ہے کہ یہ آپ کے کپڑوں میں سے جس کپڑے کو ذرا صاف اور شاندار پاتا ہے اسے دھونے سے پہلے خود ایک ہفتہ تک پہن کر اکڑتا ہے، مگر آپ سے نہیں ڈرتا۔

پچھلے زمانے کے دھوبی آج بھی نہایت تنگ و تاریک مکانات میں رہتے ہیں، مگر اس زمانے کا دھوبی شہر بمبئی میں ''بالشفر'' کی حیثیت سے ایک شاندار دکان میں رہتا ہے۔ البتہ عام دھوبیوں کے مکانات کی شان یوں نظر آتی ہے کہ ایک تاریک مکان میں سب سے پہلے اس کا ''پارچہ بردار'' ٹٹو یا گدھا یا نیلام شدہ خچر یا موٹا تازہ سا بیل بندھا ہوا نظر آتا ہے جس پر وہ تمام دنیا کے کپڑوں کا انبار لاد کر گھاٹ پر لے جاتا ہے اور کبھی کبھی اس انبار کے اوپر خود بھی بیٹھا ہوا نظر آتا ہے ورنہ اس کے دو ننھے میاں تو اس سواری سے چوکتے ہی نہیں۔ اس کا گدھا اکثر ایسے حصۂ مکان میں بندھا رہتا ہے جس کے بالکل ہی قریب آپ کے اور تمام محلے اور شہر کے شریفوں کے کپڑوں کا انبار لگا ہوتا ہے، جس کا یہ مطلب ہے کہ اگر اس کا گدھا گھاس چرتے چرتے کبھی کپڑے چرنا چاہے تو آسانی سے چر سکتا ہے۔ اسی لیے کبھی کبھی سنا ہے کہ وہ اپنے ننھے میاں کی والدہ سے چلا کر یہ کہتا ہے کہ ''اری اندھی دیکھ وہ گدھا کپڑے کھا رہا ہے، ذرا بھگا اسے جلدی''۔

اس کے اقتدار اور اثر کا دوسرا نمبر یہ ہے کہ اپنے ہاں کے جمع کیے ہوئے کپڑوں کے انبار پر دھوبی کے پانچ چھ ننھے میاں ہر وقت کھیلتے اچھلتے، کودتے، پھاندتے اور گھسیٹ گھسیٹ کر بھاگتے ہوئے نظر آتے ہیں اور کہیں کہیں والد صاحب کی نظر بچا کر انہی کپڑوں کے اندر پیشاب بھی فرما دیتے ہیں اور پھر کھیل میں مصروف ہوجاتے ہیں۔ اسی لیے تو یہ ''بڑے مولوی صاحب'' کی قسم کے لوگ دھوبی کے عوض خود اپنے ہاتھوں سے جامع مسجد میں کپڑے دھو لیتے ہیں، مگر دھوبی کو نہیں دیتے۔ دھوبی کے گھر میں بڑا اہتمام اس ''کارخانہ پارچہ شوئی'' کا ہوتا ہے جسے بعض لوگ ''بھٹی'' اور بعض لوگ ''بھٹا'' کہتے ہیں۔ چنانچہ جب کپڑے اس بھٹی کے اندر ڈال دیے جاتے ہیں تو پھر اگر پولیس بھی چاہے تو وقت پر انھیں نکال نہیں سکتی۔ مثلاً جب آپ دھوبی

کے گھر کپڑوں کے لیے جائیے یہی جواب ملے گا کہ ابھی بھٹی گرم ہو رہی ہے پرسوں ملیں گے آپ کے کپڑے۔

دھوبی یقیناً ایک برادری والا انسان ہوتا ہے جو ایک منتظم حیثیت سے جماعت سمجھی جاتی ہے۔ اس برادری کے آداب و رسوم خاص ہوتے ہیں جن کا ہر دھوبی پابند ہوتا ہے۔ اس کے ہاں دوسری برادری اور جماعت میں شادی بیاہ جائز نہیں ہے، لہٰذا اس کی بیوی بھی اسی برادری سے ہوتی ہے، جو نہایت درجہ جاہل خاندان میں پیدا ہوتی ہے اور جاہلانہ رسوم و حالات کے ساتھ پرورش پاتی ہے۔ اس کی پیدائش پر حسب حیثیت مسرت اور تقاریب کا سامان کیا جاتا ہے۔ اس کے ہاں کم عمری کی شادی جائز ہے اور بعض کے ہاں منع۔ اس کی تربیت اور تعلیم کا کوئی بندوبست نہیں ہوتا بس جاہل ماں باپ کے ساتھ رہتی ہے اور کپڑے دھونے کا کام سیکھ جاتی ہے اور بس۔ البتہ یہ شادی ہو جانے کے بعد نہایت ''علامہ'' ہو جاتی ہے۔ خصوصاً ابتدائی عہد میں تو اس کے پاس کپڑے لینے جانا خود کو موت کے منہ میں دینا ہوتا ہے۔ یہ صبح اور شام کے وقت سر سے لے کر جہاں تک اس کا بس چلتا ہے وہاں تک نیچا گھونگھٹ فرمائے نظر آتی ہے، مگر اس نظری حجاب کے یہ معنی نہیں ہوتے کہ وہ کوئی بڑی ہی شرمیلی دُلہن ہے بلکہ اس گھونگھٹ کے اندر اس کی ہاتھ بھر کی وہ زبان ہوتی ہے جس سے نہ سڑک پر کھڑا ہوا پولیس کا سپاہی محفوظ نہ ہم اور آپ۔ چنانچہ جس نے بھی اس سے اپنے کپڑے مانگے اور اس نے گھونگھٹ ہی کے اندر سے فرمایا:

— دھرے ہیں کپڑے ابھی سے۔
— وہ پچھلے مہینے کے دام تو دو پہلے، پھر لینا کپڑے۔
— تو آپ کے ہاتھ کون جوڑتا ہے، دھلوا لیجیے کسی اور سے۔
— ہاں ہم تو مہینے میں دو مرتبہ ہی دے سکتے ہیں کپڑے۔
— مجھے نہیں معلوم وہ کہاں رکھ گئے ہیں آپ کے کپڑے۔
— بس تو انہی سے لے جانا کپڑے۔
— اے میاں ایک روپلی میں سارے گھر کے کپڑے ہم سے تو نہیں دھوئے جاتے۔

مردوں سے اس نخرہ سے گفتگو کے مقابل یہ ہمارے آپ کے گھر کی عورت ذاتوں سے جو

گفتگو کرتی ہے اس میں یہ فرق ہوتا ہے کہ غریب گھرانے کی عورتوں سے جو بات کرتی ہے کافی نخرے سے اور امیر عورتوں سے جتنی دیر بات کرتی ہے کافی ادب، کافی خوشامد اور کافی دعائیں دے کر۔

اور جو کہیں یہ ہوئی افسروں اور رئیسوں کے کپڑے دھونے والی، پھر تو عوام سے اس کے نخرے کا اندازہ ہی محال ہے۔ حد سے سوا شوخ اور بھڑک والا لباس پہنے گی۔ بھونڈا زیور اس کے سر کے بالوں سے لے کر پاؤں کے ناخن تک نظر آئے گا، چلے گی تو نخرے سے اور بات کرے گی تو نخرے سے۔ غرض یوں سمجھیے کہ وہ دھوبی کی بیوی ہونے پر خود کو دھوبی کی بیوی نہیں سمجھتی۔

اس کے ہاں اولاد کی تعداد بھی کافی ہی نظر آتی ہے، لیکن اس کی عملی مستعدی اور اس کی بہادرانہ جرأت کا اندازہ اسی وقت ہوتا ہے جب یہ اپنے گھر سے تین چار سو کپڑوں کی گٹھری سر پر لے کر اس طرح گھاٹ کو جاتی ہوئی نظر آتی ہے کہ سر پر اتنا بوجھ اور گود میں ایک بچہ دودھ سے چمٹا ہوا اور دو چار آگے پیچھے روتے ہوئے یا کھیلتے ہوئے اور ان سب کے آگے اس کے کپڑے لے جانے والا گدھا۔ گویا بیک وقت وہ ایک گدھے اور دو تین بچوں کی کمانڈ بھی کرتی جاتی ہے۔ خود بھی بوجھ اٹھائے رہتی ہے اور ایک بچے کو دودھ بھی پلاتی جاتی ہے۔ اس کے بعد اس کا گھاٹ اس کے عمل کا مرکز بھی ہوتا ہے اور یہی اس کی دوسری آرام گاہ بھی بنجاتا ہے۔ چنانچہ یہ عین اس وقت جب کہ صبح صادق سے بھی کچھ پہلے اپنے بڑے مولوی صاحب نماز کے لیے کھانسنا شروع کرتے ہیں اور ان کے ہاں سفید مرغا اذان دینا شروع کرتا ہے یہ کسی دریا یا کسی تالاب کے پانی میں اتر جاتی ہے اور ہمارے آپ کے نفیس اور نازک کپڑوں کو کسی بڑے پتھر پر یوں اٹھا اٹھا کر دے مارتی ہے کہ دیکھ کر جی چاہتا ہے کہ اسی پتھر پر اس ''دھوبن'' کو دے ماریں، مگر یہ مسلسل دو تین گھنٹے تک پانی میں رہتی ہے، عام اس سے کہ جاڑے کا موسم ہو یا برف باری کا۔ اب یہ پانی سے باہر آ کر دھوئے ہوئے یا بے دھوئے ہوئے کپڑوں پر بے تامل بیٹھ جاتی ہے اور اپنے بچے کو دودھ پلانا شروع کر دیتی ہے اور کبھی جو ہوا وقت دوپہر کا تو پھر دودھ پلاتے پلاتے ہی انہی کپڑوں پر مع بچے کے خود بھی چت پڑی ہوئی نظر آتی ہے اور اسی جگہ پتہ چلتا ہے کہ وہ اپنے شوہر کے کام یا اپنی روزی خود کمانے میں کتنی مستعد اور عملی عورت ہے۔ کہیں کہیں یہ مزاج کی چور بھی

واقع ہوتی ہے۔ چنانچہ وہ آپ کے ہمارے کپڑوں میں سے بعض عمدہ سا کپڑا دوسرے شخص کو خفیہ طور پر فروخت بھی کر دیتی ہے اور آپ سے کہہ دیتی ہے کہ وہ کپڑا مجھے گھر سے دیا ہی نہیں گیا یا دیا تھا مگر کھو گیا۔ اس موقع پر اس کے اور کپڑے مالک کے درمیان جرمنی کی جولڑائی نظر آتی ہے خدا اس سے ہر شریف انسان کو بچائے:

— تو میرے بھی تو تین مہینے کے دام ہیں آپ کی طرف۔

— میاں کا ایک کپڑا کیا کھو گیا کہ اب ہم ہو گئے چور زمانے کے۔

— تو اپنے کپڑے کے دام ہی لو گے کہ کسی کی جان؟

— ہاں ہاں حضور ہم تو ہیں کمین ذات مگر آپ اشراف ذات ہیں تو ہمارے بھی حساب صاف کر دیجیے۔

— ہاں ہاں میں اولاد کی قسم کھا کر کہتی ہوں کہ مجھے وہ کپڑا نہیں دیا۔

— اچھا اچھا تو آپ اول فول کیوں بولتے ہیں بس کاٹ لینا ہماری تنخواہ سے جتنا جی چاہے۔

— دیا بھی تھا کبھی انعام۔

— بس رہنے بھی دیجیے حضور کیوں مجھ سے زیادہ...

— ہاں ہاں کہہ تو رہی ہوں کہ...

— اچھا تو پھر کوتوالی میں بند کرا دیجیے اب آپ۔

— کس کے سامنے؟

— جھوٹ جھوٹ۔

اس درمیان میں کہیں کہیں ان کے شوہر صاحب بھی فرماتے جاتے ہیں بس تو چپ ہو جانا تو ہی۔

— ہاں ہاں تو دام دے دیں گے پھر کیوں چلا رہی ہے تو۔

— حضور میں ذمہ دار ہوں وہ تو ہو گئی ہے دیوانی۔

— بس تو آپ مجھ سے لینا۔

اس موقع پر یہ شوہر صاحب کو بھی وہ سناتی ہے کہ سنیے اور مست ہو جایئے۔

— بس تو پھر تم ہی لا نا ان کے کپڑے۔
— تو تم بیچ میں کیوں بولے۔
— کیا تم گئے تھے کپڑے لانے۔
— تو ان کی بھی سنی تھیں باتیں۔
— اچھا تو اب تم ہی دھونا ان کے کپڑے۔

کپڑ دھونے میں مستعد مگر گھر کے کاموں میں میلی اور سست۔ مکان اور اس کا سامان گندہ، صرف اپنا لباس اور زیور صاف۔ نہ زیادہ فضول خرچ نہ زیادہ جمع کرنے والی۔ اولاد کی تربیت میں نہایت جاہل اور بے پروا۔ شوہر کی عزت کرنے والی مگر کبھی کبھی برابر سے لڑنے والی۔ اپنی روزی کمانے میں خود نہایت ہوشیار، چالاک، شوہر کی طرح اولاد سے بھی بے پروا۔ شدید قسم کی جاہلانہ رسوم کی پابند۔ نہ مذہب سے خبردار نہ دنیا کی کسی دوسری تحریک سے واقف۔

بہت بڑھی تو میلے اور تہوار کے دن بچوں کے کپڑے ذرا عمدہ بنا دیے ورنہ ننگ دھڑ نگ، کم شرمانے والی، زیادہ بولنے والی اور زیور کو بڑھاپے تک نہ چھوڑنے والی۔ بے حد حریص اور لالچی۔ چنانچہ تقریبات میں جتنا بھی انعام دیجیے آخر میں اتنا ضرور کہے گی کہ ایک روپیہ تو اور دے دیجیے۔ اب کی تو کچھ بھی نہ ملا۔ بے حد مکار اور جھوٹ بولنے والی۔ چنانچہ جب یہ کہے بس جمعہ کے دن لا دوں گی کپڑے تو سمجھ لیجیے کہ دوسرے جمعہ کو بھی دے دے تو احسان ورنہ چاند کی پہلی کو۔ سو وہ بھی اس طرح کہ آپ خود دس مرتبہ اس کے گھر جا کر گالیاں دیں یا ملازم کے ذریعے اسے مسلسل غزلیں اور نظمیں سناتے رہیں۔ اسی عادت کی بنا پر وہ کبھی کبھی کپڑے والوں کے طمانچے بھی تناول فرماتی ہوئی دیکھی گئی ہے۔

◆◆◆

بھنگی کی بیوی

بازاری تعلقات، خدمات اور اثرات کے لحاظ سے بھنگی کی بیوی کا رتبہ بھی خاص ہے۔ یہ انسانی ضروریات اور خدمات کے لحاظ سے نہایت ضروری بیوی۔ لفظ ''بھنگی'' کے ظاہری معنی کے لحاظ سے سمجھا جاتا ہے کہ یہ بیوی غلاظت، گندگی اور میلے پن کی ایک نہایت گھناؤنی پوٹ ہوگی اور ایک حد تک ایسی ہی ہوتی بھی ہے لیکن بعض حالات کے ساتھ یہی ''بھنگی زادی'' بعض اشراف اور امرا کے گھر کی ملکہ بھی بن جاتی ہے۔

بھنگی کی پیدائش بھنگی ہی کے گھر سے ثابت ہے۔ دوسرے ممالک کو چھوڑ کر ہندستان میں ''بھنگی'' سے زیادہ ذلیل، پست، خوار اور پلید دوسرا کوئی انسان نہیں سمجھا جاتا، اسی لیے اس کے خواص میں بھی حد سے سوا بے چارگی، بندگی، غربت، ذلت اور پستی بہ طریق ضابطہ موجود ملتی ہے۔ یعنی ایک بھنگی خود کو ہر انسان سے نہایت درجہ پست، ذلیل، کمزور اور سب سے نیچے درجہ کا انسان سمجھا جاتا ہے اور یہ اس لیے کہ ابتدا ہی سے اس کے ساتھ جماعت میں نہایت ذلیل اور ذلت انگیز برتاؤ روا رکھا گیا ہے۔ چنانچہ جماعت یا عام افراد کی طرف سے بھنگی انسان کے ساتھ جس قسم کے تعلقات رکھے جاتے ہیں ان میں سے بعض یہ ہیں:

1۔ بھنگی، اس کی بیوی اور اس کی اولاد اور اس کے جملہ متعلقات سے چھو جانا، ہاتھ لگانا یا اس

کے قریب سے گزرنا ''ناپاکی''، ''پلیدی'' اور ''گناہِ عظیم'' کی حیثیت رکھتا ہے۔ چنانچہ جاہل طبقات میں سے اگر کوئی شخص کسی بھنگی سے سہواً بھی چھو جائے یا اس کے کپڑے سے کپڑا چھو جائے تو اس صورت میں چھو جانے پر غسل کرنا اور ان کپڑوں کو یا پھینک دینا یا از سرِ نو پاک کرنا فرض سمجھا گیا ہے۔

2۔ بھنگی کو اشراف کی آبادی میں رہنے کے لیے جگہ دینا جماعت میں ممنوع ہے، اسی لیے بھنگی ہمیشہ آبادی سے ایک طرف اور دور گھر بناتا ہے۔

3۔ بھنگی ضرورت کے سوا آپ کے گھر میں قدم نہیں رکھ سکتا۔

4۔ اس کے آدابِ گفتگو یہ ہیں کہ اس سے آپ جب مخاطب ہوں تو تو تڑاق سے اسے مخاطب کریں اور وہ جب آپ کو جواب دے یا آپ سے بات کرے تو آپ کو حضور، اَن داتا، مائی باپ، مالک، آقا اور سرکار کہے اور اس طرح کی گفتگو کو نہ آپ معیوب سمجھتے نہ بھنگی اسے غیر منصفانہ برتاؤ قرار دیتا۔

5۔ بھنگی کو اپنے سامنے کا بچا ہوا کھانا، باسی ترکاری اور گندگی سے بھرا ہوا کھانا دینا بھی جائز ہے اور بھنگی اپنی گندہ ذہنیت کے باعث اسے بغیر کسی اعتراض اور نفرت کے قبول بھی کر لیتا ہے۔

6۔ جماعت کے اس ذلّت انگیز برتاؤ نے جب ایک ضابطہ کی صورت اختیار کر لی تو بھنگی کی نسل اور طبیعت تک میں گندگی اور ذلّت نے جگہ پکڑ لی۔ چنانچہ اس کے اندر گندگی اور ذلّت پسندی کے جملہ خواص موجود نظر آتے ہیں۔

البتہ 1914 کے بعد سے ہندستان میں جو ذہنی اور عقلی انقلاب شروع ہوا ہے اس کے اثر سے یہاں کی بعض پست اور ذلیل جماعتوں میں اپنی فطری خودداری اور تبدیلی کا ایک خفیف سا احساس پیدا ہو گیا ہے جس کے زیرِ اثر حجام، دھوبی، چمار اور بھنگی برادری میں نئی زندگی کے آثار اور اعمال نظر آنے لگے ہیں۔ چنانچہ ایسی جماعتوں میں اپنی برادری کی تنظیم، تفوق، تعلیم اور رسوم بد کی اصلاح کے لیے انجمنیں اور لیڈر پیدا ہو گئے ہیں جو اپنی اپنی جماعتوں کو عام انسانوں کے برابر ترقی دینے کے لیے مساعی ہیں، لیکن پست جماعتوں کے اس احساس کی رفتار اس لیے ابھی سست

اور نا قابلِ التفات ہے کہ ان میں دیرینہ جہالت کے اثرات کافی سے زیادہ موجود ہیں۔ اس لیے وہ جدید انقلاب اور تبدیلی کو مذہبی اور قومی روایات کا مخالف اور ایسے اعمال کو مذہبی گناہ سمجھتے ہیں جو نیم تعلیم یافتہ ہونے کے باعث پست جماعتوں کو عام انسانی حقوق دینے اور دلانے کو اپنے اقتدار کے خلاف سمجھتی ہیں، اسی لیے پست جماعتوں کے مصلحین کو اصلاح کے لیے عام تائید حاصل نہیں ہوتی، پھر بھی اعلیٰ جماعتوں کی اصلاحی تدابیر اور ترقی حاصل کرنے کے ذرائع کو دیکھ کر پست اقوام کے افراد نے اپنی اپنی جگہ کام شروع کر دیا ہے اور کچھ شک نہیں کہ ہندستان کی پست اقوام کو عام انسانوں کے برابر ترقی حاصل کرنے کے جو مواقع انگریز قوم نے دیے وہ ان سے پہلے نظر نہیں آتے۔ مثلاً انگریزوں نے اپنی جاری کردہ عام سواریوں مثلاً ریل، موٹر کار، سائیکل، مسافر خانوں اور اسٹیشنوں پر پست جماعتوں کے لیے کوئی ممانعت اور خصوصیت روا نہیں رکھی اور اسی لیے جس ریل میں آپ سفر کر سکتے ہیں اسی میں ایک بھنگی اور چمار بھی سفر کر سکتا ہے۔ اسی طرح انتظامی امور میں بھی انگریزوں نے متعدد مواقع پر پست جماعتوں کو برابر کے حقوق دے کر انھیں ترقی کے مواقع بہم پہنچائے مثلاً ایک چمار اور بھنگی کا لڑکا اور اس کی لڑکی ہر انگریزی تعلیم گاہ میں اس کی عام شرائط کے ساتھ ہمیشہ سے داخل ہو سکتا ہے اور داخل ہو سکتی ہے۔ اسلام میں بھی پست اور اعلیٰ جماعت کا کبھی کوئی معیار قائم نہیں ہوا لہٰذا اب وہ لوگ پست جماعتوں کے محسن نہیں کہے جا سکتے جو آج انھیں ترقی دلانے چلے ہیں بلکہ یوں کہیے اور نہایت دیانت سے کہیے کہ اگر انگریز قوم اپنے نظمِ حکمرانی میں پست اقوام کے لیے مذکورہ بالا اور ان سے بھی سوا مراعات کو جائز نہ رکھتی تو پست اقوام کا موجودہ احساسِ ترقی کبھی بیدار نہ ہوتا۔ چنانچہ انگریزوں کے جملہ قوانین میں بعض خاص الخاص حالات کے سوا اعلیٰ اور پست اقوام کے ساتھ یکساں برتاؤ کو جگہ دے کر موقع بہم پہنچایا گیا ہے کہ پست اقوام آگے بڑھیں۔ چنانچہ پست اقوام کی جدید جد و جہد تعلیم، تمدن، معاشرت، تجارت، ملازمت، خدمت غرض ہر شعبے میں جاری ہے اور نام یہ ہے کہ ہندستان کے بعض وسیع حوصلہ افراد اپنے ہاں سے پست اقوام کا امتیاز اور فرق مٹانے کے لیے بیدار ہو چکے ہیں۔ حالانکہ پست اقوام کی بیداری پہلے انگریزی حکومت کی، پھر طبعی ارتقا کی ممنونِ کرم ہے اور بس، جس میں غیر اقوام کے میل جول اور حالات کی اطلاع خصوصاً اخبارات کی کثرت نے مزید جوش اور

بیداری پیدا کردی ہے۔ چنانچہ بھنگی برادری میں بھی ترقی اور بیداری کے جملہ اثرات کام کر چکے ہیں اور اب ان میں ترقی اور طلبِ حقوق کے لیے انجمنیں، مدرسے اور رہنما پیدا ہو چکے ہیں اور جن صوبوں میں اعلیٰ جماعتوں نے جتنی ترقی کی ہے وہاں کی جماعتوں میں بھی اتنا ہی کام کیا جا رہا ہے۔ چنانچہ اس وقت جب کہ ملا رموزی یہ مضمون لکھ رہے ہیں ان کے سامنے صوبہ پنجاب کے ایک بھنگی کے لیے یہ اطلاع موجود ہے کہ وہ صوبۂ پنجاب کی سرکاری ''مجلس قانون ساز'' کا رُکن مقرر ہو چکا ہے، پھر اتنی بڑی مجلس کا رُکن بن کر وہ جو کام کر رہا ہے اسے اخبار ''ملاپ'' لاہور مورخہ 18 فروری 1931 نے اپنے صفحہ 3 کالم 2 پر ان الفاظ میں پیش کیا ہے:

''لاہور 16 فروری 1931، آج صبح ایک ہزار بھنگی، چمار اور دیگر اچھوت اقوام کا ہجوم ''بنسی'' بھنگی ممبر کونسل کی رہنمائی میں ٹکسالی دروازہ سے جلوس کی صورت میں روانہ ہوا تا کہ گورنمنٹ ہاؤس یعنی گورنر کے مکان پر جا کر اس امر کی شکایت کرے کہ آئندہ مردم شماری میں پست اقوام کو ہندو یا سکھ کیوں لکھا جاتا ہے۔ مشن کالج کے قریب پولیس نے اس جلوس کو روک لیا اور اس کے گرد گھیرا ڈال لیا۔ اچھوتوں کا رہنما بنسی بھنگی ڈپٹی کمشنر کے پاس گفت وشنید کے لیے چلا گیا اور جلوس کو ہدایت کی کہ سب لوگ بیٹھے رہیں اور گفت وشنید کے نتیجہ کا انتظار کریں۔

معلوم ہوا ہے کہ اچھوتوں کا مطالبہ یہ ہے کہ انھیں پنجاب کونسل اور تمام مقامی محکمات میں جداگانہ حق نہایت دیا جائے''۔

جناب بنسی کی یہ کارروائی پنجاب کے بعض ہندو بھائیوں کے خلاف تھی، اس لیے مخالف ہندوؤں کی ترجمانی کرتے ہوئے اخبار ''ملاپ'' لاہور نے اپنی اشاعت مورخہ 17 فروری 1931 کے صفحہ 2 پر اس شخص کے متعلق ذیل کے الفاظ لکھے ہیں:

''مسٹر بنسی کے متعلق یہ ذکر کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ وہ لاہور کا ایک بھنگی ہے اور جب ہندستان کو انگریزوں سے آزادی اور حقوق دلانے والی انجمن'' کانگریس'' نے مجالس قانون ساز میں جانا جائز قرار دے دیا تھا تو چند بے سمجھ لوگوں نے ''کانگریس'' کے اثر ورسوخ کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے اس شخص کو چند نہایت ہی

بارسوخ ہندوؤں کے مقابلہ میں کھڑا کر دیا اور اسے پنجاب کونسل کا رکن بنا کر خواہ مخواہ ہندوؤں کے سر مڑھا"۔

لیکن 15 فروری 1931 کو شہر لاہور میں چوہڑوں، چماروں اور دیگر اچھوت اقوام کا جو زبردست جلسہ ہوا اس میں اسی بھنگی نے جو تقریر کی اسے اخبار "ملاپ" لاہور نے اپنی مذکورہ بالا اشاعت میں ان الفاظ کے ساتھ شائع کیا ہے:

"پہلے رحمتِ شاہی کا زمانہ تھا، وہ اب گزر گیا، اب مطلب شاہی کا زمانہ ہے، میں اپنے مطلب کے لیے ہندو بنا، میں نے اپنا الو سیدھا کیا اور لاہور کے ہندوؤں کی بدولت مجھے پنجاب کی مجلس قانون ساز کی رکنیت نصیب ہوئی یہ صدر جلسہ جناب عبدالغنی صاحب ایم۔اے بارایٹ لا کی انگریزی ٹوپی ہے جو آپ کے سامنے کرسی پر بیٹھے ہوئے ہیں، اس مجلس کے ویسے ہی رُکن ہیں جیسا کہ میں ہوں، مگر یہ مزدوروں کے نمائندے ہیں، مجلس میں ان کے متعلق یہ مشہور ہے کہ یہ "مفت کے رکن ہیں" کیونکہ یہ مزدور لوگوں کی تنظیم کرنے کے بعد ان کے حلقے سے مفت میں رُکن بن جاتے ہیں، مجھ میں اور ان میں یہ فرق ہے کہ وہ مزدوروں کے نمائندے ہیں اور میں لاہور کے ہندوؤں کا نمائندہ ہوں، میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ میں اپنے مطلب کے لیے ہندو بنا تھا، تم بھی مطلب پرست بنو، مگر تم ہرگز ہندو نہ بننا۔ میرے کئی رام داسی بھائی اپنے آپ کو سکھ لکھاتے ہیں حالانکہ وہ سکھ نہیں ہیں۔ کیونکہ سکھ وہ ہوتا ہے جو فوج میں ملازم ہو، بندوق رکھے، تلوار اٹھائے، صوبیدار ہو، جمعدار ہو، تم ٹوکری اٹھانے والے ہو تم کیا سکھ ہو سکتے ہو؟ ہندو اس وقت تک بھنگیوں اور چوہڑوں کے حقوق پر ڈاکہ ڈال رہے ہیں اور ان کی لاعلمی اور بے سمجھی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مجالس قانون ساز اور میونسپلٹیوں میں ان کی نشستوں پر فائز ہوتے رہے ہیں"۔

اس تقریر کے نقل کرنے سے یہ مطلب ہے کہ آپ بھنگی برادری کے ارکان کی ذہنی اور عملی ترقی وتبدیلی کا اندازہ کر سکیں۔

لیکن اس قدر حالات کا یہ منشا نہیں ہے کہ ہندستان کے تمام بھنگیوں میں اتنی ہی تبدیلی او
بیداری پیدا ہو چکی ہے بلکہ اس قسم کی بیداری ابھی پانچ فیصدی سے آگے نہیں بڑھی ہے اور عام بھنگی
اسی پست حالت میں ہے جن کو اوپر اختصار کے ساتھ دکھایا گیا ہے، اس لیے بھنگی کی بیوی عام طور
پر جس طرح پیدا ہوتی ہے، اس کا نمونہ یہ ہے۔ یہ نہایت گندہ اور تاریک مکان یا جھونپڑے میں
پیدا ہوتی ہے، مگر پیدائش پر اظہارِ مسرت میں باجا اور گانا بھی ہوتا ہے اور برادری کی عورتیں بھی جمع
ہوتی ہیں۔ حسبِ حیثیت جاہلانہ رسوم بھی ادا کی جاتی ہیں اور عقیقہ بھی۔

ابتدائی تربیت میں کچھ بھی نہیں یعنی اس کی عمر کے دس سال بے کار جاتے ہیں، جن میں
نہ اسے تعلیم دی جاتی نہ کوئی ہنر سکھایا جاتا۔ دس سال کے بعد وہ اپنے ماں باپ کے پیشہ اور کام
میں شریک کر لی جاتی ہے یعنی غلاظت اور سڑکوں کی صفائی کا کام کرتی ہے اور بس۔ اس کے ہاں
بھی کم عمری کی شادی جائز ہے، اس لیے وہ کہیں آٹھ نو برس کی اور کہیں پندرہ سولہ سال کی دلہن
بنتی ہے۔ شادی کی رسوم میں پوری برادری کا شریک کیا جانا اور کھانا نہایت ضروری شرط ہے۔
اس کے سوا دوسری رسوم میں بھی حسبِ حیثیت روپیہ خرچ کیا جاتا ہے اور بس چلتا ہے تو رنڈی
بلائی جاتی ہے۔ اب اس کا دلہن بن کر شوہر کے گھر آنا قیامت ہے۔ چنانچہ دلہن کے آنے پر اس
کی ساس مارے غرور کے قابو میں نہیں رہتی۔ چنانچہ وہ دلہن کے کپڑے اور زیور پہنا کر پہلے تمام
مکانوں میں ''سلام'' کے لیے اسے لے جاتی ہے اور ہمارے آپ کے ننھے میاں کی والدائیں
اسے ''سلائی'' میں روپیہ، زیور اور کپڑے دیتی ہیں۔ یہ گویا اس کا ابتدائی تعارف ہوتا ہے۔ اس
کے چند دن بعد تک وہ اپنے شوہر یا اپنی ساس کے ساتھ نہایت آراستہ پیراستہ ہو کر ایک لمبے
گھونگھٹ کے ساتھ مکانوں اور سڑکوں کی صفائی کا کام شروع کرتی ہے اور اسی طرح وہ رفتہ رفتہ
بے باک اور بے حجاب ہوتی جاتی ہے۔ اب وہ چند دن کے بعد سے مکانوں میں صفائی کے لیے
اس طرح آتی ہے کہ صفائی کے بعد تھوڑی دیر آپ کے ننھے میاں کی والدہ سے باتیں بھی کرتی
ہے اور آہستہ سے پان، ٹکے یا کسی کپڑے کی فرمائش بھی کرتی ہے جسے اپنے ننھے میاں کی والدہ
فوراً پورا کر دیتی ہیں۔ اسی طرح اس کے مراسم بعض گھرانوں میں بہت زیادہ ہو جاتے ہیں اور
ننھے میاں کی بعض ''والدائیں'' تنہائی کے اوقات میں اس سے ''راز'' کی باتیں بھی کر گزرتی

ہیں۔ گفتگو میں یہ ہمیشہ ''ہزار داستان'' ہوتی ہے، اس لیے عام عورتیں اس سے بہت جلد مانوس ہو جاتی ہیں۔

اب یہ عورتوں سے بڑھ کر مردوں سے بھی ہم کلام ہوتی ہے۔ اپنے لباس اور زیور کی نمائش پر مرتی ہے اور ہمیشہ نہایت آراستہ پیراستہ ہو کر ''تشریف لاتی ہے''۔ ایک گھر میں دوسرے گھر کے حالات سنا جاتی ہے، تمام محلے کے گھرانوں خصوصاً عورتوں کے حالات سے کافی طور پر واقف ہو جاتی ہے اور ہر گھر کی عورتوں کے حالات سے واقفیت بہم پہنچانے کی شائق ہوتی ہے اور انہی خوبیوں کے باعث بعض ''اشراف'' اس سے نکاح کر لیتے ہیں۔

یہ اپنی خدمات کے بجالانے میں نہایت مستعد اور تیز ہوتی ہے۔ چنانچہ سورج نکلنے سے پہلے یہ ہمیشہ سڑکوں کو صاف کرتی نظر آتی ہے، مگر اس طرح کہ اگر اس سڑک پر سے آپ گزر رہے ہیں تو یہ ترچھی نظروں سے آپ کو دیکھ کر اسی طرف گرد زیادہ اُڑائے گی جس طرف سے آپ گزر رہے ہوں گے۔ اخلاق کے لحاظ سے یہ نہایت درجے بے حس، بے حیا اور بے غیرت ہوتی ہے اور یہ اس لیے کہ خود اعلیٰ جماعتوں کا اس کے ساتھ برتاؤ نہایت غیر شریفانہ ہوتا ہے۔ مثلاً اسے ہر مرد ہر عورت اور ہر بچہ جس قسم کی گالی چاہے دے سکتا ہے مگر یہ اس کا ویسا ہی جواب نہیں دے سکتی لہٰذا بے جواب گالیاں کھانے سے اس کی خودداری اور غیرت کی قوت مردہ ہو جاتی ہے اور کہنے میں یوں آتا ہے کہ بھنگی زادی بڑی بے غیرت ہوتی ہے۔

اس کی معاشرتی حالت نہایت درجہ پست اور گندہ ہوتی ہے۔ اس کے ہاں بچوں کی صحت، بچوں کی تعلیم اور بچوں کی تربیت کا خیال تک نہیں ہوتا۔ اس کا گھر اس کے برتن، اس کا بستر غرض ہر چیز نہایت تاریک، گندہ اور میلی ہوتی ہے۔ البتہ زیور کو نہایت سلیقے اور صفائی سے رکھتی ہے اور اسے روزانہ پہنتی ہے۔ وہ بیمار اور ''مردار'' جانوروں کا گوشت کھاتی ہے۔ پیروں، قبروں اور گنڈے تعویذ کی بے حد معتقد ہوتی ہے اور مذہبی احکام سے یکسر بے خبر۔

باوصف قلیل آمدنی کے بے حد منتظم اور روپیہ جمع کرنے والی ہوتی ہے۔ مرغا مرغی پالنے کی بڑی شائق اور کثرتِ اولاد کے لحاظ سے ہر وقت دس بارہ بچوں کی ماں، زیور، کاجل، سُرمے اور رنگین کپڑوں پر عاشق۔

شوہر کی خدمت گزاری، مگر حادی۔ بڑھاپے میں مزاج کی تیز اور کام میں مستعد۔ شادی بیاہ کے مواقع پر خود ہی گانے والی اور خود ہی ناچنے والی، حریص، لالچی اور کہیں کہیں چور، زیادہ بات کرنے والی اور زیادہ کام کرنے والی۔

◆◆◆

تیلی کی بیوی

کاروباری لحاظ سے اس بیوی کو بھی بازار سے تعلق حاصل ہے، مگر حالات اور اثرات کے اعتبار سے یہ بہت معمولی قسم کی بیوی ہے۔ اس کے متعلق وسطی ہندستان میں ملا رموزی کو جو تجربات ہوئے ہیں وہ نہایت محدود ہیں۔

تیلی وہ جو تیل کا کاروبار کرتا ہو سو وہ بھی کھانے پکانے کے تیل کا ورنہ آپ سمجھیں کہ یہ ''لونڈر'' یا ''ہیئر آئل'' قسم کے سر میں ڈالے جانے والے تیل کا۔ پس واضح ہو کہ تیلی ایک حد سے سوا جاہل انسان کا نام ہے جس کے ہاں بہ لحاظِ جہالت گویا کسی ایک نسل میں بھی علم و تعلیم کا اثر پاس سے ہو کر بھی نہیں گزرتا اور اسی لیے اس کی بیوی ایک تاریک تر خاندان میں پیدا ہوتی ہے اور نہایت بھونڈی اور تاریک رسوم و تقریبات کے ساتھ اس کی پیدائش کی خوشی منائی جاتی ہے اور اسی طرح وہ خالص جاہلانہ مراتبِ زندگی سے گزر کر کبھی 6 برس کی عمر میں اور کبھی 12 برس کی عمر میں بیوی بنادی جاتی ہے۔ اس کی برادری اور قومیت خاص ہوتی ہے۔ یعنی یہ نہیں ہو سکتا کہ جلاہے کے بیٹے کی بیوی تیلی کی لڑکی بنادی جائے، اس لیے تیلی شوہر کے لیے شادی کے وقت کسی خاص قابلیت یا دولت مندی کی شرط ضروری نہیں، بس یہ دیکھا جاتا ہے کہ وہ ''تیلی ابن تیلی'' ہے یا نہیں۔ پس اس کے ''تیلی زادہ'' ہونے کی تصدیق کے بعد ہی سمجھ لیجیے کہ شادی ہوگئی۔

ایک بیمار سے ٹٹو پر دولہا میاں لال لال رنگ کے عجیب وغریب کپڑے پہن کر لد گئے اور نہایت ذلیل قسم کے باجے بجاتے ہوئے دلہن کے گھر آ گئے۔ یہاں بغیر فرش کے زمین پر اور کبھی کبھار چھوٹے سے فرش پر ورنہ اپنے اپنے پاس کی دھوتیوں اور چادروں کو بچھا کر باراتی لوگ بیٹھ گئے، عورتوں میں "گانا" تو کیا ہاں گانے قسم کا ایک شور سا ہوا، نہایت ادنیٰ قسم کے چاول خود باراتیوں نے پکائے اور سڑک کے کنارے پر بغیر فرش اور دسترخوان بچھائے، رات کے تین بجے کھانا کھا کر اسی جگہ یوں سو گئے گویا بڑے اول نمبر کا ماحضر تناول فرما کر اب آرام فرما رہے ہیں۔ جب سورج سر پر سے ہو کر سینے پر آ گیا اور محلے کے کتے ان کے آس پاس جب گشت کرنے لگے تو عجیب تال سُر کے ساتھ جمائیاں اور انگڑائیاں لے کر اٹھے اور دو تین تولہ پانی چھڑک کر چلم پی اور پھر شادی کا ناچ ناچنے میں یوں مصروف ہو گئے کہ سڑک پر سے گزرنے والے ڈپٹی کلکٹر صاحب بھی موٹر روک کر ان کی بیہودگیوں کے دیکھنے کے لیے کھڑے ہو جائیں تو ان ناچنے والے تیلیوں میں کا ایک تیلی بھی ان کی طرف متوجہ نہ ہو بلکہ تمام ناچنے والے تیلی ڈپٹی صاحب ہی کو الٹا بے وقوف سمجھ کر گاتے رہیں، مگر چپ نہ ہوں۔

تھوڑی دیر بعد سسرال سے "جس قسم کی ملی" دولہا کے ٹٹو پر لاد کر اس طرح سے چلے کہ تمام راستے نئی دُلہن ٹٹو پر بیٹھی ہوئی چلا چلا کر روتی ہوئی دولہا کے گھر آتی ہے مگر کیا مجال جو راستے میں ایک باراتی بھی ٹٹو روک کر اس سے کہے کہ "اری نیک بخت" راستے میں تو نہ رو۔

گویا ان کے ہاں راستے میں دُلہن کا چلا چلا کر رونا کوئی ایسی زیادہ معیوب بات نہیں۔ نہایت بھونڈے قسم کے زیور سے لدی ہوئی دُلہن جہاں دولہا کے گھر آئی کہ دوسرے ہی دن سے آزاد، اب وہ تیلی کے گھر کا کام بھی کر رہی ہوگی اور دکان پر بھی کبھی کبھی نظر آ جائے گی اور رفتہ رفتہ کے قاعدے سے وہ ایک دو مہینے میں اتنی آزاد ہو جائے گی گویا اسی گھر سے بیاہ کر اسی گھر میں رکھ لی گئی ہے۔

اب وہ تیل کا برتن لے کر محلے کے گھروں میں تیل فروخت کرنے بھی جائے گی اور دکان پر بھی تیل فروخت کرے گی۔ البتہ گھروں میں جا کر تیل فروخت کرنے میں وہ اپنی ساس کے بغیر ابتدا میں ذرا کم آزاد ہوتی ہے، مگر جب وہ ساس کے بغیر گھروں میں جانے لگتی ہے تو پھر وہ خاصی

آزاد ہوتی ہے اور گھر کی پردہ نشین عورتوں کو بے وقوف بنانے میں کافی استاد ہو جاتی ہے، مگر اپنے محدود قسم کے حالات کی بنا پر یہ گھروں کے اندر زیادہ دلچسپ نہیں ہوتی۔

اس کی دکان اکثر اس کے گھر ہی کے باہر والے حصہ میں ہوتی ہے، جہاں یہ کبھی کبھی بہت خاصی خوبصورت بنکر بیٹھنے کی کوشش کرتی ہے، مگر تیلی کی گندہ معاشرت کے لحاظ سے یہ جتنی زیادہ خوبصورت بننے کی کوشش کرتی ہے اتنی ہی زیادہ بھونڈی اور بدصورت نظر آتی ہے۔ چنانچہ ہم نے آج تک ایک تیلی کی بیوی کو بھی سفید رنگ نہیں دیکھا، پھر خوبصورتی پیدا ہو تو کس طرح؟۔

اس کی گھریلو زندگی نہایت درجہ گندہ اور تاریک ہوتی ہے۔ صفائی کے عوض ہر طرف غلاظت اور گندگی نظر آتی ہے۔ اسے جب دیکھیے معلوم ہوتا ہے کہ پیدائش کے دن سے آج تک نہ اس کے کبھی غسل کیا نہ کپڑے بدلے۔

اس کی گندگی کے اثرات اس کی اولاد کے اندر بہت زیادہ نظر آتے ہیں اور اسی لیے اس کے ہاں اولاد کی کثرت نظر آتی ہے، لیکن گھر کے کاموں میں نہایت تیز، مستعد اور ہوشیار۔ روزی کمانے میں بے حد مستعد، شوہر کی فرماں بردار، مذہب سے یکسر ناواقف، جاہلانہ رسوم کی پوٹ، باقی خیریت۔

◆◆◆

جُلاہے کی بیوی

جُلاہا وہ جو کپڑا بنانے یا بننے کا کام کرتا ہو۔ اسے مُؤمن بھی کہتے ہیں۔ اس کا وجود نہایت قدیم اور تاریخی روایات رکھنے والا ہے۔ اس کا کام بازار کی زندگی کے لیے روح کا حکم رکھتا ہے کیونکہ جب تک یہ کپڑا تیار کر کے بازار میں نہ لائے اس وقت تک ہم گھر سے باہر نکلنے کے قابل ہی نہیں ہو سکتے اور اگر آپ بغیر جلاہے کی امداد کے گھر سے باہر نظر آئیں تو تمام دنیا آپ کو بے وقوف کہے اور شہر کی پولیس آپ کو فوراً پاگل خانے بھیج دے۔

لفظ جلاہا اُس کے پیشے اور کاروبار کی نسبت سے وضع کیا گیا ہے ورنہ اس کا اصل نام شیخ محمد ابراہیم اور کشن رام ہوتا ہے۔ اس کی جماعت میں نہایت ممتاز، ذی علم اور ارباب سطوت واقتدار بھی موجود ہیں، یہاں تک کہ یورپ کے جلاہے سے تو وہاں کے اچھے اچھے وزیراعظم کانپتے ہیں۔

ہندستان میں بھی یہ ہمیشہ سے ممتاز و معزز رہا ہے۔ البتہ پچھلی صدی میں یورپ والوں کی تجارتی آسانیوں اور مشینوں کی درآمد نے اس کی حیثیت کو کافی نقصان پہنچایا اور اپنے کاروبار کی کمزوری کے باعث بہت زیادہ حقیر سا نظر آنے لگا تھا کہ پچھلے دس سال میں ہندستان کے سیاسی رہنما جناب موہن داس کرم چند گاندھی گجراتی نے ہندستانیوں کو ملکی کپڑا استعمال کرنے کی ہدایت کر کے اس کی کھوئی ہوئی شان کو پھر دوبالا کر دیا ہے۔ بین الاقوامی اعتبارات سے بھی اس کا رتبہ

ہمیشہ سے بلند رہا ہے، مگر ہندستان میں یہ طویل عرصے تک تعلیم سے دور رہنے اور سقیم الحال کے ہاتھوں برباد ہوتا رہا یہاں تک کہ بہت زیادہ حقیر اور پست قسم کے طبقات میں شمار ہونے لگا تھا مگر 1914 کے بعد سے ہندستان میں جو بیداری اور ذہنی انقلاب ترقی پذیر ہوا اس نے جلا ہے برادری کے اندر بھی ایک قابلِ اعتبار جوش پیدا کر دیا اور کچھ شک نہیں کہ اس سے پہلے بھی اس کا وجود قومی تحریکات میں بہت زیادہ کارآمد ثابت ہوتا تھا۔ خصوصاً قومی چندوں میں اس کے افراد نے لائقِ احترام رقوم پیش کی ہیں۔ اور اگر آج علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے بانی علامہ سرسید زندہ ہوتے تو وہ بتاتے کہ کتنے بی۔اے پاس مسلمان ہیں جو محض جلاہوں کے روپیہ سے پڑھ کر بی۔اے ہوئے ہیں اور آپ افسر بن کر مسلمانوں کے سامنے اکڑتے ہیں۔ چنانچہ عہدِ حاضر میں اس کے بعض ذی مقدرت افراد نے اس کی ترقی کے لیے بڑے بڑے مدارس اور صنعتی ادارے قائم کر دیے ہیں۔ بعض جگہ اس کے لیے ''حقوق طلب'' انجمنیں بھی ہیں، کہیں کہیں اس کی اصلاح و تنظیم کے لیے سالانہ اجتماعات بھی ہوتے ہیں۔ خود اس کے افراد ایم۔اے پاس ہو چکے ہیں، اس کے اخبارات اور رسائل بھی جاری ہیں جن میں سے ایک ماہوار رسالے کا نام ''المومن'' ہے جو شہر بنارس سے نکلتا ہے۔ اسی طرح کلکتہ سے بھی اس کے رسالے نکلتے ہیں۔ انہی میں سے بعض کے کارخانے بھی ہیں، جن میں ہزاروں مزدور کام کرتے ہیں۔

لیکن ہمیں جس جلاہے سے بحث کرنا ہے اس کی تعداد کثیر ہے، یعنی غریب جلاہا۔ لہٰذا اس کی پوری زندگی نہایت پست اور قابلِ رحم ہے۔ اس کے افراد کی زیادہ تعداد پرانی لکیر کی فقیر ہے۔ اس کا کاروبار نہایت مختصر اور پست ہے چنانچہ وسطی ہندستان میں اس کی آبادی نہایت مفلس، بے ہنر، بے علم اور بے یار و مددگار ہے۔ گو ہر جگہ اس کی جماعتی تنظیم مکمل ہے یعنی جلاہا برادری کے ضوابط اور قواعد ہی اس کی زندگی کو بنانے اور بگاڑنے کے ذمہ دار ہیں، مگر یہی قواعد اس کی اصل بربادی کے اسباب ہیں چنانچہ ان تاریک قواعد میں اس کے لیے موجودہ زمانے کے برابر ترقی کرنے کی کوئی گنجائش ہی نہیں ہے۔ اس کے مقابل اس کے تمام افراد نہایت درجہ جاہلانہ اور تباہ کن رسوم و قواعد میں جکڑے ہوئے ہیں۔ دور از دین احکام و ضوابط نے اسے موت کے قریب کر دیا ہے۔ چنانچہ خود ملا رموزی نے 1920 میں ایک جلاہے کی تقریبِ شادی میں ایک تقریر کی

تھی جس کا خلاصہ یہ تھا کہ:

> ''تم جلاہے جو اپنی برادری کی رسوم اوز جاہلانہ قواعد کی خلاف ورزی کرنے والوں سے جُرمانے کے نام سے سال بھر تک روپیہ جمع کرتے ہو اور آخر سال میں اس تمام روپیہ کا پلاؤ پکا کر ''قومی باغ''۔ کے نام سے کھا جاتے ہو، تو اب تم جلاہے اس حرکت سے باز آجاؤ اور اس روپیہ سے ایک ''مومن اسکول'' قائم کرو اور اس میں اپنی برادری کے بچوں کو جدید تعلیم اور جدید صنعت وحرفت سکھاؤ''۔

اس تقریر کی عام جلاہوں نے بڑی قدر کی، لیکن ایک جلاہے نے اس تجویز کو ''نیچری تعلیم'' کہہ کر اس کی سخت مخالفت کی تھی، مطلب یہ تھا کہ اگر برادری کے بچے چند دن میں اس تعلیم سے ہوشیار ہو گئے تو پھر ہم موٹے موٹے اور بوڑھے بوڑھے جلاہوں کو برادی کی ''سرداری'' کس طرح حاصل ہوگی اور کچھ شک نہیں کہ چند خود غرض اور تاریک دماغ جلاہے اکثر مقامات پر عام جلاہوں پر اپنا اقتدار قائم کرنے کے لیے مذہب کے نہایت غلط قواعد کے نام سے انھیں مرعوب کیے ہوئے ہیں۔

پس اس قسم کے جلاہوں کی بیوی بھی ایک نہایت تنگ وتاریک جھونپڑے یا مکان میں پیدا ہوتی ہے۔ اس کی پیدائش سے لے کر عمر کے آخری حصہ تک اسے ہر ادنیٰ تقریب پر ''برادری کا چندہ'' ادا کرنا ہوتا ہے اور ملاّ رموزی کو اس جماعت کے جتنے حالات معلوم ہوئے ہیں ان میں یہ ایک رسم وقید ہی اس کی تباہی کے لیے کیا کم ہے کہ اگر کوئی جلاہا اپنی اولاد کی کتنی ہی چھوٹی تقریب کرنا چاہے تو گویا اس کا مذہبی فرض ہے کہ وہ اپنے شہر کے ایک ایک جلاہے کو اس میں شریک کرے ورنہ قومی چندہ دے اور برادری سے خارج یا پھر اس تقریب ہی کو ملتوی رکھے۔ اس لیے اس کی اکثر تقریبات اس وقت تک رُکی رہتی ہیں، جب تک اس کے پاس اتنا روپیہ جمع نہ ہو جائے کہ وہ ساری برادری کو ''عقیقے کا کھانا'' کھلا سکے۔ اسی لیے اکثر اوقات اس کی پیدائش پر کوئی خاص اہتمام نہیں ہوتا بس نہایت درجہ غریب حیثیت سے پیدا ہو کر رہ جاتی ہے۔ ہاں اگر پیدائش کے وقت محلے کی دو چار ماں بہنوں نے ''راہِ خدا پر'' جمع ہو کر ڈھول بجا کر گا دیا تو ان کی مہربانی ورنہ اس کی بھی شکایت نہیں۔

اب بڑی ہوئی تو ماں باپ پہلے ہی سے حد سے سوا غریب، تنگدست اور جاہل ہوتے ہیں لہٰذا بغیر کسی خاص تعلیم و تربیت کے سیدھی کی سیدھی جوان ہو جاتی ہے۔ بس کپڑا بُننے کا کام اور موٹی موٹی روٹی اور ترکاری پکانے کا کام اس لیے سیکھ لیتی ہے کہ بالآخر وہ عورت ذات ہوتی ہے جو اس کا طبعی اور فطری کام ہے۔ اس کی شادی میں بھی برادری کی قید ہے مثلاً اس کے لیے شوہر بھی ''جُلا ہا ابن جُلا ہا'' درکار ہے کسی دوسری جماعت میں محال ہے، اسی لیے اس برادری میں بیوہ عورتوں کو نکاح ثانی کے لیے بے چارگی نا قابلِ برداشت ہے۔

شادی میں گویا مصارف کے لیے خاص قید نہیں مگر ''ولیمہ کی دعوت'' میں تمام برادری کی شرکت ہی جُلا ہے کو ہمیشہ کے لیے قرض کے عذاب میں مبتلا کر دیتی ہے۔ چنانچہ نہایت درجہ سادہ رسوم کے ساتھ یہ بیوی بن کر اِدھر دولہا کے گھر آئی اور دوسرے ہی ہفتے سے اس نے اپنی روزی کمانے میں شوہر کا کام سنبھالا۔ اب وہ گو دُلہن ہے اور سرخ اور پیلے کپڑے اور موٹا موٹا سا زیور پہنے ہے مگر چولہے چکی سے لے کر تانے بانے کا کام بھی کرتی پھرتی ہے۔ بعض جگہ اسے اپنا بنایا ہوا کپڑا خود لے کر بازار جانا ہوتا ہے اور یہ بغیر کسی رکاوٹ کے بازار بھی جاتی ہے۔ اس کا کام صبح سے شام اور رات کے ابتدائی حصے تک جاری رہتا ہے۔ ملاّ رموزی نے 1921 میں صوبہ جات متحدہ کے مشہور شہر فیض آباد سے قریب مقام اجودھیا کی ایک شکستہ مسجد میں اس قسم کی دُلہن کو دیکھا تھا۔ یہ مسجد شاہی عہد کی مسجد تھی جو اس وقت نہایت درجہ شکستہ ہو چکی تھی، اس کے اندر کا دالان پختہ تھا جس کے نصف حصے میں جُلاہے کا ایک مختصر سا خاندان پردے باندھ کر آباد تھا۔ اس مسجد کے صحن میں اس جلاہے کا تانا بانا تھا جسے اس کی تازہ بیوی تن رہی تھی۔ ملاّ رموزی جب سے لیفٹننٹ اختر علی صاحب تاباں اسپیشل اودھ کمپنی واقع فیض آباد کے ہمراہ اس مسجد کی تحقیق کے لیے اس کے صحن میں داخل ہوئے تو اس تازہ بیوی نے اپنے چہرے پر ایک لمبا سا گھونگھٹ فرما لیا مگر کام میں برابر مصروف رہی۔ اس کے شوہر صاحب پاس ہی ایک چار آنے والی چار پائی پر ایک چھوٹی سی دھوتی فرمائے آرام میں تھے، پھر انھی نے آ کر ملاّ رموزی کو بتایا تھا کہ یہ مسجد اس کی ملحقہ زمین کے ساتھ ایک ہندو بھائی نے خرید لی ہے اور ہمیں اتنے حصے میں رہنے کی اجازت دے دی ہے۔

الغرض یہ حد سے سوا فرماں برداری اور غربت کے ساتھ اپنے شوہر کے کاروبار میں شریک ہوتی ہے، گھر کی جملہ ذمہ داریوں میں وہ ہر وقت مستعد رہتی ہے۔ مذہبی احکام کا احترام کرنے

والی، بے حد قانع، کفایت شعار، منتظم۔ صرف دو باتوں کی شائق ایک زیور کی دوسرے پڑوسن سے لڑنے کے لیے صبح سے شام تک یوں تیار کہ تانے بانے کا کام بھی جاری اور لڑنے والی کے لیے تیز و تلخ جوابات کا سلسلہ بھی جاری۔ کیا مجال جو اس کی زبان تو بند ہو جائے یا رُک جائے۔ پھر بڑی آسانی یہ کہ شوہر اس معاملہ نہ معاون نہ مددگار جس کا یہ مطلب ہے کہ شوہر اپنے تانے بانے میں مصروف اور بیوی اپنی لڑائی میں مصروف۔ اس کی لڑائی اکثر بچوں کے معاملات سے شروع ہوتی ہے اور اس کی انتہا یہ کہ اب یہ تانا بانا چھوڑ کر یا گھر کے دروازے پر آجاتی ہے یا گھر کی کسی منہدم سی دیوار پر چڑھی ہوئی نظر آتی ہے، جہاں ہم آپ ایسے سفید بھائیوں کو دیکھا تو ذرا نیچی ہوگئی اور جب ہمارے گزر جانے کا اسے اطمینان ہوگیا کہ پھر دیوار سے اونچی ہوگئی ہے۔ اس وقت اس کی گالیوں اور بددعاؤں کی رفتار بحساب 45 میل فی گھنٹہ سے کسی طرح کم نہیں ہوتی۔ یہ اس تاؤ میں اپنے مار کھائے ہوئے بچے کو بھی مارتی ہے اور پڑوسن کو گالیاں دیتی جاتی ہے، جس کے بچے نے اس کے بچے کو مارا تھا۔ کہیں کہیں نصف پردہ کرتی ہے اور کہیں ''صفا''۔ اس افلاس اور جہالت کے باعث اولاد تو کیا خاصی ایک پلٹن کی ماں ہوتی ہے۔ بچے ہمیشہ گندے، میلے، آوارہ اور ننگ دھڑنگ۔

حد سے سوا محنت کر کے کمانے والی، مگر معمولی حیثیت کے کاروبار کے باعث ہمیشہ قلاش اور محتاج، پھر بھی دولت جمع کر کے بیٹے اور بیٹی کی شادی پر تمام برادری کو کھانا کھلانے والی، زیادہ محنت کے باعث کم بیمار ہونے والی، محلے سے آگے شہر تک کی کسی اہم بات سے ہمیشہ بے خبر۔ البتہ چند دن سے وہ ہندو مسلم فساد سے واقف ہوگئی ہے اور کہیں وہ اپنے شوہر اور اپنے بچوں کی حفاظت کے لیے خود بھی نہایت بے جگر ہو کر لڑی ہے۔ قومی چندے میں روپیہ دے آنے پر شوہر سے لڑتی نہیں اور خلافت کے سوا کسی دوسری تحریک میں خود چندہ دیتی نہیں۔ نہ یہ کلب کی ممبر، نہ پمپ جوتے کی عاشق مگر ہاں قومی میلے اور تہواروں پر تماشہ دیکھنے کے لیے ضرور جاتی ہے، سو کسی اہتمام سے نہیں اور نہ کسی سواری پر بلکہ زیور پہنا تھوڑی خوبصورت بنی اور ڈھائی ڈھائی گز کے چار بچوں کو گھسیٹتی ہوئی تماشہ گاہ جا پہنچی۔ اسی لیے یہ عید، بقرعید، محرم اور ہولی دیوالی اور رام لیلا کے ہنگاموں میں نظر آجاتی ہے اور محرم کی راتوں میں تو یہ کسی بھی گھر میں صبر کر کے نہیں بیٹھ سکتی۔ واپسی پر اس کے ہاتھ اور گود میں بچوں کے ساتھ ہی پاپڑ، بڑے، مٹھائی یا ایک آدھ کھلونا بھی نظر آتا ہے۔ تماشوں کے مواقع پر شوہر کا ساتھ رہنا ضروری بھی ہے اور نہیں بھی۔ بہرحال وہ تماشوں میں جا کر

ہی دم لیتی ہے مگر ایسے تماشوں میں نہیں جن کے لیے اسے ٹکٹ خریدنا پڑے بلکہ ایسے تماشے جو بغیر ٹکٹ کے اسے نظر آ جائیں۔ پھر تماشوں کے اندر بھی مردوں کا سہواً سے اس سے ٹکرا جانا یا اس کے کسی بچے کے پاؤں پر پاؤں رکھ دینا، اس لیے قیامت ہے کہ پھر جو آپ سے چمٹ جائے تو وہ سنائے کہ تمام تماشے والے آپ کا تماشہ دیکھیں مگر آپ اس سے بازی نہ جا سکیں:

— تو کیا اندھے ہو گئے ہو۔
— اور اگر میرے بچے کا پاؤں پھسل جاتا تو؟
— مزہ تو چکھا دیتی۔
— اچھا تو لو یہ کھڑا ہے، دیکھوں تو کیسے بہادر ہو؟
— تو ذرا مار کر دیکھو نا؟
— خود تو آنکھیں بند تھیں اور میرے بچے کو گرا دیا اندھے نے۔
— وہ تو اس کے خون نہیں نکلا ورنہ بتا دیتی پھر میاں کو۔
— جب سوجھتا نہیں ہے تو پھر تماشے میں کیوں آتے ہو؟

غرض تماشے میں اس کی غزل اس قدر طویل ہو جاتی ہے کبھی مقطع سنا ہی نہیں سکتی۔ شوہر کے حق میں ہر طرح مفید، صورت کی بھونڈی مگر سیرت کی حد سے سوا اچھی۔ شادی کے لحاظ سے کہیں بوڑھی اور کہیں بالکل بچی۔ موٹے زیور اور موٹے کپڑے سے خوش۔ مصیبت میں شوہر کی مددگار اور خوشحالی میں بھی شوہر کی وفادار۔ فقط۔

◆◆◆

چمار کی بیوی

اب تو کیا مگر ہاں چند سال پہلے ہندستان کے بازار میں چمار کا بھی وہ زور تھا کہ بس دیکھنے ہی سے تعلق رکھتا تھا، مگر جب سے یورپ کے چماروں نے ہندستان میں اپنا مال بھیجنا شروع کیا، ادھر ہندستانی بی۔اے پاس ہونے لگے تو اس کی وہ اگلی سی شان باقی نہ رہی اور اب یہ ہندستان کی مزدور، کسان، دھوبی، بھنگی، بہشتی اور حجاموں کی جماعت کے لیے زندہ ہے اور بس۔

چمار کی ایک تعریف تو یہ ہے وہ جوتا بنائے اور دوسری تعریف یہ ہے کہ وہ جوتا فروخت کرے۔ پھر تیسری تعریف یہ کہ وہ اپنی قومیت اور برادری کے لحاظ سے کتنا ہی بلند مرتبہ، شریف آدمی ہو لیکن اگر آپ کو اس پر حد سے سوا غصہ آ جائے تو اب وہ آپ کی نظر میں بھی چمار اور آپ کی باتوں سے بھی چمار۔ کچھ شک نہیں کہ اس کا وجود جماعت کے لیے حد سے سوا ضروری اور مفید ہے اور پھر وجود بھی کیسا کہ نہایت تاریخی۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ چماروں نے بھی اپنی کوئی علاحدہ تاریخ لکھوا کر شائع کر دی ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ چمار نہایت قدیم جماعت کے افراد کو کہتے ہیں۔ یہ چمڑہ کا کام کرتا ہے، جوتا بناتا ہے، بندوق کے چرمی تسمے بناتا ہے اور اب تو وہ چمڑے کے صندوق، چمڑے کے غلاف، گھوڑے کا زین اور بے شمار چیزیں بناتا ہے۔ اِدھر یورپ کی قوموں کی تجارت کو دیکھ کر ہندستان کے بے شمار ''غیر چمار بھائیوں'' نے بھی اس پیشے کو اختیار کر لیا ہے

اور لفظ ''چمار'' کی تکلیف سے محفوظ رہنے کے لیے اپنا نام کہیں ''بوٹ شوز کمپنی'' رکھ لیا ہے تو کسی جگہ ''لیدر ورکس''، کہیں ''شوز میکر'' تو کسی جگہ ''شو فیکٹری'' غرض ان ''غیر چمار بھائیوں'' کے ''دخل در چماریات'' کا نتیجہ یہ ہوا کہ اب ہندستان کا اصل چمار صرف قصبات، دیہات اور پست اقوام کے لیے خاص ہو کر رہ گیا اور غریبوں کے ہاتھ کی یہ دیسی صنعت اب ملک کے اعلیٰ طبقے کے قبضے میں آ گئی ہے لیکن ہم اسی تاریخی چمار سے محبت کریں گے جو کبھی ہم تو ہم کوتوالِ شہر کو اپنی دکان کے دس طواف کراتا تھا، مگر وقت مقررہ پر کبھی جوتا نہ دیتا تھا۔

اس چمار کی بھی مختلف قسمیں ہیں جن میں سے بعض کو موچی بھی کہتے ہیں۔ موچی اکثر اس چمار کو کہتے ہیں جو ذرا نازک، نفیس، حسین اور خوبصورت جوتا بناتا ہے اور چمار وہ جو بس جوتا بنا دیتا ہے۔ اب اس کی بلا سے اسے لکھنؤ والے پہن کر چل سکیں یا ہر قدم پر اٹھیں اور مارے جوتے کے بوجھ کے دس مرتبہ گر پڑیں اور ہمیں اسی چمار سے بحث کرنا ہے جو ہندستان کی 70 فیصدی آبادی کی عزت کا اس طرح محافظ ہے کہ ڈاسن کے پمپ جوتے کے مقابل یہ بس اڑھائی روپیہ میں چھ مہینے تک کام دینے والا جوتا بنا دیتا ہے۔ پس اس قسم کا چمار شہر کے نہایت تاریک اور گندہ حصے میں رہتا ہے یا یوں کہیے کہ یہ جس جگہ رہتا ہے اسے اپنی غلیظ زندگی سے غلیظ کر دیتا ہے۔ اس کی عام معاشرت یہ ہے کہ وہ ہر وقت بقدر ستر پوشی دھوتی سے کام لیتا ہے۔ بس پورا لباس اسی وقت پہنتا ہے جب وہ برادری کے کھانے میں جائے یا کسی تھانیدار کے ملازم کا جوتا وقت پر نہ دینے کے جرم میں تھانے میں جائے۔ ایک تنگ و تاریک سی دکان جس کا بقیہ حصہ مکان، اس کے ایک گوشے میں کسی نہایت گندہ سی گدڑی پر ایک چھوٹا سا پتھر، ایک لکڑی اور جوتے سینے اور جوڑنے کے دیسی اوزار۔ اس کے منہ کے بالکل سامنے ایک چھوٹا سا حقہ رکھا ہوا جس کی چلم کے ساتھ ایک زنجیر میں چھوٹا سا دست پناہ آگ جمانے کے لیے لٹکتا رہتا ہے اور چمار تھوڑی تھوڑی دیر بعد اسی دست پناہ سے چلم کی بیمار سی آگ کو کھانس کھانس کر درست کرتا جاتا ہے اور حقہ پیتا جاتا ہے۔

تعلیم اور دنیا کی ہر نئی چیز سے یہ یکسر بے خبر۔ بس برادری کے چند آداب سے واقف یا بازار کے رستے سے خبردار۔ اس کے پاس کام زیادہ مگر پونجی ہمیشہ اس لیے کم کہ اولاد سے تین کوٹھریاں لبریز، قانوناً تو یہ صرف جوتے بنانے کا کام جانتا ہے مگر ''سرکاری بے گار میں'' خود اس

کے جوتے مار کر اس سے جو کام چاہیے لے لیجیے، زیادہ سے زیادہ روئے گا، عاجزی کرے گا، ہاتھ جوڑے گا اور بے گار پوری کر کے بھی یہ نہ کہے گا کہ میرے اوپر ظلم ہوا۔ اس کے پاس جوتا بنوانے جائیے تو پیمانے کے لیے اس سے یہ نہ کہیے کہ:

اب سات چار ہے میرا نمبر۔

بلکہ اس سے ہمیشہ ''تیرھواں''، ''پندرھواں'' کہیے تو یہ آپ کے پاؤں کے طول و عرض کو فوراً سمجھ لے گا۔ اس کے ہاں جوتے کی قیمت کبھی طے شدہ اور مقررہ نہیں ہوتی بلکہ ہمیشہ ''فی البدیہہ'' طے کی جاتی ہے، جس کے الفاظ یہ ہوتے ہیں:

— اب چل ڈھائی آنے اور دے دوں گا بس یہ ہو گئے دو روپیہ ساڑھے چار آنے۔

— اور وہ اُس عید پر بھی تو تو نے سوا دو روپیہ میں بنایا تھا میرا جوتا اندھے۔

— اب بے ایمان چار مہینے بھی تو پورے نہ ہوئے تھے کہ ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا وہ۔

— دیکھ اسے بھی کہیں ویسا ہی نہ بنا دینا۔

— اور سن اگر سنیچر تک نہ دیا تو نے تو مارے جوتوں کے سر توڑ ڈالوں گا اور ایک پیسہ بھی نہ دوں گا۔

— اچھا تو اب جاؤں؟

— لے ذرا ایک مرتبہ اور دیکھ لے پاؤں، ایسا نہ ہو کہ پنجے کو دبانے لگے۔

— اچھا تو لے یہ ایک روپیہ اور باقی پھر دے دوں گا۔

— ہاں ہاں ابھی کھڑا ہوں خوب بجا لے اسے۔

عام طور پر یہ سادے جوتے بناتا ہے مگر بعض ''روشن خیال گنواروں کے لیے'' اسے گوٹے کناری اور ستاروں کا جوتا بھی تیار کرنا پڑتا ہے اور اس کام کے لیے اس کی ''بیوی'' کام آتی ہے، جو اسی کے سامنے بیٹھے ہوئی جوتوں پر ''کشیدہ کاری'' کے کمالات دکھایا کرتی ہے اور بعض اوقات اپنے شوہر کو گالیاں دینے والے کو بھی جوابات دیتی جاتی ہے۔

یہ بیوی ایسے ہی گندے اور قلاش چمار سے ''بنتی'' ہے، اس کی پیدائش پر بس اتنی خوشی ہوتی ہے گویا وہ اپنی ہی خوشی سے پیدا ہوئی ہے، چمار کو اس کی ضرورت نہیں تھی۔ اس کے ہاں گو

اولاد کی تقاریب اور رسوم بھی کافی ہیں مگر حد سے بڑھی ہوئی تنگدستی کے ہاتھوں عام طور پر اس وقت صبر ہی سے کام لیا جاتا ہے کیونکہ اس کے ہاں بھی ''ساری برادری کی شرکت'' ضروری چیز ہے، جسے ''چمارذات'' برداشت نہیں کر سکتا۔ اسی طرح حد سے گزری ہوئی جہالت کے باعث ''پاپوشی کشیدہ کاری'' کی تعلیم کے سوا اس کی ذہنی اور عملی تربیت کا تذکرہ تک نہیں ہوتا۔

یہ چھ سات برس کی عمر تک اکثر اوقات ننگ دھڑنگ نظر آتی ہے۔ محلے کے چمارزادوں اور چمارزادیوں کے ساتھ دن بھر کھیلتی ہے اور خوب گالیاں بکتی ہے کیونکہ اس سے کہیں زیادہ فحش گالیاں اس کے ماں باپ اسی کے سامنے بکتے رہتے ہیں۔ بس اس طرح ''پل پلا کر'' وہ ہوشیار سی ہوئی کہ بیوی بنادی گئی، کیونکہ اس کی برادری میں بھی کم عمری کی شادی جائز ہے۔ اس کی بارات میں بھی نصف برہنہ باراتی نظر آتے ہیں۔ دولہا کے لیے اگر ٹٹو مل گیا مل گیا ورنہ باراتیوں کے ساتھ بغیر سواری کے حاضر۔ شہر میں سب سے نیچے درجے کا باجہ، جس کی آواز دُلہن کے ہاں پہنچ کر اگر حد سے سوا شان ہی دکھانا ہوا تو باغ بہاری کا ایک آدھ تختہ بھی ساتھ رکھ لیا اور آتش بازی سے دو چار انار چھوڑ کر دُلہن والوں کو دکھادیا کہ آخر ہمیں سمجھا کیا تھا؟ دُلہن کے والد نے باراتیوں کو اگر دعوت دی تو تمام سامان باراتیوں کو دے دیا کہ بھائیو ''دستِ خود اور دہانِ خود''۔ دعوت سے پہلے یا بعد ''شراب خوری'' نے تمام محلے والوں پر ثابت کر دیا کہ ہاں ہمارے محلے میں بھی چماروں کی بارات آئی ہے۔ ایک طرف چمار پی کر سیدھی سیدھی غزلیں سنا رہے ہیں اور انھی کے قریب کے حصے میں ان کی عورت ذاتیں پی رہی ہیں اور سنا رہی ہیں۔ دولہا میاں بھی ایک طرف عجیب و غریب سی چیز بنے ہوئے یا بیٹھے ہوئے ہیں یا پڑے ہوئے ہیں۔ رخصتی کے وقت جو کچھ نصیب تھا لیا اور گھر آ گئے۔ اب اگر دولہا کے والد صاحب کچھ ہیں تو ولیمہ کے کھانے میں بھی سب سے زیادہ خرچ تمباکو اور شراب کا اور اس کے بعد گالیوں کا۔ بہت زیادہ مست ہوئے تو تھوڑی دیر تک ناچنے اور گانے میں مصروف رہے اور پھر پی لی، پھر پی کر اس کی ضرورت نہیں کہ بارات کے ادب سے حسبِ ضابطہ بیٹھے رہیں بلکہ اسی حالت میں چاہا تو دولہا کے گھر کے صحن میں گر پڑے اور چاہا تو گھر سے نکل کر سڑک پر یوں بھاگے کہ یہ آگے اور دو چار مست ان کے پیچھے۔ انھیں اس حالت میں دیکھ کر دوسرے لوگوں کو خود ہی سمجھ لینا پڑتا ہے کہ یہ باراتی چمار ہیں ورنہ ان کی حرکات سے جی تو یہ

چاہتا ہے کہ بس ان میں سے ہر ایک کے بالکل ہی منہ پر...اب ضروری ہی نہیں کہ شادی کے بعد تین چار دن تک دولہا دلہن کوئی کام ہی نہ کریں اور مارے شرم وحجاب کے پردہ بنے رہے بلکہ زیادہ اہتمام ہوا تو چند دن دلہن کو رخصتِ اتفاقیہ دے دی مگر شوہر صاحب تیسرے ہی دن سے کام پر چڑھ گئے۔ یعنی جوتے اور بازار۔ اب دلہن صاحبہ نے رفتہ رفتہ گھر کا کام سنبھالا اور ایک مہینے کے اندر تمام محلے نے پہچان لیا کہ یہ ہے کلوا کی بیوی۔

اب وہ آزاد ہے اور چمڑے یا جوتے کے لیے بازار میں بھی نظر آتی ہے اور دکان پر بھی۔ پھر بازار میں جوتے فروخت کرنے کے بعد وہ شام کے کھانے کے لیے اگر روپیہ کے سولہ سیر ہیں تو گیہوں ورنہ جوار ہی خرید کر گھر واپس ہوتی ہے اور جب ہم آپ سونے کے لیے بستر پر جاتے ہیں تو اس وقت تک وہ اس غلے کو صاف کرتی ہے او عین گیارہ بجے وہ چکی چلاتی ہے۔ مصیبت یہ ہے کہ چمار لوگ رات کے تیرہ چودہ بجے کھانا کھاتے ہیں اور صبح ہی صبح چلم پیتے ہوئے نظر آجاتے ہیں۔ الغرض اب وہ جتنی پرانی ہوتی جاتی ہے اتنی ہی ہر کام میں تیز اور مستعد ہوتی جاتی ہے۔ اولاد کے بعد دنیا کی ہر عورت قدرے ضعیف اور مضمحل نظر آتی ہے مگر اس کے ہاں آج بچہ پیدا ہوا اور یہ پرسوں پوری قوت کے ساتھ شوہر سے لڑتی ہوئی اور اسے گالیاں دیتی ہوئی مل جائے گی کیونکہ اس کے ہاں یہ بتایا ہی نہیں گیا کہ بچے کی پیدائش کے وقت عورت کے لیے آرام بھی ضروری ہے۔ نہ حفظانِ صحت کے اصول کی اسے پروا نہ اس کی جان کی، اس کے ہاں کی میونسپلٹی کو پروا۔ لہٰذا وہ دس دن کے بچے کو دھوپ میں لے کر یوں بیٹھ جاتی ہے کہ جوتے کا کشیدہ بھی کاڑھ رہی ہے اور ننھے سے بچے کو دودھ بھی پلا رہی ہے۔ پھر کیا مجال جو اسے یا اس کے بچے کو زکام ہی ہو جائے۔ اب اس کے پاس نہ بچے کے کھلونے ہیں نہ نرم ونازک بستر بس ایک رسی کا جھولا ہے اور ایک ٹوکری اب چاہے بچہ اس ٹوکری میں لیٹ کر جھولا جھولے یا روتا رہے وہ ہر حالت میں گھر کا اور دکان کا کام کرے گی۔

عام طور پر چمار کی بیوی چوبیس گھنٹے کام میں مصروف رہتی ہے، لیکن رات کے کھانے پکانے کا وقت اس کے ہاں نہایت خطرناک وقت قرار پاچکا ہے، اس طرح کہ ادھر اس نے چولھے کے پاس قدم رکھا اور اُدھر رات کے نو دس بجے اس کا شوہر شراب خانے سے لڑکھڑاتا ہوا گھر میں

آیا۔ بس اب میاں صحن سے اور بیوی چولھے کے پاس سے ایک دوسرے کو وہ صاف صاف سنا رہے ہیں کہ خدا کی پناہ۔ کیا مجال جو شوہر کی گالی سے کم درجہ کی گالی بیوی دے۔ اسی طرح ناممکن ہے کہ اب شوہر شراب پی کر اور بیوی کو خود گالیاں دے کر پھر اسے ڈنڈے، جوتے، طمانچے اور ٹھوکریں مارتے مارتے بے دم نہ کردے۔ چنانچہ گالیوں کا سلسلہ شروع ہونے سے کبھی تو ایک گھنٹے کے بعد اور کبھی فوراً چمار صاحب نے جو بیوی صاحبہ کو ٹھوکنا شروع کیا تو اب، جب تک کہ پولس کا گشت نہ آجائے نہ وہ مارنے سے تھکتے، نہ یہ مار کھانے سے گھبرا کر بھاگ جاتی اور یہ اوپر سے رو کر شور اتنا کرتی کہ ہے کہ شوہر کے مار کھانے کا کسی کو شک بھی نہ ہو۔ کیونکہ اس ہنگامے میں اس کے چھوٹے چھوٹے بچے ہی کبھی ان دونوں کے بیچ میں آگئے آگئے ورنہ کسے ضرورت کہ ان کے بیچ میں آکر خود اپنی بھی گت بنوائے۔

یہ تو جوانی کی باتیں تھیں لیکن اگر اسے بڑھاپے میں دیکھ لیا جائے تو پھر کسی شریف انسان کے لیے کوئی پناہ کی جگہ نہیں اس لیے کہ اب یہ ہر سامنے آجانے والے گاہک سے، خواہ مخواہ بھی لڑنے کے لیے اپنے شوہر سے دس بارہ میل آگے ہی نظر آتی ہے۔ آپ اس کے شوہر سے سیدھی سادی ہی گفتگو کیجیے مگر یہ اپنی جگہ بیٹھی بڑبڑاتی رہے گی۔ مثلاً بات کیجیے شوہر سے اور جواب دے گی یہ بوڑھی بیوی صاحبہ اور جوان سے براہِ راست معاملہ ہو جائے پھر تو شام تک پیچھا چھڑانا محال۔ آپ کہیے ایک اور وہ کہے گی دس۔ ایسی صورت میں اپنا سامنہ لے کر گھر آجایئے اور بس۔ نہایت درجہ مرعوب فطرت، غربت اور انتہائی تنگدستی کے ہاتھوں ہلاک، انسانی مظالم اور جبر کا شکار، بچوں کا مال گودام۔ محنتی، جفاکش، کفایت شعار، اخلاق سے نہ خود واقف نہ ان کے اثرات کی ذمہ داریاں، نہ زیادہ خوش اخلاق نہ زیادہ بدکردار۔

اب سنا ہے کہ کچھ دن سے مشن اسکولوں میں بھی جانے لگی ہے، پس اگر صحیح ہے تو وہ کبھی کبھی اور کہیں کہیں مس اور لیڈی بھی کہی جاتی ہوں گی، مگر یہ بات مردم شماری والوں کو معلوم ہوگی اور ضرور معلوم ہوگی، ہمیں نہیں، فقط۔

◆◆◆

گداگر کی بیوی

گداگر یعنی بھیک مانگنے والے مرد عورت اور بچے جس تعداد میں ہندستان میں پائے جاتے ہیں دنیا کے کسی دوسرے ملک میں نہیں ہیں۔ اب اگر یہ سوال کیا جائے کہ کیوں؟ تو جواب یہ ہوسکتا ہے کہ انگریزوں کے ہندستان پر قبضہ کرنے سے پہلے کے زمانے میں ہندستان میں پیداوار کی کثرت اور برآمد بند ہونے کے باعث فراغت کا جو دور گزرا اس نے عام ہندستانیوں کو عیش پسند اور بے ہنر رہنے کی طرف مائل رکھا۔ اسی طرح سابق سلاطین کے عہد میں گو تعلیم کا نہایت کافی انتظام تھا مگر ملک میں ذرائع نقل وحمل نہ ہونے کے باعث ایک جامد زندگی ساری و طاری تھی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ انگریزوں کے ہندستان پر قبضہ پاتے ہی یہاں کی جامد زندگی میں ایک دم حرکت پیدا ہوئی۔ ریلوں کے ذریعے ملکی پیداوار اور مصنوعات ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونے لگیں، تعلیم یکسر غیر زبان میں دی جانے لگی، اس لیے برسوں کی جامد زندگی میں ایک دم کافی انقلاب کا پیدا ہونا محال ہوگیا اور گھرانے کے گھرانے اب جاہل اور بے ہنر نظر آنے لگے اور اب صرف ایسے گھرانے آسانی سے روٹی کھا سکتے تھے جو جدید تعلیم اور جدید صنعت وحرفت سے واقف ہوچکے تھے اس لیے ملک میں بے روزگاری اور افلاس نے ترقی کی اور لوگ قدرتاً بھیک مانگنے پر مجبور ہوگئے۔

لیکن ان اسباب سے پہلے بھی ہندستان میں ''گداگر'' کا وجود پایا جاتا ہے۔ ان میں سے بعض تو وہ ہیں جنھیں کسی وجہ سے شاہی زمانے میں قبروں کی خدمت و نگرانی کے عوض بڑی بڑی زمینیں جاگیر میں دی گئی تھیں، بعض غیر ملکی آوارہ گروہ تھے جنھوں نے ہندستان میں آ کر یہاں کی زبان اور علوم سے بے خبری کے باعث گداگری کو ذریعۂ معاش بنایا۔ بعض وہ تھے جو افلاس کے پنجے میں گرفتار ہو کر کسی دوسرے طریقے سے نجات حاصل نہیں کر سکتے تھے۔ الغرض ایسے ہی اسباب کے تحت ہندستان میں گداگروں کے خاندان اور برادری بلکہ قبیلے تیار ہو گئے۔ پھر ان جماعتوں میں چند خاص اصول وضوابط نے رواج پایا۔ نتیجہ یہ کہ آج اس قسم کے گداگر بکثرت موجود ہیں جو ''قوم'' کی حیثیت سے اپنے ہاں کی شادی بیاہ اور دوسری رسوم کو اپنے ہی ہم پیشہ لوگوں تک محدود اور خاص کر چکے ہیں، ان کی برادری کی طرح ان کا لباس اور ان کا طریق معاشرت بھی یکساں اور خاص ہوتا ہے۔ گویا ہندستانی گداگر بھی ایک مستقل حیثیت رکھنے والی قوم کا رکن ہوتا ہے، مگر بدقسمتی سے اس قسم کی برادری مسلمانوں میں زیادہ ہے۔

ہندو قوم میں بھی گداگروں کی کمی نہیں بلکہ ان میں بعض جماعتیں ایسی بھی موجود ہیں جن کا یہ عقیدہ ہے کہ وہ صرف ''خیرات کھانے'' کے لیے پیدا کیے گئے ہیں اور مذہباً وہ خیرات ہی سے گزر کر سکتے ہیں اور انھیں کام کر کے روزی کمانا مذہباً حرام ہے۔ شاید اسی جماعت سے مسلمان گداگروں میں بھی ایسے عقیدے کے لوگ پیدا ہو گئے ہیں جو کہتے ہیں کہ ہمیں روزی کمانا جائز نہیں بلکہ ہماری روزی کا حق دوسروں کی کمائی ہے۔ بدقسمتی سے ایسے لوگوں میں بعض چالاک اور قدرے تعلیم یافتہ ارکان نے ایسے اصول بھی گھڑ لیے ہیں جنھیں مذہبی احکام کا رتبہ دیا گیا ہے اور اپنے لیے انھی احکام سے بھیک اور خیرات کو جائز قرار دے لیا ہے۔ ایسے ذی ہوش گداگروں میں ہندوؤں میں ''برہمن'' اور مسلمانوں میں ''پیر صاحب'' کے نام سے بعض لوگ خاص ہیں، جن کے متبعین بھی ان کے اقوال پر مذہبی عقیدت کے ساتھ گداگری پر عمل کرتے ہیں۔

اب چند سال سے تعلیم کی کثرت نے جب عوام میں روشن خیالی اور وسعتِ نظر پیدا کی تو اس مکروہ اور ذلیل کسبِ معاش کے انسداد کا احساس پیدا ہوا اور کہیں کہیں ''قانون'' کے ذریعہ اس پیشے کو ترک کرانے کی کوشش عمل میں لائی گئی ہے، لیکن اس پر بھی ہندستان میں گداگروں کی جو

کثرت پائی جاتی ہے، وہ اب بھی کسی دوسرے ملک میں نہیں ہے۔ اگر چہ اس بلا سے یورپ ایسا اعلیٰ تعلیم یافتہ اور ترقی پذیر براعظم بھی محفوظ نہیں ہے، پھر بھی ہندستانی گداگری اس سے آگے ہے۔ چنانچہ اس وقت تک ہندستان میں گداگروں کی اقسام پائی جاتی ہیں ان میں سے بعض یہ ہیں:

1۔ نسلی گداگر، جن کے ہاں خاندانی طریقے پر بھیک مانگ کر روزی کمانا بزرگوں کا پیشہ سمجھا جاتا ہے۔

2۔ وہ گداگر جو بے ہنری اور عیش پسندی کے باعث ہر کام سے گھبراتے ہیں اور بھیک کو آرام کی روزی سمجھ کر پیشہ بنا چکے ہیں۔

3۔ مذہبی گداگر، جو اپنے حماقت آفریں خیال میں بھیک کو "مذہبی عطیہ" سمجھے ہوئے ہیں۔

4۔ وہ گداگر جو ہاتھ پاؤں سے قطعاً محتاج اور معذور ہیں اور کسی ایک خدمت کو انجام دے کر اپنی روزی نہیں کما سکتے اور صحیح معنی میں انھیں کو بھیک کا مستحق مانا جا سکتا ہے۔

ان طبقات کے سوا بھی گداگر پائے جاتے ہیں مثلاً وہ جو کسی دوسرے ملک سے نہایت ابتر اور پریشان حالت میں آئے ہیں اور انھیں کوئی دوسرا ذریعۂ معاش ملتا ہی نہیں۔ ان طبقات کی روزی کمانے کے طریقے بھی بکثرت ہیں، مگر ہر طبقہ نہایت درجہ مکر وفریب سے بھرا ہوا۔ ان لوگوں نے بھیک مانگنے کے جتنے طریقے ایجاد کیے ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ بھیک مانگنے والے میں جب عقل وفکر کی اتنی استعداد موجود ہے کہ وہ بھیک کے لیے ایک نہایت پُرفریب طریقہ ایجاد کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے تو اسے بہ جبر کسی شائستہ خدمت پر مامور کیا جائے تو وہ یقیناً عزت کے ساتھ روزی کما سکتا ہے۔ فی الجملہ ہندستان میں گداگروں کی کثرت نہ فقط قومی وقار کی ذلت کا باعث ہے بلکہ حکمراں جماعت کی نیک نامی کو بھی بدنام کرنے والی چیز ہے۔ غرض ہندستانی گداگروں میں بھیک مانگنے کے مکر وفریب سے بھرے ہوئے اتنے طریقے رائج ہیں کہ ان کی تفصیل سے ایک نہایت طویل کتاب تیار ہو سکتی ہے۔

پس ہندستانی گداگر کی بیوی بھی کسی گداگر ہی کے گھر میں پیدا ہوتی ہے اور گو بعض گداگر نہایت درجہ مالدار اور ذی ثروت ہو~~تے ہیں~~ مگر رواج کے عام انداز کے باعث وہ اپنی دولتمندی کا

اظہار کرنے سے مجبور ہیں اسی لیے یہ بیوی خواہ کتنے ہی امیر گداگر کے گھر پیدا ہو اس کے لیے کوئی ہنگامہ خیز اظہارِ مسرت نہیں کیا جاتا۔

چونکہ گداگر پیشہ طبقات عام طور پر جاہلِ محض ہوتے ہیں اس لیے نہایت تاریک اور تباہ کن رسوم کے پابند بھی ہوتے ہیں۔ لہٰذا اس کی پیدائش کے وقت کی خوشی میں اس کے ماں باپ عجیب و غریب قسم کی نذر و نیاز اور رسوم سے کام لیتے ہیں۔ بعض کے ہاں اس کی پیدائش کو کسی قبر، کسی ولی اور کسی بھوت کا انعام قرار دیا جاتا ہے۔ چنانچہ عرصہ دراز تک اسی قبر، اسی ولی اور اسی بھوت کے نام کی چوٹی اس کے سر پر برقرار رکھی جاتی ہے۔

بعض کے ہاں اس کی پیدائش پر باجا بھی بجایا جاتا ہے اور گانا بھی ہوتا ہے، اور بعض کے ہاں کسی ولی اور کسی دیوتا کے نام کی مٹھائی بھی تقسیم کی جاتی ہے اور اکثر کے ہاں کچھ بھی نہیں۔

پیدا ہونے کے بعد سے جوانی تک کسی قسم کی تعلیم اور ہنرمندی سے یہ دوچار بھی نہیں کی جاتی۔ البتہ غلط اور جاہلانہ رسوم سے ضرور خبردار کر دی جاتی ہے اور بھیک مانگنے کے طریقے وہ آنکھیں کھولتے ہی دیکھتی ہے اور خود بخود ماں باپ کے ساتھ رہ کر سیکھتی جاتی ہے۔ افلاس اور تنگدستی کے ساتھ اسے بچپن سے لے کر جوانی تک نہایت گندہ اور میلا رہنا پڑتا ہے۔ اسے کوئی خاص ہنر بھی نہیں سکھایا جاتا نہ امورِ خانہ داری کی کوئی تعلیم دی جاتی۔ بس جہاں جوان ہوئی اور کسی دوسرے گداگر کی بیوی بنا دی گئی۔

وہ بہت چھوٹی عمر سے بازاروں میں بھیک مانگنے کی عادی ہوتی ہے، اسی لیے وہ دلہن بن کر بھی بہت جلد بازار میں بھیک کے لیے نکل آتی ہے اور اسے گداگر برادری میں معیوب نہیں سمجھا جاتا۔ اس کے لیے گھر میں کسی خاص قسم کے فرائض نہیں ہوتے بس صبح بھیک مانگی اور کھالی اور شام بھیک مانگی اور کھالی۔ کپڑوں کا بھی یہ ہی عالم ہوتا ہے کہ لوگوں سے پھٹے پرانے کپڑے مانگے اور پہن لیے یہاں تک کہ اس جماعت میں صاف ستھرا کپڑا پہننا اس لیے جائز نہیں کہ ایسے کپڑوں کو دیکھ کر لوگ اسے بھیک نہیں دیں گے، لہٰذا وہ اس خطرے سے دانستہ طور پر چیتھڑے لگائے پھرتی ہے۔

اس کا مکان نہایت تنگ و تاریک اور جھونپڑی یا جھونپڑا ہوتا ہے، جو غلاظت اور گندگی سے

اتار ہتا ہے۔ یہ خودمزاج کی نہایت گندی اورست ہوتی ہے۔ یہ بھیک مانگنے کے بعد گھر میں بہت کام کرتی ہےاورزیادہ سوتی ہے۔

اس کے ہاں اولاد کی جو کثرت پائی جاتی وہ مزدور کی بیوی کو چھوڑ کر دنیا کی تمام بیویوں سے زیادہ ہوتی ہے۔ چنانچہ دعا ہے کہ خدا کسی بچوں والی گداگرنی سے بازار میں ملاقات نہ کرائے ورنہ یہ اگر بھیک مانگنے کے لیے مع اولاد کے آپ سے چمٹ جائے تو نہ آپ کو اس کے چنگل سے کوتوال صاحب بچا سکتے نہ وزیر جنگ۔

یہ گھروں پر جا کر نہایت دردانگیز الفاظ میں بھیک مانگتی ہے اور بازاروں میں بھی نہایت تکلیف دہ صورتیں بنا کر لوگوں سے بھیک وصول کرتی ہے۔ اس کے پاس بھیک مانگنے کا نہایت بااثر ذریعہ اس کی کمسن اولاد ہوتی ہے، جسے بڑے دردناک انداز سے دکھا کر یہ لوگوں سے بھیک وصول کرتی ہے۔ بعض اپنی کم عمر اولاد کو عین وقت پر کوئی غیر محسوس تکلیف پہنچا کر رُلاتی ہیں اور اس بچے کے رونے کی آواز سے گھر کی عورتیں اور مرد متاثر ہو کر اسے کافی بھیک دیتے ہیں۔ بعض دوسروں کے بچوں کو کھلانے کے نام سے لے آتی ہیں اور ان کو اپنا بچہ کہہ کر لوگوں اور گھروں سے بھیک وصول کرتی ہیں۔ بعض نہایت چالاکی سے ''پردہ والی شریف بیوی'' بن کر نکلتی ہیں اور اپنے کو ذی عزت گھرانے کی ذی عزت مگر مصیبت زدہ عورت ظاہر کر کے بھیک مانگتی ہیں۔ بعض اپنے شوہر کے ساتھ بھیک مانگتی ہیں اور اکثر علاحدہ۔

یہ شوہر کے حق میں نہ مفید نہ مضر۔ اسی طرح نہ زیادہ فرماں بردار نہ زیادہ شوخ، اس لیے کہ وہ اپنی روزی خود کماتی ہے لہٰذا ایک حد تک شوہر پر غالب رہتی ہے۔

کردار و اخلاق کے لحاظ سے ایک حد تک خطرناک اور غیر معتمد ہوتی ہے۔ اس کے بھیک مانگنے کے آزاد طریقے اس کے اخلاق کو ذلیل کر دیتے ہیں۔ اس میں چوری کی عادت ہوتی ہے اور بے حیائی کا مادہ زیادہ۔ وہ بازار میں اگر اپنے شوہر یا ساتھ والی سے جھگڑا مول لے لے تو اس سے پیچھا چھڑانا اتنا ہی مشکل ہے جتنا ایک مرتبہ پولس کی نظر میں مشکوک ہو کر پھر عمر بھر خود کو نیک چلن ثابت کرنا محال مان لیا گیا ہے۔ شوہر کے حق میں کم وفادار، کم خدمت گزار، خودغرض، لالچی اور حد سے سوا مکار مگر بے حد کفایت شعار اور اپنی حیثیت میں سلیقہ مند۔

◆◆◆

رنڈی بیوی

بازار کو متاثر کرنے اور بازار سے علاقہ رکھنے والی عورت ذاتوں میں رنڈی ہی وہ عورت ذات ہے جس کی تعریف میں اس کے شوہر کا نام نہیں لیا جا سکتا۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ اس کا شوہر ہی نہیں ہوتا یا وہ اپنا شوہر آپ ہی ہوا کرتی ہے بلکہ منشا یہ ہے کہ وہ جس حیثیت سے بازار میں ملتی ہے وہاں شوہر کا وجود نہیں پایا جاتا۔ بس اس کی تعریف یہ ہے کہ یہ انسانی عیش پسندی، فضولی اور لطف اندوزی سے پیدا ہوئی ہے۔ اس کے وجود سے شادی، بیاہ، خوشی کی تقاریب اور عیش کی مجالس کو رونق دی جاتی ہے۔ اس کی برادری بھی مختلف طبقات پر مشتمل ہے۔ سب سے بلند طبقہ وہ ہے جو گانے اور ناچنے کا پیشہ کرتا ہے۔ اس کی ابتدا کے متعلق معلوم نہیں کہ وہ کس شریف آدمی کی بیٹی تھی، لیکن اب یہ ثابت ہو چکا ہے کہ وہ رنڈی ہی کے گھر پیدا ہوتی ہے اور بڑے ناز نخرے کے ساتھ پیدا ہوتی ہے۔ اس کی رسائی عوام سے لے کر بادشاہوں کے درباروں تک ہے۔ چنانچہ 1930 میں اخباروں میں یہ افواہ تک شائع ہوئی تھی کہ اکتوبر 1930 میں بادشاہ افغانستان اپنی تخت نشینی کا جو جشن منانے والا ہے اس میں اس نے ہندستان سے رنڈیاں بلائی ہیں اور ہندستانی روٴسا کی تو کوئی ایک مجلس اس کے وجود سے خالی نہیں پائی گئی اور تو اور یہ اپنے ملاّ رموزی صاحب کی شادی میں بھی آئی تھی۔

یہ اگلے زمانے میں تو جو کچھ تھی وہ تھی مگر موجودہ عہد میں اس نے بھی شائستگی اور ترقی کی طرف قدم بڑھایا ہے مگر یہ ترقی قابلِ تذکرہ ترقی نہیں ہے یعنی کسی تعلیم اور ہنرمندی کی طرف نہیں بلکہ صرف چند معاشرتی اور تمدنی معاملات میں اس نے تبدیلی کو قبول کیا ہے اور احساسِ خودداری نے بے حد قلیل صورت میں ترقی کی ہے۔ البتہ اس کے خلاف عوام وخواص میں بے حد مخالفانہ جذبات بیدار ہو رہے ہیں اور اسے قومی خودداری اور وقار کے خلاف سمجھا جا رہا ہے۔ چنانچہ جن مقامات میں اس کے خلاف تحریک کی گئی ہے، ان میں ہندستان کا دارالحکومت دہلی سب سے آگے ہے۔ چنانچہ 1930 میں دہلی کے عوام نے رنڈی برادری کے خلاف نہایت منظم اور باقاعدہ کوشش کا آغاز کیا جس کی ابتدا اس طرح کی گئی کہ حکومت سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ رنڈیوں کو وسط شہر میں رہنے کی اجازت نہ دے اور انھیں شہر کے باہر یا کسی علاحدہ حصے میں آباد ہونے کا حکم دے، لیکن جب انفرادی کوشش کارآمد ثابت نہ ہوئیں تو عوام دہلی نے اپنی نمائندہ مجلس ''بلدیہ دہلی'' کے ذریعہ باضابطہ مقدمہ دائر کر کے ان کے اخراج کا مطالبہ کیا۔ یہ مقدمہ اپنی نوعیت کا پہلا مقدمہ تھا جس کے حالات نے تقریباً کل ہندستان کی رنڈیوں اور کل ''اشراف'' کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ چنانچہ جس طرح رنڈیوں کے خلاف عوام میں دلچسپی اور جوش پیدا ہوا، اسی طرح رنڈی برادری میں بھی اپنی حفاظت اور حقوق کا احساس طاقتور ہو گیا۔ چنانچہ اس وقت اخبارات میں ان کے خلاف جس زور کے ساتھ آواز بلند کی گئی، اس کے مقابل دہلی کی رنڈی برادری نے بھی اپنے تحفظ کے لیے ایک اخبار اردو زبان میں جاری کیا جس کا ایڈیٹر ایک رنڈی کو ظاہر کیا گیا تھا۔ یہ اخبار چند دن جاری رہ کر بند ہو گیا اور چند دن کے بعد پھر جاری اور پھر بند ہو گیا۔ اس کے بعد رنڈیوں کے خلاف مقدمہ دائر رہا، اور عوام کے ساتھ اخبارات نے بھی اس کی تائید میں بہت کچھ لکھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ عدالت نے رنڈیوں کے خلاف فیصلہ دے دیا اور دہلی کی مجلس انتظامیہ عرف میونسپلٹی نے انھیں ''سرخ روشنائی'' کا لکھا ہوا حکم دے دیا کہ:

> ''ہرگاہ کہ تم رنڈی ہو لہٰذا فوراً دہلی کے چاوڑی بازار سے کسی ویران خطے میں چلی جاؤ ورنہ عافیت تنگ کر دی جائے گی''۔

اس حکم پر عام طبقات میں نہایت اطمینان کا اظہار کیا گیا، مگر رنڈی برادری نے اس حکم کے

خلاف ''ذرا اونچی عدالت'' میں اپیل ٹھونک دیا، جس کا فیصلہ اخبار ''وطن'' دہلی مورخہ 13 جنوری 1931 اور اخبار ''زمیندار'' لاہور مورخہ 15 جنوری 1931 سے ذیل میں نقل کیا جاتا ہے جنھوں نے ان رنڈیوں کو ''زنانِ بازاری'' اور ''شاہدانِ بازاری'' اور ''طوائفوں'' کے الفاظ سے یاد کیا ہے۔ فیصلے کے اخباری الفاظ یہ ہیں جو ''زمیندار'' نے چھاپے ہیں اس عبارت کے عنوانات یہ ہیں:

''میونسپل کمیٹی پر شاہدانِ بازاری کا استغاثہ۔

دہلی میں ایک دلچسپ مشغلہ۔

دہلی 13۔جنوری 1931

دہلی میونسپل کمیٹی کے خلاف دہلی کی مشہور طوائفوں مثلاً چنبیلی، خورشید جان، اقبال پتلی، چندا، رادھا، سندر، مشتری، سرتی، ننھی، بسنتی، بھاگا، ہیرا، آہنی، ہری، گوپی، جوگل، محمودہ، خورشید، اللہ رکھی، سرداری، فیاض، زہرہ، نور جہاں، شاہ جہاں، عیداً، شریفاً، الٰہی جان، بجلی، رامو، لچھی، رام بوری، بیوٹی، حفیظاً، چندی، بشیراً جان، مشتری جان دوم نے مقدمات دائر کیے ہیں۔

عرضی دعویٰ کا مضمون یہ ہے کہ کمیٹی نے ہمیں پیشہ ور عورتیں تصور کر کے چاوڑی بازار دہلی سے نکل جانے کا حکم دیا ہے، لیکن ہم طوائفیں نہیں، بلکہ داشتہ ہیں اور گانا بجانا ہمارا پیشہ ہے۔ یہ مقدمات، سید محمد عبداللہ صاحب جج درجۂ اول دہلی کے اجلاس پر پیش ہیں۔ ان رنڈیوں کے علاوہ دوسو شاہدانِ بازاری بھی احاطۂ کچہری میں موجود تھیں۔ ان مقدمات میں سے سرِ دست تین چار مقدمات کی سماعت شروع ہوئی۔ رنڈیوں کے بیانات قلم بند کیے جانے کے بعد مقدمات آئندہ تاریخوں پر ملتوی کر دیے گئے''۔

اس کے بعد اخبار ''وطن'' دہلی مورخہ 13 جنوری 1931 نے ذیل کی اطلاع شائع کی۔ یہ اخبار دہلی اور ہندستان کے قوم پرست ہندوؤں کا نامور اخبار ہے جس کی اطلاع یہ ہے کہ:

''کل چودھری نعمت خاں، ڈسٹرکٹ وشیشن جج کی عدالت سے وہ اپیل خارج کر دی گئی جو جناب شنکر لال صاحب سب جج درجہ اول کے فیصلہ کے خلاف چاوڑی بازار

کی چار رقاصہ عورتوں کے خلاف دائر کی گئی تھی۔ ان عورتوں کو زنانِ بازاری قرار دیتے ہوئے میونسپل کمیٹی نے چاوڑی بازار سے اخراج کا نوٹس دے دیا تھا۔ کمیٹی کی جانب سے جناب راج نرائن اور رقاصہ عورتوں کی جانب سے جناب گلاب چند پیروکار تھے۔

فاضل جج نے اپنے فیصلے میں تحریر کیا ہے کہ میونسپل کمیٹی نے قرار دیا ہے کہ مسماۃ چندا، بسنتی، لالی اور بجلی اپنی بسر اوقات بطور زنانِ بازاری کرتی ہیں لیکن مدعا علیہم کا بیان ہے کہ وہ رقاصہ کا پیشہ کرتی ہیں اس لیے میونسپل کمیٹی کا کوئی حق نہیں تھا کہ اس کو اخراج کا نوٹس دیتی اس کے علاوہ دیگر مدعا علیہم نے بھی ایسی شہادتیں پیش کی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بطور رقاصہ کے بسر اوقات کرتی ہیں۔

گرداور کا بیان صرف اتنا ہے کہ میں نے انھیں بازار کے رخ کے برآمدہ میں بیٹھا دیکھا ہے۔

لہٰذا اتنا ثبوت ناکافی ہے، لہٰذا اپیل منظور''۔

اس فیصلے کے خلاف اخبار ''وطن'' دہلی نے 13 جنوری 1931 کا مقالہ مدیری جس جذبات کے ساتھ لکھا ہے وہ یقیناً ہندستان کے تعلیم یافتہ طبقے کے احساسات کا صحیح ترجمان ہے، جو یہ ہے:

''چاوڑی بازار دہلی سے جو شہر کا ایک مشہور تجارتی مرکز ہے۔ زنانِ بازاری کو اٹھانے کا مسئلہ کئی سال سے میونسپل کمیٹی کے سامنے پیش ہے، لیکن افسوس ہے کہ اس وقت تک اس کا کوئی خاطر خواہ حل نہیں ہوسکا ہے۔ اس قسم کی بازاری عورتوں سے شہر کے اخلاق کو بچانا چاہیے۔ اس قسم کے خیالات ہی کے تحت دہلی کے ہزارہا باشندوں نے اس کمیٹی کو درخواست دی تھی جس نے انھیں اس بازار سے اٹھانے کی تجویز منظور کر لی تھی، لیکن افسوس ہے کہ دہلی میونسپل کمیٹی اس وقت تک اپنی اس تجویم کو عملی جامہ نہ پہنا سکی۔ جب میونسپل کمیٹی نے رنڈیوں کو نکل جانے کا نوٹس دیا تو انھوں نے کمیٹی پر دیوانہ مقدمہ دائر کر دیا اور لالہ شنکر لال صاحب سب جج نے اس بنا پر انھیں جتا دیا کہ

میونسپل کمیٹی کے لگائے ہوئے الزامات کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔اس شکست کا سبب یہ ہے کہ کمیٹی کے ملازمین نے اس مقدمہ کو اچھی طرح نہیں چلایا۔اگر کمیٹی کوشش کرتی تو ان زنانِ بازاری کے خلاف ثبوت بہم پہنچا دینا مشکل نہ تھا اب بھی کچھ نہیں بگڑا ہے۔ابھی وقت ہے کہ میونسپل کمیٹی اپنے فرائض کو پہچانے اور اپنے وکلا کے مشورہ سے ضروری ثبوت بہم پہنچا کر اس بلا کو شہر سے ٹالنے کی کوشش کرے کیونکہ ان بے ماں باپ کی بچیوں کے چند سرپرستوں کے سوا باقی تمام شہر کی ہمدردی کمیٹی کو حاصل ہوگی۔ہم امید کرتے ہیں کہ کمیٹی اپنے فرائض سے جلد سبکدوش ہو کر اہلِ شہر کی ایک ٹھوس خدمت انجام دے گی جس کا احسان موجودہ ہی نہیں بلکہ آئندہ نسلیں بھی مانیں گی''۔

دارالحکومت دہلی کے ایک وسیع الاثر اخبار کے اس مقالہ مدیری سے ہم نے وہ تمام پُرجوش جملے حذف کر دیے ہیں، جن میں ان عورتوں کے خلاف بہت کچھ کہا گیا تھا۔پھر اس قدر الفاظ سے پتہ چلتا ہے کہ موجودہ زمانے میں اس عورت کو ملک وقوم کے وقار کے خلاف سمجھنے کا احساس عام ہو گیا ہے جس کا یہ مطلب ہے کہ اب یہ بے چاری چند دن کی مہمان ہے۔

اس قسم کی بیوی کو شاعرانِ نکتہ سنج ونکتہ آگاہ نے بھی اب محسوس کیا ہے اور ان کی حکیمانہ نکتہ دانی نے بھی اسے قوم کے حق میں ''کالی بلا'' تصور کیا ہے۔چنانچہ اس زمانے کے ذی مرتبہ اور فاضل شعرا نے بھی اس کے خلاف بہت کچھ لکھا ہے۔

اس کے لیے شمالی ہندستان کے نامور بلند مرتبہ اور شہرۂ آفاق شاعر حضرتِ گرامی ابوالاثر حفیظ جالندھری، ایڈیٹر رسالہ ''مخزن'' لاہور ومصنف ''شاہنامہ اسلام'' نے بھی رقاصہ کے عنوان سے اس عورت کے خلاف ایک نظم کہی ہے جو سارے ہندستان میں حد سے سوا جوش اور احترام سے پڑھی جاتی ہے، وہ یہ ہے۔اس نظم کے پیش کرنے کے یہ معنی ہیں کہ ہندستانی شعرا نے اسے کس نظر سے دیکھا ہے:

اُٹھی ہے مغرب سے گھٹا
پینے کا موسم آ گیا

ہے رقص میں ایک مہ لقا
نازک ادا ناز آفریں

ہاں ناچتی جا، گائے جا
نظروں سے دل برمائے جا
تڑپائے جا، تڑپائے جا
اے دشمنِ دنیا و دیں

تیرا تھرکنا خوب ہے
تیری ادائیں دل نشیں
لیکن ٹھہر تو کون ہے
او نیم عریاں نازنیں
کیا مشرقی عورت ہے تو
ہرگز نہیں ، ہرگز نہیں
تیری ہنسی بے باک ہے
تیری نگہ چالاک ہے

اُف کس قدر دل سوز ہے
تقریرِ بازاری تری
کتنی ہوس آموز ہے
یہ سادہ پرکاری تری
ہاں ہاں مسلماں زادیاں
ہوتی ہیں عفت والیاں

وہ حسن کی شہزادیاں
پردے کی ہیں آبادیاں
چشمِ فلک نے آج تک
دیکھی نہیں ان کی جھلک
سرمایۂ شرم و حیا
زیور ہے ان کے حسن کا
شوہر کے دُکھ سہتی ہیں وہ
منہ سے نہیں کہتی ہیں وہ
کب سامنے آتی ہیں وہ
غیرت سے کٹ جاتی ہیں وہ
اعزازِ ملّت ان سے ہے
نامِ شرافت ان سے ہے
اسلام پہ قائم ہیں وہ
پاکیزہ و صائم ہیں وہ
تجھ میں نہیں شرم وحیا
تجھ میں نہیں مہر و وفا
سچ سچ بتا تو کون ہے
او بے حیا تو کون ہے
احساسِ عزت کیوں نہیں
شرم اور غیرت کیوں نہیں
یہ پُرفسوں غمزے ترے
نامحرموں کے سامنے
ہٹ سامنے سے دور ہو
مردود ہو، مقہور ہو

تقدیر کی بیٹی ہے تو
شیطان کی بیٹی ہے تو
جس قوم کی عورت ہے تو
اُس قوم پر لعنت ہے تو
لیکن ٹھہر جانا ذرا
تیری نہیں کوئی خطا

مردوں میں غیرت ہی نہیں
قومی حمیت ہی نہیں
وہ ملّتِ بیضا کہ تھی
سارے جہاں کی روشنی
جمعیتِ اسلامیاں
شاہنشہِ ہندوستاں
اب اس میں دم کچھ بھی نہیں
ہم کیا ہیں ہم کچھ بھی نہیں
ملی سیاست اُٹھ گئی
بازو کی طاقت اٹھ گئی
شانِ حجازی اب کہاں
وہ ترک تازی اب کہاں
اب غزنوی ہمت کہاں
اب بابری شوکت کہاں
ایمانِ عالمگیر کا
مسلم کے دل سے اُٹھ گیا

قوم اب جفا پیشہ ہوئی
بلکہ گدا پیشہ ہوئی
اب رنگ ہی کچھ اور ہے
یہ قوم اب مٹنے کو ہے
یہ مرد اب پٹنے کو ہے
افسوس یہ ہندوستاں
یہ گلشن جنت نشاں
ایمان داروں کا وطن
طاعت گزاروں کا وطن
رہ جائے گا ویرانہ پھر
بن جائے گا بُت خانہ پھر
لیکن مجھے کیا خبط ہے
تقریر کیوں بے ربط ہے
ہاں ناچتی جا گائے جا
نظروں سے دل برمائے جا
تڑپائے جا، تڑپائے جا
او دشمنِ دنیا و دیں

ان تمام اقتباسات سے مقصد یہ ہے کہ آپ معلوم کرلیں کہ اب ملک کی ذہنی اورفکری شائستگی اس درجہ بلند ہوچکی ہے کہ وہ اس کے وجود کو قوم اور ملک کے لیے یکسر بربادکن سمجھتی ہے، لیکن اسی کے ساتھ ملک کے ان اعلیٰ تعلیم یافتہ حضرات کے مقابل جو اس کے وجود کو مٹادینا چاہتے ہیں، بعض ''دوسرے دماغ'' کے لوگ ایسے بھی موجود ہیں جو اس کے حفظ وبقا کے لیے اپنے دماغ کی بہترین قوتیں صرف فرمارہے ہیں اور اخبارات ورسائل کے ذریعہ اس کی حمایت کا حق ادا کرکے ''تاریخ وطنی'' میں اپنے لیے معلوم نہیں کس قسم کا باب قائم کرانا چاہتے ہیں۔ چنانچہ

''حامیانِ شاہدان بازاری'' میں شہر بمبئی کے چند کم علم مگر دولت مند نوجوانوں کے بیچ میں ایک ''اُبال کھائے ہوئے دماغ کے ایسے مسلمان صاحب سب سے پیش پیش ہیں جو اپنی عمر کے آخری حصے میں ''مولویانہ حیثیت سے بالکل بوکھلا گئے ہیں''۔

بارے اس کی پیدائش کے وقت جو دھوم دھام نظر آتی ہے وہ اچھے اچھوں کی بیٹیوں کو پیدائش میں نظر نہیں آتی۔ اس کی پیدائش پر حد سے سوا مسرت اور دھوم دھام کا اظہار اس لیے کیا جاتا ہے کہ یہ اپنی والدہ صاحبہ اور خاندان کے مستقبل کی روزی کا ذریعہ ہوتی ہے۔۔ ادھر اس کی والدہ کے پاس دولت بھی خاصی ہوتی ہے۔ لہٰذا پیدائش سے لے کر دس سال کی عمر تک۔ اس کی بے شمار تقریبات دیکھنے میں آتی ہیں جو یکسر جہالت کا نمونہ ہوتی ہے، مگر ان تقریبات کے مصارف کو ہندستان کے وہ دولت مند برداشت کرتے ہیں اور بڑے فخر سے برداشت کرتے ہیں جو یا تو نرے ایم۔ اے پاس ہوتے ہیں اور صحیح علوم سے کوسوں دور یا پھر جنھیں دولت تو حاصل ہوگئی ہے بے شمار مگر شائستہ ذوق اور اعلیٰ ذہنیت سے محروم ہیں، اسی لیے رنڈی کی امداد کو اپنی زندگی کا بلند تر کارنامہ سمجھتے ہیں اور دوستوں میں اس امداد پر فخر فرماتے ہیں۔

اس کی پیدائش کے وقت کی فضولیوں کے بعد سے اس کی ''تعلیم'' کا اہتمام ہوتا ہے۔ ''تعلیم'' سے ایک تو لکھنا پڑھنا مراد ہے، دوسرے ناچنے اور گانے کی مشق کا آغاز۔ لکھنے پڑھنے کی تعلیم کا یہ حال ہے کہ شروع میں اس کے لیے ایک ''ماسٹر صاحب'' اور ''مولوی صاحب'' مقرر کیے جاتے ہیں مگر ''حدِ تعلیم'' یہ ہے کہ عمر بھر رنڈی صحیح الفاظ میں خط نہیں لکھ سکتی ہے بجز اس کے کہ چند کتابیں اردو یا ہندی کی غلط سلط طریقے پر پڑھ لیتی ہے۔ سو وہ بھی اس طرح کہ کوئی بوڑھا آدمی رو رہا ہو۔ یہی حال اس کے خطوط کا ہوتا ہے جن میں املا اور انشا کی بے شمار لغزشیں موجود ہوتی ہیں۔ مگر اس کے ''قدردانوں'' میں اس کے خطوط کی زبردست عزت اور تعریف کی جاتی ہے اور یہ اس لیے کہ ''قدردان صاحب'' خود خیر سے کودن یا ''نیم تعلیم یافتہ'' ہوا کرتے ہیں۔ ادھر اپنے خطوط میں ناولوں اور افسانوں کے الفاظ اور جملے چُرا کر نقل کرتی ہے اور قدردان سمجھتے ہیں کہ یہ اسی کے عالمانہ اور ادب آزاد دماغ کی ایجاد ہیں۔ اسے مکروفریب سے بھرے ہوئے خطوط لکھنے کا مشورہ بھی بہ طریق تعلیم دیا جاتا ہے اور اسی طرح بھری ہوئی محفل میں لوگوں سے مذاق اور دل لگی

کے الفاظ بھی سکھائے جاتے ہیں۔ چنانچہ جس وقت ''حمقاء'' اور ''بلغمی تاجر'' اس کے گھر جاتے ہیں تو یہ بڑے ''عالمانہ نخرے سے'' ان سے مذاق فرماتی ہیں۔ اسی طرح اس کے ہاں جانے والے بھی خود کو بہت بڑا ''ظریف'' اور زندہ دل سمجھ کر تشریف فرما ہوتے ہیں، لیکن رنڈی کے تمام جملے اور فقرے نہایت درجہ ذلیل، فحش اور بے ہودہ مفہوم کو ادا کرنے والے ہوتے ہیں، مگر اس کے مخاطب گدھے اِن جملوں پر مارے حیرت کے شیروانیوں سے باہر ہوئے جاتے ہیں۔ حالانکہ رنڈی اپنی جہالت اور کم علمی کے باعث اربابِ علم سے گفتگو کی کبھی اہل نہیں ہوتی مگر پھر بھی اس کے جملوں اور اس کے خطوط کی جو قدر رہوتی ہے وہ اس لیے کہ: ''جیسی روح ویسے فرشتے''۔

اس کے مکان میں تصاویر اور آئینوں کی کثرت ہوتی ہے۔ ایک کمرہ خاص طور پر نہایت درجے آراستہ اور شاندار بنایا جاتا ہے۔ اس کے ہاں جانے والوں میں موٹے موٹے تھانیداروں، بلغمی قسم کے کوتوالوں اور آنریری مجسٹریٹوں کی تعداد کافی ہوتی ہے اور کہیں کہیں حاکم ضلع یا تحصیلدار صاحب بھی مل جاتے ہیں، مگر اس کمرہ کے بعد دوسرے کمرے نہایت تاریک اور گندہ ہوتے ہیں۔ اس کی بوڑھی والدہ صاحبہ اور افیونی قسم کے ملازم اور خدّام پڑے حقہ پیا کرتے ہیں۔

جہاں آپ تشریف لے گئے اور یہ بڑے گورنری نخرے سے آ کر سامنے تشریف فرما ہوگئیں۔ اب بیٹھنے کے بعد سے اگر یہ دس برس بھی آپ کے سامنے بیٹھے گی تو جتنی باتیں کرے گی اور جو حرکت بھی کرے گی اس میں سر سے پاؤں تک بناوٹ اور حد سے سوا بھونڈا مکر اور فریب ہوگا مگر اس کے ہاں تشریف لے جانے والے درجہ اول کے حُمقا اس کی ان احمقانہ اور فریب دہ حرکات کو اپنے حق میں نعمت اور جانِ حسن تصور فرما کر بے حد شاد اور مسرور ہوتے ہیں، پھر یہی نہیں کہ خود بے وقوف بنے تھے تو بنے تھے وہاں سے تشریف لا کر ملّا رموزی ایسے دوستوں کو اس کی ان سر تا سر مصنوعی حرکات اور بھونڈے اقوال کو لطف لے لے کر اور جھوم جھوم کر سناتے ہیں اور ملّا رموزی صاحب ایسے مجبور دوست ظاہر میں اپنے تعلقات باقی رکھنے کے لیے ان کی ہاں میں ہاں ملاتے مگر دل میں ان کی اور رنڈی صاحبہ کی ان یکسر مصنوعی حرکات کا مذاق اڑاتے ہیں۔

اس کے ہاں جانے والے مرد سنگھار اور آرائش کے لحاظ سے خود رنڈی بن کر جاتے ہیں اور

''رنڈیانہ لغت'' میں ایسوں کو ''اربابِ نشاط'' کہا جاتا ہے یعنی ''چھچھوندر کے سر میں چنبیلی کا تیل''۔

اس کے ہاں جانے والوں کے لیے لازم ہے کہ وہ خود نہایت درجہ شوخ، رنگین، بھڑک والا اور بڑھیا سے بڑھیا لباس پہن کر جائیں۔ سرمہ لگائیں اور عطر کا تو یہ حال کہ بس چلے تو شہر قنوج بن جائیں۔ بس اِدھر سے یہ مرد صورت مگر زنانہ لباس اربابِ نشاط پہنچے اور اُدھر سے وہ مٹک کر آئیں۔ یہ گدّے تکیے سے لگ کر نہایت حسین و جمیل بن کر بیٹھ گئے اور وہ ان کے سامنے مگر دو میل دور کچھ بڑی ہی شرمیلی بن کر اس انداز سے بیٹھ گئیں گویا آج تک نہ وہ کبھی مردوں کے سامنے آئی تھیں نہ مردوں سے گفتگو کی عادی۔ ان کے پیچھے ان کی کھوسٹ اور افیونی سی والدہ یا ایک آدھ میلی سی ملازمہ یا ملازم ادب سے بیٹھ جاتے ہیں۔ تھوڑی دیر میں پورے مرادآباد کے برابر ایک پاندان بی رنڈی صاحبہ کے سامنے رکھ دی جاتا ہے اور یہ حد سے سوا نخرے کے ساتھ پان لگانے میں جہاں مصروف ہوئیں کہ اربابِ نشاط نے وہ مہمل، بے معنی اور بازاری مفہوم کے جملے شروع کیے جو ان لوگوں میں بڑے عالمانہ جملے سمجھے جاتے ہیں۔ کبھی کبھی کسی ''فلسفیانہ جملے'' کے جواب سے رنڈی صاحبہ قاصر رہتی ہیں تو ''رنڈیانہ فلسفہ کی پروفیسر یعنی ان کی اُبال کھائی ہوئی والدہ صاحبہ'' اس کا جواب رسید فرماتی ہیں تو مارے لطف اور وجد کے اربابِ نشاط قابو سے باہر ہو جاتے ہیں اور دوسرے دن بڑی شان سے اس جواب کے مہمل فقرات کو لاجواب چیز بنا کر ملا رموزی کو یہ کہہ کر سناتے ہیں کہ بس ملا صاحب ہم تو اس کے اس جواب پر دنگ ہو کر رہ گئے۔ اِدھر ملا رموزی صاحب بھی اپنی اغراض کی خوشامد میں کہہ دیتے ہیں کہ بے شک قیامت کا جملہ کہا اس نے اور اس کا جواب ہی کیا ہو سکتا ہے؟ حالانکہ دنیا جانتی ہے کہ ایک ایسی عورت کیا خاک جملے اور فقرے وضع کرے گی جس کی تعلیم اردو، ہندی کی دس پانچ کتابوں تک ہو سو یہ تعلیم بھی اس لیے کہ گانے کے لیے غزلیں خود پڑھ کر یاد کرنے میں آسانی ہو، پھر جس کی صحبت میں بجائے ذی علم حضرات کے موٹے موٹے تاجر اور بے ذوق دفتری قسم کے افسر ہوں وہ بے چارے اگر جملے بھی وضع کرے گی تو بس دس پانچ اور اس کے بعد اس کا ذخیرہ ختم ہوا تو پھر سمجھ لیجیے کہ مہمل ہی مہمل۔

اس کے بعد یہ حد سے گزری ہوئی مگر خالص مصنوعی حجاب سے پان حاضر کرے گی اِدھر اربابِ نشاط میں ایک ایسے صاحب ضرور ہوتے ہیں جو اپنی جماعت میں سب سے زیادہ فاضل،

سب سے زیادہ ظریف، سب سے زیادہ بذلہ سنج، سب سے زیادہ حاضر جواب سمجھے جاتے ہیں۔
چنانچہ انھیں اسی غرض سے ارباب نشاط بڑی خوشامد سے اپنے ساتھ لے جاتے ہیں کہ وہ رنڈی کے
موتیوں کے تول کے فقروں اور لاجواب کر دینے والے جملوں کا بڑا ہی معقول اور برجستہ جواب
دیتے ہیں، اسی لیے ان لکھے نہ پڑھے نام محمد فاضل صاحب کو بھی اپنے متعلق یہ گھمنڈ ہو جاتا ہے کہ
وہ رنڈی سے جو فقرہ بھی کہتے ہیں اس درجہ لطیف، لاجواب اور ہنسانے والا ہوتا ہے کہ ساری محفل
صدائے تحسین سے گونج ہی تو اٹھے گی لہٰذا یہ قابل اور لائق صاحب رنڈی کے ہاں جاتے وقت
راستے ہی سے ایسے جملے بنا کر جاتے ہیں کہ بس جاتے ہی کہہ گزریں گے اور محفل ان کی قابلیت
اور حاضر جوابی کی تعریف سے گونج اٹھے گی۔ چونکہ اس شخص کے خیال کو سوچ وچار اور فقرے
گڑھنے کی فکر دامن گیر ہو جاتی ہے اور عام حواس بند ہو جاتے ہیں لہٰذا اس سے اکثر ایسی بے اختیار
حرکات سرزد ہوتی ہیں جن پر رنڈی اور اس کے متعلقین دل کھول کر بھائی صاحب کا مذاق اڑاتے
ہیں۔ اگرچہ یہ فاضل صاحب اپنی ایسی بیہودگی کو اپنی بوکھلائی اور عجیب وغریب حرکات سے چھپانا
چاہتے ہیں مگر دل میں مارے ندامت کے کافی ذلیل ہوتے ہیں۔ اب ان کی بذلہ سنجی ان کی
برجستہ گوئی اور ان کی ظرافت کا یہ عالم ہوتا ہے کہ جہاں رنڈی نے کوئی فقرہ کہا اور ان کی ساری
جماعت نے انھیں غور سے دیکھا اس امید کہ ساتھ کہ بس دیکھنا اب یہ ایسا جواب دیں گے کہ رنڈی
پھر کوئی فقرہ نہ کہہ سکے گی، ادھر بھائی صاحب کوئی جامعۂ از ہر مصر یا علی گڑھ یونیورسٹی کے سند یافتہ
تو ہوتے نہیں، اس لیے اب وقت پر معقول جواب نہ بن آنے کی خفیت کو یہ کبھی ہنس کر مٹاتے
ہیں، کبھی گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر دوزانو بیٹھ کر یوں جھومتے ہیں گویا بس اب وہ جواب دینے ہی والے
ہیں۔ آخر جب کوئی برابر کا جواب سوجھتا ہی نہیں تو یہ چمک کر کوئی مہمل سا فقرہ کہہ کر خود ہی زور
سے قہقہہ لگاتے ہیں اور اپنے ساتھیوں کو دیکھ کر ہنستے جاتے ہیں اور گردن ہلا ہلا کر ساتھیوں سے بھی
اپنی ہنسی میں امداد چاہتے ہیں تاکہ ہنسی کے شور میں اپنی لاجوابی کی ندامت چھپ جائے اُدھر
ارباب نشاط پہلے ہی کورے دھرے ہوتے ہیں لہٰذا انھیں اس سے کوئی بحث نہیں کہ ان کے لائے
ہوئے فاضل محمد خاں کے جواب میں ہنسی اور معنی آفرینی کی کوئی تک ہے بھی یا نہیں انھوں نے جو
دیکھا کہ ہمارے برجستہ گو فاضل محمد خاں ایک جملہ کہہ کر خود ہی مارے ہنسی کے قابو سے باہر ہو رہے

ہیں تو وہ بھی گے تکیوں اور گدوں سے اونچے ہو ہو کر قہقہے لگانے۔ اِدھر رنڈی ہر حال میں عورت ہوتی ہے اور ویسے بھی دس آدمیوں کے خواہ مخواہ ہنسنے اور شور کرنے سے دوسرا آدمی شرمندہ سا ہوجاتا ہے لہٰذا ایسے حجاب کو ارباب نشاط سمجھتے ہیں کہ ہمارے حاضر جواب فاضل محمد خاں کے جملے نے رنڈی کو بالآخر لاجواب ہی کر دیا نا؟ اِدھر فاضل محمد خاں ہوتے ہیں کہ چار دن بعد تک اپنی جماعت والوں سے کہتے رہتے ہیں کہ کیوں یاد ہے کہ وہ میں نے اس دن جو فلاں فقرہ کہا تھا تو کیسی لاجواب ہوگئی تھی وہ آپ کی مشتری جان؟

بعض ارباب نشاط رنڈی کے گھر کی تفریح کے لیے اپنے ساتھ ایسے لوگوں کو رکھتے ہیں جو یا تو قد وقامت اور حلیے بُشرے کے لحاظ سے عجیب وغریب ہوں یا پھر بنے ہوئے مجذوب خبطی یا ''مولانا''۔ بس جہاں یہ رنڈی کے گھر پہنچے اور انھیں بنایا گیا، کوئی انھیں گفتگو سے بے وقوف بناتا ہے کوئی دھول رسید کرتا ہے اور یہ فرضی غصہ کے ساتھ ان سب سے ناراض ہو کر بھاگتے ہیں تو پھر ساری محفل خاص کر رنڈی انھیں منا کر یا خوشامد کر کے اس شرط پر واپس لاتی ہے کہ اب آپ کو نہ ستائیں گے، مگر تھوڑی دیر کے بعد انھیں پھر چھیڑا جاتا ہے اور پھر یہ بگڑتے ہیں مگر چاہو کہ ہمیشہ کے لیے رنڈی کے گھر جانا چھوڑ دیں تو یہ ان بے چارے کے بس کی بات اس لیے نہیں کہ ارباب نشاط سے روٹی ہی اسی بات کی کھاتے ہیں۔ ایسے لوگوں سے رنڈی صاحبہ انتہائی ہمدردی اور خلوص کا اظہار فرماتی ہیں مثلاً جس دن یہ بنے ہوئے خبطی صاحب ارباب نشاط کے ساتھ رنڈی کے گھر نہ جائیں اُس دن رنڈی ارباب نشاط سے ناراض ہوجاتی ہے اور یہ فوراً بلائے جاتے ہیں۔

الغرض جب رنڈی پان پیش کرتی ہے تو حاضرین کے ''رنڈیانہ قانون'' کی دفعہ یہ ہے کہ اس کے پانوں کے برتن کو بغیر روپیہ اور نوٹ رکھے خالی واپس نہ کیا جائے مگر اس روپیہ کی مقدار آپ کی حماقت اور دولت مندی کی مقدار پر موقوف ہے یعنی جس نمبر کے آپ احمق ہیں اتنے ہی زیادہ روپیہ اس برتن میں رکھ دیں۔ چنانچہ سنا ہے کہ شہر بمبئی کے ارباب نشاط سو روپیہ کے نوٹ سے کم نہیں دیتے۔ اس کے بعد ارباب نشاط کی طرف سے گانا سنانے کی فرمائش ہوتی ہے اور رنڈی کی طرف سے نخروں کا آغاز ہوتا ہے۔ کبھی کہتی ہے کہ کل رات کو فلاں مہاراجہ صاحب کے اے۔ ڈی۔ سی تشریف لائے تھے، انھوں نے صبح تک گانا سنا تھا اس لیے بے حد تھکی ہوئی ہوں،

آج معاف کیجیے کل سناؤں گی۔ کبھی کہتی ہے کہ رات کو گورنر صاحب کی کوٹھی پر گاتی رہی کیونکہ خفیہ طور پر گورنر صاحب میرا گانا سنے بغیر کھانا نہیں کھاتے۔ کبھی کہتی ہے کہ کل رات سے میرے گلے میں خدا جانے کیا ہوگیا ہے کہ آواز ہی ٹھیک نہیں ہوتی۔ غرض ہزاروں بہانے کرتی ہے۔ حالانکہ گانے کے لیے شام ہی سے تمام ساز و سامان خفیہ طور پر تیار رکھتی ہے مگر اس طرح کہ سارنگی والا بھی پوشیدہ اور طبلے والا بھی غائب مگر جب اربابِ نشاط کے ذوقِ سماع کو خوب مشتعل کر دیتی ہے تو ''خیر آپ کی خاطر سے ایک دو چیزیں سنا دیتی ہوں'' کہہ کر جو حکم دیتی ہے تو تمام متعلقین ہوتے ہیں کہ فرضی طور پر آنکھیں ملتے ہوئے اس کے ہر گوشے سے برآمد ہونے لگتے ہیں گویا واقعی وہ سو رہے تھے یا سونے والے تھے۔ اب جو ہزاروں نخروں کے ساتھ گانا شروع ہوا تو نہ پوچھیے اربابِ نشاط کے وجد و کیف کا عالم۔ بس ہر مصرع پر یہ اچھل اچھل کر اور مست و مدہوش ہوکر داد دیتے ہیں۔ حالانکہ آپ کی دعا سے رنڈی جس غزل کو بھی کہے گی وہ کسی دقیانوسی اور مرے ہوئے شاعر کی جن کے اشعار میں نہ کوئی نیا خیال ہوتا نہ کوئی اچھوتی فکر، پھر مصیبت پر مصیبت یہ ہے کہ رنڈی جس غزل کو بھی کہتی ہے اتنی غلط کہ کپڑے پھاڑ کر بھاگ جانے کو جی چاہتا ہے۔ پھر اس پر اگر وہ یکا یک کوئی غزل فارسی زبان کی شروع کر دے تو سمجھ لیجیے کہ اب یہ جاہل اربابِ نشاط مارے کیف کے بغیر اسپتال پہنچائے ہوش میں ہی نہ آئیں گے۔ گویا ان میں کا ہر ایک فارسی زبان کی شاعری کے نکات و رموز کو اتنا سمجھتا ہے کہ خود سعدی، انوری اور عرفی نے بھی نہ سمجھا ہوگا۔

غرض خدا خدا کر کے گانا ختم ہوا، مگر اس عرصے میں رنڈی صاحبہ کی سارنگی کا صندوق سو دو سو روپیہ نقد یا اتنے ہی نوٹ سے لبریز ہوگیا اور صبح صرف اتنا تذکرہ ہوا کہ افسوس ملّا رموزی صاحب آپ رات کو گانے میں نہ تھے واللہ ملّا صاحب اگر رات کو آپ مشتری جان کا گانا سن لیتے تو آپ کو وہ لطف آتا جو عمر بھر نہ آیا ہوگا کیونکہ واقعہ یہ ہے کہ گانے کو تو آپ ہی ایسے ذی علم لوگ سمجھ سکتے ہیں مگر آپ بھی اس درجہ خشک واقع ہوئے ہیں کہ بجز مضمون نگاری کے نہ دوست کے نہ آشنا کے۔ خیر اب کی جمعرات کو انشاء اللہ آپ کو ضرور لے چلیں گے مگر دیکھیے خدا کے لیے کوئی بہانہ نہ کر دیجیے گا۔

ان کے بعد رنڈی کی قدر دانی اور قدر افزائی کا دوسرا میدان شادی بیاہ کی تقاریب ہیں۔

خصوصاً غنڈوں کی شادی میں تو رنڈی کا مرتبہ شہر کوتوال سے کچھ ہی نیچا ہوتا ہے سو وہ بھی ادباً ہم لکھ رہے ہیں ورنہ کوتوال تو کوتوال رنڈی تو غنڈوں کے ہاں بس ''کمیشن افسر'' ہوتی ہے۔ جہاں یہ آئی اور صاحبِ خانہ سے لے کر اس کے تمام عزیزوں پر اس کی تواضع اور خاطر کا خوف طاری ہوا اور یہ اس لیے کہ رنڈی صاحبہ جب کسی کے ہاں شادی میں تشریف لے جاتی ہیں تو ان کے ہمراہ جو لاؤ لشکر نظر آتا ہے وہ کسی بادشاہ کی سواری ہی میں نظر آ سکتا ہے۔ چنانچہ ان کے ناچ اور گانے کے ''معاونین'' کی عام تعداد مبلغ چھ یا پھر دس ہوتی ہے کیونکہ ذرا بڑی حیثیت کی رنڈی کے ساتھ طبلہ بجانے والے دو ہوتے ہیں اور پان کھلانے والا اور جوتوں کی حفاظت کرنے والا ملا کر دس اور اوپر سے اس کی کھانسی کی ماری ہوئی اماں جان گیارہ۔ بس ادھر رنڈی شادی کے گھر میں آئی کہ پہلا ہنگامہ تو شادی والے گھر اور محلے کے بچوں میں برپا ہو جاتا ہے جو انتہائی شوق اور حیرت سے اس کی ایک ایک حرکت کو دیکھنے کے لیے ایک کے اوپر ایک کر کے گرے جاتے ہیں۔ دوسرا ہنگامہ اس کے گھر عورتوں میں برپا ہوتا ہے جو کتنی ہی ''باقاعدہ'' ہوں مگر رنڈی کو دیکھنے کے لیے وہ ''جھانکنے'' سے باز نہیں رہتی ہیں۔ چنانچہ بعض عورتیں اپنے بچوں کو پیسے دے کر دروازے پر یہ کہہ کر بٹھا دیتی ہیں کہ ''اگر خالو میاں آئیں تو ہم سے دوڑ کر کہہ دینا ہم ذرا رنڈی کا تماشہ دیکھتے ہیں''۔

اس کے بعد تیسرا ہنگامہ اس شہر کے غنڈوں کا ہوتا ہے جو بغیر کسی اذن اور تکلف کے رنڈی کے بالکل منہ پر آ کر بیٹھ جاتے ہیں۔ پھر اپنے لباس، اپنے ڈنڈے اور اپنی اکڑی ہوئی گفتگو سے رنڈی پر رُعب بٹھاتے ہیں۔ مہمل اور ڈرانے والے آوازے کستے ہیں اور موقع پا کر اپنی پسند کی ہوئی غزل کی فرمائش بھی کر گزرتے ہیں۔ اس موقع پر رنڈی جس شخص سے ہنس کر بات کر لے وہ مارے غرور کے خود کو اس شہر کا سب سے بڑا آدمی سمجھتا ہے۔ اسی موقع پر دولہا دُلہن کی طرف کے بعض پوپلے اور پنشن یافتہ بوڑھے بھی رنڈی سے مذاق فرماتے ہیں۔ شادی والوں کی طرف سے دو چار بے وقوف اس کی تواضع کے لیے ہر وقت تیار رہتے ہیں۔ جہاں اس نے اِدھر اُدھر دیکھا کہ فوراً ان میں سے کوئی پان لے کر دوڑا تو کوئی سگریٹ اور اب کچھ دن سے غنڈوں میں رنڈی کو چائے بھی پلا دی جاتی ہے اور درجۂ سوم کی رنڈی بھی چائے پینے سے چوکتی نہیں۔ امرا کی محفلوں میں بھی یہ بڑے ٹھاٹھ اور آن بان سے پہنچ جاتی ہے۔ فرق صرف یہ ہوتا ہے کہ امرا کی محفلوں میں یہ لباس اور زیور کی بھڑک اور شان تو دکھاتی ہے مگر وحشت کا یہ عالم ہوتا ہے کہ اس محفل میں اگر

چپراسی بھی ذرا شاندار ساڈریس پہن کراس کے سامنے آجائے تو اسے بھی جھک کر سلام کرگزرتی ہے محض یہ سمجھ کر کہ ہوں گے یہ بھی کوئی افسر۔

اس کے بعد اس کی قدر دانی کا تیسرا میدان دولت مندوں کی خفیہ مجالس ہیں۔ان مجالس میں کوئی ایک ''بڑا آدمی'' اسے گانے کے لیے طلب کرتا ہے اور اپنے برابر کے افسروں یا اپنے برابر کے دولت مندوں کو اس محفل میں شرکت کے لیے ''بڑے راز میں اذن پہنچا دیتا ہے''۔اس محفل میں گورنڈی بہت زیادہ ''حسبِ ضابطہ'' ہوکر آتی ہے اور آداب واحترام کا ہر قاعدہ ملحوظ رکھتی ہے،مگر تھوڑی ہی دیر میں اس محفل کے ''معزز شرکا'' اس کے ساتھ یا آپس ہی میں ایسا مذاق اور بے تکلفی شروع کر دیتے ہیں کہ مجبوراً اس رنڈی کو بھی سارے آداب کو طاق پر رکھ دینا پڑتا ہے۔یہاں اس کے گانے پر بھی وجد وکیف کا وہی عالم ہوتا ہے جو اپنے دہلی کے خواجہ حسن نظامی صاحب کے ہاں قوالی میں نظر آتا ہے۔ایسی محفلوں میں یہ بجائے دور کھڑی ہوکر ناچنے کے امیروں سے بہت زیادہ قریب بیٹھ کر گاتی ہے اور ہر شریک مجلس رشوت اور بے ایمانی کی تجارت سے کمائے ہوئے نوٹ اور نقد روپیہ اسے دکھاتا ہے اور یہ بڑے نخرے سے اٹھ کر آتی ہے اور اسے آداب عرض کر کے دل میں یہ کہتی ہوئی روپیہ لے کر واپس ہوتی ہے کہ ''ہو بڑے بڑے احمق'' ادھر نقد روپیہ یا نوٹ دینے والے صاحب روپیہ دینے کے بعد لمبی سی جمائی لے کر محفل والوں کو اس خیال سے دیکھتے ہیں کہ میرے اتنے زیادہ روپیہ دینے سے محفل والوں پر میرا کتنا اثر ہوا؟ بعض ایسی محفلوں میں رنڈی کی ''مزدوری'' کے لیے چندہ کیا جاتا ہے اور بعض تمام مصارف اپنی جیب سے ادا کرتے ہیں اور دوستوں کو ''بہ مرحمتِ رنڈیانہ'' مفت گانا سنواتے ہیں اور کہیں کہیں گانے سے پہلے دوستوں کو ''مرغ مسلّم'' بھی کھلاتے ہیں۔اس قسم کے بے وقوفوں کی پہلی علامت یہ ہے کہ وہ بہت زیادہ چست پاجامہ پہنتے ہیں۔اس کے بعد ''بہ حالاتِ مختلف'' کسی سے اس کی شادی ہو جاتی ہے لیکن بہت کمی کے ساتھ۔البتہ جس کی شادی ہو جاتی ہے وہ رنڈی بیوی ہو کر جو کچھ ہوتی ہے اس کے اثرات یہ ہوتے ہیں۔

1۔ وہ نکاح سے قبل اپنے ہونے والے شوہر سے اپنے نام اس کی تمام جایداد یا جایداد کا بڑا حصہ عدالت سے ''رجسٹری'' کراتی ہے۔

2۔ رہنے کے لیے شوہر کے اصل مکان سے علاحدہ ایک مکان لیتی ہے۔

3۔ اس کی اولاد کی شادی شریفوں میں محال ہو جاتی ہے۔
4۔ اس کے شوہر صاحب کے سابق خسر صاحب اپنی بیٹی کے مہر کا دعویٰ دائر کر گزرتے ہیں۔
5۔ سابق بیوی اکثر اپنے ماں باپ کے ہاں چلی جاتی ہے ورنہ تپِ دِق کے مرض میں ضرور مبتلا ہو جاتی ہے۔
6۔ اس کے شوہر کی عام عزت اور اثر میں بہت زیادہ کمی ہو جاتی ہے۔
7۔ اس سے پیدا شدہ لڑکے کو شہر کے غنڈے ہمیشہ ''ابے او رنڈی والے'' کہہ کر پکارتے ہیں۔
8۔ اس کے بیوی ہو جانے سے گھر کے مصارف میں اضافہ ہوتا ہے۔
9۔ مکان بے حد صاف، آراستہ اور ہر چیز میں سلیقہ پیدا ہو جاتا ہے۔
10۔ پچھلی زندگی کی ندامت اور خوف سے وہ اب حد سے سوا مذہبی عورت بن جاتی ہے، وہ عباداتی مسائل و وظائف کا بے حد احترام کرتی ہے۔
11۔ نہایت محتاط، مآل اندیش اور نیک سیرت ہو جاتی ہے۔
12۔ شوہر کی حد سے سوا فرماں بردار ہوتی ہے اور خدمت گزار۔
13۔ بے حد کفایت شعار اور منتظم ہو جاتی ہے۔
14۔ اولاد کی تربیت اور تعلیم میں سب سے زیادہ قابلِ تعریف۔
15۔ نیکو کاری، خوش اطواری اور دینداری کی باتوں سے ہر وقت خوش ہونے والی اور فضولیات سے نفرت کرنے والی۔

غرض بیوی ہو کر اس کے جملہ اطوار بلند پایہ شریف عورتوں سے کہیں سوا ہوتے ہیں، مگر ان خوبیوں کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اب آپ بھی جب تک ایک رنڈی ہی سے شادی نہ کر لیں اس وقت تک کھانا ہی نہ کھائیں۔ آئندہ اختیار، بدست سرکار۔ فقط۔

◆◆◆

تھیٹر اور سنیما کی بیوی

اس کا یہ مطلب نہیں کہ تھیٹر اور سنیما دو قسم کے شوہروں کا نام ہے بلکہ تھیٹر اس تماشے کو کہتے ہیں جس میں مرد اور عورتیں نئے نئے اور عجیب عجیب قسم کے بھیس بدل کر تماشہ کرتے ہیں اور سنیما اس تماشے کو کہتے ہیں جو بجلی کی مشین کے ذریعہ ایک پردہ پر تصاویر کے ذریعہ تمام دنیا کے حالات و واقعات کو اپنی اصل حالت میں دکھاتا ہے۔ ان دونوں تماشوں میں تھیٹر قدیم اور سنیما جدید تماشہ ہے اور اسی لیے سنیما کی مقبولیت نے تھیٹر کو قریب قریب ختم سا کر دیا ہے۔

سنیما کے آغاز کا جو زمانہ بتایا گیا ہے اس میں اور اس کے موجد کے صحیح علم کے متعلق ابھی تک اختلاف ہے۔ مثلاً 1827 میں لندن کی رائل سوسائٹی یعنی مجلسِ شاہی کے ناظم پیٹر مارک اور بٹ نے اس کے متعلق ایک ایجاد کی تھی، جو صرف ایک ''کارڈ بورڈ'' کو گھماتی تھی جس سے معلوم ہوتا تھا کہ چڑیاں ناچ رہی ہیں، پھر 1889 میں ایڈیسن اسٹمس کوڈک کیمرہ کی پہلی فلم تیار کی اور چلتی پھرتی تصویروں کو دکھانے کا بھی آلہ تیار کیا لیکن آج 1931 میں یہ تماشہ اس درجہ مکمل ہو چکا ہے کہ اس کے پردہ پر حرکت کرنے والی تصاویر گفتگو بھی کرتی ہیں جو سنی جا سکتی ہے۔ ہندستان کا شاید ہی کوئی چھوٹا سے چھوٹا شہر ہوگا جہاں سنیما کا تماشہ موجود نہ ہو۔ اس کا سب سے پہلا تماشہ 1910 میں دکھایا گیا۔ اُس وقت لوگوں کو اس کے اس درجہ مقبول ہونے پر یقین نہیں

تھا، مگر 1910 کے اعداد وشمار سے ثابت ہوتا ہے کہ اس وقت تک پچاس ہزار سنیما بن چکے تھے۔ اسی وقت امریکہ کے ایک کروڑ افراد روزانہ سنیما دیکھتے تھے۔ انگلستان کے نصف باشندے ہفتہ میں دو مرتبہ سنیما دیکھتے تھے۔ امریکہ میں ایک سال میں دس کروڑ روپیہ کے ٹکٹ فروخت ہوئے تھے۔

اب ہندستان میں یہ تماشہ مقبول ہو رہا ہے۔ غرض اس کو ذریعۂ تفریح بھی کہا جاتا ہے اور تعلیم واصلاح کا عملی سبق بھی اور اسی لیے بعض حالات میں طلبا کو بھی ان تماشوں کے ذریعہ سبق دیا جاتا ہے حالانکہ اس تھیٹری سبق کے بعد بھی ہندستانی طالب علم گدھا کا گدھا ہی رہتا ہے، مگر کہنے میں یوں آتا ہے کہ تھیٹر اور سنیما کے ذریعہ بھی پڑھاتے تو ہیں، ملا رموزی کے خیال میں یہ بھی ایک طریقہ ہے بے وقوف قوموں میں اس کے شوق کو پیدا کرنے کا۔ بہرکیف ان دونوں تماشوں میں مردوں کے ساتھ عورتیں بھی ملازم رکھی جاتی ہیں جو گانے اور ناچنے کے کام کے ساتھ ہی عورتوں کے حالات کی نقل بھی کرتی ہیں مگر ان عورتوں کے اندر چند خصوصیات کا ہونا ضروری قرار دیا گیا ہے۔ اب اگر کسی عورت میں وہ باتیں نہیں ہیں تو کہیں کہیں ان کی تعلیم کا بندوبست خود تھیٹر اور سنیما والے کرتے ہیں۔ ان خوبیوں میں سب سے اول درجہ کی خوبی عورت کا خوبصورت ہونا ہے، مگر ہندستان میں ان کھیلوں میں جس قسم کی عورتیں ملازم رکھی جاتی ہیں یا ملازم ہوتی ہیں، وہ اپنی جگہ پر کتنے ہی بلند اور پاکیزہ اخلاق کی ہوں، مگر عام طور پر ان سے نفرت کی جاتی ہے اور اس نفرت کے دوسرے اسباب میں سے دو سبب نہایت قوی ہیں۔

اول یہ کہ یہ تماشہ ہی سرے سے ہندستان کی ایجاد نہیں اس لیے یہاں کے باشندوں کی نظر اور ان کے اعتقاد میں اس کی ہر چیز عجیب وغریب معلوم ہوتی ہے، اسی لیے اس کے اندر کام کرنے والی عورت بھی انھیں ایک عجیب سی چیز نظر آتی ہے۔ دوسرے یہ کہ بعض واقعات بھی اس قسم کے رونما ہو چکے ہیں جن کے باعث عام طور پر تھیٹر اور سنیما کی عورت کو نفرت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ تیسرا سبب گو معمولی ہے مگر نہایت اہم اور وہ یہ کہ شروع ہی سے ان تماشوں میں ان عورتوں نے حصہ لیا ہے جو خاندانی اعتبارات سے ناقابلِ توجہ تھیں مگر جو سبب اس نفرت کا خاص ہے وہ اس کی عورتوں کے حالات ہیں۔ چنانچہ رسالہ ''نئی روشنی'' دہلی بابت ماہ مئی 1930 جلد 1، نمبر 9 کے

صفحہ 50 پر اس تماشہ کی ایک مشہور عورت مساۃ شانتا کماری نے ایک مضمون بہ عنوان ''آپ بیتی اور جگ بیتی'' شائع کیا۔ اس مضمون میں اس نے اپنی ملازمت کے جو حالات قلم بند کیے ہیں وہ حد سے سوا عبرت انگیز اور غیرت سوز ہیں اور ملا رموزی کی اس کتاب کا وقار اور اس کی شائستگی ہرگز اس کی اجازت نہیں دیتی کہ ایک مسلمان نام کے رسالے میں ان شائع شدہ حالات کو بھی نقل کیا جائے۔ البتہ اس مضمون سے اس قسم کی بیوی کے متعلق چند خاص باتیں معلوم ہوتی ہیں جو یہ ہیں:

اول یہ کہ تھیٹر اور سنیما میں وہ لڑکی زیادہ آسانی سے ملازم ہو جاتی ہے جس کی خاندانی نگرانی کمزور ہو۔

دوسرے یہ کہ وہ لڑکی اخلاقی قیود سے آزاد ہو اور گھر کے باہر تفریحی مشاغل میں کسی نہ کسی طرح سے حصہ لے سکتی ہو۔ چنانچہ خود مضمون نگار موصوفہ نے اپنے خاندان اور سنیما میں اپنی ملازمت کے واقعہ کو ان الفاظ میں لکھا ہے:

> ''میرا تعلق ایک اعلیٰ خاندان سے ہے (ماشاء اللہ) میرے والد موتی لال ایک اسکول کے پرنسپل تھے۔ آکسفورڈ یونیورسٹی لندن کے تعلیم یافتہ تھے۔ 1911 میں ان کا انتقال ہوا اور اس کے بعد میری تعلیم کا سلسلہ رُک گیا۔ مجھے شروع سے سنیما میں دلچسپی تھی (گویا گھر والے تماشہ دیکھنے کی اجازت دیتے تھے) میں نے اس زندگی کو 1920 میں جناب نرنجن پال کے مشورہ سے اختیار کیا''۔

اس اقتباس سے ہمارے مذکورہ بالا خیالات کی تائید ہو گئی۔

تیسرا سبب ملازمت کے لیے لڑکی کی تنگ دستی، غربت اور فاقہ کشی بھی ہے۔ ان حالات و اسباب کے بعد بعض ایسی عورتیں بھی ان تماشوں میں ملازم ہیں جو شادی کے بعد اپنے شوہر کے ساتھ ملازم ہوئی ہیں اور بعض ایسی بھی جو ملازم ہونے پر بھی ہر قسم کے اعتراض سے بری ہیں۔

القصہ یہ جب ان تماشوں میں ملازمت کی حیثیت سے داخل ہوتی ہے تو اس وقت عموماً یہ بے بیاہی ہوئی ہوتی ہے۔ اس کے بعد اس کی شادی اول تو تماشہ کے کسی ملازم ہی سے ہو جاتی ہے ورنہ پھر تماشائیوں میں سے کسی سے خصوصاً کسی دولت مند سے۔ اس کی شادی اگر ملازم کے ساتھ ہو تو کہا جائے گا کہ اس شادی میں خود بیوی کی پسند اور خواہش کو دخل ہے یعنی اس نے اپنے شوہر کو

خود پسند کیا ہے یا پھر اس میں ملازم شوہر کی چالاکی اور مکاری کو دخل ہوگا۔ یعنی اس ملازم شوہر نے ہر وقت کی قربت سے فائدہ اٹھا کر اسے مسلسل دھوکے دیے ہیں اور لالچ کے سبز باغ دکھائے ہیں جن کے اثر سے اس نے اس شوہر کو پسند کیا اور اب اسے فریبی اور مکار پا کر رو رہی ہے، لیکن اگر تماشائیوں میں سے وہ کسی کے ساتھ بیاہی جائے تو سمجھ لیجیے کہ وہ اس تماشائی کی دولت مندی سے متاثر ہوئی ہے۔ بہرکیف! دونوں قسم کے شوہروں سے شادی ہونے کے اصول علاحدہ علاحدہ ہیں۔ مثلاً اس کی شادی اگر کسی ملازم کے ساتھ ہو رہی ہے تو نہایت دیدہ دلیری اور آزادی سے ہوگی اور اگر کسی تماشائی کے ساتھ ہے تو مشکلات اور خفیہ طریقے سے۔

ملازم کے ساتھ اس لیے آزادی حاصل ہے کہ بصورتِ ملازم تھیٹر اور سنیما کی لڑکی کے خاندان کا کوئی اثر لڑکی پر نہیں ہوتا۔ البتہ کہیں کہیں اس کی والدہ صاحبہ بھی اسی تماشا میں ملازم ہوتی ہیں مگر تھیٹر اور سنیما کی ملازمت اختیار کر لینے کے بعد خود لڑکی اتنی آزاد ہو جاتی ہے کہ اب اسے اپنی شادی کے لیے والد صاحب اور والدہ صاحبہ کی اجازت کی ضرورت نہیں۔ صرف تماشے کے مالک کی اتنی فکر ہوتی ہے کہ وہ ''دخل درمیان بیوی'' نہ بن جائے۔ یا اس کے معاہدہ کی کسی دفعہ کی خلاف ورزی نہ ہو۔ چنانچہ ہوتا ہے کہ تماشے کے مالک ایسی شادیوں میں اس لیے رکاوٹ پیدا کرتے ہیں کہ شادی کے بعد کہیں دلہن صاحبہ بھاگ نہ جائیں اور پھر ان کے نہ ہونے سے ہمارے تماشے کے ٹکٹ فروخت نہ ہوں، لیکن کسی ملازم کے ساتھ یہ خطرہ اس لیے کم محسوس ہوتا ہے کہ لڑکا اور لڑکی شادی کے بعد ہمارے ہی تماشے کو اپنا میکہ اور سسرال سمجھیں گے لہٰذا اجازت ہے۔ چنانچہ اکثر شادیاں ایسی ہی ہوتی ہیں جن میں لڑکی بھی تماشے کی اور لڑکا بھی تماشے کا۔ اس شادی میں نہ نکاح کے اذن والے کو کارڈ چھپوانے کی ضرورت ہوتی ہے نہ ولیمہ کے لیے پلاؤ پکایا جاتا ہے۔ بس تماشے کے تمام ملازم جمع ہو گئے اور نکاح کی رسوم ادا کر کے ان دونوں کو میاں بیوی سمجھ کر پھر تماشہ دکھانے میں مصروف ہو گئے۔ اس قسم کے شوہر کے ساتھ اس کے تعلقات ناقابلِ اعتبار رہتے ہیں۔ محض اس لیے کہ اپنی مقررہ خدمت سے ترقی کرنے پر بیوی دوسرے تماشے میں زیادہ تنخواہ والی ملازمت چاہتی ہے اور یہاں سے نااتفاقی کا آغاز ہوتا ہے یا پھر حریص اور لالچی ذہنیت ہونے کے باعث اس شوہر کی قلیل آمدنی پر وہ صابر نہیں رہتی اور کسی مالدار ملا رموزی کے ساتھ

شادی کے لیے راضی ہو کر وہ اس شوہر سے طلاق چاہتی ہے اور جو یہ کچھ بھی نہ ہو تو وہ افلاس اور تنگدستی کی تکلیف کو برداشت نہیں کرتی، اس لیے ایسا بھی ہوتا ہے کہ شوہر صاحب پلنگ پر سوتے رہ جاتے ہیں اور وہ کہیں سے کہیں۔ پھر شوہر صاحب کوتوالیوں میں اس کا حلیہ لکھاتے پھرتے ہیں اور ملا رموزی صاحب گواہی دیتے پھرتے ہیں کہ ہاں یہ اس کی بیوی ہے اور فلاں تماشے سے بھاگ کر آئی ہے اور حلف سے کہتا ہوں کہ دو سو روپیہ کا زیور بھی لے کر بھاگی ہے۔ ایسی بیوی کی تلاش میں کوتوال لوگ زیادہ محنت سے کام لیتے ہیں مگر مجسٹریٹوں کے لیے نہیں کہہ سکتے کہ وہ ایسے میاں بیوی کے مقدمہ میں پیشی پر پیشی کیوں بڑھاتے ہیں؟ القصہ اس قسم کے میاں بیوی کی اخلاقی کمزوریوں اور آزادیوں کے باعث تعلقات بہت کم خوشگوار رہتے ہیں۔ خصوصاً بڑھاپے میں ان دونوں کی ابتر اور قابلِ رحم زندگی ناقابلِ برداشت ہو جاتی ہے، محض اس لیے کہ تھیٹر اور سینما کی ملازمت سے جتنا آدمی مالدار ہوتا ہے اتنا ہی فضول خرچ بھی ہو جاتا ہے۔ بہت کم ایسے ہوتے ہیں جو مآل اندیشی سے کوئی جائیداد خرید لیتے ہیں۔ اِدھر ان لوگوں کے ہاں اولاد بھی کم ہوتی ہے لٰہذا بڑھاپے میں اولاد کا سہارا بھی نہیں ہوتا۔

اس قسم کی بیوی فراغت اور خوشحالی کے زمانے میں بھی شوہر کے لیے مصیبت بنی رہتی ہے مثلاً وہ کسی کلب کی ممبر تو نہیں ہوتی مگر شام کے وقت ڈھائی سو روپیہ نقد کی ساری اور ڈاسن کا پمپ پہن کر وہ ٹھنڈی سڑک پر ضرور جاتی ہے۔

انہی میں سے بعض ایسی ہوتی ہیں جو اپنے کمالات کی وجہ سے اتنا روپیہ کما لیتی ہیں کہ کوٹھی بھی خرید لیتی ہیں اور خود ایک تماشے کی مالک بھی بن جاتی ہیں پھر بھی شوہر کو اپنی بے کمائی کے باعث اس کا خانساماں ہو کر رہنا پڑتا ہے۔

مزاجی اور اخلاقی آزادی کے باعث ان دونوں میں چوبیس گھنٹے اختلافات کا موجود ہونا تو یہاں تک ثابت ہے کہ ملا رموزی صاحب تو ٹکٹ لے کر ان کا تماشہ دیکھنے کے لیے بیٹھے ہیں اور یہ ہیں کہ عین تماشے کے وقت لڑ رہے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یا تو میاں تنہا اپنا تماشہ دکھا جاتے ہیں اور ملا رموزی بیٹھے تاؤ کھایا کرتے ہیں کہ ''آج وہ نہ آئی'' یا پھر شوہر صاحب تاؤ کھا کر بیٹھ جاتے ہیں اور تماشے کے مالک انھیں پردہ کے اندر سمجھایا کرتے ہیں اور ملا رموزی نے تو بعض تماشوں

میں ان دونوں کے جھگڑنے کی آواز تک سنی ہے اور تماشہ کے مالک کی خوشامدیں۔

مگر انہی میں بعض بیویاں تماشے کے دیوالیہ ہو جانے کے بعد اپنے شوہر کے ساتھ حد سے سوا جفاکش اور صبر سے دن گزار دیتی ہیں اور کسی دوسرے ذریعۂ معاش کو اختیار کر لیتی ہیں، مگر طلاق کا نام نہیں لیتی ہیں، لیکن اگر اس حالت میں خود ان کے شہر میں کوئی تماشہ آ جائے تو پھر یہ دونوں اس جدید زندگی کو چھوڑ کر پھر اس تماشے میں ملازمت کیے بغیر رہ بھی نہیں سکتے مگر ایسے میاں بیوی معمولی درجہ کے تماشوں میں ہوا کرتے ہیں بڑھیا میں نہیں۔

بے کاری کے زمانے میں اس قسم کی بیوی پر اعتماد کرنا حماقت ہے۔

اس کے مقابل اگر اس کی شادی کسی دولت مند سے ہوتی ہے تو اس کے لیے عام طور پر اسے اور اس کے دولت مند شوہر کو مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور یہ اس لیے کہ جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے کہ ہندستانی آدابِ اخلاق میں ابھی اس قسم کی عورت کو کوئی مرتبہ نہیں ملا ہے، اس لیے اس قسم کی شادی میں خفیہ طریقوں سے زیادہ کام لیا جاتا ہے۔ مثلاً عورت کی طرف سے اس لیے کہ اگر وہ کسی دولت مند سے شادی کے لیے خفیہ طور پر تماشے سے بھاگ نہ جائے تو اس کی شادی اس لیے ناممکن ہے کہ اسے تماشہ کا مالک اپنے معاہدہ کی رو سے اجازت نہ دے یا تماشے کی آمدنی کم ہو جانے کے خوف سے وہ اسے طرح طرح کے لالچ دے کر اس مقصد سے باز رکھنے کی کوشش کرے اور جو کچھ بھی نہ کر سکے تو اس کے فرار ہو جانے پر یہ اس پر چوری ہی کا الزام لگا کر پولس کے ذریعہ نکاح سے روک لینے کی کوشش کرے اور خدا جانے پولس والے اس قسم کے مفرورین کی بے ضمانت گرفتاری پر کیوں ادھار کھائے بیٹھے رہتے ہیں، کچھ نہیں بس حوالات میں بند کر کے گانا سنتے ہوں گے؟

شوہر کی طرف سے اس لیے خفیہ کارروائی ہوتی ہے کہ ان کے شہر، ان کے محلے اور ان کے خاندان میں ''ایسی'' کے شادی کرنا معیوب، مکروہ اور ایک حد تک ممنوع ہوتا ہے۔

بہر حال دونوں کے لیے بھاگ جانا یا لے بھاگنا ضروری ہے، مگر کہیں کہیں یہ بھی ہوتا ہے کہ ''صاف صاف'' پھر بھی یہ شوہر کے حق میں مفید نہیں ہوتی مثلاً وہ شوہر کے اصل مکان اور اصل بیوی کے پاس رہنا نہیں چاہتی، اس لیے وہ اپنے واسطے علاحدہ ایک کوٹھی بنواتی ہے۔

جس شہر میں اس کا تماشہ ہوتا ہے وہاں وہ گرفتاری کے خوف سے نکاح کرنا نہیں چاہتی۔ لہٰذا اس کے ساتھ مرد کو شوہر ہو کر بھی بھاگنا پڑتا ہے۔ تماشے کی ملازمت اور آزاد زندگی کے باعث اس کے خواص میں کافی عیش پسندی اور فضولی ہوتی ہے، اس لیے قیمتی لباس اور سیر و تفریح کی ہر وقت خواہش مندر ہتی ہے اور ان سب باتوں میں شوہر کا کافی روپیہ خرچ کرتی ہے۔ شوہر پر عمر بھر غالب رہتی ہے، اس لیے کہ وہ شوہر کی خواہش پر تماشے کی نوکری ترک کر کے بھاگی ہے لہٰذا جو مانگے سو دیجیے ورنہ پھر جاتی ہے اسی تماشے میں۔

بیوی بن جانے پر بھی وہ گھر کے کاموں میں حصہ نہیں لیتی اور ایک کی جگہ دو ملازم عورتیں پاؤں دبانے کے لیے چاہتی ہے۔ صرف مزاجی صفائی کی بنا پر گھر کو زیادہ صاف اور آراستہ رکھتی ہے۔ بے پردہ رہنے کی عادت کے باعث نئے شوہر کے ہاں پردہ میں رہنے سے دل تنگ رہتی ہے، اس لیے طرح طرح کے مطالبات سے شوہر کو تنگ کرتی رہتی ہے۔ اب خود کچھ نہیں کماتی مگر شوہر سے دولت وصول کرنے کی ہر لحظہ خواہش رہتی ہے۔

معمولی خط و کتابت اور ڈرامے وغیرہ پڑھ لینے کی قابلیت ہوتی ہے، اس لیے کہ آج تک نہیں نہیں سنا کہ کوئی بی۔ اے پاس لڑکی سنیما یا تھیٹر کی ملازمت سے بھاگ کر ملا رموزی صاحب کی بیوی بن گئی ہے۔

مذہبی آداب و رسوم سے یکسر بے خبر ہوتی ہے، اس لیے شوہر کی کافی خدمت اور فرمانبرداری سے دور رہتی ہے۔ جاہلانہ رسوم کی پابند خصوصاً نذر نیاز، منّت، عرس اور پیروں فقیروں کی معتقد۔ تنہائی کا وقت کتب بینی اور امور خانہ داری کی مصروفیت کے عوض ہارمونیم باجا بجانے میں گزارتی ہے۔

اس قسم کی میاں بیوی کے تعلقات بڑھاپے سے پہلے تک بہت زیادہ خوشگوار ہوتے ہیں، مگر بڑھاپے میں ایک دوسرے کے لیے مصیبت۔ اولاد کہیں کم اور کہیں زیادہ۔ اس قسم کی اولاد سے والد صاحب اس لیے گھبراتے ہیں کہ برادری میں اس اولاد سے کوئی عزت نہیں ملتی۔ تماشے کی ملازمت تک نہایت حسین، نہایت نازک اور نہایت تیز و طرار اور شادی کے بعد نہایت آرام طلب، نہایت بلغمی اور نہایت افسردہ اور رنجیدہ رہنے والی۔ اِلّا بعض شادی کے بعد ایمانی قوتوں

کی بیداری سے نہایت خندہ پیشانی، آداب مذہب کی کافی عزت کرنے والی، شوہر کی پروانہ، منتظم، جفاکش، کفایت شعار، اولاد کی اعلیٰ تعلیم و تربیت پر حریص اور ملا رموزی کی دعا گو۔

اس قسم کی بیوی کی شادی میں منگنی، نکاح، بارات، ولیمہ اور جہیز کی رسوم کا کوسوں پتہ نہیں۔ بس وہ دونوں میاں بیوی راضی اور ملا رموزی صاحب قاضی۔ فقط۔

◆◆◆

بلّوچی کی بیوی

ہندستان کے بازاروں سے تعلق رکھنے والی بیویوں میں بلّوچی کی بیوی بھی خاص ہے۔
یہ علاقۂ بلوچستان میں پیدا ہوتی ہے اور تجارت کے لیے ہندستان کے ہر شہر میں ''قدم رنجہ'' فرماتی ہے۔ بلوچستان شمالی ہند اور افغانستان جنوبی سے متصل ایک پہاڑی علاقہ کو کہتے ہیں جس کے زیادہ حصہ پر انگریزی حکومت قابض ہے۔ اس علاقے کے باشندے اگرچہ بلوچستان میں پیدا ہوتے ہیں لیکن ان کا نسلی علاقہ ایک حد تک ایران سے ملتا ہے، لہٰذا اکثر افراد خود کو بلّوچی کے عوض ایرانی کہتے ہیں۔ رسم و رواج اور عادات و معاشرت کے لحاظ سے ہرگز ایرانیوں سے نہیں ملتے، پھر بھی مذہب اور زبان کے چند اعتبارات سے یہ خود کو ایرانی کہہ سکتے ہیں۔

کچھ شک نہیں کہ یہ لوگ نہایت تنومند، ذی حوصلہ، بہادر، جنگجو اور آزاد ہوتے ہیں۔ ان کا مذہب اسلام ہے۔ عقائد میں زیادہ حصہ شیعہ ہے۔ عموماً تجارت پیشہ ہوتے ہیں۔

ہندستان سے سرحدی قربت کے باعث ان کی خاصی تعداد ہر وقت ہندستان میں موجود ملتی ہے، مگر اس طرح کہ انھیں ''خانہ بدوش'' کہہ سکتے ہیں۔ آج ہمارے شہر میں تو کل آپ کے شہر میں۔

ان کی بیوی کسی ایسے ہی مقام میں پیدا ہوتی ہے جہاں وہ خیموں اور درختوں کے سایہ

میں مقیم ہوتے ہیں۔ چونکہ عموماً جاہل ہوتے ہیں اس لیے کل کی فکر سے ہمیشہ بے پرواہ ہوتے ہیں اور جو شخص فکر سے فارغ ہوتا ہے وہ ہمیشہ خوش رہتا ہے، لہٰذا اس کی پیدائش پر پورا قافلہ خوشی کا اظہار کرتا ہے۔ گانا بھی ہوتا ہے اور ناچ بھی۔ پھر یہ آپ ہی آپ بڑھنے لگتی ہے اور جتنا جی چاہتا ہے بڑھ جاتی ہے اور یہ آپ ہی بڑھنا اس لیے لکھا ہے کہ اس کی پرورش اور خدمت و حفاظت کا کوئی ایک قاعدہ بھی نہیں برتا جاتا۔ مثلاً اگر وہ کسی انتہائی گرم موسم میں پیدا ہوئی ہے تو اسی حالت میں اسے لے کر ماں باپ سفر فرماتے ہیں اور جو شدت کے جاڑے میں پیدا ہوئی ہے تو بھی والدین سفر سے باز نہیں رہتے۔ قیام کی چھت کبھی پختہ نہیں ہوتی بس وہی کپڑے کا خیمہ نما خیمہ۔ کیونکہ اس خیمہ میں بھی خیمہ پن نہیں ہوتا بلکہ جس طرح چاہا ایک کپڑا تان دیا اور دل میں خوش ہو گئے کہ تنبو کے نیچے تو رہتے ہیں، اس لیے یہ بیوی بچپن میں موسموں کی تمام شدتوں کا مقابلہ کرتی ہے، مگر زندہ رہتی ہے۔ ذرا بڑی ہوئی تو بڑے بڑے تعویذوں سے سینہ لدا ہوا، مگر ننگ دھڑنگ۔ ایک آدھ نیچا کرتا مل گیا تو پہن لیا ورنہ قافلے میں ادھر سے اُدھر خوش خوش دوڑتی پھرتی ہے۔

بڑی ہوئی تو قافلہ ہی کے کسی لڑکے سے بیاہ کر رکھ دی سو وہ بھی اس طرح کہ تمام تقاریب میں جملہ شرکا بلوچی ہی بلوچی۔ نہ اس شہر کا کوتوال نہ کلکٹر نہ ہم نہ آپ۔ بس قافلے میں جتنے ہیں وہی سمدھی اور وہی باراتی۔ البتہ ہر تقریب میں یہ آپس ہی میں اس قدر خوش ہو لیتے ہیں کہ دوسرے کی حاجت ہی نہیں۔ اگر ماں باپ کے پاس روپیہ ہے تو ولیمہ بھی ورنہ اس کی بھی شکایت نہیں۔ پھر کسی ایک تقریب کے لیے بھی پختہ مکان کی ضرورت نہیں۔ جو کچھ ہے اپنے خیموں میں ہے۔ اب جو شادی ہوگئی تو اسی ہفتہ سے یہ اپنے شوہر کے ساتھ چاقو، چھری، قفل، تسبیح، جھوٹے سچے موتی، اُسترے قینچی وغیرہ لیے ہوئے بازار میں نظر آتی ہے۔ اب وہ تجارت ہی میں آزاد نہیں بلکہ ہر معاملے میں آزاد ہے۔ اگر خدانخواستہ آپ بازار میں اس کے پاس کسی چیز کے خریدنے کے لیے چلے جائیں تو ایسا معلوم ہوگا گویا وہ آپ کو خرید کر چھوڑے گی۔ جہاں آپ نے انگلی سے بتایا کہ وہ چیز اور یہ بجلی سے بھی تیز زبان چلانا شروع کر دے گی۔ فوراً ہی اس چیز کو لے کر کھڑی ہو جائے گی پھر آپ کے منہ کے بالکل ہی قریب کھڑی ہو کر وہ اس چیز کی مضبوطی، اس کی قیمت،

اس کی قسم، اس کا فائدہ اور اس کی تاثیر کو ہزار ہزار مرتبہ بیان کرے گی اور ہر بات پر آپ کے سر کی قسم کھاتی جائے گی۔ اب اگر قسم جھوٹی ہو تو اس کی بلا سے آپ کا سر جائے یا رہے۔ اسی اثنا میں اگر دوسرا گاہک آ گیا تو وہ اس سے بھی اسی مستعدی کے ساتھ چمٹ جائے گی۔ وہ اس چیز کو اٹھا کر بار بار آپ کے منہ کے پاس لائے گی اور آپ کی داڑھی کی جگہ کو ہاتھ لگا کر اب وہ خدا اور سول کے واسطے بھی دے گی گویا وہ بھی کوئی راہِ خدا کا سودا ہے جس کا خریدنا شرعاً بھی فرض ہے اور عرفاً بھی ثواب کا باعث۔ اب اس درجہ عاجزی اور کوشش پر بھی اگر آپ نے اس سے کوئی چیز نہ خریدی تو اب وہ دکان چھوڑ کر آپ کے پیچھے بھی چلاّتی ہوئی آئے گی کہ اچھا تو جو آپ کا جی چاہے دے دو مگر اسے خرید لو۔ اس پر بھی اگر آپ کا پتھر کا دل موم نہ ہو تو اب وہ آپ کو گالیوں اور بددعاؤں پر دھر لے گی۔ اب فرق یہ ہے کہ وہ سخت سے سخت گالی بلوچی فارسی میں دیتی ہے اِدھر آپ ہوتے ہیں نرے بی۔ اے پاس اس لیے آپ اس نا قابلِ برداشت گالی کو صرف اتنا ہی سمجھ کر ہنستے ہوئے چلے آتے ہیں کہ بلوچی زادی بک رہی ہے چلیے اس کی بکواس کا خیال ہی نہ کیجیے حالانکہ اس کی ایک ہی گالی کا ترجمہ کسی آزاد ملک کے باشندے کو سنا دیا جائے تو وہ گولی ہی مار دے یا خودکشی کر لے۔ بعض مولویوں کی قسم کے ہندستانی اس سے بڑی آن بان سے اپنی اُبال کھائی ہوئی فارسی میں گفتگو شروع فرماتے ہیں لیکن جہاں اس نے اپنی پہاڑی فارسی شروع کی یہ بے چارے آہستہ سے اردو پر اتر آتے ہیں اور دل میں کہتے ہیں کہ خدا مجھے غارت کر دے کہ میں نے انگریزی تو پڑھ لی مگر اتنی فارسی نہ پڑھی کہ آج اس عورت سے فارسی میں گفتگو تو کر سکتا۔

یہ بازار سے واپس ہوتے وقت غلہ اور ترکاری بھی خرید کر لیتی جاتی ہے اور ساتھ ہی کوئی نہ کوئی پھل، مٹھائی یا پھر چنے ہی سہی مگر راستہ چلتے ہوئے کھاتی جاتی ہے اور لطف یہ کہ اس سرِ راہ کھانے میں اس کا شوہر، اس کا بھائی اور اس کی والدہ تک شریک ہوتی ہے۔ البتہ بازار سے واپسی پر ایک خاص بات اس کے اندر دیکھنے کے قابل ہوتی ہے اور وہ اس کے چہرے کی مسرت اور گفتگو کی آزادانہ فرحت۔ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا وہ ہفت اقلیم فتح کر کے واپس ہو رہی ہے۔ اب اس کی ہر حرکت میں مستی، شوخی، طراری اور بے باکی ہوتی ہے۔ وہ اپنے ساتھ کی عورتوں

اور مردوں سے اس زور سے گفتگو اور مذاق کرتی ہوئی جاتی ہے کہ اپنے ہاں کے، اچھے اچھے غنڈے یہ کہہ کر ایک طرف ہو جاتے ہیں کہ چلو بھائی وہ بلوچی آ رہے ہیں۔ ماشاء اللہ اپنے ہاں کے بچے تو چیخ مار کر والدہ کی گود میں جا کر چھپ جاتے ہیں، جب ان سے جھوٹ کہہ دیجیے کہ ''وہ بلوچی آیا''۔ اب وہ دن بھر بازار اور محلوں میں گھوم کر بھی اپنے خیمہ پر پہنچ کر اتنی مستعد اور طرار ہے کہ فوراً ہی کھانا پکانے، پانی لانے اور لکڑی پھاڑنے میں یوں مصروف ہو جائے گی کہ مٹک مٹک کر کوئی شعر بھی پڑھتی جائے گی اور پاس والی سے لڑتی بھی جائے گی۔ پاس والی سے اس کی لڑائی دنیا کے کسی قانون کے روکے نہیں رُکتی۔ پھر مصیبت یہ کہ سارے قافلے کی عورتیں لڑتے لڑتے اگر خون میں بھی نہا جائیں تو ان کے مردوں کو پرواہ نہیں۔ وہ مزے سے پاس بیٹھے جُوا کھیلتے رہیں گے۔ بس کبھی کبھی بیٹھے بیٹھے کسی عورت کی طرفداری میں ایک آدھ فقرہ کہہ دیں گے اور پھر کھیل میں مصروف ہو جائیں گے۔ یہی حال ان کے بچوں کا ہوگا کہ وہ بھی برابر اپنے کھیل میں مصروف رہیں گے۔ یہ اپنی ہندستانی عورتوں کی طرح نہیں کہ اگر ایک عورت نے، دوسری کو ایک گالی دے دی تو اس کے باوا بھی لٹھ لے کر آ گئے اور دادا بھی، بیٹے بھی اور بھائی بھی اور شوہر کا تو پوچھنا ہی کیا کہ اکثر ہندستانی شوہر اپنی بیوی ہی کی راہ میں شہید ہو چکے ہیں۔ اسی طرح ہندستانی عورتوں کی لڑائی تو ہو رہی ہے میری اور آپ کی بیوی کے درمیان مگر محلے والی عورتیں ہیں کہ اپنے اپنے گھروں سے بھاگی ہوئی چلی آ رہی ہیں۔ کوئی ہے کہ گلی میں کھڑی لڑائی کے الفاظ سن رہی ہے، کوئی ہے کہ اپنے ہی بیٹے کو یہ کہہ کر ڈانٹ رہی ہے کہ جا تو مردود وہ دیکھ ملا رموزی صاحب کی بیوی کس سے لڑ رہی ہیں۔ کوئی ہے کہ اپنا کام چھوڑ کر اپنے گھر کی ٹوٹی ہوئی دیوار پر چڑھ کر جھانک رہی ہے۔ کوئی اپنے شوہر کو ڈانٹ رہی ہے کہ ذرا چپ تو رہو وہ سنو تو کہ ملا رموزی صاحب کی بیوی اپنی ساس سے لڑ رہی ہیں یا کسی اور سے۔ پھر اگر یہ پتہ بھی چل گیا کہ ہاں جہالت کے باعث ملا رموزی صاحب کی بیوی اپنی ساس ہی سے لڑ رہی ہیں تو اس پر بھی صبر نہ ہوگا بلکہ اب اپنے اپنے گھر میں یہ عورتیں ڈھائی گھنٹے تک ملا رموزی صاحب کی بیوی کی لڑائی پر اظہارِ خیال فرماتی رہیں گی کہ:

— اے بیوی تم کیا جانتی ہو؟

— آہ جب سے وہ غریب ملا اس کمبخت کو بیاہ کر لایا ہے اس وقت سے اس کا یہی حال ہے۔
— ارے بڑی مکار ہے۔ وہ ساس سسر کو تو ہوا میں اُڑاتی ہے۔ خدا کی قسم آپا کل ہی وہ کہہ رہی تھی کہ جب میرے ہاتھ کا کھانا پسند نہیں ہے تو پھر مجھے کیوں لائے تھے بیاہ کر۔
— کیا کہتی ہو تم وہ ملا بھی اپنے نام کا ملا ہے۔ آخر بیٹا کس کا ہے؟ اس نے بھی بیوی کو اپنا درست کیا ہے کہ چھٹی کا کھایا اب یاد آ رہا ہے بیوی کو۔
— ہوئی کا ہے پر سے بس ابھی وہ غریب نوکری پر سے آیا اور بس اتنا ہی اس نے پوچھا کہ ابھی تک تم بیٹھی ہو، چائے تیار نہیں کہ بس وہ چمٹ گئی۔
— اور بیوی زبان کی تو جتنی تیز میں نے اسے دیکھا ہے خدا میری اولاد کو ایسی زبان سے دور ہی رکھے۔
— ارے تو خالہ بی وہ ہے آخر کس باپ کی بیٹی؟
— ہاں ہاں اسے تو اپنے ماموں کا گھمنڈ ہے، اسی لیے تو وہ نہ شوہر کو سمجھے نہ ساس سسر کو۔
— بس ملا غریب کی قسمت ہی پھوٹ گئی، جو یہ چڑیل اس کے گلے کا ہار ہو کر آئی۔
— اُفّوہ بہن میں نے تو ایسی علامہ نہ دیکھی نہ سنی۔

الغرض ہندستانی عورتوں میں ایک عورت کی لڑائی پر اس محلے کی تقریباً تمام عورتیں گھنٹے سوا گھنٹے کے لیے معطل ہو کر اسی لڑنے والی کے تذکرہ میں مصروف رہتی ہیں۔ یہ اس لیے کہ ہندستانی عورتوں کی ذہنیت اور تربیت غلامانہ ہے جس کے اثر سے ان کے اندر ہر غیر معمولی بات اور خبر سے وحشت، گھبراہٹ، خوف اور پریشانی کے اثرات پیدا ہوتے ہیں اور بلوچی عورت کی ذہنیت آزاد اور اس کی تربیت کے اصول بھی آزادی سے بھرے ہوئے ہیں۔ اس کے مرد جنگجو اور بہادر ہوتے ہیں اس لیے اس کے دماغ میں کسی لڑائی یا حادثے کی خبر کوئی وحشت پیدا نہیں کرتی، اس لیے اب خواہ وہ اپنے شوہر یا اپنی ساتھ والی سے بازار میں لڑے تو لڑے اور قافلے کی قیام گاہ پر لڑے تو لڑے اب اس حالت میں اسے نہ ساتھ والیاں بچائیں گی نہ اس کا شوہر اس کے بیچ میں بولے گا۔ اسی لیے قیام گاہ پر جہاں اس کی کسی دوسری سے چھڑی اور یہ 90 میل فی گھنٹہ کی رفتار سے اسے گالیاں دینے کے لیے کھڑی ہو گئی، مگر ساتھ والیاں اسی کے پاس بیٹھی ہوئی نہایت سکون سے روٹی پکاتی رہتی ہیں اور بس۔ اسی قسم کی کبھی کبھی اس کے شوہر سے بھی چھڑ جاتی ہے۔ اگر چہ نتیجہ میں وہی

شکست کھاتی ہے کیونکہ دنیا میں بلوچی مرد کا طمانچہ ویسے بھی بہت مشہور ہے، پھر اگر کسی کے بالکل منہ پر پڑ جائے اور وہ بھی دس بارہ مرتبہ تو پھر بیوی تو بیوی اگر بیوی کے والد بھی ہوں تو شکست کا اقرار کرنے پر مجبور ہو جائیں، مگر کمال اخلاق یہ کہ وہ شوہر کے طمانچوں اور گھونسوں سے صرف ایک رات ہی رنجیدہ رہتی ہے اور صبح پھر اسی کے ساتھ پٹی کمر پر لٹکائے بازار میں نظر آتی ہے۔

یہ بازار کے بعد ہمارے آپ کے مکانوں کے اندر بھی سامان فروخت کرنے ''تشریف لاتی ہے'' مگر اس وقت ہمارے آپ کے ہاں کی عورتوں کا خوف اور پریشانی دیکھنے کے قابل ہوتی ہے۔ بچے تو صورت ہی دیکھ کر بہادر والدہ سے چمٹ جاتے ہیں اور بہادر والدہ اکثر مع ننھے میاں کے کمرہ کے اندر۔ البتہ ذرا بوڑھی قسم کی عورتیں اس سے گفتگو کر لیتی ہیں یا پھر اگر مرد گھر میں موجود ہیں تو۔ جب یہ گھروں میں سامان فروخت کرنے داخل ہوتی ہے، اس وقت یہ اپنے سامان کو عورتوں کے ہاتھوں فروخت کرنے کی پوری کوشش کرتی ہے لیکن اس کے بعد وہ کبھی کبھی بھیک کے طریقہ پر روٹی اور کپڑا بھی مانگتی ہے اور اپنے ننھے میاں کی والدائیں، عورت ذات سے ہمدردی کرنے کے معاملے میں جرمنی تک مشہور ہو چکی ہیں لہٰذا اسے خوب کپڑے ملتے ہیں اور بارہ بارہ روٹیاں۔ لطیفہ یہ ہے کہ بلوچی کی بیوی سے بعض ہندستانی مرد اپنی عورتوں کو یہ کہہ کر ڈراتے ہیں کہ:

— خبردار کبھی اس عورت کو گھر میں نہ آنے دینا۔
— یہ بڑی لڑاکا ہوتی ہے۔
— یہ بچوں کو پکڑ کر لے جاتی ہے۔
— یہ چوری کا مال فروخت کر جاتی ہے۔
— یہ گھر میں سے چیزیں چُرا کر لے جاتی ہے۔
— اور بس میں تم سے کہتا ہوں کہ اسے گھر میں نہ آنے دینا پھر تم کون؟

امورِ خانہ داری اور بچوں کی پرورش کے قاعدوں سے کافی حد تک ناواقف ہوتی ہے، اسی لیے اس کے بچے اس طرح دیکھے جاتے ہیں گویا وہ اپنی ہی بے غیرتی سے زندہ ہیں اور بڑھتے چلے جا رہے ہیں۔ اسی لیے اس کے بچوں کے پاس جھک کر سلام کرنے، میر صاحب کو آداب بجالانے اور مصافحہ کرنے کا کبھی کوئی نمونہ نہیں ملتا۔ البتہ اولاد سے اس کی محبت کا اتنا ثبوت ضرور ملتا ہے کہ وہ

بازار میں بھی انھیں ''لادے پھرتی ہے'' مزاج کی نہایت غلیظ اور گندہ، خیالات محدود اور پست، عادات خوفناک، خطرناک مگر شوہر کی بے حد وفادار، بے حد کمانے والی اور بے حد کھانے اُڑانے والی۔ سب سے بڑی خوبی یہ کہ جُوا بھی کھیلتی ہے۔ قویٰ اور جسم کے لحاظ سے نہایت معتدل بلکہ اکثر دُبلی پتلی، مگر سفر کی تکالیف برداشت کرنے میں وہ ہندستان کی ہر عوت سے زیادہ صابر، جری اور محنتی۔ اسی لیے جب یہ سفر کے لیے کسی ریلوے اسٹیشن پر نظر آتی ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے گویا بلوچیوں کا تمام قافلہ مع خیموں اور جلانے کی لکڑیوں کے اسی کے اوپر لاد دیا گیا ہے۔ چنانچہ اس کے سر پر موٹا بستر، اسی پر لکڑیوں کا گٹھا، کمر پر سامان کی موٹی سی پیٹی، ایک شانے پر بڑا سالڑکا اور دوسرے پر چھوٹا سا لڑکا لٹکا ہوا، ہاتھ میں طوطے یا تیتر کا پنجرہ ورنہ موٹا سا حقہ۔ پھر لطف یہ کہ اتنا ذخیرہ لے کر وہ اکثر بے ٹکٹ ریل پر سوار ہتی ہے۔ اس وقت ریلوں کے ہندستانی پولس والوں اور بڑے بڑے فیشن ایبل ٹکٹ کلکٹروں کی بدحواسی دیکھنے کے قابل ہوتی ہے۔ کوئی کہتا ہے: امان جانے بھی دو ان کم بختوں کو۔

کوئی کہتا ہے لاحول ولاقوۃ یہ مردود کدھر سے آ گئے۔

کوئی کہتا ہے اجی بند کر دو تھانے میں۔

اس وقت یہ بجلی کی طرح زبان چلاتی ہے۔ ٹکٹ کلکٹر اور پولس والوں کی پہلے خوب خوب خوشامد کرتی ہے، پھر خدا کا واسطہ دیتی ہے اور پھر وہ گالیاں جو ریلوے کے کسی ایک قانون میں بھی درج نہیں۔ اگر چہ بعض اوقات یہ بے ٹکٹ ہونے کے باعث تھانے تک جاتی ہے مگر نتیجہ یہی ہوتا ہے کہ بغیر جُرمانے کے پھر اسی شہر میں کودتی پھرتی ہے اور چند دن بعد اسی اسٹیشن سے بے ٹکٹ سوار ہوجاتی ہے اور کہتے یوں ہیں کہ ریلوے کمپنیوں میں پولس کا بھی انتظام ہے۔ جاہلِ محض، صورت کی نہایت بھونڈی، لباس میں ایک پنڈلیوں سے اونچا لہنگا، موٹا سا کرتا، لمبی لمبی آستینیں، سر پر بجائے دوپٹہ کے ایک چھوٹا سا ہاتھ کا رومال۔ خاص بات یہ کہ دنیا کی تمام عورتوں سے کم زیور پہننے والی۔ بعض حالت میں غیر معتمد، باقی خیریت۔ یہ صرف ہندستان کے خانہ بدوش طبقہ کا حال ہے لیکن اکثر کے حالات نہایت بہتر اور روبہ ترقی ہیں۔

◆◆◆

مشاطہ بیوی

یعنی وہ عورت جو دولہا دُلہن والوں کی طرف سے شادی کے معاملات کو طے کرائے اور ایک دوسرے کو پیغامات پہنچائے۔ یہ لڑکی کو تلاش کرتی ہے۔اس کے جملہ حالات سے واقفیت حاصل کر کے دولہا والوں کو بتاتی ہے اور دولہا کے تمام حالات معلوم کر کے دُلہن والوں کو اطلاع دیتی ہے اور اس خدمت کا صلہ پاتی ہے۔

یہ بیوی کسی خاص خاندان اور قبیلے سے پیدا نہیں ہوتی بلکہ اکثر اوقات یہ افلاس، تنگدستی، بیوگی کی مصیبت اور کبھی کبھی بری صحبت اور مزاج کی آوارگی سے بنتی ہے۔ اِلّا بعض گھرانے ایسے ہیں جن میں یہ کام آبائی اور پیشے کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔اس کے خاندان کا جس طرح کوئی ٹھکانہ نہیں ہوتا اسی طرح اس کے شوہر کی کوئی خاص حیثیت نہیں ہوتی بلکہ اکثر حالات میں ایسی بیوی کا شوہر قمار باز، افیونی، چور اور نہیں تو کسی ذلیل برادری کا رُکن ہوتا ہے۔ چونکہ یہ خاندانی مشاطہ نہیں ہوتی بلکہ اپنے حالات کے لحاظ سے جب چاہتی ہے اور جس وقت چاہتی ہے مشاطگی کا پیشہ اختیار کر لیتی، اس لیے اس کی عام حالت بھی کسی نوعیت کی نہیں ہوتی۔ مثلاً اکثر یہ جاہلِ محض ہوتی ہے اور کہیں کہیں کسی قدر لکھی پڑھی بھی۔

مشاطہ اس عورت کو بھی کہتے ہیں جو دُلہن کو سنوارتی ہے، مگر یہاں مشاطہ سے مراد وہی

عورت ہے جو شادی کے پیغامات کو ادھر سے اُدھر لیے پھرتی ہے۔ اس کی ابتدائی زندگی کا پتہ نہیں چلتا بلکہ یہ جب سے اس پیشہ کو اختیار کر لے اسی وقت سے اس کے حالات سے بحث کی جا سکتی ہے۔ بہر حال اس کا تعلق عام زندگی اور ہر جماعت سے بہت طاقتور ہے۔ یہ سب سے پہلے نظر آتی ہے تو اس طرح کہ وہ جوانی سے گزر کر بوڑھی ہونے والے درجہ میں ہوتی ہے مگر مزاج اور زبان کی حد سے سوا تیز اور چالاک اور اسی لیے وہ زیادہ تعداد میں "خطرناک" ہوتی ہے، خواہ وہ کسی سن و سال کی ہو، مگر ہر حالت میں نہایت مکار، فریبی، جعل ساز اور لالچی حالانکہ اس کا پیشہ زبردست راز داری اور اعتماد کا پیشہ ہے، مگر لالچ اور حرص کی قوت اس درجہ غالب ہوتی ہے کہ وہ کبھی کسی کی راز دار نہیں ہوتی یہ ضرورت کے وقت گھروں میں خود بلائی جاتی ہے لیکن وہ حصول مقصد کے لیے اکثر گھروں میں بے وجہ بھی جاتی رہتی ہے، اس لیے اس طرح گھروں میں بے وجہ جانے کے دو سبب ہوتے ہیں۔

اول یہ کہ وہ پتہ چلائے کہ اس گھر میں کسی لڑکی یا لڑکے کی شادی کی ضرورت تو نہیں ہے، اگر ہے تو وہ اس خدمت کے لیے حاضر ہے اور اگر فی الحال نہیں ہے تو آئندہ کی امید پر وہ اس گھر کے لوگوں سے تعلقات بڑھانا چاہتی ہے۔ غرض ان دونوں ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے وہ کم علم مردوں اور کم علم عورتوں کو عجیب عجیب قسم کے فریب دیتی ہے۔ کبھی اپنی خاندانی حیثیت کو بلند سے بلند کر کے دکھاتی ہے اور اس کے بعد اس خاندان کی فرضی تباہی کے فرضی واقعات سناتی ہے جس سے ثابت ہو کہ یہ عورت جس خاندان کی ہے وہ اب تباہ ہو چکا اور اسی تباہی کی وجہ سے اس بے چاری نے اب پیٹ بھرنے کے لیے یہ پیشہ اختیار کیا ہے۔ پھر پیشہ کے لحاظ سے وہ اپنی فرضی کامیابیاں سناتی ہے۔ مثلاً یہ کہ جی ہاں میں نے ہی ملا رموزی صاحب کی شادی ڈپٹی کلکٹر صاحب کی لڑکی سے کرائی ہے۔

بیوی کیا کہوں کہ اس میں کتنی مشکلوں کا سامنا کرنا پڑا مجھ کو۔

بات یہ تھی کہ وہ رموزی صاحب کہتے تھے کہ میں جتنا پڑھا لکھا ہوشیار اور نئے خیال کا ہوں اتنی ہی لکھی پڑی حسین خوبصورت اور نئے خیال کی بیوی بھی ہو۔

تو اب بہن ایسی لڑکی بس ڈپٹی صاحب ہی کی تھی مگر ڈپٹی صاحب کے خیالات بھی بہت

اونچے تھے وہ یہ چاہتے تھے کہ میں اپنی بیٹی کو دوں تو کسی مالدار کو تا کہ وہ عمر بھر سکھ اور آرام سے رہے میں نے جو عندیہ لیا تو لڑکی ملا صاحب سے خوش تھی مگر مشکل تھی تو بس اتنی کہ ڈپٹی صاحب راضی نہیں ہوتے تھے اور بہن آج کل تو ہر باپ اور ہر ماں کا خیال ہی بدل گیا ہے جو چاہتا ہے یہی چاہتا ہے کہ میری لڑکی کسی مالدار کو دی جائے اور اب نہ تو کوئی خاندان کو دیکھتا نہ علم کو پوچھتا۔ غرض قصہ کون کہے، بہن میں نے بھی رات اور دن ایک کر دیے آخر کار لڑکی کی ماں نے ڈپٹی صاحب کو راضی کر ہی لیا۔ اِدھر میں نے بھی موقع موقع سے ڈپٹی صاحب کو سمجھایا کہ آپ ہیں کہاں ذرا ہوشیاری سے کام کیجیے کیوں آپ کی لڑکی کی رغبت خود اسی طرف ہے، بس بہتر ہے کہ اب بسم اللہ کر دی جائے۔ خدا کا شکر ہے کہ کام ہو گیا۔ اور سچ پوچھو تو لڑکی کا نصیب جاگ گیا کیونکہ ماشاءاللہ جیسی وہ علم والی ہے ویسے ہی ملا رموزی صاحب۔ یہ جو میرے ہاتھوں میں سونے کے کڑے دیکھ رہی ہو یہ اُسی وقت تو ملا صاحب نے مجھے دیے تھے کیوں، بہن میں نے بھی ان کی مرضی کے موافق ہی لڑکی دلائی۔

مشاطہ بیوی کے مکر و فریب کا یہ نمونہ کوئی مبالغہ نہیں بلکہ اس کے اخلاق و کردار اور اعمال کا یہ نمونہ نہایت صحیح اور تاریخی ہے۔ چنانچہ مشہور سیرت نگار مصنف ''فسانۂ آزاد'' نے اس عورت کا جو نقشہ ''فسانۂ آزاد'' میں پیش کیا ہے وہ یہ ہے:

> ''شاہزادۂ قمر طلعت نے ایک روز چاہا کہ اپنے حرم کو جا کر دیکھیں تو اس کے لیے انھوں نے ''مشاطہ'' کو حکم دیا کہ وہ ایسی تدبیر کرے کہ کسی طرح ''حرم'' کو شاہزادہ جھروکے سے دیکھ سکے۔ اس خیال پر مشاطہ نے جو کچھ کیا وہ یہ تھا کہ:
>
> ''کل باتیں سن کر عرض کی کہ خداوند نعمت لونڈی کو اصلاً عذر نہیں مگر اس طرح پر عرض کرنا ان کے خلاف گزرے گا۔ میں بات بنا کر کسی عمدہ پیرائے میں عرض کروں گی حضور یہ تو نہیں ہو سکتا کہ وہ حضور کو صورت دکھائیں، دُلہن کہیں ایسی بے شرم ہو سکتی ہے''۔
>
> یہ کہہ کر مشاطہ روانہ ہوئی اور اپنی منہ بولی بہن سے جا کر صلاح لی۔
>
> مشاطہ:۔۔۔ آج سنجر سطوت نے بلوایا تھا، ہمیں تو کچھ ہونے جھطے سے معلوم ہوتے

ہیں، وہ بے تکی باتیں کہ توبہ بھلی، اور ہم ہاں میں ہاں ملانے کے سوا اور کہیں تو کیا کہیں؟ مجھے ایک دوپٹہ دیا، خاصا بھاری دوپٹہ اور پانچ روپیہ ملے اور کہا کہ تم بڑی بیگم کے گھر جاؤ، سپہر آرا سے ملو اور کہو حضور کی سواری ادھر سے نکلے گی جھروکہ سے ہم کو دیکھیں۔

نواب جان:—اے ہے، کہیں سڑن نہ بنتا بہن بھلا کوئی بات بھی ہے واہ منہ کے آگے ناک سوجھے کیا خاک، گدّی میں عقل ہے کیا۔

مشاطہ:—بہن میں چپ چاپ سنتی رہی کاٹا تو لہو بدن میں نہیں۔

نواب جان:—اوئی وارے مردوئے اور پھر شاہزادے کھاتے ہیں اور یہ عقل کی مار، ان سے تو ایسے ویسے مردوئے ہی بھلے۔

مشاطہ:—بہن دوپٹہ ہضم نہ ہونے کا، جاکے شام کو آ ئیں بائیں شائیں بتادیں گے، ان کی سواری اُدھر سے نکلے گی بس کی خدمت گار سے کہہ دوں گی وہ اُنگلی اٹھادے گا، بس دیکھیں یا نہ دیکھیں ہم کو اس سے کیا؟

نواب جان:—اے تم جاکے خوب بناؤ، دل کھول کے روپیہ لوتو ان کے سر پر جنون سوار ہے، کیا دور کی سوجھی، سودائی پن کی باتیں۔

مشاطہ:—اور جب تک میں بیٹھی رہی تب تک برابر اپنی بڑائی کی اور پاکی جتائی، سنتے سنتے عاجز ہوگئی، اف توبہ۔

نواب جان:— نہیں، بہن یہ نہ کہو، بڑائی میں کچھ شک بھی ہے اولادِ شاہ ہیں کہ نہیں کیا کچھ ایسے ویسے ہیں شہزادے کی باتیں؟

اب شام کو کوئی پانچ بجے کے وقت مشاطہ نے شہزادے کے حضور جا کر آداب عرض کیا اور کہا حضور کُل باتیں پکی پوڑھی کر آئی ہوں، بس حضور کے سوار ہونے کی دیر ہے، سب معاملہ لیس ہے''۔

(فسانۂ آزاد' جلد سوم، صفحہ:699-698)

یہ ہے ایک مختصر سا نمونہ اس بیوی کے اخلاق و کردار کا جو ملک کے ایک مسلم الثبوت،

ماہرنفسیات نے آج سے بہت پہلے پیش کیا تھا۔ الغرض یہ ایسی ہی مکاریوں اور چالاکیوں سے جب کسی گھر سے پیغام لے کر جاتی ہے تو پہلے اسی گھر سے بسم اللہ کرتی ہے یعنی پیغام لے جاتے وقت وہ مختلف قسم کی دعائیں اور برکتیں چاہتی ہے۔ بہتر سے بہتر الفاظ اور کامیابی کے جملے ادا کر کے اپنا حق طلب کرتی ہے۔ اِدھر کم علم اور جاہل عورتیں پیغام کی مسرت اور خوشی سے اس درجہ مست ہوتی ہیں کہ یہ جو مانگتی ہے وہ دیتی ہیں۔

پھر جس گھر میں وہ پیغام لے جاتی ہے وہاں بھی اس کی مکاری اور عیاری کے عجب عجب نمونے نظر آتے ہیں۔ وہ کہتی ہے کہ:

— بہن! کیا لڑکا خدا نے آپ کو دیا ہے؟

— ایسا فرماں بردار۔

— ایسا حسین، جوان۔

— ایسا لائق، قابل۔

— ایسا دین کا پکا

— ایسا مزاج کا غریب۔

— اور میری تو گود کا کھلایا ہوا ہے۔ میں تو اس کی ایک ایک رگ سے واقف ہوں۔ کیا مجال جو ماں باپ کے سامنے نظر اٹھا کر تو بات کر لے۔

— بڑے بڑوں میں اس کی بات ہے۔

— سارا شہر جانتا ہے اسے کہ کیسا نیک اور صالح جوان ہے؟

— بس خدا مبارک کرے۔

— آپ کہیں گے تو وہ آپ ہی کا عمر بھر ہو کر رہے گا۔

— آپ کہیں گے تو وہ اپنی پوری تنخواہ بچی کے نام لکھ دے گا۔

— آپ کہیں گے تو وہ ملازمت تک کو لڑکی کے مہر میں لکھ دے گا۔

— آپ کہیں گے تو وہ علاحدہ مکان لے کر رہے گا۔

— اور ویسے بھی وہ آپ ہی کی اولاد ہو گا۔

— اگر لڑکے والوں میں لڑکی کی تعریف کرے گی تو کہے گی:

بہن! خدا مبارک کرے لڑکی کیا ہے، حور کی بچی ہے اور چاند کا ٹکڑا۔ گھر کا اجالا ہوگی۔ لکھی پڑھی اور کیسی سلیقہ والی کہ سبحان اللہ ہزاروں میں ایک، کشیدہ وہ جانے، ہزار قسم کے کھانے پکانا وہ جانے، دستکاری میں وہ طاق، چھوٹے بڑوں کے قاعدے وہ جانے، کام میں ایسی تیز کہ سو مہمانوں کی میزبانی کرے، مگر نہ گھبرائے۔ ماں باپ کی خدمت گزار، نمازی پرہیزگار اور پھر کیسی پیاری اور شرمیلی کہ سبحان اللہ۔

اب اگر خدانخواستہ اس کے ذریعہ سے کام کا آغاز ہوجائے تو پھر خدا کی پناہ۔ جہاں ایک آدھ رسم یا تقریب ہوئی اور اسے معاملے کا طے ہوجانے کا یقین آ گیا کہ بس اب، وہ ہے اور پورے خاندان پر اس کی حکومت۔ اب وہ جو چاہتی ہے کہتی ہے اور جو چاہتی ہے لیتی ہے اور اس لیے کہ جاہل اور کم علم لوگ اس کی عیاری اور مکاری کو توڑ کی صلاحیت نہیں رکھتے ورنہ ایک اپنے ملا رموزی صاحب کی مشاطہ بھی تھیں جنھوں نے منگنی کے بعد ہی ملا رموزی صاحب کی منطق اور قانونی جرم سے جو توبہ کی تھی تو پھر ولیمہ کے دن ہی بے غیرت بن کر خود ہی تشریف لائی تھیں، اس پر بھی ملا رموزی صاحب کے خوف سے عورتوں ہی میں بیٹھ کر جو تشریف لے گئی ہیں تو اب کبھی کبار راستے میں مل جاتی ہیں تو آڑی ترچھی دعائیں دے کر جلد راستہ اختیار فرماتی ہیں۔

مگر جاہل اور رسم پرست گھروں میں معاملہ شروع ہوجانے پر وہ جس درجہ نخوت، غرور، اکڑ، بہانے، حیلے اور مکر سے کام لیتی ہے شاید ہی کوئی دوسری عورت اس کا مقابلہ کر سکے یہاں تک کہ اب وہ بات بات پر ناراض ہوکر اپنے گھر چلی جاتی ہے اور کم علم لڑکے یا لڑکی کے والد صاحب اور والدہ صاحبہ اس کی خوشامدیں کرتے پھرتے ہیں، مگر وہ ہوتی ہے کہ بغیر روپیہ کے قابو ہی میں نہیں آتی۔

اس کے تمام نخرے اور غرور کا سبب اصل میں شادی بیاہ والوں کی جہالت اور بری اور غلط رسموں کی پابندی ہے۔ مثلاً بعض جاہلانہ رسمیں ایسی ہیں جن کا ادا کرنا اسی عورت کا فرض قرار دے دیا گیا ہے۔ حالانکہ نہ شریعت اور مذہب میں اس عورت کا کوئی ذکر ہے نہ اس کی رسموں کا کوئی حکم، مگر جاہل عورتوں نے اس عورت کے حقوق کو اتنا زیادہ اونچا اور ضروری بنا دیا ہے کہ شادی کے

وقت ان عورتوں کے شوہر تک اس کی خوشامد کرتے پھرتے ہیں۔

دوسرا سبب اس کے نخرے کا یہ ہے کہ چونکہ ہر گھر میں بغیر پولس کی اجازت اور بغیر روشنی کے جس وقت چاہتی ہے چلی جاتی ہے۔اسی لیے ہماری آپ کی خالص جاہل عورتیں اس سے ڈرتی ہیں کہ یہ کہیں کسی دوسرے گھر میں جا کر ہماری اور ہمارے خاندان کی برائی نہ کرے جس سے ہم اور ہمارا خاندان بدنام ہوگا اور کچھ شک نہیں کہ یہ عورت ایسا ہی کرتی ہے۔البتہ اسے اس کے منشا کے موافق روپیہ، زیور اور کپڑوں کے ساتھ ساتھ عمدہ کھانا دیتے جایئے تو پھر ہر گھر میں جا کر کہتی ہے کہ میں نے ملا رموزی صاحب کے خاندان کے برابر شریف خاندان ہی نہیں دیکھا۔ بہن ایسے شریف لوگ ہیں کہ آپ سے کیا کہوں۔ یہ دیکھیے آج مجھے بے ضرورت ہی ملا صاحب کی والدہ نے دس روپیہ کا نوٹ دے دیا۔

اگر چہ دوسرے گھروں میں جا کر یہ جو تعریف کرتی ہے وہ بھی اس لیے کہ اس گھر کے لوگ بھی اسے انعامات دیں۔ یہی حال شادی کے موقع پر ہوتا ہے۔ وہ اسی گھر میں خوشی سے کام کرتی ہے جس گھر سے اسے بہت کچھ ملا ہو۔

شادی کے موقع پر یہ نہایت شاندار بنی رہتی ہے۔ بہترین لباس اور بہترین زیور پہن کر آتی ہے اور اپنی ہر چیز کو کسی رئیس کا دیا ہوا انعام بتاتی ہے تا کہ دوسری عورتیں متاثر ہوں۔خود اس کی شادی کے حالات اس لیے صحیح نہیں بتائے جا سکتے کہ وہ کبھی شادی سے پہلے ہی خاندانی مشاطہ ہوتی ہے اور کبھی وہ اپنی شادی کے بعد اس پیشہ کو اختیار کرتی ہے۔البتہ اس کے شوہر کے حالات ہر حالت میں یہ ہوتے ہیں کہ وہ عام طور پر جاہل ہوتا ہے، اسی لیے کسی بی۔اے پاس مرد کی بی۔اے پاس عورت کو مشاطہ نہ پایئے گا۔شوہر اکثر حالات میں اسی کی کمائی پر گزارہ کرتا ہے اور اسی لیے یہ ہمیشہ اپنے شوہر پر غالب اور حاوی رہتی ہے اور شوہر صاحب بھی اس کے مقابلہ میں ہمیشہ کہا کرتے ہیں کہ:

— بس بس تو اب چپ ہو جا۔

— اری نیک بخت جو تیرا جی چاہے وہ کر میں کب منع کرتا ہوں کہ تو ملا رموزی صاحب کا کام نہ کر۔

— اچھا اچھا تو اب سن لیا، اب نہ کہوں گا۔

یہ خاصی دولت مند ہوتی ہے اور مزاج کی ہمیشہ لالچی مگر بخیل۔ شوہر کے حق میں مصیبت بھی اور آرم دہ بھی۔ مصیبت تو اس لیے کہ کبھی شوہر کے کہے پر عمل نہیں کرتی اور آزاد رہتی ہے اور راحت و آرام اس لیے کہ ہمیشہ خود کماتی ہے اور شوہر کو کھلاتی ہے۔ اس کے ہاں اولاد بہت کم ہوتی ہے اور اکثر کے ہاں تو کچھ بھی نہیں اور بالکل ہی نہیں۔

امورِ خانہ داری اور گھر کی صفائی میں نہایت طاق، دین کے مسائل سے یکسر بے خبر، غلط اور جاہلانہ رسوم کی استاد۔ اس کی قربت اور صحبت سے کم عمر اور کم سمجھ بلکہ ہر قسم کی عورت ذات کو بچانا چاہیے۔ فقط۔

◆◆◆

منشی بیوی

اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس شخص کی بیوی جسے اردو میں ''منشی جی'' اور انگریزی میں ''کلرک'' کہتے ہیں بلکہ اس سے وہی بیوی صاحبہ دام اقبالہا مراد ہیں جو یا تو خود ''از حد جاہل ہوں'' بے حد جاہل ہوں اور بہت ہی ''بالکل جاہل ہوں'' یا قطعاً بالکل ہوں یا حد سے سوا بالکل ہوں، مگر شوہر صاحب لکھے پڑھوں میں دم مارتے ہوں یا پھر شوہر صاحب تو نرے کندۂ ناتراش ہوں، مطلق ہوں، از حد مطلق ہوں، بیحد مطلق ہوں، مگر بیوی صاحبہ ہل ہل کر ''نور نامہ''، ''شہادت نامہ'' اور ''میلاد شریف'' کی کتابیں پڑھ لیتی ہوں مگر لکھنے کے معاملہ میں کوری دھری ہوں اور جب کوئی دریافت کرے کہ کیوں بہن یہ کیا ہے تو بڑے نخرے سے کہیں کہ ہمارے ہاں عورتوں کا لکھنا برا سمجھا جاتا ہے اور دل میں مارے شرم وندامت کے پانی پانی ہو جائے۔ لطیفہ یہ ہے کہ اس قسم کی ''نصف تعلیم یافتہ'' بیوی ہندستانیوں کے بلند گھرانوں میں بھی نظر آتی ہے۔

بدقسمتی سے اس کا شوہر بھی ملازمانی ذہنیت کا مارا ہوا ہوتا ہے اور اس کے خیالات میں بلندی، وسعت، روشنی، جدت، ندرت، خوش ذوقی اور انقلاب پسندی نہیں ہوتی، اس لیے معاشرت اور معاش کا معاملہ بھی درجۂ سوم ہی رہتا ہے۔

اس کی تربیت نہایت تاریک اصول کے ساتھ ہوتی ہے۔ اگر چہ خاندان لکھا پڑھا مشہور ہوتا

ہے۔ والد صاحب کے منشی صاحب ہونے سے تمام محلّہ انھیں جھک کر سلام کرتا ہے، مگر جہاں یہ پانچ برس سے اوپر کی طرف چلی اور اسے پڑھنے بٹھایا گیا، اس موقع پر "بقدر جہالت" روپیہ برباد کرنے والی رسمیں ادا کی جاتی ہیں اور نام یہ ہوتا ہے کہ مذہبی تعلیم کا آغاز ہو رہا ہے۔ کچھ شک نہیں کہ کسی مذہبی تعلیم کے آغاز پر اظہارِ مسرت کرنا ہر طرح قابلِ تعریف کام ہے مگر نہ اس طرح جس طرح کہ اس قوم اور اس طبقے میں دیکھا جاتا ہے کیونکہ اس موقع پر اظہارِ مسرت کا مقصد اصل مقصد کی حیثیت سے نہیں بلکہ اپنی خاندانی اور مالی حیثیت کے موافق پورا کیا جاتا ہے ورنہ آپ ہی بتائیے کہ ایسی تعلیم کے موقع پر یہ تمام دنیا کے ننھے میاں کے والد تو خیر بلائے ہی جاتے ہیں مگر یہ دس بارہ محلے کے ننھے میاں کی "والداؤں" کا بلانا فضول نہیں تو اور کیا ہے۔ پھر لطف یہ کہ پلاؤ، زردے کے ساتھ ساتھ کبھی ملّا رموزی صاحب کی نظر بچا کر "گانا بھی ہوتا ہے"۔

اب جو تعلیم کا آغاز ہو گیا تو بس اس طرح کہ والدہ کو فرصت ملی تو انھوں نے دو حرف بتا دیے اور والد صاحب بیٹھے تو دو چار سطریں انھوں نے پڑھا دیں۔ چلیے اولاد کی تعلیم شروع ہو گئی۔ اب یہ ہے کہ کتاب کے نام سے رونا شروع کر دیتی ہے۔ کبھی والدہ مارے محبت کے چھٹی دے دیتی ہیں اور کبھی والد صاحب کتاب طاق پر رکھ کر اسے پیار کرنے اور پیسے دینے میں مصروف ہو جاتے ہیں اور جو بڑی مستعدی سے یہ پڑھنے ہی بیٹھی تو اس طرح کہ کتاب کہیں اور خود کہیں۔ اسی طرح پڑھانے والی والدہ صاحبہ چولھے کے پاس اور یہ دالان میں، اب یہ دالان میں بیٹھی پڑھ رہی ہے اس طرح کہ دماغ اور دھیان صحن اور کھیل کی طرف اور آنکھیں اور انگلی کتاب پر اور پڑھانے والی والدہ صاحبہ ہیں کہ چولھے کے پاس سے فرما رہی ہیں:

— اری اندھی پیش نہیں زبر ہے زبر۔
— پھر کہہ ذرا چلّا کر۔
— تو آواز تو حلق سے نکال۔
— ٹھہر جا ذرا آنے دے تیرے باوا کو۔
— خدا تجھے غارت کرے بے ایمان دس مرتبہ بتا چکی ہوں مگر جب پڑھتی ہے غلط۔
— ہاں دیکھوں تو اب کی تو غلط پڑھ۔

— دیکھ ایسی پھکنی پھینک کر ماروں گی کہ بدذات کا منہ ٹوٹ جائے گا۔

— اری او بے غیرت انگلی تو رکھ۔

— ہے ہے خدا تیرا کالا منہ کرے خدا کے کلام کو بھی اس بے ادبی سے رکھے بیٹھی ہے۔

— اری اندھی تو کتاب پر کیوں اوندھی پڑی ہوئی ہے۔

— دیکھ پھر زبر پڑھا تو نے اور میں بتا رہی ہوں کہ اسے دس مرتبہ چلا چلا کر پڑھ۔

— بس اب آگئی موت، اب آواز تھوڑا ہی نکلنے کی تیرے منہ سے۔

— اچھا ہاں سن رہی ہوں، پھر کہہ اُسی کو۔

— دیکھ دیکھ، پھر آئی شامت تیری، ذرا اب کی تو کہہ۔

— کیا کہوں میری روٹی جل جائے گی ورنہ ابھی آکر بتاتی تجھ کو۔

— اچھا لا تو میرے پاس۔

— ہاں اب اندھی یہ تیرا باوا زبر ہے یا پیش؟

اس موقع پر صاحبزادی کے کان توڑے جاتے ہیں، طمانچے مارے جاتے ہیں اور جو بہت زیادہ قابو سے باہر ہوئیں تو ایک آدھ لکڑی بھی ماردی مگر اس زور سے کہ لکڑی کو خود شرم آجائے مگر صاحبزادی کے چوٹ نہ آئے۔ اِدھر صاحبزادی کے جہاں طمانچہ رسید ہوا کہ انھوں نے کتاب ہی کو بستر بنا کر اس پر لوٹنا اور ہاتھ پاؤں مارنا جو شروع کیا تو اب نہ وہ اپنی والدہ کے کہے سے چپ ہوں نہ ملّا رموزی صاحب کی بیوی کے سمجھانے سے آخر کار اس قسم کی تعلیم کا خلاصہ والدہ نے یوں کر کے رکھ دیا کہ دو چار مرتبہ کہا کہ:

— اچھا تو اب چپ نہ ہوگی تو۔

— تو پھر اٹھوں اور بتاؤں تجھے۔

— اُفوہ ری مکّار، ابھی تو میں نے تجھے ایک ہی طمانچہ مارا ہے۔

— اچھا تو نہ پڑھے گی تُو۔

— اچھا تو آج تو خوب جی بھر کر رو ہی لے۔

— دیکھوں تو کب تک روتی ہے تُو۔

— مجھے بھی امّاں نہیں لونڈی کہنا اگر آج مار مار کر دم نہ لے لوں تیرا۔

— سمجھ رہی ہوں، سمجھ رہی ہوں۔

— دیکھ اگر خدا کی قسم کتاب پھاڑی ہے تو نے تو مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔

— میں تو جب تک خوب پکا نہ سن لوں گی، تجھے ایک منٹ کو نہ چھوڑوں گی۔

— آنے تو دے ذرا آج اُن کو۔

— بہت سر اٹھایا ہے تو نے۔

اب اگر اس گھر میں خدانخواستہ موجود ہوئیں دادی صاحبہ تو مار پڑتے ہی یوں قابو سے باہر کہ:

— چل رہنے دے آئی کہیں کی مارنے والی۔

— پڑھایا بھی تھا کبھی اولاد کو۔

— لا اِدھر لا میرے پاس کتاب۔

— بس خبردار جواب کچھ کہا ہے بچی سے۔

— ہمیں نہیں چاہیے ایسی تعلیم۔

— بھلا دیکھنا یوں بھی کہیں مارتے ہیں بچوں کو۔

— اور جو خدانخواستہ ذرا اوپر کو لگ جاتی تو بچی کی آنکھ پھوٹ جاتی۔

— بس رہنے دو دُلہن ہم نے بھی بچے پڑھائے ہیں۔

— ہاں تو تمھارے ہاں ایسا ہی پڑھایا جاتا ہوگا۔

— بس تو کہہ دیا نا کہ ہماری بچی بے علم ہی اچھی، ایسے پڑھانے سے۔

— توبہ بیوی، کیا برا مارا ہے اونہہ دیکھنا اب تک اس کا گال سرخ ہو رہا ہے۔

اتنے میں کہیں والد صاحب گھر میں آ گئے تو بیٹی نے دیکھتے ہی پھر ٹھسکنا شروع کیا اور دادی صاحبہ نے یوں سنبھال لیا کہ:

— دیکھو میاں اولاد تو تمھاری ہے تم چاہے اسے ذبح کر ڈالو مگر میں اس قسم کا قصائی پن نہیں دیکھ سکتی۔

— اُفّو ہ یہ آج دُلہن نے اسے پڑھایا ہے کہ اچھا خاصا اس سے بدلہ لیا ہے، اونہہ دیکھوتو ذرا اس کی آنکھ، وہ پڑی ہے پھلکنی جس سے بیوی صاحبہ نے اس معصوم کو مارا ہے۔ بھلا سوچو تو بیٹے اگر ذرا اوپر کو پڑ جاتی تو آنکھ باہر نکل آتی کہ نہیں۔
— اور ہم تو شروع سے کہہ رہے ہیں کہ ہمارے خاندان میں بیٹیوں کو اتنا نہیں پڑھاتے بس پڑھ لیا اس نے جو کچھ اس کی قسمت میں تھا۔
— ہاں جب تک وہ اللہ رسول کی باتوں سے ناواقف تھی ہم خود اس کے پڑھنے میں سختی کرتے تھے اور جو میاں تمھیں اسے ایسا ہی ''مغلانی بنانا ہے'' تو خدا کے واسطے تم اسے اپنے ہی ساتھ کچہری لے جایا کرو ورنہ یہ تمھاری بیوی دیکھ لینا کسی دن اس کا گلا گھونٹ کر رکھ دیگی۔
— اے بیوی توبہ میری کیا بری طرح پڑھاتی ہیں کہ دیکھنے والے کا دل ہل جائے۔
— بھلا ابھی بچی کی عمر دیکھو اور اس کے ساتھ بیوی کا یوں کشتی لڑنا دیکھو۔ خیر میاں تمھاری اولاد پر ہمارا کیا زور، مگر ہاں اتنا ضرور کہیں گے کہ ہم سے تو ایسا پڑھنا پڑھانا نہیں دیکھا جاتا۔
— اچھا تو یہ کرونا کہ وہ سامنے مُغلانی رہتی ہیں دن کو ان کے گھر بھیج دیا کرو اور رات کو تم پڑھادیا کرو۔

اب جو والد صاحب نے اپنی ذاتی والدہ کا یہ وعظ سنا تو اٹھتے ہی بیوی کو یوں جھنبوڑ ڈالا کہ:

— کیوں جی یہ کیا فرما رہی ہیں اماں بی؟
— تو یوں پڑھایا جاتا ہے بچوں کو؟
— ارے بھئی تو چھوڑ دیا ہوتا تم نے اس کو میں آ کر پڑھا دیتا۔
— اچھا تو جب اماں بی روک رہی تھیں تم کو تب تو تمھیں خیال کرنا چاہیے تھا۔
— اچھا تو تمھارے پاس اس کا کیا جواب ہے کہ اگر خدانخواستہ اس کی آنکھ پھوٹ جاتی؟
— بالکل غلط، میں کبھی نہیں مانوں گا، اس بات کو۔
— کیسے ہوسکتا ہے۔

— اچھا اچھا میں نے کہہ دیا کہ اب لڑکی کی طرف پڑھانے کا خیال بھی نہ کرنا تم، بس میں کل سے مغلانی بی کے سپرد کیے دیتا ہوں۔

اب جو "مغلانی بی" کے گھر تشریف لے گئیں تو صاحبزادی کے عوض صاحبزادہ بن گئیں۔ وہ پڑھنا وڑھنا تو رہا مغلانی بی کے پاس، اب صاحبزادی ہیں اور مغلانی بی کے گھر بھر کا کام۔ اب مغلانی بی ہیں کہ محلے کی دس بارہ لونڈیوں کو گھیرے بیٹھی ہیں اور پڑھانے کا وہ زور شور کہ جو اس کے گھر کے پاس سے گزرے وہ سن لے کہ ہاں مغلانی بڑی محنت سے پڑھا رہی ہیں، مگر گھر کے اندر یہ حال کہ دس لڑکیاں تو چیخ چیخ کر یوں پڑھ رہی ہیں کہ ایک کا پڑھا دوسری یاد کر لے اور تیسری کا چوتھی نہ اس کا پڑھا ہوا یاد نہ اس کا۔ اور پانچ لڑکیاں ہیں کہ مغلانی بی کے گھر کے کاروبار میں مصروف ہیں۔ کوئی ہے کہ برتن صاف کر رہی ہے اور کوئی جھاڑو کے فرض کو ادا کرنے میں مصروف ہے۔ کوئی چولھے کے پاس سے چلا رہی ہے کہ:

— مغلانی بی دیکھیے یہ پانی خوب جوش کھانے لگا اب ڈال دوں اس میں آلو۔

— اور نمک تو بتائیے کہاں رکھا ہے؟

— یہ دیکھیے یہ نصیبن ہمیں آپ کے پاس سے بیٹھی زبان دکھا رہی ہے۔

اب جو ان فرائض اور خدمات سے نجات ملی تو یا تو چھٹی کا وقت آ گیا یا مغلانی بی نے سبق یوں پڑھا کر رکھ دیا کہ اس کے سبق کو اسی کے ساتھ چلا چلا کر پڑھنا شروع کر دیا جسے آدھا لڑکی نے سمجھا اور آدھا خود مغلانی کو یاد رہا کہ چھٹی مل گئی۔ بڑی مہربانی فرمائی تو کہہ دیا:

— دیکھو کل بہت صبح آنا۔

— یہ آج کا سبق کچا ہے تیرا، کل اگر یاد کر کے نہ لائی تو تُو جان۔

غرض اس تمام تعلیم کا خلاصہ اتنا نکلا کہ "نورنامہ" حفظ یاد ہو گیا۔ عبادت کے چند قاعدے رٹ لیے۔ آڑی ترچھی سلائی سیکھ لی، مونگ کی دال سے لے کر جو حد سے سوا ترقی کی تو دھواں ملا ہوا پلاؤ پکانا سیکھ گئیں اور اولاد کی تربیت، پرورش، حفظ صحت اور امورِ خانہ داری اور شوہری فرائض کا پڑھانا تو شادی سے پہلے اس طبقے کے ہر ملّا رموزی کے نزدیک شرمناک اور معیوب بات ہے۔ اسی لیے یہاں تک پہنچی تھیں کہ شادی کا معاملہ چھڑ گیا۔ اب اگر یہ معاملہ دس برس میں بھی طے ہو تو

لڑکی تعلیم کے نام سے ایک کتاب کو بھی ہاتھ نہیں لگا سکتی۔

شادی جو شروع ہوئی تو الامان والحفیظ۔ یعنی جہاں اسے اطلاع ملی کہ اس کی شادی کا ابھی پیغام آنا تو دور گھر ہی میں اس کے ماں باپ تذکرہ کر رہے تھے کہ اب وہ دین سے بھی گئی اور دنیا سے بھی۔ یعنی اب وہ اپنے اوپر اس درجہ زبردست شرم وحجاب سوار کر لے گی کہ جہاں گھر میں کسی نے کسی کے کان کے قریب منہ لگا کر بات کی کہ یہ بھاگی اور گھر کے کسی تاریک حصے میں جا کر یوں بند ہوگئی کہ جب تک اسے یہ یقین نہ آجائے کہ ہاں یہ لوگ اس کی شادی کا تذکرہ نہیں کر رہے، اس وقت تک وہ کبھی باہر نہ آئے گی اور جو خدانخواستہ اس کے گھر میں پیغام لانے والی کوئی عورت آجائے تو اب اگر یہ عورت دن بھر بیٹھی رہے تو یہ بھی مارے حجاب کے دن بھر کسی تاریک کوٹھری یا تاریک کمرے میں جا کر بند ہو جائے گی۔ پھر لطف یہ کہ اس کے اس حماقت اور جہالت کے حجاب کو اس کی والدہ صاحبہ، بہن صاحبہ، دادی صاحبہ، نانی صاحبہ، چچی صاحبہ، پھوپھی صاحبہ، غرض دنیا کی ہر صاحبہ اس کی قابلِ تعریف لیاقت سمجھیں گی چاہے اس حرکت سے وہ پسینے میں نہا جائے یا زور کی کھانسی کو روکتے روکتے اس کے گلے کی تمام رگیں پھول کر ٹوٹ بھی جائیں مگر وہ کبھی باہر نہ آئے گی اور پیغام والی عورت کے سامنے آنا تو انگریزوں کے سامنے آنے کے برابر ہے۔ اب پیغامات اور معاملات کا سلسلہ جو شروع ہوا تو اسے آخر وقت تک بھی یہ نہ بتایا جائے گا کہ تیرا شوہر اس نام کا ہے۔ اس عمر کا، اس تنخواہ کا، اس صورت کا، اس خاندان کا، اس شہر کا، اس مزاج کا، اس آمدنی کا، اس لیاقت کا اور اس چلن کا۔

اسی طرح اس کے شوہر سے بھی نہ کہا جائے گا کہ ''اللہ اور دولہا بندے'' سن کہ تیری آنے والی بیوی اس خاندان کی ہے۔ اس قابلیت کی، اس عمر کی، اس مزاج کی اور سب سے بڑی بات یہ کہ ہمیں پسند ہے، اس لیے اٹھ اور دولہا بن کر تو بھی پسند کر ورنہ جدھر تیرے سینگ سمائیں جا اور اپنی شادی آپ کرلا، پھر نہ تجھے ہم سے کوئی علاقہ اور نہ ہمیں تجھ نالائق بیٹے سے۔

اس موقع پر اس بیوی کا حجاب ''قدرتی کہا جاتا ہے'' اور کچھ شک نہیں کے ایک حد تک ایسا ہی ہے مگر نہ اتنا جتنا کہ کہا جاتا ہے۔ اسی لیے بعض ''بجلی کی بنی ہوئی لڑکی'' اسی زمانے میں اپنے گھر کے کمسن بچوں یا اپنی بے تکلف سہیلیوں کے ذریعے اپنے والے شوہر کے حالات کو اڑتے اڑتے

دریافت کرتی رہتی ہے۔ یہی حال اس موقع پر امورِ خانہ داری اور شوہری فرائض کے سمجھانے کا ہوتا ہے کہ یا تو اس کی کم تجربہ اور بے علم سہیلیاں اسے کچھ بتائیں یا رشتہ کی کوئی غیر ذمہ دار اور محلہ کی عورت جو چاہے سمجھادے۔ یہ نہیں کہ شوہر کے ذوق، اس کے صحیح مزاج اور جملہ امور سے کوئی اسے خبردار کرے۔

اس کی بارات سے خدا بچائے کیونکہ ہونے والے شوہر بھی لکھے پڑھے ہوتے ہیں، اس لیے کیا مجال جو شادی کی کوئی ایک جاہلانہ رسم تو ادا ہونے سے باقی رہ جائے۔ وہ تو بس نہیں چلتا ورنہ وہ اپنی بارات میں ملا رموزی صاحب تک کے گانے ناچنے کا انتظام کر گزریں۔ غرض ہزار قسم کی بجلی کی روشنی، باجوں، گھوڑوں، ہاتھیوں، رنڈیوں، باغ بہاریوں، آتش بازیوں، جوڑوں، خوانوں، مٹھائیوں، زیوروں، ہاروں، پھولوں، عطروں اور جو علی گڑھ کے ہوئے تو سگریٹوں اور سگاروں کے ساتھ جتنے ملے اتنے آدمیوں کے ساتھ جو گھر سے روانہ ہوئے تو صرف اتنا کہنے میں آیا کہ وہ چلی ملا رموزی کی بارات۔

رات بھر دلہن کے گھر باجوں، رنڈیوں، قوالیوں اور بے شمار جاہلانہ رسوم کا ہنگامہ رہا۔ صبح جو ہوئی تو سسر صاحب نے بھی خزانے کے دس بارہ منہ کھول دیے۔ اب آنے دیجیے محلے والوں اور بارات والوں کے سامنے پلاؤ، زردہ، قورمہ، مزعفر، شیر مال، فیرنی، کباب، بریان، بورانی یا پھر میٹھے چاول، گوشت مانڈے ورنہ بیٹی دی تو سب کچھ دے دیا۔ رخصتی کے وقت جہیز میں برتنوں پر برتن، کپڑوں پر کپڑے، صندوقوں پر صندوق ہیں کہ دیے جا رہے ہیں۔ وہ تو قاعدہ ہی نہیں ورنہ یہ دلہن کے ''باوا لوگ'' تو ملا رموزیوں پر ملا رموزی بھی جہیز میں دیتے چلے جائیں اور نہ گھبرائیں۔ پھر لطف یہ کہ اتنا دینے پر بھی سسر صاحب باراتیوں کے سامنے ہاتھ جوڑ کر روتے ہیں کہ میں کسی لائق نہیں ہوں، جو کچھ مجھ غریب سے ہو سکا وہ پیش کر دیا۔ اس پر باراتی لوگ بھی ٹھنڈی سانس لے کر کہتے ہیں کہ ماشاءاللہ صاحب خوب دیا آپ نے اور پھر جب بیٹی دی تو اور کیا چاہیے؟

اب جو یہ ''نور نامے'' اور ''شہادت نامہ'' تک کی تعلیم پائی ہوئی بیوی صاحبہ دولہا میاں کے گھر آئیں تو ان پر دولہا میاں بھی صدقے اور دولہا میاں کے والد صاحب بھی نثار اور سب سے زیادہ شہرہ یہ کہ ماشاءاللہ ''لڑکی پڑھی لکھی ہے''۔

17

اب کوئی ایک مہینے تک یہ بیوی نہ گھر کے کام سے ہاتھ لگائے گی، نہ کسی سے زور سے بات کرے گی، بس اب یہ ہوگی اور فرضی شرم وحجاب۔ جب دیکھیے کسی کونے میں ''ریشم کی گٹھری'' بنی ہوئی بیٹھی ہے۔ اب اسے جس کام کی ضرورت ہوگی اس کے لیے اس کی ساس اور اس کی نند اس کی امداد کرے گی۔ یہ ایک مہینے سے بھی زیادہ اپنے منہ پر اتنا لمبا گھونگھٹ کیے رہے گی یا لٹکائے رہے گی یا ڈالے رہے گی کہ اسے نہ پوری زمین نظر آئے گی نہ آسمان، بس ایک جگہ بیٹھی رہے گی تو وہ بھی اس طرح کہ گھونگھٹ کے اندر سے شوہر کو دیکھتی جائے گی اور ملا رموزی صاحب کی بیوی کو بھی۔ اگر بات کرے گی تو اس قدر بیمار لہجے کے ساتھ گویا کچھ دن سے وہ بات کرنا بھول گئی تھی اور اب پھر سے بات کرنا شروع کر رہی ہے۔ یہ اکثر دولہا کے گھر کے بچوں کے ذریعہ گفتگو بھی کرتی ہے اور انہی سے کام بھی لیتی ہے۔ سسر اور ساس کے سامنے یوں رہتی ہے جیسے ہم اور آپ انگریزوں اور دیسی افسروں کے سامنے۔

اب جہاں یہ دولہا کے گھر آئی کہ پھر اس کے دیکھنے کے لیے اس محلے کی، اس دولہا کے رشتے کی، اس کے دوستوں کی غرض دنیا کی عورتیں جن سے تعارف کی رسم اس بیوی کی ساس صاحبہ یوں ادا کرتی ہیں کہ آنے والی عورت کو دُلہن کی طرف سے خود سلام کرتی ہیں یہ کہہ کر:

— بہن دُلہن آپ کو سلام کرتی ہے۔

اور جو لکھنؤ کی طرف کی ہوئیں تو یوں کہہ دیا کہ:

— دُلہن آپ کو آداب عرض کرتی ہے۔

یہ کہا اور پھر اس عورت سے یوں سلسلۂ کلام جاری فرمادیا کہ:

— ہاں بہن تمھیں بھی بہو مبارک ہو۔ بے شک خدا کا احسان اور آپ بہنوں کی دعا مجھ بدنصیب نے آج بیٹے کی بہو کو دیکھا۔

— کیا کہوں بہن میں نے اس شادی میں کیا کچھ کیا۔

— بس کیا کہوں آپ سے مگر ہاں خدا دیکھنے والا ہے کہ میرا پورا بیس کم چار سو روپیہ خرچ ہوگیا۔

— خیر خدا بچے کے گھر کو آباد رکھے اور اسے ہر بلا سے بچائے۔ زندہ ہے تو انشاءاللہ کمالے گا

پھر۔

— بہن خدا کا بڑا فضل یہ ہوا کہ میری زندگی میں اس کا گھر آباد ہو گیا، ورنہ آپ کو تو معلوم ہے کہ اُس سال میں کیسی سخت بیمار ہوئی تھی اور کیا آپ کہہ سکتی تھیں کہ میں پھر سے زندگی پاؤں گی؟ خدا کی قسم وہ دہلی والے حکیم صاحب تک جواب دے چلے تھے مگر اس کی خدائی کے صدقے کہ اس نے مجھے اِس دن کے لیے بچالیا اور ابھی تو میرا ارادہ نہیں تھا مگر وہ تو کہو کہ خدا کا حکم ہو چکا تھا۔

— دل میں ضرور تھی میرے کہ خدا جلد ملّا رموزی کا گھر آباد کرے، مگر کہیں کوئی خیال نہیں تھا۔ خیر جس گھرانے سے لائی ہوں اللہ کا شکر ہے اسے شہر بھر جانتا ہے کیسے شریف لوگ کہ سبحان اللہ میں کہتی ہوں نا آپ سے کہ ان لوگوں نے میرے ساتھ کوئی شرط نہیں کی اور میرے جاتے ہی کہہ دیا کہ ''بوا'' لڑکی بھی آپ کی ہے اور ہم بھی آپ کے۔ اگر شربت کا آدھا گلاس بھی لے کر آؤ گی تو ہم اپنی بچی کو آپ کے حوالے کر دیں گے۔ بس اُن کی اس شرافت پر میں نے ملّا رموزی سے کہہ دیا کہ بیٹا اگر میری رضامندی چاہتے ہو تو اب چھوڑ دو رئیسوں کی اولاد سے شادی کا خیال اور اسی جگہ کو قبول کر لو۔

— خدا اس کی ہزار سال کی عمر کرے کہ اس نے میرے اس کہے پر چوں بھی نہ کی اور اُلٹا یہ کہا کہ اماں جان اگر آپ فرمائیں تو میں بھنگی کی بیٹی تک سے راضی ہوں۔

— اب بہن اتنی آرزو ہے کہ خدا ملّا رموزی کی اولاد اور دکھا دے۔

اب جو یہ بیوی دو چار مہینے کے بعد حجابی زندگی سے باہر آئیں تو پھر خدا کی پناہ۔ کیونکہ آخر وہ بھی ''نور نامہ'' پڑھ کر آئی ہیں، اس لیے اب صبح بھی ساس سے لڑائی اور شام بھی۔ کبھی نند سے الجھی ہوئی ہیں تو کبھی پھوپھی ساس سے اور ہوتے ہوتے وہ لیجیے وہ آج شوہر سے بھی چھڑ گئی اور جو اِن حالات سے گزر کر صاحبِ اولاد ہو گئیں تو اب نہ وہ کوتوال صاحب کے اختیار کی نہ قاضی صاحب کے بس کی۔

بچے کی پیدائش سے پھر کوئی سوا تین مہینے تک وہ نزاکت وہ نزاکت کہ محلّہ بھر پریشان۔ ادھر بچہ پیدا ہوتے ہی آنے دیجیے دُلہن کے ماں باپ کو، دُلہن کے چچا چچی کو، دُلہن کے نانا نانی،

دُلہن کے خالو، خالہ اور دُلہن کے ماموں ممانی کو اور ہونے دیجیے اب عقیقوں پر عقیقے اور بسم اللہ پر بسم اللہ۔ خدا جانے کتنی رسمیں ہوں گی کہ ادا ہوتی ہی چلی جائیں گی اور شوہر بے چارہ ہوگا کہ آج ڈپٹی صاحب سے دس روپیہ قرض لا رہا ہے تو کل تھانیدار صاحب سے، مگر دولہا دُلہن کے ماں باپ ہوں گے کہ رسوم اور جاہلانہ تقاریب کا تار نہ توڑیں گے۔

اور 99 فیصدی تو ایسے طبقات کے تازہ شوہر اپنی پہلی ہی اولاد پر کچھ اس درجہ بھی بے اختیار ہو جاتے ہیں کہ وہ ان کے نرم و گرم دیکھے ہوئے ماں باپ بھی ایک طرف اور ان کے سرد و تر دیکھے ہوئے ساس سسر بھی ایک طرف۔ جب دیکھیے دوستوں کے بغیر ان کے دریافت کیے ہوئے خود ہی کہہ رہے ہیں کہ:

— کیا کہوں بھائی صاحب جب سے بچہ پیدا ہوا ہے میری طبیعت ہی بدل گئی ہے۔
— واللہ اب دفتر میں میرا دل ہی نہیں لگتا۔
— سچ کہتے ہیں کہ اولاد بُری بلا ہے۔
— اب تو بھئی اس کے عقیقے کی فکر ہے۔
— کیونکہ میں ہرگز اس معاملہ میں تاخیر کرنا مناسب نہیں سمجھتا۔
— خیر خدا مالک ہے۔ ڈھائی سو آدمیوں کے کھانے کا بندوبست تو کر لیا ہے۔
— ہاں ہاں بھئی کھلاؤں گا مٹھائی آپ کو بھی۔
— مگر ذرا دعا کیجیے کہ وہ میری قرض کی جو درخواست کل ڈپٹی صاحب نے آگے بڑھائی ہے وہ منظور ہو جائے کیونکہ وہ جمنا لال مہاجن نے تو عین وقت پر روپیہ دینے سے انکار کر دیا ہے اور ویسے بھی میں قرض تو لے ہی نہیں سکتا۔
— آپ دیکھ رہے ہیں کہ اس مرتبہ بھی اُس لال کافر نے میرا اضافہ روک دیا تو اب جب تنخواہ چالیس سے پچاس نہیں ہوتی تو بتایئے کہ میں یہ نیا قرضہ کہاں سے ادا کروں گا، مگر بھئی آخر کار پہلا بچہ ہے۔ اگر کچھ نہیں کرتے ہیں تو کل آپ ہی کہیں گے اور نام رکھیں گے۔
— ایمان سے آپ سے کہتا ہوں کہ ابھی شادی کے زمانے ہی کا قرض ادا نہیں ہوا ہے وہ تو

کہیے کہ وہ ملا رموزی حد سے سوا شریف آدمی ہے کہ بے چارے کے سو روپیہ آج تک ادا نہیں کر سکا، مگر خدا کی قسم جب ملتا ہے منہ سے اُف نہیں کہتا اور اگر خود میں کبھی کہہ دیتا ہوں کہ ملا صاحب معاف کیجیے کہ میں ابھی تک آپ کا روپیہ نہ دے سکا تو قرآن کی قسم الٹا غریب شرمندہ ہوتا ہے اور کہتا ہے کہ برادر مجھے آپ کیوں نادم کر دیتے ہیں۔

— میں تو کہتا ہوں کہ اگر کوئی دوسرا ملا رموزی کی جگہ ہوتا تو اب تک کبھی کا عدالت کے ذریعہ وصول کر چکا ہوتا۔ خیر تو اب میں نے جمعہ کا دن عقیقہ رکھا ہے۔ کیوں ٹھیک ہے نا؟

— کیوں بھئی اتوار کی چھٹی میں تو لوگوں کو ہزار کام ہوتے ہیں۔ اِدھر جب سے یہ بے ایمان افسر ملا ہے، بس کیا کہیں کہ کس قسم کا خبیث انسان ہے، اس سے تو انگریز افسر ہی اچھا تھا۔

— اماں کچھ دیسی افسروں میں یہ مرض ہی ہوتا ہے کہ جہاں خدا نے انھیں افسری کی کرسی دی اور وہ پاجامے سے باہر ہوئے۔ حالانکہ بھائی صاحب قوم کے بُلا ہے ہیں مگر ماتحتوں سے جس نخرے سے پیش آتے ہیں، آپ دیکھ رہے ہیں۔

— خیر چولھے میں جانے دیجیے۔ اب تو یہ فرمائیے کہ آپ ٹھیک چار بجے پہنچ جائیں گے عقیقے میں؟

— دیکھو بھئی تمھارا ہی بچہ ہے اور اس کی پہلی تقریب ہے اور ہاں یہ تو فرمائیے کہ وہ بھابی جان کو بھی بھیجیے گا یا نہیں؟ واللہ والدہ نے بہت اصرار سے فرمایا تھا ان کے لیے۔

بس اب ہونے دیجیے عقیقہ اور جاہلانہ رسوم کا آغاز۔ عقیقے کے دن یہ ''نور نامہ'' پڑھی ہوئی بیوی صاحبہ از سرِ نو دلہن کے کپڑے، دلہن کے زیور اور دلہن ایسے نخرے فرماتی ہیں اور اپنے لاڈلے کو بڑی تمکنت سے سنبھالے پھرتی ہیں۔ محفل میں جو آتی ہے اسے اپنے بچے کو دیتی ہیں اور دبی زبان سے اس کی نئی حرکتوں کی تعریف بھی کرتی جاتی ہیں۔

غرض ان کا بس نہیں چلتا ورنہ یہ اپنے شوہر تک کو نیلام فرما کر اپنی اولاد پر قربان فرما دیں۔ اس کے بعد یوں تو خدا اولاد سبھی کو عطا فرماتا ہے مگر اس کے ہاں کی اولاد کی مقدار دوسرے تمام لکھے پڑھے طبقات سے زیادہ ہوتی ہے، اس لیے بس خدا اسے کسی محفل کا اذن نہ پہنچائے۔

اماں غضب خدا کہ اگر محلے میں کسی کے ہاں جمائی لینے اور انگڑائی لینے تک کی کوئی چھوٹی موٹی تقریب ہے تو یہ جائے گی اور اگر کوئی بڑی تقریب ہے تب تو اس کی شرکت کا قانون ہی نرالا ہوگا۔ وہ شرکت سے کوئی ایک مہینہ پہلے اپنے شوہر سے کہنا شروع کر دیتی ہے:

— سبحان اللہ! کیا خوب فرمایا آپ نے۔ اچھا تو کیوں نہ جاؤں میں ان کے ہاں؟

— اور وہ جو میرے بچے کی تقریب میں دو روپیہ خرچ کر گئی ہیں۔

— آخر دنیا میں جو بیٹھی ہوں تو مجھے بھی کسی کے احسان کا بدلہ ''اتارنا ہے'' کہ نہیں؟

— اچھا تو اگر میری چیز مہاجن کے ہاں رکھ کر کچھ لاتے ہو تو پھر اس کے چھڑانے کی کیا صورت ہوگی؟

— ہاں مگر مجھے تو اس لیے بھروسہ نہیں کہ وہ جو اُس مہینے کے دس روپیہ وکیل صاحب کی بیوی کے دینا ہے مجھ کو۔

— کیا کہا؟

— ماشاءاللہ!

— اے ذرا سوچو ایسے غافل نہ بنو۔ اچھا وہ یاد ہے جب آپ اپنے ملا رموزی صاحب کے ساتھ لاہور جا رہے تھے، اس وقت میں نے کھڑکی میں سے جا کر ''وکیلنی صاحب'' سے لا کر دیے تھے اور وہ آپ کے ہاتھ میں اس وقت ملا رموزی صاحب کی کوئی کتاب بھی تھی، اور خود آپ ہی نے کہا تھا کہ جاؤ میرا نام لے کر ''وکیلنی صاحبہ'' سے لا دو، میں لاہور سے لاتے ہی دے دوں گا۔

— خیر اب، کچھ بھی ہو مجھے تو ان کی تقریب میں جا کر ان کا بدلہ کرنا ہے۔ اب چاہے آپ میری چیز رکھ کر لائیں یا گھر بیچ دیں۔

— اور اچھا جب آپ میرے کنگن لے جا رہے ہیں تو پھر میں پہن کر کیا جاؤں گی؟

— خدا کی قسم مجھے تو اپنی اتنی پروا نہیں مگر یہ دیکھو یہ ننھے کے پاس نہ تو کوئی قمیص نئی ہے اور نہ ٹوپی اور وہ رقیہ کے پاس تو چیتھڑا بھی نہیں۔

— کیا میرا کیا نام تو آپ ہی کا بدنام ہوگا۔

اب اگر لا دیے ان کے ملاّ رموزی صاحب نے دو چار نئے کپڑے تو پھر دیکھیے کہ ہر وقت بیوی صاحبہ دالان کے بیچ میں انھیں پھیلائے دن بھر یوں سی رہی ہیں کہ جو آتی ہے اس سے نہایت بے پروا لہجے میں فرماتی ہیں:

— کیا کہوں آپا میرے تو ہاتھ ٹوٹ گئے سیتے سیتے۔ ادھر گھر کا کام کروں کہ روزانہ ایک جوڑا سی کر تیار کروں۔

— ضرورت کیا، اے وہی ملاّ رموزی صاحب کے لڑکے کے عقیقے میں جانا ہے اور ان بے چاروں نے ایک مہینہ پہلے سے کہہ رکھا ہے ان سے کہ دیکھو بھئی اگر تمھارے گھر کے لوگ شریک نہ ہوئے میرے بچے کی تقریب میں تو پھر مجھ سے برا کوئی نہیں، اور حق یہ ہے کہ آپا ملاّ صاحب بھی میرے بچوں پر فدا ہیں۔ بے چارے جب آتے ہیں تو پہلے تمھارے اس شریر بنے ہی کو آواز دیتے ہیں۔ اِدھر ان کی بیوی ہیں کہ مجھے بہن کہہ کر بولتی ہیں اور ایسی شریف ہیں بے چاری کہ میں نے تو اس عمر کی لڑکیوں میں ایسی ملنسار بیوی آج تک نہیں دیکھی۔

— تو اب وہ لوگ جب مجھے اتنا چاہتے ہیں تو آپ ہی بتائیے آپا بی کہ میں کس طرح ان کی تقریب میں نہ جاؤں اور کوئی بہانہ کر دوں؟

اب جو یہ آپ کے تقریب والے گھر میں داخل ہو گئی تو سمجھ لیجیے کہ آپ کے گھر میں ایک ''بجلی کا انجن'' آ گیا۔ کیا مجال جواب اس کی زبان بند رہے یا یہ کسی جگہ چین سے بیٹھی رہے۔ جو سامنے آتا ہے اس سے کچھ نہ کچھ کہہ گزرتی ہے اور جو کام دیجیے اسے دوڑ دوڑ کر کرتی ہے۔ اگر کوئی کام نہ بتائیے تو یہ خود آ کر گھر کی عورتوں کے ہاتھ سے کام چھین لے گی۔ اسے دوسروں کے گھر جا کر کھانا پکانے کا مرض تو لاحق ہوتا ہی ہے مگر تقریب کے گھر میں وہ گانے اور کبھی کبھی ناچنے سے بھی نہیں چوکتی۔ بس جہاں محفل کی ایک آدھ بوڑھی عورت نے اس کے کسی کام کی تعریف کر دی کہ اب یہ قابو میں کہاں۔ گود میں بچہ بھی دبا ہوا ہے مگر کام کر رہی ہے۔ موقع پر رنڈی کو بھی جھانک لیتی ہے۔ اب اس عرصہ میں اگر آپ اس کے ذاتی گھر میں اس کے شوہر کے پاس چلے جائیں تو ایسا معلوم ہوگا گویا اس کے گھر میں ڈاکہ ڈالا گیا ہے۔ ہر چیز بے تکی صورت سے پڑی ہوگی، جو برتن

جس حال میں چھوڑ گئی ہے وہ اسی طرح پڑا ہوگا۔ اب جو آپ پہنچیں گے تو اس کے شوہر صاحب بڑی بے پروامزاجی کے ساتھ فرمائیں گے کہ بھئی تم خود ڈھونڈ لو پاندان، خدا جانے وہ کدھر رکھ گئی ہیں؟ کہاں وہی پیش کار صاحب کے بچے کے عقیقے میں گئی ہیں۔

اب شادی سے آئیں تو پھر وہی چولھا چکّی۔

مزاج کی کافی تیز۔ ایک حد تک سلیقہ مند، عیش پسند، حریص، مفلس، اولاد کی عاشق مگر اصولِ پرورش سے کافی حد تک بے خبر۔ گھر کی بوڑھی عورتیں اس کے بچوں کی ڈاکٹر ہوتی ہیں۔ شوہر سے ڈرنے والی ساس سے لڑنے والی، سسرال سے زیادہ میکے میں رہنے سے خوش۔

ایسی بیوی سے ''منشی جی قسم کے شوہر'' ہمیں آپ کو دکھانے کے لیے کبھی کبھی کوئی چیز پرچہ لکھ کر طلب فرماتے ہیں تاکہ ہم آپ قائل ہو جائیں اور دل میں کہیں کہ اوہ ان ملاّ رموزی صاحب کی بیوی تو لکھی پڑھی بھی ہیں۔

بیوی صاحبہ کو کبھی کبھی جو دوپہر کے وقت فرصت ملتی ہے تو کوئی گرد آلود ''نور نامہ'' جھاڑ کر پڑھنے بیٹھ جاتی ہے، مگر اس طرح کہ خود ہی پڑھیں اور خود ہی سمجھیں مگر دیکھنے والا یہ دیکھ لے کہ ہاں بیوی کتاب بھی پڑھ لیتی ہیں۔ فقط۔

◆◆◆

عالم بیوی

لکھے پڑھے طبقے میں اس کا رتبہ دوسرے نمبر کا ہے یعنی یہ ''منشی بیوی'' سے ایک گز آگے ہوتی ہے۔ پیدائش کے وقت اچھی خاصی بلکہ زیادہ اچھی خاصی دھوم دھام سے کام لیا جاتا ہے۔ پرورش کے معاملات میں اس پر کافی رقم خرچ کی جاتی ہے۔

عقیقے اور دوسری ابتدائی رسوم کے موقع پر مارے دھوم دھام کے محلے کو سر پر اٹھالیا جاتا ہے۔ بہت زیادہ اہتمام اور ''شاندار طریقوں'' سے پرورش ہوتی ہے۔ ''شاندار طریقوں سے'' مطلب یہ کہ اصل پرورش اور صحت کے قاعدوں کی اتنی پابندی نہیں ہوتی جتنی کہ رسم اور نمود و نمائش کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ مثلاً اس کی خدمت کے لیے ملازمہ تو رکھی جاتی ہے مگر ملازمہ کے اندر یہ نہیں دیکھا جاتا ہے کہ وہ اصولِ حفظِ صحت سے باضابطہ یا بے ضابطہ طور پر واقف ہے یا نہیں بلکہ مقصد صرف بچی کو کھلانے والی سے ہے خواہ وہ کتنی ہی غلط کار، میلی اور جاہلِ محض ہو۔

اس کی ابتدائی تقاریب میں بھی تمام باتیں ''شاندار'' ہوتی ہیں اور ہوشیار ہوتے ہی ''تعلیم یافتہ'' بنانے کا کام شروع ہو جاتا ہے، جس کے لیے یا کوئی ''مغلانی'' ملازم رکھی جاتی ہے یا پھر کوئی ''کھوسٹ مولوی صاحب''۔ لڑکی ہونے کے حجاب سے ''مولوی صاحب کا کھوسٹ ہونا'' ضروری قرار دیا گیا ہے۔ مولوی صاحب یا مغلانی بی خود اس کے گھر پر حاضر ہو کر ابتدائی کتابیں اور مذہبی

امور کی تعلیم دیتے ہیں۔ چونکہ لڑکی ہوتی ہے 1931 کی بنی ہوئی اور مولوی صاحب 308 قبل مسیح کے زمانے کے بنائے ہوئے لہٰذا ایسیوں کی تعلیم جیسی ہوسکتی ہے ظاہر ہے۔ مولوی صاحب تشریف لائے کہ ''لونڈیا'' آن بان کے ساتھ کپڑے پہنے کتابیں دبائے کمرہ میں آئیں، بہت جھک کر جو سلام کیا تو سب خوش ہوگئے کہ ماشاءاللہ بچی ہے بڑی تہذیب والی۔ والد صاحب نے دیکھا تو دل میں کہا کہ مولوی صاحب نہایت عمدہ پڑھانے والے ہیں۔ اب جو تعلیم شروع ہوئی تو اس سے کوئی بحث نہیں کہ مولوی صاحب لڑکی کے ذہن و دماغ کو پہچان کر اور اس کی ذہنی استعداد کے موافق پڑھا رہے ہیں یا خود لڑکی سے پڑھ رہے ہیں؟ البتہ پڑھانے کا شور اتنا ہوتا ہے کہ تمام محلّہ سن لے کہ وہ دیکھو سلیمان خاں صاحب کی بچی کو ملّا رموزی صاحب پڑھا رہے ہیں۔ پرانے دستور تعلیم کے موافق مولوی صاحب نے چلّا چلّا کر بتانا شروع کیا اور لڑکی نے چلّا کر پڑھنا شروع کر دیا۔ اگر پڑھانے سے پہلے مولوی صاحب کو اس گھر سے چائے، پراٹھے اور انڈے یا حلوا وغیرہ کھانے کو مل جاتا ہے تب تو خیر ورنہ درمیان میں جس جگہ اور جتنے منٹ، تک مولوی صاحب چاہیں اونگھ سکتے ہیں اور لڑکی پڑھتے پڑھتے رونا شروع کر سکتی ہے۔ دنیا مان چکی ہے کہ بچے کا مارتے مارتے جب تک سر نہ توڑ دیا جائے اس کے اندر استاد کا خوف اور یاد کرنے کا جوش پیدا نہیں ہوتا، اسی لیے کھوسٹ مولوی صاحب اس لڑکی کو مارنے کے لیے اپنا لٹھ اور طمانچہ پورے جوش سے اٹھاتے تو ہیں مگر لڑکی کے مالدار والد صاحب کے ڈر سے پھر رکھ دیتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ناز ونخرے سے پلی ہوئی لڑکی جب چاہتی ہے چھٹانک ڈھائی چھٹانک رونا خرچ کر کے وقت سے پہلے چھٹی طلب کرتی ہے اور مولوی صاحب مارے خوف کے کہہ دیتے ہیں کہ ''اچھا بھائی جا چھٹی ہے مگر دیکھ کل کو آموختہ بھی یاد سن لوں''۔

اس قسم کی تعلیم کا سلسلہ رہتا ہے کوئی پانچ سات برس کی عمر تک۔ اس کے بعد اسے اسکول بھیجا جاتا ہے اور یہ اسکول میں تعلیم کے لیے جہاں پہلے دن گئی اور محلے میں تعریف شروع ہوئی کہ ماشاءاللہ بھئی لڑکیوں میں لڑکی ملّا رموزی صاحب کی لڑکی، دیکھو تو کس محنت اور شوق سے اسکول پڑھنے جاتی ہے۔

اب اسکول جانے کے بعد ماں باپ کو سب سے زیادہ فکر اس بات کی لاحق ہوتی ہے کہ

لڑکی کا لباس ہر حال میں اس لیے ''قیمتی'' اور ''شاندار'' رہے کہ وہ آخر کار اسکول میں پڑھتی ہے جہاں بڑے بڑے لوگوں کی لڑکیاں تعلیم پاتی ہیں۔ اس لیے آج کل کے مروجہ کالے رنگ کے جوتے اور موزے ضرور دیے جاتے ہیں۔ اب یہ لڑکی کی رضامندی پر موقوف ہے کہ وہ اسکول کا کام اپنے ماں باپ کو روزانہ دکھائے یا نہ دکھائے کیونکہ والدین کو یہ اطمینان کافی ہے کہ ''اسکول میں تو پڑھتی ہے''۔

ظاہر ہے کہ تعلیم کا صحیح منشا یہ ہے کہ سب سے پہلے انسان اُن علوم کو مکمل طور پر حاصل کرے جنھیں وہ ''تعلیم'' کہتا ہے، اس کے بعد ان پر جتنا ہو سکے عمل کرے۔ یہ تعلیم کی اتنی صحیح تعریف ہے کہ اس میں کوئی کمی بیشی کسی طرح ہو ہی نہیں سکتی اور جب کوئی انسان اس تعریف کے بالکل موافق عمل کرے گا اسی وقت اسے ''تعلیم یافتہ'' کہہ سکتے ہیں لیکن اس تعریف کے مقابل اس بے چاری کی تعلیم اور تعلیم کے بعد اس کی زندگی کا جو رنگ ہوتا ہے وہ ملاحظہ ہو اور ملاحظہ کیا ہو بس یہ ہے کہ اگر حد سے سوا لیاقت دکھائی تو یہ کہ یکا یک خبر ملی کہ لڑکی کو اسکول سے اٹھا لیا گیا اور اس لیے اٹھا لیا گیا کہ مسلمان ہونے کی وجہ سے اب اس کی عمر پردے اور حجاب کے قابل ہو چکی یا شادی کے قابل یا ہندو ہونے کی وجہ سے اس لیے اٹھائی گئی کہ اب اس کے تعلیمی مصارف برداشت نہیں کیے جا سکتے اور اٹھائی بھی گئی تو ساتویں جماعت سے یا آٹھویں جماعت سے اور جب کسی صاحب نے اپنی تعلیمی عقلمندی سے حد سے سوا کام لے ہی لیا تو انٹرنس پاس کرا دیا اور اب خاندان تو خاندان شہر بھر کہتا پھرتا ہے کہ سبحان اللہ اُس لڑکی کا کیا کہنا وہ انٹرنس پاس ہے مگر کوئی نہیں سمجھتا کہ انٹرنس پاس ہونے سے اگر آدمی تعلیم یافتہ ہو جاتا تو پھر یہ ایم۔ اے تک پڑھنے کے خبط میں لوگ کیوں مبتلا ہوتے؟

واضح ہو کہ اس طبقے کی تمام لڑکیاں ہی آٹھویں اور نویں جماعت سے تعلیم نہیں چھوڑ دیتی ہیں، مگر ہاں زیادہ تعداد ایسی ہوتی ہے جو آٹھویں جماعت ہی سے ''فارغ الاسکول'' ہو جاتی ہیں اور ایسی ہی لڑکیوں سے ہم یہاں بحث کر رہے ہیں اور انھی کا نام ہم نے ''عالم بیوی'' رکھا ہے کیونکہ آٹھ دس سال تک درس گاہ کی زندگی سے اتنا احساس ضرور پیدا ہو جاتا ہے کہ ''میں لکھی پڑھی ہوں''۔

ماں باپ کا ماحول اور مشاغل بھی کافی حد تک علمی ہوتے ہیں اور آس پاس کے لوگ لکھے پڑھے، اس لیے آٹھویں جماعت سے ''پسپائی'' کے بعد اب اس کے ذہن کا جو عالم ہوتا ہے وہ یہ کہ اسکول سے وہ اعلیٰ درجہ کا لباس، پمپ جوتے، موزے، رِسٹ واچ، اخبار نہیں تو ماہوار رسالوں کے مطالعہ کا شوق اور کہیں کہیں مضمون نگاری کا حوصلہ لے کر آتی ہے اور کچھ شک نہیں کہ وہ گھر میں بھی ''کتب بینی'' میں کبھی کبھی مصروف نظر آتی ہے۔ گو اس کا خط حد سے سوا بھونڈا اور غلط املا والا ہوتا ہے مگر اتنا ضرور ہوتا ہے کہ وہ کسی کو چاہے اپنا مطلب لکھ کر بھی سمجھا سکے اور اسی لیے تو سمجھ لیا جاتا ہے کہ ''اب لڑکی ذات کے لیے اس سے سوا کیا چاہیے'' کوئی ملازمت تو اس سے کرانا نہیں ہے۔

اس کے بعد اس ادھورے پن کا دوسرا اثر یہ ہوتا ہے کہ لڑکی صبح و شام اپنے کو ہر معاملے میں تعلیم یافتہ سمجھتی ہے۔ جہاں اس کے سامنے اس کی کوئی سہیلی آئی یا کوئی غیر عورت کہ اس نے فوراً اپنا لہجہ بدلا اور خواہ مخواہ اس سے لکھنؤ والیوں کی طرح واللہ چنانچہ کے ساتھ گفتگو شروع کر دے گی۔ ہر فقرے کو حد سے سوا بلیغ، نا قابلِ فہم اور مشکل بنانے کی کوشش کرے گی۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ساری گفتگو مصنوعی، غلط اور اتنی مہمل ہو جاتی ہے کہ گھر ہی کے مرد اس کی اس ''بناوٹی گفتگو'' پر دل ہی دل میں تاؤ کھاتے ہیں، مگر وہ غریب اپنی کم علمی کے باعث سمجھتی ہے کہ میں جس سے مخاطب ہوں وہ میری علمی لیاقت سے بہت زیادہ دب رہی ہے۔ اس قسم والی کے لیے اس کے والد یا بھائی ایک دو رسالے بھی جاری کرا دیتے ہیں محض اس خیال سے کہ لڑکی کی علمی استعداد اور بڑھے گی۔ کچھ شک نہیں کہ رسالے پڑھنے سے اتنی تعلیم والی اور والا پڑھنے کی استعداد بڑھا سکتا ہے مگر مضامین کے علمی نکات سمجھنے کی اس میں ہرگز صلاحیت نہیں ہوتی۔ اسی لیے تو زیادہ تعداد میں ''فسانے'' اور ''ڈرامے'' پڑھے جاتے ہیں یا پھر غزلیں۔ البتہ اتنی تعلیم والی لڑکیوں میں جن کا ذوق شائستہ اور تربیت مکمل ہے وہ رسالوں سے ''امورِ خانہ داری'' اور قورمہ پکانے کے نسخے نقل کر کے رکھتی جاتی ہیں اور موقع پا کر ان کو استعمال کرتی ہیں۔

اتنی تعلیم سے وہ تکیوں، غلافوں، ہاتھوں کے رومالوں اور لفافوں پر عمدہ عمدہ پھول اور بیلیں بنانا سیکھ جاتی ہے۔ اور ہاں وہ زمین پر رکھ کر سینے والی سنگر کمپنی کی آدھی مشین بھی چلا سکتی ہے اور

موزے وغیرہ پر بھی پھول کاڑھ لیتی ہے اور ہاتھ کے ریشمی رومالوں پر ''نام کاڑھ لینا'' تو بہت زیادہ آجاتا ہے۔

اس کی شادی میں ''بہت زیادہ روشن خیالی'' صرف ہوتی ہے۔ اسی لیے پیغامات میں کہیں کہیں لڑکے کی تصویر طلب کی جاتی ہے۔ مصارف کی استعداد بھی برابر کی ہوتی ہے، اس لیے بارات میں تمام دنیا کے الہ آبادوں کی جانگی بائیاں ناچتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ باراتی بھی حد سے سوا سگریٹ نوش او بوٹ پوش ہوتے ہیں، مگر رسوم میں جاہلانہ آداب کو کافی دخل رہتا ہے اور بارات کے مرد کہتے یوں ہیں کہ: کیا عرض کروں ملا صاحب میں تو ان رسوم کو جہالت سمجھتا ہوں مگر یہ کمبخت عورتیں باز نہیں آتیں۔ مصارف کی کثرت کا یہ عالم ہوتا ہے کہ رخصتی کے بعد چاہو تو دلہن کے والد کو چار آنے میں نیلام کردو اور چاہو تو دولہا کے والد کو۔ کیونکہ اس قسم کی اولاد کا ولیمہ اور دعوت بغیر شامیانہ تانے اور باراتیوں سے انگریزی میں گفتگو کیے مکمل سمجھی ہی نہیں جاتی۔ ایک ایک آدمی کے لیے ہر چیز میں ''ڈبل حصہ'' استعمال ہوتا ہے۔ شادی کے پہلے ہی اذن کے لیے ''نول کشور پریس'' سے زیادہ عمدہ مطبع میں لفافے اور کارڈ چھپوائے جاتے ہیں مگر اذن کی عبارت پڑھ لیے تو وہی قالوا بلیٰ کے زمانے کی جس کی پیشانی پر یہ شعر ضرور ہوگا کہ:

گر قدم رنجہ کنی جانبِ کاشانۂ ما
رشکِ گلزار شود از قدمت خانۂ ما

بہت زیادہ ''خوش ذوقی'' فرمائی تو کوئی دوسرا شعر لکھ دیا یا پورا اذن ہی سیماب اکبر آبادی صاحب سے اُجرت دے کر نظم میں لکھوالیا۔ لطف کی بات یہ ہے کہ ایسے مہمل لفافوں کو بڑے لطف کے ساتھ پڑھا بھی جاتا ہے اور ملا رموزی کو یہ کہہ کر سنایا بھی جاتا ہے کہ ملا صاحب یہ کمال تو ملاحظہ ہو کہ پورا اذن نظم کردیا گیا۔

اس کی بارات میں ''مسٹر قسم کے لوگ'' زیادہ ہوتے ہیں، اس لیے موٹر کا استعمال بھی زیادہ ہوتا ہے۔ تقریباً 95 فیصدی باراتی انتہائی ''مسٹری انداز میں'' تشریف لاتے ہیں اور کیا کہیں کہ اس رات بھی بعض انگریزوں کی ٹوپی اوڑھ کر آتے ہیں اور منٹ منٹ پر پتلون کی جیب سے سگریٹ کیس نکالتے ہیں۔

اسی قسم کی بارات کے بعض دولہا بجائے گوٹے کناری کے کپڑوں کے نہایت ''صوفیانہ لباس'' پہن کر آتے ہیں اور اکثر بے چارے ایم۔ اے پاس ہوکر بھی دولہا بنتے وقت گوٹے کا عمامہ اور رنگین کپڑے پہنتے ہیں اور باتیں یوں بنادیتے ہیں کہ ''کیا کہوں مسٹر وہ والدہ صاحبہ نے میری ایک نہ سنی'' اس قسم کا دولہا روزانہ شائستہ اور مروجہ لباس میں نظر آتا ہے لہٰذا آج وہ دولہا کے لباس میں خاصا اُلّو نظر آتا ہے اور اسے دیکھ کر ملاّ رموزی ایسے دماغ کے لوگ اس کا مذاق اڑاتے ہیں، اسی لیے یہ بے چارہ بارات کی رات خاصا نادم اور پریشان رہتا ہے۔ غرض جملہ تقریبات میں حد سے سوا روپیہ برباد کیا جاتا ہے۔ اس قسم کی بیوی کی خاص پہچان یہ ہے کہ اس کے جہیز میں ''مسہری'' ضرور دی جاتی ہے اور رخصتی کے لیے زیادہ تعداد میں وہ لکھنؤ والے میرصاحب کی سواری والی فینس اور کہیں کہیں دُلہن کے لیے بھی موٹر اور دولہا کے لیے بھی موٹر۔ اس کی بارات میں جتنے ملاّ رموزیوں کی بیویاں آتی ہیں وہ سب کی سب دس دس سیر وزن کا زیور پہن کر اور بغیر شلوار کے تو وہ کسی بارات کا نام تک نہیں لیتی ہیں۔

اس کے اندر چونکہ آٹھویں جماعت کی تعلیم کی ''چمک'' ہوتی ہے لہٰذا شوہر کے ہاں یہ قدیم رسوم کی ذرا کم پابند رہتی ہے۔ اُدھر دولہا میاں بھی ''مسٹر'' ہونے کی وجہ سے بزرگوں سے لے کر ان کی ایک ایک رسم کو ''بے ہودہ'' کہتے ہیں اس لیے شادی کے بعد والی رسوم میں بہت کافی کمی واقع ہوجاتی ہے، مگر ولیمہ ضرور ٹھاٹھ کا ہوتا ہے۔

شادی کے بعد اس کے دماغ میں اپنے خاندان اور اسکول کے اثرات بہت زیادہ کام کرتے ہیں۔ یعنی خاندان کے ناز ونعم سے پالنے والے اور آزاد اور عیش پسند خیالات اور اسکول کے نیم تعلیمی تاثرات اسے اب نہ صحیح معنی کی بیوی ہونے دیتے نہ وہ بالکل خارج از ''بیویّت'' ہوتی۔ اُدھر شوہر بھی کسی اسکول یا کالج کے ''نیم'' ہی ہوتے ہیں، اس لیے نتیجے میں ابتدائی زمانے میں یہ دونوں خدا جانے کیا ہوتے ہیں اور جو کہیں خدانخواستہ دونوں ہوئے ''قدرے اخبار میں'' یا ''رسالہ میں'' یا فقط ''ناول میں'' تب ان دونوں سے مل ملا کر بالکل ہی عجیب قسم کے میاں بیوی پیدا ہوتے ہیں۔ چنانچہ ان دونوں کا زور سب سے پہلے ''زبانی بحث ومباحثے'' پر صرف ہوتا ہے۔ شوہر صاحب چاہتے ہیں کہ میں اپنی اس لکھی پڑھی بیوی پر اپنے فیشن اور اپنے سوٹ بوٹ کے

فوائداور اپنی ''مساوات نوازی کی'' دھاک بٹھادوں اور آٹھویں جماعت کی پڑھی ہوئی بیوی صاحبہ چاہتی ہیں کہ میں اپنے پمپ جوتے، شلوار، انگریزی تیل، کلائی کی گھڑی، موزے، تولیے، صابن سے منہ دھونے، پاؤڈر لگانے، چائے پکانے کے قاعدوں سے ثابت کردوں کہ میں دنیا میں سب سے قیمتی چیز ہوں، اس لیے مجھے بیوی کے عوض ''برابر کا دوست'' کیوں نہ تسلیم کیا جائے۔

امورِ خانہ داری پر اگر کبھی گفتگو شروع ہوگئی تو ان میں کا ہر ایک یہ ثابت کر دکھاتا ہے کہ اپنے خاندان کے یہ پرانے اور ''باسی بزرگ'' ہم ''تازہ بزرگوں'' کے امورِ خانہ داری کے کسی طرح بھی اہل نہیں۔ بیوی صاحبہ کوشش فرماتی ہیں کہ اپنی ''اُبال کھائی ہوئی ساس'' کے ہاتھ سے گھر کا تمام انتظام چھین کر اپنے قبضہ میں کرلوں اور پھر دکھادوں کہ میں نے جو آٹھویں جماعت تک پڑھا ہے تو دیکھو گھر کا کس درجہ بہتر انتظام کرسکتی ہوں۔

ایسی بیوی کی ابتدائی قوتیں اپنے اور شوہر کے کمرے کو حد سے سوا فیشن ایبل طریقے سے سجانے پر صرف ہوتی ہیں۔ اسی طرح شوہر صاحب بھی شروع میں روزانہ پاؤڈر، لونڈر، ریشمی رومال، چائے کے برتن، تولیے، نئے نئے صابن اور تصویریں زیادہ خرید کر لاتے ہیں۔ گفتگو میں بھی ''آپ''، ''جناب'' اور ''واللہ، چنانچہ'' کا بہت زیادہ استعمال ہوتا ہے۔ گفتگو کے معمولی سے معمولی سلسلہ کے بالکل ہی شروع میں بڑے بڑے علمی حوالے، تاریخی واقعات اور بے موقع فقرے اور جملے استعمال ہوتے ہیں۔ کیونکہ دونوں کو اپنی اپنی ''علمی لیاقت'' کے ثابت کرنے کا شوق ہوتا ہے اور یہی پہچان ہے ان دونوں کے ادھورا ہونے کی۔ جب دیکھیے دونوں میں مباحثہ ہو رہا ہے۔ معاملہ ہے چولھے چکی کا مگر حوالے دیے جا رہے ہیں ملٹن، شیکسپیئر اور ملا رموزی کی کتابوں اور باتوں کے اور اسی لیے کبھی کبھی ان کے کمرہ میں ''ہارمونیم باجہ'' بھی بجتا ہوا سنائی دیتا ہے ورنہ چوڑی کا باجہ تو ہر صورت میں موجود ہے۔ اس بیوی کی ابتدائی ''کارستانی'' یا ''کارگزاری'' یہ ہوتی ہے کہ وہ تمام قوت اپنی صورت اور لباس کو حسین بنانے پر صرف کرتی ہے۔ اس کے بعد ہر معمولی سے کام میں بادشاہوں کے برابر تکلف کرتی ہے۔ اگر اسے معلوم ہوجائے کہ شوہر سے ملاقات کے لیے ملا رموزی صاحب آئے ہیں تو پھر دیکھیے اس کے پان اور سگریٹ بھیجنے کے تکلفات۔ اسی طرح اگر اس کا تازہ شوہر کبھی چند خاص دوستوں کو مختصر سی دعوت دے

دے تو پھر دیکھیے کھانا اور کھانا کھلانے میں اس کے تکلفات۔ غرض وہ ہر صورت سے اس بات کی کوشش کرے گی کہ میرے شوہر کے دوست مجھے اسکول کی تعلیم یافتہ بیوی تسلیم کرلیں حالانکہ باہر بیٹھے ہوئے دوست اُن کے انہی تکلفات سے اسے ''ادھورا''، ''ناتجربہ کار'' اور ''بے وزن'' عورت سمجھ کر اس کا اس کے ''شوہر سمیت'' مذاق اڑاتے ہیں کیونکہ ذی عقل اور باوقار بیوی کی تعریف یہ ہے کہ اس کے ہر کام میں سادگی، وزن، بردباری اور فطری اصول موجود ہیں۔ یہ سلیقہ نہیں ہے کہ شوہر کے دوستوں کے لیے نئے نئے رنگ کے علاحدہ علاحدہ دس وضع کے گلاسوں میں شربت بھیجا جا رہا ہے یا شوہر کے پانوں کے ڈبّے کے کپڑے پر بیوی کے ہاتھ کا کشیدہ مع نام کے موجود ہے، جس سے سمجھا جائے کہ بیوی صاحبہ بڑی ہی صاحبِ کمال ہیں۔ چائے بھیجی جائے تو اتنے بھی اونچے تکلف سے کہ عقلمند آدمی فوراً سمجھ جائے کہ بیوی صاحبہ اپنی مالداری کا اظہار فرما رہی ہیں۔ بالآخر چند دن کے بعد ساس سسر کے انتقال فرما جانے پر اگر اسے گھر کا انتظام مل گیا تو سمجھ لیجیے کہ اب وہ مارے جدید قاعدوں کے شوہر کو دیوالیہ بنا کر چھوڑے گی۔ جو کام کرے گی حد سے سوا بناوٹ اور دکھاوے کا، جو چیز خریدے گی حد سے سوا قیمت اور قسم اول کی۔

اس کا صاحبِ اولاد ہونا سارے محلے کے لیے مصیبت ہے اور شوہر کے لیے تو عذابِ عظیم۔ بچے کی پرورش جتنی غلط اس بیوی کے ہاتھوں ہوتی ہے دنیا کی کسی ایک بیوی سے اتنی غلط تربیت کی امید نہیں کی جاسکتی۔ چنانچہ ابھی بچہ سایہ ہی میں رکھنے کے قابل ہے کہ اس نے شوہر سے اس کے لیے انگریزی ٹوپی بھی منگالی اور انگریزی ٹوپا بھی بلکہ اس قسم کی بیوی کا بچہ عقیقے کے دن بھی انگریزی بچوں ہی کے لباس میں نظر آتا ہے اور جو ذرا بڑا ہوگیا تب تو نہ پوچھیے اس کے بچے کے انگریزی پن کا عالم، جو کپڑا پہنائے گی انگریزی بچوں کا۔ وہی چھوٹے چھوٹے بوٹ، نصف پاجامہ، کوٹ، انگریزی ٹوپی اور سر پر انگریزوں کے بال۔ ان کے شوہر صاحب بھی اس کے لیے جو چیز لائیں گے وہ انگریزوں کی۔ جو کھلونا لائیں گے وہ انگریزوں کا۔ یہ بچہ کھلانے سے لے کر گھر کے ہر کام میں ایک خادمہ چاہتی ہے اور خود کو گھر کے ہر کام میں حد سے سوا ''نازک'' اور ''مہین'' ثابت کرتی ہے۔ یہ ادنیٰ سی بات پر بیمار ہوجاتی ہے اور کونین مکسچر کی تاثیر سے یکسر بے خبر ہوتی ہے، مگر ڈاکٹری علاج پر مرتی ہے۔ انشا پردازی کا زور دکھانے کے لیے بات بات پر ''پرچہ'' لکھتی

ہے" یہاں تک کہ "شوہر" تک کو عاشقانہ خط لکھتی ہے۔ ادھر ایف۔ اے قسم کے شوہر صاحب بیوی کے ایسے خطوط کا تذکرہ دوستوں میں بڑے فخر اور غرور سے فرماتے ہیں۔ گو بیوی کا غلط املا والا خط دوستوں کو نہیں دکھاتے، مگر اس کے بعض جملے ضرور سناتے ہیں اور دوستوں کی داد کے بغیر اپنی بیوی کی علمی لیاقت کی خود ہی داد دیتے ہیں۔ بعض تو بات بات پر بیوی کا حوالہ دیتے جاتے ہیں۔

اس بیوی کو کسی محفل کا اذن آجانا اس کے اور اس کے شوہر کے حق میں "تُرقی کے وارنٹ" کا کام کرتا ہے۔ جہاں اسے ملّا رموزی کی شادی کا اِذن آیا اور اب میاںؒ بیوی اختیار سے باہر ہوئے۔ ایسی بیویوں کے بعض شوہر چاہتے ہیں کہ اس محفل میں میری ہی بیوی تمام بیویوں سے زیادہ تعلیم یافتہ نظر آئے، جس کا یہ طریقہ اختیار کیا جاتا ہے کہ دیسی عورتوں کی محفل میں پہن کر جانے والے لباس کو انگریز عورتوں کے لُباس کا ہم پایہ بنایا جاتا ہے۔ ادھر بیوی صاحبہ ہیں کہ اب انواع واقسام کی تیاریوں میں مصروف ہیں۔ ایسی چھچھوری بیوی کی پہچان یہ ہے کہ وہ دیسی عورتوں کی محفل میں جب آتی ہے تو اس کے پاس بناؤ سنگھار کا ایک چھوٹا سا صندوق ہوتا ہے جسے انگریز لوگ "ہینڈ بکس" یا "اٹاچی کیس" کہتے ہیں۔ اس میں انگریزی کنگھا، انگریزی صابن، پاؤڈر اور آئینہ ہوتا ہے اور ادھوری بیوی صاحبہ بات بات پر محفل میں اس صندوق کو کھولتی ہیں اور بے ضرورت سنگھار میں مصروف ہو کر دیسی عورتوں پر اپنے آٹھویں جماعت تک کی تعلیم یافتہ ہونے کا رُعب ڈالتی ہیں۔ بعض اپنے ساتھ دو چار جوڑے کپڑے کے بھی لے جاتی ہیں اور محفل میں ہر پانچ گھنٹے کے بعد نئے جوڑے میں سے ایک آدھ چیز بدل کر عورتوں کے سامنے آتی ہیں اور بعض ایک ہی دن میں جوڑے پر جوڑا بدلتی رہتی ہیں اور محفل کی بوڑھی اور تجربہ کار عورتیں اس کا خوب مذاق اڑاتے ہیں اور اسے اس کا "نادیدہ پن" اور "لونڈیانہ حرکت" قرار دیتی ہیں۔ یہ محفل میں بڑے دبدبے سے تشریف لاتی ہیں اور ادنیٰ سے کام کے لیے بھی اپنی خادمہ کو یوں آواز دیتی ہیں کہ ساری محفل کی عورتیں دیکھ لیں کہ اُفوہ ان کے ساتھ ایک خادمہ بھی ہے۔ یہ محفل کے کاموں میں کوئی حصہ نہیں لیتی بلکہ ایک طرف گال سے ہاتھ لگائے یوں بیٹھی رہتی ہیں کہ دوسری عورتیں مان لیں کہ ہاں کسی بڑے آدمی کی بیوی ہیں، مگر رنڈی کا ناچ دیکھنے کے لیے اس کی تمام متانت ختم ہو جاتی ہے اور وہ ہُڑدنگی بن کر گھر کے ہر دروازے سے رنڈی کو جھانکتی پھرتی ہے۔ ایسی محفلوں میں

بعض اوقات اس کے شوہر صاحب باہر سے اسے پرچہ لکھ کر بھیجتے ہیں اور یہ عورتوں کو دکھا دکھا کر اس کا جواب لکھ کر خادمہ کے ذریعہ ارسال فرماتی ہیں۔ اور جو صاحب اولاد ہیں تو پھر محفل میں ان کا یہ حال ہوتا ہے کہ عورتوں کو سنا سنا کر خادمہ سے کہتی رہتی ہیں کہ:

— دیکھ دیکھ اندھی تیرے ہاتھ کے نیچے میاں کا ہاتھ دبا ہوا ہے۔

— تو بے غیرت کبھی سنبھالا بھی ہے بچوں کو تو نے؟

— لے جاؤ ذرا باہر لے جا کر کھلا انھیں۔

— اور یہ دیکھ اگر رُلایا ہے تو تیرے حق میں اچھا نہ ہوگا۔

— لے یہ کھلونے تو لے اُن کے۔

— بس بس لے جا جلد، میں ذرا بہن سے باتیں کرتی ہوں۔

اتنے فقرے ملازمہ سے محض محفل کو سنانے اور دکھانے کے لیے کہے جائیں گے اور دل میں یہ جوش بھرا ہوگا کہ بجائے ملازمہ کو دینے کے بیٹے کو خود ہی لٹکائے پھروں۔ چنانچہ اس کے روتے ہی بڑے نخرے سے خادمہ سے لیا جائے گا اور محفل کے ایسے رُخ بیٹھ کر اسے دودھ پلائیں گی جہاں سے محفل کی تمام عورتیں آپ کو صاحبِ اولاد دیکھ لیں۔

جو دودھ پلا کر فارغ ہوئیں تو تمام محفل کی شامت آ گئی۔ جو عورت آپ سے مخاطب ہوتی ہے یا جو مخاطب بھی نہیں ہوتی اسے بھی خود بخود مخاطب کر کے اپنے لاڈلے کے کرتب دکھائیں گی اور اپنے سے زیادہ شوہر صاحب کے اس سے عشق ظاہر فرمائیں گی:

— سلام کرو بیٹے یہ تمھاری نانی اماں ہیں۔

— اور انھیں بھول گئے اِنھیں، ارے بے وقوف یہ تو تیری دادی جان ہوتی ہیں اور انھیں تو پہچان یہ اپنی خالہ بی ہیں اُلّو۔ ارے یہی تو تیرے لیے جوڑا لائی تھیں۔

— اچھا میاں ذرا خالہ بی کو ڈانٹ تو دو۔

— اور ذرا میاں آداب تو عرض کر لو۔

اس قسم کی مذاق اُڑانے کے قابل قواعد پریڈ دکھا کر اب یہ والدہ صاحبہ اس لاڈلے کے حالات و خواص کی تفصیلات اور اپنی اور اپنے شوہر کی اس لونڈے سے محبت کی داستان شروع

فرمائیں گی اور انھیں یہ خیال ہرگز نہ ہوگا کہ سننے والی عورت ان حالات کو پسند بھی کرتی ہے یا دل میں میرا مذاق اُڑا رہی ہے۔ بس وہ تو اپنے بیٹے کی تعریف میں اب ''رواں دواں'' رہیں گی۔

— بہن کیا کہوں تم سے کہ میں نے اس بچے کے لیے کیسی کیسی تکالیف اٹھائی ہیں۔ خدا عمر دراز کرے اس کی۔ آپ دیکھیے جب یہ تین مہینے کا پیٹ میں تھا تو مجھ اندھی کو ہوش تو رہا نہیں میں ''اُن'' کے ساتھ موٹر میں بیٹھ کر ٹھنڈی سڑک پر چلی گئی، وقت تھا سخت جاڑے کا بس مجھے کھانسی ہوگئی، اسی وقت سے بس خدا جانے کیا اثر ہوا کہ پیدا ہوتے ہی اسے بھی جو کھانسی ہوئی ہے تو جانے کا نام نہیں لیتی، مگر خدا ''انھیں'' بھی سلامت رکھے کہ انھوں نے بھی اس کے علاج کے لیے زمین آسمان ایک کر دیے ہیں۔ کون سا حکیم ہے اور کون سا ڈاکٹر ہے جس کے پاس وہ ان میاں کو لے کر نہ گئے ہوں اور جس کی ڈبل فیس نہ دی ہو انھوں نے۔

— بس اب میں نے ارادہ کرلیا ہے کہ اسے دہلی لے جاؤں گی اور جو کچھ بھی خرچ ہوگا وہاں خرچ کروں گی مگر اس کا مکمل علاج کراؤں گی کیونکہ الحمدللہ روپیہ کی تو نہ مجھے پرواہ ہے نہ انھیں، خدا بچے کو آرام سے رکھے کیونکہ بہن حق تو یہ ہے کہ مجھ سے سوا وہ اس بچے پر فدا ہیں چنانچہ اب جو میں یہاں آگئی ہوں تو بس دیکھ لینا کہ ''وہ'' اس کے لیے بے چین ہو رہے ہوں گے۔

— کیا مجال جو گھر میں اسے تنہا چھوڑ کر میں ایک منٹ تو علاحدہ ہو جاؤں، بس گھر کو سر پر اٹھا لیں گے کہ دیکھو تم ہو بد احتیاط، تمھارے علاحدہ ہونے سے خدانخواستہ میرے بچے کو کوئی نقصان پہنچ گیا تو؟

— اور بہن کیا کہوں میں تم سے اس شریر کی حرکتوں کا حال؟

— ماشاءاللہ جہاں صبح کی چڑیاں بولیں اور اس نے کھیلنا شروع کیا۔ بہن میں تو ہوتی ہوں اس وقت غافل بس خدا انھیں میرے سر پر ہزار برس سلامت رکھے وہی اٹھتے ہیں اور اسے لیمپ کے سامنے لے کر لیٹ جاتے ہیں مگر مجھ سے ایک حرف نہیں کہتے اور صبح تک کھلاتے رہتے ہیں۔

— کہنے کو یہ ابھی پانچ مہینے دس دن کا ہے کیونکہ یہ پیدا ہوا تھا وہ خالی کے مہینے کی نو تاریخ کو مگر ماشاء اللہ اتنا ذہین ہے کہ کتنا ہی چیخ رہا ہو مگر جہاں میری آواز سنی فوراً خاموش ہو جائے گا۔

— یہی حال اُس کی دادی اماں کا ہے۔

— بہن سچ یہ ہے کہ وہ بھی اس پر جاں نثار کرتی ہیں۔

— گوان کی ضعیفی کا زمانہ ہے مگر رات بھر ہیں کہ اپنی گود سے علاحدہ نہیں کرتی ہیں۔

— غرض گھر بھر ان میاں پر قربان ہے۔

(چمن، امرتسر، سالنامہ بابت 1931، صفحہ 117، جلد 4)

ایسی ہی بیوی ہوتی ہیں جن کے شوہر صاحب کو انھیں کسی کلب کا ممبر بنانے کا خاصا شوق ہوتا ہے اور یہی وہ ہوتی ہیں جن کے نام سے شوہر صاحب رسالوں میں مضامین اور غزلیں چھپوایا کرتے ہیں اور جو شوہر صاحب ہوئے ''خالص دفتری دماغ کے'' تو پھر اس غریب کا تمام ''لکھاپڑھاپن'' یا خرچ ہوتا ہے کتب بینی میں یا سودا سلف اور اس کی اجرت لکھنے میں۔ اس قسم کی بیویوں کی ''ساسیں'' اکثر جاہل ہوتی ہیں اس لیے اس کی ساس سے اکثر ''چلتی رہتی ہے'' محض اس وجہ سے کہ اس کے دماغ میں ایک حد تک ''نیاپن'' ہوتا ہے اور معاملات کی حیثیت کو ساس سے بہتر سمجھنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ نتیجہ یہ کہ کبھی کبھی اس کی ساس ''یوں ہو جاتی ہے'':

— چلو رہنے دو بیوی۔

— دیکھ لیا میں نے تمھارا رنگ۔

— خوب گھر آباد کرو گی اپنے شوہر کا۔

— چلو مجھے نہ سکھاؤ یہ تمھارے ایشن فیشن کے قاعدے۔

— مجھے یہ ''ہُڑ دنگاپن'' اچھا نہیں معلوم ہوتا۔

— اُس مہینے میں دیکھو تو بیوی نے سوا سو روپیہ اٹھا دیا اور میں نے کچھ نہ کہا۔ اس مہینے میں دیکھو تو بیوی نے بے ضرورت وہ بیس روپیہ کے جوتے ہی منگا ڈالے۔

— ہاں ہاں بیوی ہمارے خاندان میں تو ایسا نہیں ہوتا۔

— اچھا تو تم امیر کی بیٹی ہو تو تمھیں مبارک، مگر ہم تو اپنے قاعدہ پر چلائیں گے تم کو۔

— بس تو آ جانے دو آج تمھارے ملّا رموزی صاحب کو، ہم فیصلہ کیے لیتے ہیں کہ یا اب اس گھر میں تم اپنی ان بانکی ترچھی بیوی کو رکھو یا ہمیں۔

— ہاں ہاں ہم تو تمھارا یہ کلب ولب جانا پسند نہیں کرتے۔

— ہمارے گھرانے کی بہو بیٹی تو الحمدللہ آج تک دروازہ پر نہیں دیکھی گئی۔

— وہ دیکھنا وہ میاں سلّو نے اپنی بیوی صاحبہ کو ''میم صاحب'' بنا رکھا تھا آخر کیا حشر ہوا ان کا؟

— بس دُلہن خوفِ خدا سے ڈرو، بہت زیادہ غرور اچھا نہیں ہوتا۔

— مگر زبان ضرور چلائے جاؤ گی۔

— ہاں ہاں بیوی ہم تو اگلے وقتوں کی کھوسٹ ہیں، مگر تم تو ہو چودھویں صدی کی نیلم پری۔

— بس اپنے قاعدہ سے رہو۔ تم جانو تمھارا میاں جانے۔ مجھے کیا ان باتوں سے۔ تم ہو کہ مفت مجھ سے الجھی جا رہی ہو۔

اس قسم کی عالم بیوی میں مزاجی پختگی بہت کم پیدا ہوتی ہے، مگر امورِ خانہ داری میں بے حد مستعد، صفائی پسند، خصوصاً فیشن کی چیزوں سے اپنے کمرے کو آراستہ رکھنے والی، بے حد فضول خرچ، جاہلانہ رسوم سے ایک حد تک بچنے والی، شوہر سے محبت کرنے والی مگر تعلقات میں برابر کی طالب۔ موقع ملے تو تھیٹر اور سنیما کے تماشہ کی شائق۔ عمدہ کھانے پکانے والی، مگر گھی زیادہ خرچ کرنے والی۔

اولاد کی تعلیم و تربیت میں کاذ مستعد، خدا سے ڈرنے والی، زیادہ باتیں کرنے والی، صورت میں نہ سہی مگر لباس میں نفاست۔ باقی خیریت۔ مقدار میں ایسی بیوی بھی ابھی شاید تین فیصدی پیدا ہوئی ہے۔ فقط۔

◆◆◆

فاضل بیوی

یہ ہمیشہ نہایت مالدار گھرانے میں پیدا ہوتی ہے، اس لیے اس کی اعلیٰ تعلیم و تربیت کے جملہ اسباب ہر وقت فراہم رہتے ہیں۔ پورا گھرانا تعلیم یافتہ اور شائستہ ہوتا ہے، اس لیے اس کے خواص میں اعلیٰ درجہ کے اصول و اثرات بہت کم کوشش کے ساتھ پیدا ہو جاتے ہیں۔ البتہ سوال یہ ہے کہ اس کی تعلیمی فضیلات اصولاً قابلِ اعتماد بھی ہوتی ہے یا نہیں، سو اس وقت تک کے جتنے نمونے سامنے آئے ہیں ان کے لحاظ سے صحیح معنی کی تعلیم یافتہ فاضل بیوی کی تعداد ایک فیصدی بھی نہیں ہے۔ البتہ ''نظری اعتبار'' سے اس کے ساتھ موجودہ زمانے کی مقرر کی ہوئی تعلیم و تہذیب کی تمام علامتیں ہوتی ہیں مثلاً اس کی سب سے اونچی فضیلت یہی ہے کہ باوجود تعلیم یافتہ ہونے کے اپنے آبائی اور ملکی لباس کو یکلخت ترک کر کے غیر قومی لباس اختیار کر لیتی ہے جس کا یہ مطلب ہے کہ وہ اعلیٰ درجہ کے علمی اصول سیکھ کر بھی مزاج کی اس درجہ ضعیف ہوتی ہے کہ جس چیز کو انگریزی بہنیں استعمال کرتی ہیں یہ فوراً اسے اختیار کر لیتی ہے۔ اگر یورپ کی عورتیں یورپ کے قاعدوں کے موافق کوئی کھیل کھیلتی ہیں تو یہ بے چاری ہندستانی ہو کر بھی اسی کھیل کو کھیلتی ہے اور اسے اپنے تعلیم یافتہ ہونے کا ثبوت قرار دیتی ہے۔ حالانکہ علم کی تعریف یہ ہے کہ انسان اپنے ہی ملکی و قومی آداب و ضوابط کی عزت کرے، لیکن یہ جو ہندستانی ہو کر یورپ کی عورتوں ایسی صورت بناتی

ہے، اس کا راز یہی ہے کہ علوم بھی یورپ ہی کے حاصل کرتی ہے، اس لیے اعمال واثرات بھی وہی ہوتے ہیں۔

فی الجملہ یہ ابتدائی تعلیم سے لے کر انتہائی تعلیم تک پوری مستعدی سے کام لیتی ہے اور اچھے نمبروں سے پاس ہو کر کم تعداد میں وہ گھر میں آ کر بیٹھ جاتی ہے اور زیادہ تعداد میں وہ ایسے کام کرتی ہے جو مشہور ہوں۔ اور کچھ شک نہیں کہ ان مشاغل سے اس نے ہندستان کی بے حس وحرکت عورتوں میں کام کرنے کی ایک امنگ پیدا کر دی ہے جو گو ابھی بہت محسوس ہوتی۔ ہے لیکن نصف صدی بعد وہ بے حد طاقتور ہو جائے گی۔

البتہ اس کی زندگی میں اگر کوئی قابلِ اعتراض بات ہے تو صرف یہ کہ اس کے تمام مشاغل یورپ کی عورتوں کی نقل ہوتے ہیں۔ ذاتی ایجاد واختراع اور ملکی اصول وآداب تقلید کی قوت بے حد ضعیف ہے۔ مثلاً وہ جب تقریر کرتی ہے تو انگریزی زبان میں اور کچھ لکھتی ہے تو انگریزی زبان میں اور اسی سے پتہ چلتا ہے کہ ابھی اس کے اندر علمی پختگی اور تعلیمی وزن پیدا نہیں ہوا۔ البتہ کھوسٹ ہو جانے پر اس میں کچھ سادگی پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ دوسری عورتوں کو تعلیم یافتہ بنانے اور ترقی دینے کے لیے نہایت درجہ قابلِ تعریف کام کر رہی ہے اور کچھ شک نہیں کہ اس کی موجودہ رہنمائی میں ہندستان کی ''تاریخ بیداریٔ نسواں'' میں نہایت درجہ عزت واحترام کی جگہ پائے گی بشرطیکہ وہ خالی میم صاحب نہ بنی پھرے۔ اس کی دوسری فضیلت یہ ہے کہ یہ تمام ''مردانہ مشاغل'' اور ''مردانہ ذمہ داریوں میں'' برابر سے حصہ لیتی ہے۔ مثلاً ملا رموزی صاحب مضمون لکھتے ہیں تو یہ بھی مضمون لکھتی ہے، ملا رموزی صاحب لاہور جاتے ہیں تو یہ بھی لاہور جاتی ہے۔ ملا رموزی صاحب جہاز پر سوار ہوتے ہیں تو یہ بھی جہاز پر سوار ہوتی ہے، ملا رموزی صاحب سنیما کا تماشہ دیکھنے جاتے ہیں تو یہ بھی سنیما کا تماشہ دیکھنے جاتی ہے۔ بس اگر فرق ہے تو یہ کہ ملا رموزی صاحب اگر حقہ پیتے ہیں تو یہ سگریٹ پیتی ہے، حقہ نہیں پیتی۔ ملا رموزی صاحب دولت مندوں کی ناقدردانی کے باعث اگر دن میں ایک جوڑا کپڑے کا بدلتے ہیں تو یہ مالدار ہونے کی وجہ سے دن میں سولہ جوڑے بدلتی ہے۔

اس کی شادی میں جو روپیہ خرچ ہوتا ہے اس سے ایک اوپر دس ملا رموزیوں کی شادیاں

ہوسکتی ہیں۔ اگر اس کے نکاح میں مکہ معظمہ کے قاضی اور بنارس کے پنڈت بلائے جاتے ہیں تو بارات میں پیرس اور جرمنی کی رنڈیاں بھی نظر آتی ہیں۔ اسی طرح ولیمہ میں پلاؤ پر پلاؤ ہے کہ پک رہا ہے اور پوریوں پر پوریاں ہیں کہ تیار ہو رہی ہیں۔ باجوں پر باجے ہیں کہ بج رہے ہیں اور روشنیوں پر روشنیاں ہیں کہ ہو رہی ہیں۔ باراتیوں کی کثرت کا یہ حال کہ تو بھی شریک تو میں بھی شریک تو وہ بھی شریک۔ اس کو بھی اذن اور اس کو بھی اذن، مجھے بھی اذن، تو تجھے بھی اذن۔

جہیز کی کثرت کا یہ حال کہ خزانہ بھی جہیز میں اور بینک بھی جہیز میں، زیور بھی جواہرات بھی جہیز میں، تو نیلم ویاقوت بھی جہیز میں اور آخر میں تو بھی جہیز میں اور میں بھی جہیز میں، مگر کوئی نہیں کہتا کہ بیوی تم ہو تعلیم یافتہ اور تعلیم یافتہ ہو کر یہ کیا کرتی ہو؟ البتہ اب کچھ دن سے اس کی شادی میں سادگی کا آغاز بھی نظر آنے لگا ہے مگر وہ سادگی بھی کیسی کہ جس کے سامنے دنیا کی تمام دھوم دھام شرمائے اور فضول خرچی پر اس کے جہیز میں کتب خانہ بھی دیا جاتا ہے، کہیے کیسی رہی۔

باوصف اس فضیلت کے اس کی منگنی سے لے کر ولیمہ تک میں وہ تمام جاہلانہ رسوم ادا کی جاتی ہیں جو اس کے شہر اور اس کی برادری کے جاہل طبقات میں رائج ہوتی ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ ہر رسم میں دولت کی کثرت کے باعث ذرا نظری شائستگی پیدا کر دی جاتی ہے۔ چنانچہ یہ رسم کی پیروی نہیں تو اور کیا ہے کہ اس کے ہاں کی ہر تقریب میں ہماری آپ کی تقاریب سے زیادہ باجے بجائے جاتے ہیں اور ہم سے آپ سے تو یہ آگرے اور لکھنؤ کی رنڈی ریل کا کرایہ تک لے کر آتی ہیں اور اس کے ہاں محض ''انعام'' کی امید ہے کہ ایک کے اوپر ایک رنڈی ہوتی ہے کہ چلی آتی ہے۔ اس کے گھر بارات کیا آتی ہے اچھا خاصا بادشاہوں کا جلوس آتا ہے۔ بارات میں اذن والے تو ہوتے ہی ہیں مگر جن راستوں سے اس کی بارات گزرتی ہے اس پر منہ چھپائے ہوئے اچھے اچھے بیرسٹر لوگ تماشہ دیکھنے کے لیے کھڑے ہوتے ہیں اور اس راستے کے تمام دو منزل اور سہ منزل مکانوں کی کھڑکیوں سے ننھے میاں کی والدائیں صاف صاف اور کہیں کہیں ''کچھ کچھ جھانکتی رہتی ہیں''۔

اس کی بارات کے ہجوم میں اس کے ہاں کے انتظام کرنے والے بعض بے اذن غنڈوں کو بید یا طمانچے سے مارتے بھی جاتے ہیں مگر غنڈے ہوتے ہیں کہ مارے تماشے کے شوق اور ہانج

بہاری لوٹنے کے جوش میں بارات میں تمام راستے شریک رہتے ہیں۔ اکثر باراتی موٹروں میں بیٹھے ہوئے چلتے ہیں اور موٹر کے اندر سے دوسرے پا پیادہ باراتیوں کو اس انداز سے دیکھتے جاتے ہیں کہ دیکھو ہم موٹر میں جا رہے ہیں۔ اس کی بارات کے اذن کو ملا رموزی صاحب کے سوا دنیا کا ہر آدمی اپنی اور اپنے خاندان کی عزت سمجھتا ہے، مگر دولہا اور دلہن کے والد صاحب ان باراتیوں سے اتنا بھی نہیں کہتے کہ "آپ کا شکر یہ کہ آپ اپنے ذاتی اور قیمتی لباس کو پہن کر میری اولاد کی تقریب میں شریک ہوئے" بلکہ الٹا قاعدہ یہ ہے کہ دولہا اور دلہن کے دولت مند والد صاحب پانچ سیر وزن کا منہ بنائے ہوئے کسی کرسی پر بیٹھے رہتے ہیں اور باراتی انھیں جھک جھک کر سلام کرتے ہیں۔ بس باراتیوں کو بڑی خوشی اس بات کی ہوتی ہے کہ "ہمیں اذن تو آیا تھا" شامیانوں کے نیچے بڑے ادب سے بیٹھے اور رنڈیوں اور بھانڈ دوؤں نے ہنگامہ شروع کیا۔ گو آپ رنڈی کے ناچ اور گانے میں محو ہوتے ہیں مگر ہر وقت ڈرتے رہتے ہیں کہ کہیں دولہا میاں یا دلہن کے والد صاحب تو تشریف نہیں لا رہے۔ اور اگر ان والدوں میں سے کوئی ایک والد بھی اس رنڈی کے جلسہ میں آ گئے تو تمام باراتی نوکروں اور خادموں کی طرح تعظیم کے لیے کھڑے ہوئے اور رنڈی نے بھی زمین سے ہاتھ لگا کر انھیں آداب عرض کیا۔ اب آپ کی مجال نہیں جو ان والد صاحب کی موجودگی میں آپ کسی نمایاں تکیے سے کہنی لگا کر اور اکڑ کر بیٹھ سکیں اور نہ آپ رنڈی سے بہ طریق داد کہہ سکتے ہیں کہ:

— کیا کہنا ہے منّی جان۔
— سبحان اللہ ذرا پھر کہنا اس شعر کو۔
— بھئی واللہ سننا ذرا ملا رموزی صاحب کس قیامت کا شعر کہہ رہی ہے۔
— آخر ہے نا حضرت خسرو کا کلام۔
— اور بھئی حق یہ ہے کہ اس غزل کا کہنا بھی منی جان ہی کا کام ہے۔

اور نہ غنڈے چلا کر کہہ سکتے:

— ہائے رے مار ڈالا۔
— کیا ناچ رہی ہو پیاری۔

— واہ واسانپ بل کھا رہا ہے۔
— ذرا ادھر تو آؤ۔
— یہ منگل خاں دادا کو تو سلام کر لو، اُدھر کیا ناچ رہی ہو۔
— لو یہ لو روپیہ، اِدھر تو دیکھو وہ قادر بھیا بھی روپیہ دے رہے ہیں۔
— ہاں صاحب آگرے والی ہے آگرے والی۔
— ارے ادھر تو آواز ہی نہیں آتی۔
— ذرا وہ تو سناؤ: ''میرے مولیٰ بلا لے مدینے مجھے''

غرض جب تک دولہا دُلہن کے والد صاحب محفل میں بیٹھے رہتے ہیں نہ رنڈی بے تکلف ہو کر گاتی نہ باراتی چلا کر داد دے سکتے۔

یہی حال اندر عورتوں کا ہوتا ہے۔ گو کہنے کو اندر بھی پیشہ ور عورتیں گاتی رہتی ہیں مگر اس درجہ بدحواسی کے ساتھ کہ کہیں دولہا میاں یا دلہن کی والدہ صاحبہ ناراض نہ ہو جائیں۔ البتہ جب کسی وقت دُولہا کے والد یا دُلہن کے والد یا والدہ کسی سے پوپلا مذاق فرماتے ہیں تو اس وقت دوسرے باراتیوں کو خوش ہو لینے کی ہمت ہوتی ہے مگر یہ مذاق اور باہمی چھیڑ چھاڑ چند منٹ کے لیے ہوتی ہے اور پھر دولتمندی کا نخرہ شروع ہو جاتا ہے۔ باراتی عورتیں ایسی محفل میں اپنے چھوٹے چھوٹے بچوں کے رونے اور چلانے سے ڈرتی رہتی ہیں۔ یہ اپنے ہاں کی باراتوں کی طرح نہیں کہ بیچ محفل ہی میں بیٹھی اپنے بچے کو دودھ پلا رہی ہیں اور پیشاب بھی کرا رہی ہیں، آپس میں لڑتی بھی جاتی ہیں اور گاتی بھی جاتی ہیں البتہ جب اس محفل کی بڑی بڑی عورتیں آپس میں مذاق شروع کرتی ہیں تب اس محفل کی چھوٹی چھوٹی عورتوں کو ہنس کر بات کرنے کا موقع ملتا ہے، مگر ان بڑی عورتوں سے پھر بھی چھوٹی عورتوں کو مذاق کا حوصلہ نہیں ہوتا۔

عام طور پر رخصتی کے وقت غریبوں میں لڑکی کے ماں باپ چلا چلا کر بھی روتے ہیں اور آہستہ بھی اور بار بار دولہا کو بلا کر کہتے ہیں کہ:

— دیکھو بیٹے ہم نے تمھیں اپنا خونِ جگر دیا ہے اسے پیار سے رکھنا، اس کی برائیوں پر نہ جانا۔

— خدا کے حوالے کیا۔
— اللہ تمھیں آپس میں محبت دے۔
— ابھی نادان ہے اس کی باتوں پر نہ جانا وغیرہ۔

مگر اس کے ہاں تعلیم کے اثر سے اس قسم کا معاملہ نظر نہیں آتا۔ صرف والدہ صاحبہ عام عورتوں کی نظر بچا کر ذرا آبدیدہ ہو جاتی ہیں، مگر والد صاحب مسکراتے ہی رہتے ہیں۔

ولیمے کے دن باوصف تعلیم یافتہ ہونے کے پلاؤ بھی حاضر ہے اور مزعفر بھی۔ کباب بھی اور بریانی بھی۔ ڈبل روٹی بھی اور توس اور مکھن بھی۔ اور یہ اس لیے کہ ''ماحضر تناول فرمانے والوں میں'' کہیں کہیں انگریز بھائی بھی مع اپنے ننھے میاں کی والدہ کے ٹوپی اتارے ڈٹے رہتے ہیں اور لیڈر لوگ تو ایسے ولیمے میں پولس کے روکنے سے بھی باز نہیں رہتے۔ البتہ کہیں کہیں اتنی سادگی نظر آنے لگی ہے کہ ولیمے کے دام کسی یتیم خانے اور انجمن میں بھیج دیے جاتے ہیں۔ سو وہ بھی یہ اپنے گاندھی کے رو رو کر سمجھانے سے اور رضا کاروں کے ''پکٹنگ سے'' پھر بھی اس سادگی کے ہوتے ہوئے ہزاروں کی تعداد ہی میں روپیہ برباد کیا جاتا ہے، مگر ملا صاحب کو ان کی کتابیں چھپوانے کے لیے کچھ نہیں دیا جاتا، جس سے دنیائے علم و ادب میں ان کا نام زندہ رہے اور کتب خانوں میں دجال کے خروج تک محفوظ رہے۔

علمی شائستگی کے باعث چونکہ گھر کے عام حالات منظم ہوتے ہیں اور دولت کافی اس لیے اس کی اور ساس کی لڑائی نہیں ہوتی اور ہوئی بھی تو یا تحریر میں یا نہایت مختصر۔ وہ تو اپنے ہاں کی ساس بہو ہوتی ہیں کہ ساس کے پاؤں دبائے تو بہو، ساس کا بستر درست کرے تو بہو اور گھر بھر کے لیے روٹی پکائے تو بہو، مگر یہاں جو کچھ کرتا ہے خادم یا خادمہ، اسی لیے اس قسم کے گھروں میں پیانو باج بجتا ہوا سنائی دیتا ہے اور شام کے وقت دولہا ٹھنڈی سڑک پر، دلہن اور ساس بھی ٹھنڈی سڑک پر اور سسر بھی۔ اس قسم کے گھر میں اگر خدانخواستہ لڑکا پیدا ہو جائے تو سمجھ لیجیے کہ اب تک اگر قیامت نہ ہوئی تھی تو اب ہو کر رہے گی۔ جہاں میلاد شریف کا اعلان ہوا کہ سب سے پہلے، شاعروں پر مصیبت آئی۔ اب تو بھی قصیدہ کہہ رہا ہے اور میں بھی۔ یہ بھی قصیدہ کہہ رہا ہے اور وہ بھی۔ اخبارات ہیں کہ وہ مبارکبادیں چھاپ رہے ہیں کہ نہ دیکھی نہ سنی، گھر میں ہے کہ جشن بپا ہے۔

اِسے بھی انعام اُسے بھی انعام۔ مجھے بھی انعام تو تجھے بھی انعام۔ جوڑے پر جوڑا ہے کہ آرہا ہے اور باجے پر باجہ ہے کہ بج رہا ہے۔ مولویوں اور پنڈتوں سے ہیں کہ فالیں نکلوائی جارہی ہیں اور نام یہ ہے کہ تمام خاندان اعلیٰ تعلیم یافتہ ہے۔ ابھی بچہ گہوارے ہی میں ہے کہ ڈاکٹری علاج شروع ہوگیا۔ جہاں اس نے غیر معمولی انگڑائی لی کہ جرمنی تک کے ڈاکٹر بھاگے چلے آرہے ہیں۔ بیوی کی نبض بھی دیکھی جارہی ہے اور بچے کے بھی آلے لگائے جارہے ہیں اور والد صاحب کے تو اگر دس آپریشن کردیے جائیں تو غم نہیں، اس لیے کہ خدانے انھیں ''اولادِ نرینہ'' جو عطا فرمادی ہے۔

اس قسم کے بچے کی پرورش اور تربیت اس درجہ شان اور اہتمام سے شروع ہوتی ہے کہ اگر اس ایک کے انتظام سے ملا رموزی صاحب کے دس بچوں کی پرورش اور تربیت کی جائے تب بھی کچھ روپیہ فاضل ہی بچ جائے گا، مگر اس قدر اہم پرورش اور تربیت میں چونکہ انسانی قاعدوں سے اونچا اہتمام کیا جاتا ہے، اسی لیے ایسی اولاد تعلیم یافتہ ہوکر بھی عام انسانی خواص اور ضروریات سے کماحقہٗ واقف نہیں ہوتی۔ بس ہاں اعلیٰ درجے کے ریشمی قمیص، چست پاجامے، کوٹ، ٹائی، کالر اور بوٹ پہننے میں طاق نکلتی ہے اور نام یہ ہوتا ہے کہ تعلیم یافتہ ماں باپ کے تعلیم یافتہ بیٹے جرمنی سے پاس ہوکر آرہے ہیں، اس لیے چلو بمبئی تک استقبال کرنے۔

اس قسم کی بیوی کا ہی حال بڑھاپے میں بدل جاتا ہے اور کچھ شک نہیں کہ وہ بڑھاپے سے قریب ہوتے وقت بعض کام اتنے بھی بلند قابلِ احترام اور حیرت انگیز کرگزرتی ہے کہ باید شاید بشرطیکہ وہ اخبار بھی پڑھتی رہتی ہو، خصوصاً قومی کاموں میں اس کا چندہ اس کے مضامین اور اس کی تقریر میں حد سے سوا مفید اور یادگار احترام کی مستحق ہوتی ہیں، مگر ایسی تعداد ابھی ایک فیصدی بھی اس لیے پیدا نہیں ہوئی ہے کہ ہندستان کی کل آبادی 35 کروڑ سے بھی اونچی ہے۔

اس کے وجود سے ہندستانی عورتوں میں انگریزی تہذیب، انگریزی لباس، انگریزی زیور، انگریزی تفریح، انگریزی علاج، انگریزی کھانوں اور انگریزی زبان نے کافی سے زیادہ رواج پایا ہے کیونکہ شروع ہی سے تعلیم نام رکھا گیا ہے انگریزی زبان میں تعلیم حاصل کرنے کا۔ اسی لیے تو یہ ہمارے آپ کے ننھے میاں کی والدائیں اگر فارسی یا عربی زبان میں تمام دنیا کے سقراطوں، بقراطوں اور افلاطون کے علوم پڑھ کر رکھ دیں تب بھی انھیں کوئی تعلیم یافتہ کہنے کو تیار نہیں۔ غرض

اس کے لباس، اس کے جسم اور اس کے گھر کی ایک چیز سے بھی پتہ نہیں چلتا کہ یہ ہندستان کی بنی ہوئی بیوی ہے۔ حالانکہ تعلیم مگر صحیح تعلیم کا اثر ہونا چاہیے کہ تعلیم یافتہ انسان اور ''انسانی'' اپنے ملک اور اپنے قومی آداب و عادات کی عزت کرے۔ دیکھو نا یہ آخر یورپ کی اعلیٰ تعلیم یافتہ بیویوں کو یہ ایک دن بھی آپ کے ہندستان کی پشواز کو ہاتھ نہیں لگاتیں۔ فی الجملہ یہ تمام کمزوریاں اس لیے زیادہ اعتراض کے قابل نہیں کہ ابھی اس قسم کی بیوی کی تعلیم کا یہ شروع زمانہ ہے، اس لیے پختگی آنے پر یہ حد سے سوا احترام کی اس لیے مستحق ہو جائے گی کہ دولت مند کی بیٹی ہونے پر اس نے تعلیم تو پائی اور برسوں سبق یاد کرنے کی مصیبت تو برداشت کی۔

یہ اپنے شوہر سے بہت زیادہ محبت کرتی ہے، اس لیے کہ اسے دن رات بیٹھے بیٹھے خیالی محبت کرنے کے سوا چکّی تھوڑا ہی چلانی پڑتی ہے۔ اس کے ذمہ کا تمام کام جب اس کے خادم اور خادمہ کر لیتے ہیں تو یہ محبت کے سوا کیا کرے۔ البتہ وہ قومی کاموں سے دلچسپی لینے کے لحاظ بہت زیادہ کام کرتی ہے۔

منتظم، اولوالعزم، فیاض، ہمدرد، مصائب کے اندر نہایت جری، ذی حوصلہ اور شوہر پر جان تک قربان کرنے والی، حسین و جمیل، نفیس نازک، صرف فرصت کے اوقات میں سنیما کا تماشہ دیکھنے کی شائق، اولاد کی تربیت اور اعلیٰ تعلیم پر حریص، جاہلانہ رسوم سے کافی حد تک بیزار۔ بس جیسی ہمارے ننھے میاں کی والدائیں۔ فقط۔

◆◆◆

خفیہ بیوی

یہ بیوی ہندستان کی حیاتِ اجتماعی، ان کی دولت، ان کے اخلاق اور ان کے بین الاقوامی وقار اور اعزاز کے لیے نہایت درجہ ذلّت انگیز اور برباد کرنے والی ہے۔ یہ ماں باپ سے پیدا ہونے کے بعد جن مقامات اور جن حالات سے بیوی بنتی ہے وہ یہ ہیں۔

مکانات کے برآمدے، کوٹھے، اٹاریاں، ٹھنڈی سڑک، پارک، اسکول آتے جاتے، خطوط، ناول، تھیٹر، سنیما، غزلوں، ادبی رسالوں کے افسانوں، پھر افلاس، ماں باپ کی دولت مندی سے آزادی اور کبھی کبھی طبعی افتاد اور لالچ سے۔

اس کا شوہر بھی بدترین اخلاق اور ذلیل تر ذہنیت کا انسان ہوتا ہے، اسی لیے وہ اس بیوی کے لیے حقوق شکنی، قانون شکنی اور مذہب شکنی تک پر آمادہ ہوکر چوری سینہ زوری، اغوا، قتل اور کبھی کبھی ''قتل عام'' سے بھی باز نہیں رہتا اور ''رات کے وقت لے بھاگنے کی مشق'' تو بہت خاصی ہوتی ہے اور اسی لیے یہ سب سے پہلے خاندان، پھر محلے اور پھر پولس والوں کے لیے مصیبت بن جاتا ہے اور مصیبت بن جاتی ہے۔

زیادہ مقدار میں اس کا شوہر کنوارا نہیں بلکہ بیوی والا ہوتا ہے۔ یہ بغیر منگنی کے ایک دم پوری بیوی بن جاتی ہے۔ اس کے باضابطہ نکاح میں صرف ملا رموزی اور اس کے شوہر کا ایک

دوست شریک ہوسکتا ہے تاکہ قانوناً ''دوگواہ'' کہے جاسکیں۔ نکاح سے پہلے یہ اور اس کا شوہر جس درجہ مشکلات اور جانی اور مالی مصیبتوں میں مبتلا ہوتا ہے، نکاح کے بعد یہ مصیبتیں سے گزر جاتی ہیں۔ اب یہ شوہر نہ گھر کا رہتا نہ گھاٹ کا۔ چنانچہ سب سے پہلا عذاب جو اس کے شوہر پر مسلط ہوتا ہے وہ یہ کہ اب یہ اس لیے بے حیا بیوی کے لیے اپنے محلے سے دور ایک مکان کرایہ پر لیتا ہے اور اس گھر میں عام انسانی ضروریات کے اوزار عرف سامان فراہم کرتا ہے۔ ایک ڈیڑھ ملازم یا ملازمہ رکھتا ہے، دن بھر اس گھر سے غائب رہتا ہے، مگر اس کا دل اسی گھر کے دروازے پر پڑا رہتا ہے، اس ڈر سے کہ ''کہیں موقع پا کر بھاگ نہ جائے'' وہ نوکری کرتا ہے مگر دماغ اسی الجھن سے تباہ ہوتا رہتا ہے کہ ''کہیں بھاگ نہ جائے''۔ وہ رات کو اس گھر میں آتا ہے مگر اس طرح کہ ہر قدم پر ڈرتا ہے، لرزتا، کانپتا ہے، جھجکتا ہے، کہ کہیں محلے والے مارے جوتوں کے میرا سر پر اٹھا نہ کردیں، کہیں ملاّ رموزی صاحب کو خبر نہ ہوجائے، کہیں پولس والے میرا تعاقب نہ کررہے ہوں۔

یہی حال اس بیوی کا ہوتا ہے کہ وہ دن بھر شوہر سے جدا رہنے اور تنہائی کے اوقات میں ادنیٰ سی آواز اور حرکت سے کانپ جاتی ہے کہ کہیں میرے والد کو میرا پتہ نہ چل گیا ہو، کہیں بھائی نہ آ گیا ہو، کہیں پولس والے نہ آ گئے ہوں اور کہیں ملاّ رموزی صاحب نے میرے والد سے جا کر نہ کہہ دیا کہ وہ تمھاری بیٹی فلاں گھر میں موجود ہے۔ ان خطرات کے بعد وہ تنہائی میں اس اُلجھن سے گھٹتی رہتی ہے کہ:

— ہے شیطان تو نے کیسی میری مٹی پلید کی۔

— مجھے موت کیوں نہ آ گئی کہ میں نے اپنے خاندان کی آبرو اس کمبخت ملاّ رموزی کے لیے برباد کردی اور اب یہ ملاّ رموزی یقیناً میرا ساتھ چھوڑ دے گا، لعنت ہے میرے اوپر۔

— اے خدا تو اب مجھے موت دے دے۔

— اور اے خدا تو اس ملاّ رموزی کو غارت کردے جس نے مجھے میرے گھر سے نکالا اور اب مجھے پوچھتا نہیں اور اپنے بیوی بچے میں خوش ہے یا کبھی تھا کہ میری خوشامدیں کرتا پھرتا تھا۔

— اچھا تو اب مجھے یہاں سے بھی بھاگ جانا چاہیے۔

19 — نہیں نہیں میں بڑے گھرانے کی بیٹی ہوں، اس لیے مجھے خموشی سے زہر کھا کر مرجانا چاہیے۔

ان دونوں کو اس عذاب میں مبتلا کر کے اس کے شوہر کی پہلی بیوی جو دعا کرتی رہتی ہے وہ یوں ہوتی ہے:

— اے خدا تو اُس بدذات سے میرے شوہر کو بچا۔

— اے خدا تو اس بے حیا کو موت دے۔

— اے خدا تو اس پر اپنا قہر نازل فرما جس نے میرے شوہر کو مجھ سے اور میری اولاد سے جدا کیا۔

عین اسی حالت میں اگر سابق بیوی کے پاس کوئی عورت چلی جائے تو اس سے یہ بیوی جو گفتگو کرتی ہے وہ یوں ہوتی ہے کہ:

— آہ! بہن کیا کہوں تم سے کہ کیوں بیمار ہو رہی ہوں۔

— اور بیمار کیسی بہن اب تو دعا کرو کہ خدا مجھ کمبخت کو جلد ایمان سے اٹھا لے۔

— تو کیا تمھیں خبر نہیں، بہن کہ وہ یعنی (شوہر) کب سے مجھ سے علاحدہ ہو چکے ہیں۔

— آہ بہن آج پورے تین سال ہوتے ہیں کہ اھوں نے ایک خفیہ نکاح کرلیا ہے اور مجھ دُکھیاری کی صورت سے بے زار ہیں۔ وہ تو یہ بچوں کا واسطہ اور کچھ اپنے باپ کا ڈر ہے کہ دن میں گھنٹے سوا گھنٹے کو آجاتے ہیں، سو ایسے بدحواس کہ بات کرو کہیں کی اور جواب ملے کہیں کا اور مجھ سے تو وہ اُسی وقت سے بات چیت بند کر چکے ہیں جب سے وہ پری اُن کے نکاح میں آئی ہیں۔

— کون؟

— اے بہن وہی جو تمھارے مکان کے سامنے والے پکّے مکان میں رہتے ہیں، ان کی منجھلی بیٹی۔

— ہاں رہنے والی تو یہاں کی نہیں مگر اس کے ماں باپ کو آئے ہوئے ایک عرصہ ہوگیا۔

— خیر بہن میں تو اب چلی قبر میں مگر غم ہے تو ان بے قصور بچوں کا کیونکہ وہ تو اپنے ہوش میں

نہیں ہیں اور خدا کی قسم بہن اگر تم آج کل ان کا چہرہ دیکھوگی تو کبھی نہ پہچانوگی کہ یہ ملا رموزی ہیں تو وہ تو دن رات اُسی غم میں گھلے جا رہے ہیں۔

— اے خدا تمھیں اجر دے گا بہن، اگر تم ملا رموزی صاحب سے مجھے کوئی تعویذ لا دوگی۔

— مگر بہن آج کل تو نہ کوئی تعویذ کام دیتا نہ میری دعا ہی قبول ہوتی۔

— خیر تمھارا کہنا بھی پورا کرتی ہوں، خدا اسی سے انھیں راہِ راست پر لے آئے۔

— تو لو یہ پانچ روپیہ اور اللہ کی قسم بہن میں نے تو خفیہ طور پر انہی تعویذ گنڈوں میں اپنا تمام زیور پھنسا دیا مگر کروں کیا کہ ایک چیز کا بھی تو اثر نہیں ہوتا۔ خدا جانے اس بدذات نے کون سا جادو کیا ہے ان پر کہ وہ ہیں کہ جب پڑھتے ہیں تو اسی کا کلمہ پڑھتے ہیں۔

— خیر تو اب یہ بتاؤ کہ یہ تعویذ تم کب تک لاؤ گی۔

— اور دیکھو بہن میری طرف سے تم ملا رموزی صاحب سے ہاتھ جوڑ جوڑ کر کہہ دینا کہ ملا صاحب خدا نے آپ کو دین کا بزرگ بنایا ہے اور یہ ایک نیک کام ہے، اگر اللہ نے آپ کے تعویذ سے ان کو سیدھا کر دیا تو میں عمر بھر آپ کی لونڈی بن کر رہوں گی۔

اس کے بعد ظاہر ہے کہ تعویذ گنڈوں سے کبھی کچھ نہیں ہوتا بلکہ یہ چیز خلافِ دین اور جاہلوں کو لوٹنے کا ذریعہ ہے اس لیے یہ پہلی بیوی اپنے شوہر کے غم میں اب اس قدر بیمار ہوتی ہے کہ بالآخر وہ مر جاتی ہے یا دوسری صورت یہ ہوتی ہے کہ اس خفیہ بیوی بیوی کی اطلاع پاتے ہی پہلی بیوی اپنے میکے میں چلی جاتی ہے اور اس کے ماں باپ اور بھائی وغیرہ اس کے خفیہ بیوی والے شوہر پر عدالت میں اس عنوان سے مقدمہ چلاتے ہیں کہ:

— نمبر ایک یہ کہ ملا رموزی صاحب اپنی بیوی کو دن کے دو بجے سے عصر کی نماز کے بعد تک مارتے ہیں۔

— نمبر دو یہ کہ یہ ملا رموزی مدعا علیہ اپنی بیوی کو کپڑے نہیں دیتے۔

— نمبر تین یہ کہ ملا رموزی مدعا علیہ اپنے بچوں کو پاس تک نہیں آنے دیتے اور نہ اپنی بیوی سے بات کرتے۔

— نمبر چار یہ کہ ملا رموزی مہینوں گھر میں قدم نہیں رکھتے اور یہ سب کچھ اس لیے کہ اس

ملا رموزی مدعا علیہ نے ایک خفیہ نکاح کر لیا ہے اور اگر عدالت معائنہ کرے تو ہم بتا سکتے ہیں کہ ملا رموزی کی یہ خفیہ بیوی وہ سنیما کے سامنے والے مکان میں رہتی ہے اس لیے۔

— نمبر پانچ یہ کہ عدالت ہماری لڑکی کا مبلغ بیس ہزار روپیہ مہر ملا رموزی کی ذات اور جائیداد سے دلا کر ہماری لڑکی کے طلاق کی کارروائی عمل میں لائے اور ہاں سرفہ مقدمہ بھی ملا رموزی کی تنخواہ سے دلائے۔

اس کے بعد یہ خفیہ بیوی والے ملا رموزی صاحب یا عدالت میں ذریعۂ سمن، وارنٹ گرفتاری یا پھر ذریعۂ وکیل تشریف لے جاتے ہیں جہاں ان دونوں کے رشتہ کا یوں اظہار ہوتا ہے۔

— کیا تم فلاں کی فلاں لڑکی کے شوہر ہو؟

— اچھا تو پھر یہ بتاؤ کہ اس لڑکی سے تمھارا نکاح کب ہوا؟

— کہاں ہوا؟

— کس وقت ہوا؟

— کس کے سامنے ہوا؟

— کس طرح ہوا؟

— کس کے کہنے سے ہوا؟

— اچھا جس وقت یہ نکاح ہو رہا تھا یا ہونے والا تھا یا ہونے کے قریب تھا یا بس ہونے ہی والا تھا یا ہونے ہی کو تھا یا بالکل ہو رہا تھا تو اس وقت تمھارا منہ کس طرف تھا اور تم کس رنگ کے کپڑے پہنے تھے اور تمھارے منہ میں یا منہ کے کسی حصے میں پان بھی تھا یا نہیں یا اگر منہ میں پان تھا تو اس میں الائچی بھی تھی یا نہیں اور اگر الائچی تھی تو اسے کس دکان سے خریدا تھا اور خریدتے وقت اس دکان پر کوئی اور گاہک بھی تھا یا نہیں اور یہ کہ تم الائچی کب سے کھانا سیکھے اور کس کے کہنے سے کھانا سیکھے، تم نے نکاح سے پہلے کبھی الائچی کھائی تھی؟

— اچھا تو یہ بتاؤ کہ جب تمھارا نکاح اس خفیہ لڑکی سے ہوا اس وقت تم اپنی پہلی بیوی اور اپنے خاندان والوں سے اپنے ذمہ کے حقوق معاف کرا چکے تھے یا نہیں؟

— اور بتاؤ کہ جب ایک بیوی اور اس کے چند بچے پہلے سے موجود تھے تو تم نے اس خفیہ بیوی سے کیوں نکاح کیا؟

— اچھا تو یہ بتاؤ کہ اس خفیہ نکاح کی تحریک لڑکی نے کس رنگ کے لفافے کے ذریعہ کی تھی اور یہ لفافہ اس نے کس جھروکے سے باہر پھینکا تھا۔

— اور تم اس لفافے کا جواب دینے شب کے کتنے بج کر کتنے منٹ پر اس خفیہ لڑکی کے مکان کے قریب پہنچے تھے۔

— اور اس وقت اس خفیہ لڑکی کی ملازمہ کو کس قسم کی آواز دے کر تم نے لفافہ لے جانے کو بلایا تھا؟

— اچھا مانا کہ خفیہ لڑکی اپنی ملازمہ کے ذریعہ تمھیں خط بھیجا کرتی تھی اور تم ملازمہ کو روپیہ دیتے تھے۔

— تو یہ بتاؤ کہ کبھی اس ملازمہ نے تمھیں یہ دھمکی کیوں نہ دی کہ دیکھو اگر آئندہ تم کوئی خط ہماری بیگم صاحبہ کے نام لے کر آؤ گے تو ہم تمھارا خط بیگم صاحبہ کے والد کے سیدھے ہاتھ میں دے دیں گے۔ اچھا یہ بھی مانا کہ آج کل گھر کی خدمت گار عورتیں، جاہل اور مفلس ہوتی ہیں اس لیے وہ لالچ میں آ کر ایسے کام کرتی رہتی ہیں اس لیے عدالت کو چاہیے کہ وہ اپنے گھر کی لڑکیوں کو ہمیشہ ماما، دایا اور ملازمہ سے علاحدہ رکھے، مگر تم یہ بتاؤ کہ تم نے اتنے بڑے کے بیٹے ہو کر اس خفیہ لڑکی کے خط کو اپنے حلقے کے داروغہ یا کوتوال کو کیوں نہیں دے دیا تاکہ وہ اس کے باوا کو بلا کر بتا دیتے کہ:

— اے اوالّو دیکھ تو میرے حلقے کا گو بہت بڑا آدمی ہے مگر اندھے دیکھ یہ تیری لکھی پڑھی لڑکی نے ملا رموزی صاحب کے لڑکے کو کیسا خط لکھا ہے، بس اگر آئندہ تو نے اپنی بے حیائی اور عیش پسندی سے اپنی اولاد سے بھی غفلت برتی تو پھر یہ حوالات کی تنگ و تاریک کوٹھری ہو گی، اتنا بڑا آدمی اولاد کا تیری یہ حال ہے بے غیرت بس جا اگر آئندہ تیری بیٹی نے گھر میں ہارمونیم باجہ بجایا ہے تو مزا چکھاؤں گا تجھ کو۔

— ہاں ہاں بے حیا یہ باجہ بجانے ہی سے لکھی پڑھی لڑکی میں آوارگی کے جذبات پیدا ہوتے

ہیں۔ وہ دیکھ کبھی تو نے ملا رموزی صاحب کے گھر سے بھی باجے کی آواز سنی؟

— اور سن اگر اب تو نے کبھی شادی سے پہلے اپنی لڑکی کو پمپ جوتا پہنایا ہے تو تیرے حق میں اچھا نہ ہوگا اور اسی دن تیرا چالان کر دوں گا بے غیرت۔ ابے ہاں! ہم کہتے ہیں تجھ سے کہ جوانی کے عالم میں لڑکی کو نہایت سادہ، میلا اور ادنیٰ قسم کا لباس پہنانا چاہیے، بس زبان بند کر۔ تو کیا جانے انسانی خواص کے ان نازک نکتوں کو۔ اچھا تو اگر تم نے اس خفیہ لڑکی کے خط کو حلقے کے کوتوال کو نہیں دیا تھا تو پھر تمھیں یہ اندیشہ کیوں نہ پیدا ہوا کہ وہ جو میری پہلی بیوی گھر میں تین معصوم بچوں کے ساتھ بیٹھی ہے اس کے مصارف اور حقوق میں فرق نہ آئے گا۔ اچھا تو اگر تم نے اپنی اس مدعیہ بیوی کو ملا رموزی صاحب کے ذریعہ اطلاع دے دی تھی کہ اب میں فلاں صاحب کی خفیہ لڑکی سے شادی کر رہا ہوں تو کیا تم ملا رموزی صاحب کو شہادت کے لیے حاضرِ عدالت کر سکتے ہو؟ اب اگر آپ نے کہہ دیا کہ ہاں تو بس پھر آپ کی بیوی کے اس جھگڑے کو تمام دنیا میں شہرت دینے کے لیے ملا رموزی کے نام اس قسم کا حکم آجائے گا کہ:

> ''عدالت کے پاس امر کے باور کرنے کے لیے بے شمار وجوہ موجود ہیں کہ تم بمقدمہ مسماۃ فلاں بنت فلاں بنام مسمّی فلاں ابن فلاں کے خفیہ نکاح اور اس کی تفصیلات کو اس درجہ کھول کھول کر بیان کر سکتے ہو کہ جواب نہیں لہٰذا تم کو ذریعۂ ہٰذا پابند کیا جاتا ہے کہ تم مورخہ ایک اپریل 1931 بوقت 12 بجے دن کے حاضرِ عدالت ہو کر بیان دو اور جو تم نے اس معاملہ میں کسی حیلے یا بہانے سے کام لیا تو حسبِ دفعۂ فلاں، قانون فلاں، مجریہ فلاں، نمبری فلاں، ضمیمہ ایکٹ فلاں کی دفعہ فلاں ترمیم شدہ ضابطہ فلاں، تعزیرات فلاں بابتہ سنہ فلاں بہ منظوری گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل تمھارے مقابل کارروائی عمل میں لائی جائے گی۔ آج ہمارے حکم اور مہر عدالت سے جاری ہوا۔
>
> دستخط بخط انگریزی حاکمِ عدالت ضلع فلاں، بلدۂ فلاں اور شہر فلاں''۔

اس کے بعد جو ملا رموزی صاحب گواہی کے لیے پہنچے تو ایک بے لکھے پڑھے چپراسی نے

چلا کر کہا اور تین مرتبہ کہا کہ:

— ملاّ رموزی گواہ حاضر ہے؟
— ملاّ رموزی گواہ حاضر ہے؟
— ملاّ رموزی گواہ حاضر ہے؟

اب جو ملاّ رموزی صاحب اجلاس پر پہنچے تو ایک طرف سے آواز آئی کہ کہو کہ میں جو کچھ بیان کروں گا خدا کو حاضر ناظر جان کر اور بہ اقرار صالح ۔ اس کے بعد عدالت نے سوالات شروع کیے:

— کیا آپ مسماۃ فلاں مدعیہ کو جانتے ہیں؟ اور کیا آپ مسمّی فلاں ابن فلاں بی۔ اے پاس کو بھی جانتے ہیں جو اس مقدمہ میں مدعا علیہ ہیں۔

— اچھا تو بتایئے کہ ان بی۔ اے پاس مدعا علیہ نے اپنی حقیقی بیوی کو چھوڑ کر اُس خفیہ لڑکی سے خفیہ نکاح کیا۔ تو آپ اس نکاح میں خود شریک تھے یا کسی سے سنا تھا؟

— آپ کو یہ کیسے معلوم ہوا کہ یہ جو خفیہ نکاح ہو رہا ہے اس میں اس خفیہ لڑکی نے محض اپنے دولت مند عیش پسند اور بڑے گھرانے کے ماں باپ کی غفلت سے فائدہ اٹھا کر یہ آوارگی اختیار کی؟

— اچھا کیا آپ کو یاد ہے کہ وہ 1918 میں جرمنی کی لڑائی ہوئی تھی، اس وقت مدعا علیہ کہاں ملازم تھا؟

— اور وہ جو 1857 کے غدر میں ایک لڑکی شہر بریلی سے بھاگی تھی، اس وقت آپ کی عمر کیا ہوگی؟ ہاں اندازے سے بتایئے، گھبرایئے نہیں۔

— اچھا ملاّ صاحب یہ جو آپ مضامین لکھتے ہیں تو ان کا معاوضہ آپ نے 1929 میں کتنا پایا تھا اور 1930 میں کتنا؟

— اور اچھا ملاّ صاحب یہ بتایئے کہ لوگ باگ آپ کے مضامین پڑھتے وقت تو مارے خوشی اور لطف کے آپ کی بے حد تعریف کرتے ہیں اور جب روپیہ سے امداد کرنے کا وقت آتا ہے تو یہی لوگ بے وقوف، بھولے، ناواقف اور گدھے کیوں ہو جاتے ہیں اور آپ کی

نقد امداد سے کیوں منہ موڑ لیتے ہیں یا پھیر لیتے ہیں اور پھیر لیتی ہیں؟

— اچھا تو جب مدعا علیہ نے اس خفیہ لڑکی سے نکاح کیا تو آپ نے خود دیکھا تھا کہ اس خفیہ لڑکی کے والد صاحب اور بھائی صاحب بیٹھے تاش کھیل رہے تھے اور انھیں غیرت کا پسینہ نہ پیشانی پر آیا نہ بغل کے اندر؟

— اچھا ملا صاحب گھبرایئے نہیں اور یہ تو بتایئے کہ آپ نے مدعا علیہ سے جب یہ کہا تھا کہ دیکھ او احمق اس خفیہ نکاح سے تو اور تیرا خاندان دنیا میں عمر بھر ذلیل رہے گا تو اس وقت مدعا علیہ کے پاس کوئی اور شخص بھی موجود تھا؟

غرض اس قسم کے مقدمہ کا فیصلہ دو تین سال میں یہ ہوا کہ:

''روداد مثل سے ثابت ہے کہ مدعیہ مدعا علیہ کی پہلی بیوی ہے اور اسے مدعا علیہ کے خفیہ نکاح کر لینے سے جو صدمہ ہوا ہے اس سے اسے دق کا مرض ہو چکا ہے، جیسا کہ ڈاکٹر انصاری صاحب کے منسلکہ مثل سرٹیفکیٹ سے ثابت ہے اور ڈاکٹر صاحب کو عدالت خود جنگ بلقان کے زمانے سے جانتی ہے اور جیسا کہ ملا رموزی صاحب گواہ نمبر ایک کے بیان سے ثابت ہے اور عدالت خود ملا رموزی صاحب کو جانتی ہے کہ تمام دولت مند لوگ ملا صاحب کے مضامین سے خوش ہوتے ہیں مگر انھیں نقد روپیہ دینے میں ہمیشہ گھبراتے ہیں، لہٰذا عدالت کے نزدیک ثبوت کافی ہے اس لیے

حکم ہوا کہ

مدعا علیہ اگر اپنی خفیہ بیوی کے پاس رہنا چاہتا ہے تو رہے، مگر اپنی پہلی بیوی کا مہر تعدادی مبلغ بیس ہزار روپیہ اپنی اور اپنے والد صاحب کی جائیداد منقولہ اور غیر منقولہ سے نصف اس وقت ادا کرے اور نصف ملا رموزی صاحب کو دے دے تاکہ وہ اس روپے سے ایک دارالاشاعت قائم کر کے زبانِ اردو میں بہترین اور لطیف کتابیں لکھ کر قوم کو فائدہ پہنچاتے رہیں۔ خرچہ فریقین ذمہ فریقین۔

مدعیہ اور وکیل مدعیہ کی اطلاعیابی لکھالی جائے۔ آج میرے دستخط اور مہر عدالت سے جاری ہوا''۔

اس عام رسوائی اور ذلت کے بعد یہ بیوی ایک مرتبہ آپ کے نکاح سے بھی ''بھاگ جاتی ہے''۔ نکاح سے بھاگ جانے کا یہ مطلب ہے کہ خفیہ نکاح والوں میں ''دائمی اتحاد'' کی وجہ باقی نہیں رہتی، محض اس لیے کہ ابتدا میں کسی خاص جذبے کے تحت دونوں مشتعل ہوتے ہیں اور اسی اشتعال کے تحت ایک دوسرا تمام نقصانات اور ذلتوں کو برداشت کر کے رشتہ پیدا کرتا ہے لیکن اس رشتے کے پیدا کرنے سے پہلے دونوں زیادہ نقصانات برداشت کر چکے ہوتے ہیں، اس لیے اب جو نکاح سے سکون حاصل ہوا تو اب پچھلی خطائیں اور نقصانات یاد آ کر اس حاصل شدہ سکون کو برباد کرتے رہتے ہیں، اس لیے کبھی یہ ہوتا ہے کہ اس بیوی کو شوہر صاحب ہی پہلے راستہ بتاتے ہیں اور پھر اپنے پرانے بیوی بچوں سے جاملتے ہیں اور کبھی یہ ہوتا ہے کہ خفیہ بیوی صاحبہ کسی دوسرے ملا رموزی صاحب کے ساتھ پنجاب میل کے ذریعہ بمبئی اور اگر موقع مل جائے تو ولایت تک بھاگ جاتی ہیں اور یہ ''فرارِ مکرر'' کی قوت ان کے اندر اس لیے پیدا ہو جاتی ہے کہ ''فرارِ اول'' کے وقت ان کے نادیدہ شوہر نے ان کے لیے جو اسباب عیش فراہم کیے تھے زمانہ گزر جانے پر اب اس رنگ کے اسباب فراہم نہیں ہو سکتے۔ دوسرے اس لیے بھی یہ فرار عمل میں آتا ہے کہ اپنے گھر سے بھاگتے وقت مزاج اور غیرت میں جو ضعف اور ذلت پیدا ہو جاتی ہے وہ اب کسی دوسرے فرار سے نادم نہیں ہونے دیتی، اس لیے ایسی بیوی کے لیے سنا ہے کہ عمر بھر اس کے نئے نئے نکاحوں کا سلسلہ ہی ختم نہیں ہوتا۔

اس قسم کی بیوی سے شوہر کی ذہنی قوتیں برباد ہوتی رہتی ہیں اور اسی لیے ان میں خوشگوار کی جگہ پچھلی خطاؤں کی یاد ان کے ہر عیش کو برباد کرتی رہتی ہے۔

اس کی اولاد بھی بے حد بزدل، کمینہ صفات، بے حیا اور ذلیل اعمال اولاد ہوا کرتی ہے اور خصوصاً شوہر اس کی اولاد کی تربیت اور پرورش پر کبھی اُس جوش سے متوجہ نہیں ہوتا جس جوش سے وہ اپنی پہلی اولاد کی طرف متوجہ رہتا ہے۔

البتہ اگر ''بھاگنے والی'' اونچے اور شائستہ گھرانے کی ہے تو وہ اپنی پہلی خطا کے حجاب سے اس شوہر کے حق میں بے حد وفادار، جاں نثار، منتظم اور اولاد کی پرورش میں بھی بے حد سلیقہ مند ہوتی ہے مگر کمی کے ساتھ۔

اس قسم کی بیوی کے لیے یہ امر نہایت درجہ ضروری ہے کہ یا بیوی اعلیٰ درجہ کے گھرانے کی بھاگی ہوئی ہوگی، یا شوہر صاحب اعلیٰ گھرانے سے بھاگنے والے ہوں گے کیونکہ ایسے مشاہدات کم ہیں جب کہ ایک فاقہ کش لڑکی ایک فاقہ کش مزدور کے ساتھ بھاگی بھی ہو اور بیوی بن کر عمر بھر بڑی لیاقت سے بیٹھی بھی رہی ہو۔

یہ بڑھاپے میں بڑی پارسا، بڑی عبادت گزار اور بڑی نیک ہو جاتی ہے۔ امورِ خانہ داری سے خاصی واقف اور زیادہ مقدار میں لکھی پڑھی۔

فی الجملہ اس کی مجموعی تعداد دوسری بیویوں سے کسی طرح کم نہیں۔ البتہ اس کی صحیح تعداد جو ظاہر نہیں ہوتی وہ اس لیے کہ اس کا ہر معاملہ خفیہ ہی رہتا ہے اور رکھا جاتا ہے۔ پھر اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ اگرچہ نکاح اس کو شرعاً معزز و ممتاز بنا دیتا ہے، مگر اخلاقاً ہمارے ننھے میاں کی والدہ کی قسم کی عورتیں اسے اچھی نظر سے نہیں دیکھتی ہیں، اس لیے خدا اس سے بچائے۔ آمین!

اور ہاں وہ خوب یاد آئی کہ کبھی کبھی جب یہ بیوی بننے کے شوق میں گھر سے فرار ہوتی ہے تو اس کے رشتہ داروں کی ''رپٹ'' لکھانے پر یہ کوتوالی میں اس طرح بھی نظر آتی ہے کہ ایک موٹے سے کوتوال صاحب جمائیاں لیتے جاتے ہیں اور اس سے کہتے جاتے ہیں:

— اری ادھر کو ذرا۔
— کھول منہ اپنا تا کہ تجھے پہچانوں۔
— ہے تجھ پر خدا کی مار۔
— اری کمبخت آخر یہ کیا کیا تو نے؟
— تو تجھے شرم نہ آئی اس حرکت سے؟
— آہ کس کی بیٹی ہے اور کہاں نکلی ہے۔
— اری مر جا کمبخت اس بے حیا زندگی سے۔
— کھولو جی داروغہ جی اس کا صندوق، دیکھوں کہ کیا کیا چیزیں لے کر بھاگی ہے۔
— اچھا بند کیجیے اسے حوالات میں صبح کو اس کا بیان لوں گا میں۔
— اور ہاں داروغہ جی ذرا سویرے ہی اس کے باوا کو بلا لینا حلقہ نمبر چار سے۔

— ہاں ہاں! جی وُہی تیس مار خاں صاحب جن کی یہ صاحبزادی ہیں۔
— لعنت ہے ایسے تیس مار خاں پر۔
— اری ہاں سن تو ذرا میری بات۔
— اِدھر آ اِدھر۔
— دیکھ یہ تو بتا کہ تو اب بھی اپنے گھر واپس جانا چاہتی ہے یا نہیں؟
— ہاں ہاں ٹھیک ہے بدذات تو اب کاہے کو واپس جائے گی۔
— اچھا داروغہ جی اس کا بیان تو ابھی لے لو آپ اور صبح کو اس کے باوا کا بیان ہو جائے گا۔
— ہاں تو بتا تیرا پورا نام۔
— اچھا تو جب ملاّ رموزی تجھے بھگانے گیا ہے تو اس کے ساتھ تو دروازے سے نکلی تھی یا دیوار پھاند کر بھاگی؟
— ذرا زور سے جواب دے ورنہ طمانچہ دوں گا اُلٹے ہاتھ کا تو منہ سے خون ڈالے گی ابھی بدمعاش کہیں کی۔
— اور جب نہ غیرت آئی جب گھر سے بھاگی تھی تو؟
— اور ہاں ذرا اِدھر آؤ میاں ملاّ رموزی صاحب۔
— کیوں جناب یہ آپ نے کیا حرکت کی؟
— ہاں ہاں سچ کہتے ہو آپ۔
— یہی بدمعاش ہے۔
— اجی وہ تو میں کہوں نا کہ مجھے اس کوتوالی میں آئے ہوئے یہ گیارھواں برس ہے۔ مجھے تو اس گھر کی سب کیفیت معلوم ہے۔ وہ آج سے چند سال پہلے اس بدذات کی خالہ بھی تو بھاگی تھی اسی طرح۔
— کیوں جی داروغہ جی صاحب یاد ہے آپ کو وہ جب ہم آپ اسے ریل گاڑی سے اتار کر لائے تھے اسٹیشن سے؟

اِن حالات پر فیصلہ کیجیے کہ یہ بیوی شوہر کے حق میں کتنی مفید ہوسکتی ہے؟ فقط۔

◆◆◆

اپنی بیوی

اس بیوی کا شوہر ''اخبار نویس'' قوم کا فرد، مصنف اور ادیب برادری کا رکن ہوتا ہے۔ پھر ایسا عظیم الشان رکن کہ اس کی تحریری قیادت و رہنمائی کے لطیف تر اثرات پشاور سے لے کر مدراس اور کلکتے سے لے کر بمبئی تک قبول کیے جاتے ہیں۔ اور اُس کی شہرت و بلند آوازگی ہندستان سے نکل کر مکے شریف اور جنوبی افریقہ تک کے اُن لوگوں میں پہنچی ہوئی جو ہندستانی ہیں اور اردو کے اخبارات، رسالے اور کتابیں پڑھتے ہیں۔ اس کی محبت اور اس کے عزیز تر منزلت کے لیے کوتوالوں کے دلوں میں بھی جگہ ہوتی ہے اور سی۔ آئی۔ ڈی والوں کی آنکھوں میں بھی۔

اس کی تحریر کی آزادی، بے باکی، جرأت، نکتہ آفرینی و حکمت آموزی، نکتہ چینی و فاش گوئی میں وہ لطافت و شیرینی کہ تو بھی قربان اور میں بھی قربان۔ یہ بھی نثار اور وہ بھی نثار۔ اس کے طنز و طعن اور اصلاحی شدتِ بیان سے نہ تانگے والے محفوظ، نہ تمباکو فروش محفوظ، نہ ایڈیٹر محفوظ، نہ لیڈر محفوظ، نہ حکومت محفوظ نہ شاہانِ سطوت پناہ کو پناہ، نہ جھوٹے پیر فقیر محفوظ، نہ تعویذ نگار اور ''گنڈہ نویس'' محفوظ، نہ اسکول والے محفوظ، نہ اسکول ''والیاں'' محفوظ، نہ ہندو محفوظ، نہ مسلمان نہ سکھ نہ پارسی، نہ غریب نہ امیر، نہ وہ برطانیہ کے مسٹر لائیڈ جارجوں کو پناہ، نہ فرانس کے پائنکاروں اور نہ اٹلی کے مسولینیون کو امان، نہ جرمنی کے ہنڈن برگوں کو ڈھیل۔ بس اگر اس میں کوئی تحریری عیب ہوتا

ہے تو یہ کہ نقد روپیہ دینے والوں، نقد نوٹ اور اشرفیاں دینے والوں کی خوشامد کرتا ہے اور صاف کہہ بھی دیتا ہے کہ "یہ خوشامد ہے"۔

یہ ایک نہایت غریب گھرانے سے پیدا ہوتا ہے اور غریب استادوں سے تعلیم پاتا ہے۔ سو وہ بھی دینِ اسلام اور شریعتِ اسلام کی۔ یہ مڈل وڈل کی نہیں مگر پھر جو اس کی تحریر ایم۔ اے پاسوں میں مقبول ہوتی ہیں تو صرف اس لیے کہ:

قبول عام و سخن گستری خداداد ست

یہ جسم اور صحت کے لحاظ سے نہایت باریک، مہین اور افسردہ صورت کا ہوتا ہے۔ اسے دیکھ کر کہا جا سکتا ہے کہ یہ کوئی لطیف انشا پرداز اور ادیب نہیں بلکہ کسی "کارخانۂ شکر سازی" کا درجہ سوم مزدور ہے۔ وہ باصف اس قدر مقبول و محبوب ادیب اور مضمون نگار ہونے کے دن کی روشنی میں ایک نیلام کے قابل بائیسکل پر بیٹھا ہوا گزارے اور ملازمت کی فکروں اور پریشانیوں میں یوں مبتلا پھرتا ہے کہ اس کی ظہر کی نماز بھی قضا ہو جاتی ہے مگر اس کی قوم اسے اس بدحواسی میں مبتلا پا کر بھی اتنا ہی کہتی ہے کہ "عمدہ سا مضمون تو سناؤ" مگر جب وہ رات کی تاریکیوں میں امریکہ کی دھواں اُڑانے والی لالٹین کے سامنے لکھنے بیٹھتا ہے تو اس کا دماغ گلزار و گلشن کی فردوس آفریں رنگینیوں اور لطافتوں، مناظرِ قدرت کی شباب افروز اور جمال آرا صنعتوں، حسینوں کی عالم آشوب نزاکتوں اور نفاستوں، علم و ادب کی فصاحتوں اور بلاغتوں، سیاست و نظم مملکت کی عقل آزما ترکیبوں اور تدبیروں، شعرا و فصحا کی تاویلوں اور تاثیروں، اربابِ حرب و ظلم کی خوں ریزیوں و خوں آشامیوں، اصحابِ دولت و مقدرت کی تن آسانیوں اور عیش سامانیوں، ادیان و مذاہب کی خدا شناسیوں اور خدادانیوں اور خواصِ انسانی کی نازک تر ہشیاریوں اور نادانیوں۔ غرض تمام قسم کی "نیون" پر حاوی ہوتا ہے اور ندرت و لطافت، سلاست و حکمت اور اصلاح و ترقی کے وہ حسین و دلفریب نکات و جواہر صفحۂ کاغذ پر بکھیرتا ہے کہ دشمن بھی پڑھے تو کہے حبّذا اور دوست پڑھے تو کہے مرحبا اور یہ سب کچھ اس لیے کہ وہ اپنے ہر کام میں خود کو خدائے عرش و جاں آفریں اور وحدہٗ لاشریک کا بندۂ بے قید اور نبی عرب و عجم علیہ الصلوٰۃ والسلام کا غلامانِ غلام مانتا ہے اور کہتا ہے۔

پھر ایسے دماغ والے شوہر کو جتنی حسین، جتنی پری، جتنی بیدار مغز، جتنی ذی ہوش، جتنی تعلیم

یافتہ، جتنی دولت مند، جتنی تیز وطرار، جتنی محبت کرنے والی اور جتنی نفیس بیوی کی ضرورت ہوسکتی ہے ظاہر ہے۔ اور اسی دماغی صلاحیت کی بنا پر وہ کوشش کرتا ہے کہ اسے جو بیوی ملے وہ مذکورہ بالا قسم کی ہو اور عجب انگیز بات یہ کہ اسے ایسی بیوی حاصل ہو جانے کی کوشش میں ذی مقدرت رؤساو ارباب اقتدار خاص امداد بھی دیتے ہیں، مگر رسم پرستی اور جاہلانہ معتقدات وملفوظات کے تحت اسے مجبور کیا جاتا ہے کہ وہ ''غریب گھرانے کی بیوی'' کرے، اس لیے کہ دیکھو میاں اگر تم نے کسی بڑے گھرانے کی بیٹی بیاہی تو ساس سسر ہمیشہ اس کی نظر میں ذلیل وخوار رہیں گے۔

— اور دیکھو میاں وہ ہر بات پر اپنے دولت مند ماں باپ پر غرور کرے گی اور ہمیں ذلیل سمجھے گی۔
— اور دیکھو میاں یہ اسکول کی پڑھی ہوئی ویسے بھی زبان کی بہت تیز اور گستاخ ہوا کرتی ہیں۔
— اور دیکھو میاں وہ جتنے بڑے گھرانے کی ہوگی اتنا ہی اونچا لوازمہ اور ساز وسامان طلب کرے گی اور ہم تم ویسے ہی کیا کچھ کم غریب ہیں۔ تو ایسی صورت میں ہم کس طرح اس کی فرمائشیں پوری کریں گے؟
— اور دیکھو بھیا ہم تو خود جس حیثیت کے ہیں ویسی لڑکی بیاہنا چاہتے ہیں۔
— اور جو تم کسی رئیس، کسی امیر اور کسی اسکول ہی کی لڑکی سے شادی چاہتے تو تمھیں تمھارے نفس کا اختیار ہے، مگر پھر ہم سے کوئی علاقہ نہ رکھنا۔
— اور سن لو وہ تمھارے چچا میاں کیا کہہ رہے ہیں؟
— ہاں بیٹے بات تو ٹھیک فرما رہی ہیں تمھاری نانی اماں کیونکہ گو تم ماشاء اللہ آج کل کے ''علم دار نوجوان ہو'' مگر اتنا ہم ضرور کہیں گے کہ ان معاملات میں تم ابھی ہمارے تجربہ کو نہیں پہنچے ہو اور وہ دیکھو نا وہ میاں غلام قادر خاں نے اپنے بیٹے کی شادی جب سے جاگیردار صاحب کی لڑکی سے کی، اس وقت سے وہ اپنے بیٹے ہی سے ہاتھ دھو بیٹھے ہیں۔ اب ان کے صاحبزادے صاحب ہیں کہ مالدار بیوی کے غلام ہو کر رہ گئے ہیں، اب وہ نہ ماں باپ کو پوچھتے ہیں نہ بہن بھائی کے شریک۔

— تو میاں اب اگر ایسی ہی شادی تم بھی چاہتے ہو تو بقول تمھاری نانی اماں کے تمھیں تمھارے نفس کا اختیار ہے، ہماری رائے لو تو ہم تو یہی کہیں گے کہ تم اسی لڑکی پر راضی ہو جاؤ جس کے لیے نانی بی فرما رہی ہیں۔

— ہاں ہاں مانتے ہیں کہ لڑکی جاہل ہے اور ایک حرف نہیں جانتی مگر یہ کتنی بڑی بات ہے کہ مانے ہوئے پٹھان کی بیٹی ہے اور اس کے خاندان کے ایک ایک آدمی کو میں آج سے نہیں جب سے جانتا ہوں کہ تم ماشاءاللہ اس وقت پیدا بھی نہیں ہوئے تھے اور بولتے کیوں نہیں ہیں خالو میاں آپ؟

— ہاں بھئی کیا بولوں اب آج کل کے لونڈے تو اپنے بڑوں اور بزرگوں کو الّو سمجھتے ہیں۔

— ارے بھئی یہی عیب ہے نا کہ لڑکی اَن پڑھ ہے مگر یہ بھی سوچا ان صاحبزادے نے کہ تم آخر اس نے کیا ملازمت کراؤ گے، پھر لکھی پڑھی کی شرط کیسی؟

— اور ہم نے تو ایسیوں کا جو حشر دیکھا ہے بس اے خدا تو بچانا ہر مسلمان بھائی کی اولاد کو ایسی رسوائی سے۔

— ارے بھئی وہ سامنے تو ہے تمھارے وہ سکسینہ صاحب کے لڑکے کی لکھی پڑھی بیوی کا معاملہ، استغفر اللہ، لاحول ولا۔

— خیر تو بھائی جھگڑا ہی کیا ہے، اگر ان میاں کو ہماری خاطر منظور ہے تو اس لڑکی کو منظور کر لیں ورنہ یہ جانیں اور ان کی حمایتی جانیں۔

— خدا کی شان ہے ماموں صاحب کہ آج کل کے لونڈے کس درجہ بے حیا ہو گئے ہیں جو اپنے بزرگوں سے یوں کہتے ہیں کہ لڑکی ہم خود نہ دیکھیں گے جب تک شادی ہی نہ کریں گے اور ماموں میاں فرمایئے کہ ہماری آپ کی بھی شادیاں ہوئی ہیں اور ہمارا آپ کا بھی جوانی کا زمانہ تھا کہ اس زمانے کا لائق سے لائق لڑکا بھی ان معاملات میں منہ سے ایک حرف نہیں نکالتا تھا بس جو کچھ اس کے بزرگوں نے کر دیا اسے صبر و شکر سے قبول کر لیا اور اسی لیے تو ماموں میاں صاحب اس زمانے کے ہر کام میں برکت تھی اور خدا بھی خوش رہتا تھا۔

— اچھا تو بس نانی بی چپ ہو جایئے آپ اب اگر ان میاں کو ہم لوگوں کی مرضی پر چلنا ہے تو پھر یہ جو آپ نے لڑکی پسند کی ہے یہ موجود ہے اور آج مجھے بھی اس کے چچا ملے تھے، کیسے خلیق اور کیسے سچے مسلمان کہ خدا کی قسم مصافحہ کرتے ہی مجھے گلے لگالیا اور فرمانے لگے کہ میاں اشرف علی میرے بھائی کی بیٹی کو تم اپنی ہی بچی سمجھو۔ اسی طرح تمھارا بچہ میری اولاد ہے۔ پھر یہ کیا ہے کہ کل عورتوں کو بھیجو گے تو پرسوں لڑکے کو سلام کے لیے لاؤ گے، بس تم تو حکم خدا اور رسول کے موافق بسم اللہ کرو، نیک کام میں جلدی کرنا ہی اچھا ہوتا ہے۔ اور ویسے بھئی تمھاری مرضی، لڑکی موجود ہے جب چاہو آ کر دیکھ لو۔ ہاں بھئی اس میں تو شک نہیں کہ بڑے بھیا صاحب نے اسے لکھایا پڑھایا نہیں ہے۔ ہمیشہ اپنے ساتھ دیہات پر رکھا۔ یہاں تک کہ خدا کی قسم اس لڑکی کو بڑے بھیا نے آج تک یہ کھڑی ایڑی کا جوتا بھی نہیں پہنایا، بس بھئی شریفوں کی بیٹیوں کی طرح وہ تو سینا پرونا اور چولہا چکی جانتی ہے، آگے تمھاری مرضی۔ ہم زور نہیں دیتے کہ تم ہماری ہی لڑکی سے کرو۔

یوں قسمت پھوڑی جاتی ہے آج کل کے تعلیم یافتہ، روشن خیال، ترقی یافتہ اور جدید ذہنیت کے نوجوانوں کی ان 308 قبل مسیح کی پیدائش کے بزرگوں کے ہاتھوں۔ گویا لڑکا جو شادی کرتا ہے وہ اپنے لیے نہیں بلکہ ان جاہل اور رسم پرست رشتہ داروں کے لیے۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اس قسم کی بیوی کا شوہر بھی ایسے ہی بزرگوں کے ہاتھوں ہلاک ہو کر رہ جاتا ہے اور اپنی ان تمام کوششوں کو برباد کر دیتا ہے جو وہ اپنی ہی ذہنیت، اپنی ہی قابلیت اور اپنی ہی ایسی عقل کی لڑکی کی تلاش کرنے کے لیے کر رہا تھا، اس لیے ایسے شوہر کو جیسی ملتی ہے وہ یوں ہوتی ہے کہ وہ ایک ایسے گھرانے میں جنم لیتی ہے جہاں عورتوں کو تعلیم دینا گناہِ عظیم سمجھا جاتا ہے، اس لیے صرف یہی نہیں کہ اسے پانا جانا اور یاد کرو بچے اور معنی والی کتابیں نہیں پڑھائی جاتیں بلکہ قاعدۂ بغدادی کے آئیون، تائیون، راکعون، ساجدون تک پڑھا کر جو چھٹی دی جاتی ہے تو غریب کو نماز روزے تک کے مسائل نہیں سمجھائے جاتے۔ بس سارا خاندان اس خیال سے خوش رہتا ہے کہ خدا نے بیٹی تو دی اللہ اس کی قسمت سے شوہر بھی اچھا دلائے۔ یہی حال امورِ خانہ داری، آدابِ شوہری اور سسرالی ضوابط سے بے خبری کا ہوتا ہے۔ بس پلنگ کے تکیوں پر لال پیلے رنگ کے تاگے سے ایک آدھ آڑا ترچھا

پھول بنا کر لڑکی کو خود اطمینان ہو جاتا ہے کہ میں پھول بھی تو بنا لیتی ہوں اور میرے اندر کیا چاہیے۔
اِدھر کچھ زمانے کا آلۂ تفریح بھی یہ رہا ہے کہ بے ایمان افسر کو ایماندار ماتحت ملتا ہے۔ مذہب کے
دشمنوں کو دولت وحکومت ملتی ہے، مسجدوں میں بیٹھ کر یونان اور دمہ کے حکماء وفلاسفہ کے علوم
پڑھنے والوں کو مساجد کی امات اور مردہ شوئی کی روزی اور کالجوں کے بے نماز اور رٹے ہوئے
ایم۔اے پاسوں کو بنگلہ بھی، موٹر بھی۔اسی طرح حسین و نازک بیوی کو حبشی اور دبوصورت شوہر اور
صاحبِ شعور و کمال ملّا رموزیوں کو بھونڈی اور کندۂ ناتراش بیویاں اور وہ دیکھو ناک اگلے وقتوں
میں شہر شیراز میں ایک حافظ صاحب یہی کہتے ہوئے مرے کہ:

اسپ تازی شدہ مجروح بہ زیرِ پالاں
طوقِ زرّیں ہمہ در گردنِ خری بینم

اور اس زمانے میں وہ انگلستان کے دل کا سرور اور آنکھوں کا نور چارلی چپلن ایسا خوش دل
وخوش طبع اور روتوں کو ہنسانے والا ظریف ایکٹر ایک ایسی ہی بھونڈی، بدقوارہ اور ناقدرداں بیوی
سے الجھا دیا جاتا ہے، جس کے ساتھ ''مارے مقدمے بازیوں کے'' بے چارے کی ساری زندہ دلی
اور خوش مذاقی خاک میں مل جاتی ہے۔ وہ تو کہیے کہ چارلی چپلن ایک کمال پرور قوم کا فرد ہے جو
اپنے ہاں کے ہنرمندوں اور صاحبانِ کمال پر دولت کے خزانے قربان کرتی ہے، اس لیے چارلی
چپلن اپنی دولت مندی کے باعث اپنی اس علامۂ وقت بیوی سے طلاق کے ذریعہ جلد نجات
پا جاتا ہے، مگر جب آپ ایسے ہندستانی کمال پسندوں میں کوئی قومی انشاء پرداز مبتلائے مصیبت
نظر آتا ہے یا ''مبتلائے بیوی'' تو آپ لوگ اگر حد سے سوا قدردانی پر اتر آئے تو ٹھنڈی سانس
لے کر ایک آہ بھری اور دوسری تفریحات میں مصروف ہو گئے۔اب چاہے آپ کی اس بے اعتنائی
اور ہنر ناشناسی سے آپ کی زبان، آپ کے ادب، آپ کی اخبار نویسی اور آپ کی تالیف وتصنیف کا
ایک مایہ نازش فرد اپنی تنگ دستی سے مرجائے یا کوئی ملّا رموزی اپنی اس قسم کی بیوی کے ہاتھوں اپنی
لطافت آفریں زندگی کو کھودے مگر دونوں صورتوں میں وہ نہ اس بیوی کو طلاق دے سکتا نہ کسی دوسری
سے دوسرا نکاح کر کے بقیہ ایام قوم کی خدمت گزاری کی خاطر خوشگوار بنا سکتا۔لعنت ہے ایسی رسم
پرستی پر اور رحمت ہو ایسے میاں بیوی پر (آپ یہ سمجھنا کہ ملّا رموزی صاحب مذاق فرما رہے ہیں)

بہرکیف! یہ بزرگوں کی لائی ہوئی ''بیوی صاحبہ'' ہزاروں مسرفانہ اور جاہلانہ رسوم کے ساتھ جب شوہر کے گھر تشریف لاتی ہیں تو ''رسمِ غریبانہ'' کے تحت مہینوں ان کے اخلاق وعادات اورخواص وکمالات کا پتہ اس لیے نہیں چلتا کہ ان کے شوہر کے تمام رشتہ دار اس جوش میں ان سے محبت کرتے رہتے ہیں کہ یہ ''ان کی پسند کردہ'' اور ''آوردہ'' ہیں، لیکن کب تک۔ اب جو انھیں امورِ خانہ داری کا ''چارج'' دیا جاتا ہے، تو ''ہر کام میں صفر'' ایسے مواقع پر ان کے سسرال والیوں میں جو ''مذاکرۂ عورتانہ'' برپا ہوتا ہے وہ یوں کہ:

— بہن ابھی دن ہی کتنے گئے ہیں۔
— اور ویسے بھی ابھی بچی ہے۔
— آتے ہی آئے گا سلیقہ۔
— اور ابھی دن بھی تو حجاب کے ہیں۔
— مگر کیوں بہن تو یہ نماز بھی تو نہیں پڑھتی ہیں دلہن۔
— تو وہ کہا نا میں نے کہ بس شرماتی ہیں۔
— اے آپا اللہ کی قسم دُلہن کو آج دیکھ لیا میں نے وہ تو نماز بالکل ہی نہیں جانتی ہیں۔
— توبہ کرو بیوی کیسی باتیں کرتی ہو آخر مسلمان کی بچی ہے۔
— اچھا تو تم ذرا مغرب کی نماز چھپ کر دیکھنا اگر وہ صحیح صحیح پڑھ لیں تو جو چور کی سزا وہ میری۔
— اِناللہ ہے ہے بہن لڑکے کی تو قسمت ہی پھوٹ گئی۔ اے وہ کیا کہا تھا اس وقت جمیلہ نے کہ بھابی جان کو صحیح نماز پڑھنا بھی نہیں آتا۔ تو سچ تو کہا تھا اس نے اس وقت تو مجھے یقین نہیں آیا تھا مگر جب بچہ آیا یعنی ان بیوی کا شوہر تو میں نے اس سے دریافت کیا کہ کیوں بیٹے تمھارے سامنے بھی دلہن نے نماز پڑھی کبھی۔
— بس کیا کہوں تم سے کہ مجھے کیسا قلق ہوا ہے جب لونڈے نے گردن جھکا لی اپنی۔
— میں فوراً سمجھ گئی کہ لونڈا شرماتا ہے مجھ سے اور ''واقع'' میں دلہن کو نماز نہیں آتی، اس لیے بہن اب میرا تو فرض تھا میں نے دلہن سے جو دریافت کیا تو پہلے تو کچھ انھوں نے چھپانا چاہا اس کو مگر بہن معاملہ تھا دین اسلام کا، اس لیے جب میں نے انھیں مجبور کیا تو بے

چاری نے صاف صاف کہہ دیا کہ ہمارے تو خاندان میں بھی کوئی نماز نہیں پڑھتا۔ ہے ہے بہن یہ سننا تھا کہ میں کانپ گئی۔

— اے بہن تو پھر میں پوچھتی ہوں تم سے کہ آخر یہ میاں تیس مار خاں نے کیا سکھایا اپنی بیٹی کو یعنی دلہن کے باپ نے؟

— آہ بہن میرے تو تمام ارمان خاک میں مل گئے۔

— اور سنو اب میں کہنے پر ہی آئی ہوں تم سے تو اب کیا چھپاؤں تم سے؟

— اے وہ جو کل میں نے بیوی سے (دلہن سے) روٹی پکوائی تو یقین نہ کرو گی بہن تم کہ جو روٹی دیکھو وہ کوئلہ اور اس پر جواب کیا دیا بیوی نے کہ ہم نے اپنے گھر پر روٹی پکائی ہی نہیں اب تو بہن آگ لگ گئی اور میں نے کہا کہ دلہن تو پھر تمھارے گھر میں کوئی ملازمہ بھی تو کبھی نہیں دیکھی پھر تمھارے گھر بھر کے لیے آخر چولھے چکی کا کام کون کرتا تھا جو تمھارا یہ حال ہے؟
تو فرمانے لگیں کہ کرتا کون تھا، ہماری بھاوج صاحبہ سب گھر کو سنبھالے ہوئے ہیں۔

— آہ بہن کیا کیا کہوں تم سے کہ اب ان بیوی کے کیا کیا راز کھل رہے ہیں؟

— خیر سب جانے دو مگر یہ دیکھو کہ بیوی صورت کی بھی ایسی کھرّی (خشک) واقع ہوئی ہیں کہ ہم آپ اگر بیٹھ کر کوئی ہنسی مذاق کی بات کریں تو چاہو کہ وہ اللہ کی بندی بھی کچھ ہنسے بولے تو اس کا نام تک نہیں، بس جو ایک کونے میں منہ بنا کر بیٹھیں تو دن بھر کوئی نہ بولے تو وہ نہ گھبرائیں۔

— اب کہو تو بہن کہ بچے کا مزاج تو ہے ایسا کہ وہ روتوں کو ہنساتا رہتا ہے اور بیوی آئی ہیں سو برس کی بوڑھی ہو کر۔ اب میں سوچتی ہوں کہ آخر اب ہوگا کیا؟ بیوی کیا بن کر آئیں کہ لونڈے کی زندگی برباد کر دی۔ خیر وہ لکھی پڑھی نہیں تھیں تو نہ سہی مگر بہن وہ غریب تو کس کام ہی کی نہیں جو بات پوچھو اس کا یہ جواب کہ ہمارے خاندان میں تو ایسا ہوا ہی نہیں تو میں کہتی ہوں تم سے کہ آخر ان کے گھر میں پھر ہوتا کیا تھا؟

— آہ صبر ہے بہن صبر۔

— اے بہن میں تو لُٹ گئی، تم دیکھنے والی ہو کہ میں نے اس بچے کے ارمان کے لیے کیا کچھ خرچ نہ کیا۔ بارات لے گئی تو ایسی کہ محلے میں کسی کی دیکھی ہو تو تم کہہ دو۔

— رسموں میں کوئی ایک رسم چھوڑی ہو تو بتا دو۔

— منگنی، نکاح اور ولیمہ جیسا کچھ کیا ہے خدا جانتا ہے یا تم، ماں بہنیں دیکھنے والی ہو پھر اس پر بیوی کا دماغ تو دیکھو کہ آج شلوار کی فرمائش کر رہی ہیں تو کل قمیص کی۔ ارے اور بھی سنا تم نے اچھن کی پھوپھی کہ بیوی نے اپنے منہ سے فرمایا کہ آپ جو سارے ہندستان میں مشہور تو ہم تب جانیں آپ کو کہ ہمیں بھی سارا ہندستان دکھا دو۔

— مگر اے اللہ تو نے جیسا میرے بچے کو نیک کیا ہے ''جملہ جہان کے'' بچوں کو ایسا ہی نیک کرنا کہ اس نے آج تک میرے سامنے اتنا بھی اشارہ نہ کیا کہ میں سمجھ لیتی کہ اسے اس پھوہڑ سے کتنی تکلیف ہے۔

— خیر میں نے بھی بہن کہہ دیا کہ بیٹے اللہ تمھیں ہزار سال کی عمر دے جو کچھ ہونا تھا وہ تو ہو گیا مگر اب انشاءاللہ میں کراتی ہوں تمھاری مرضی کی دوسری شادی۔ دیکھوں تو اب میرا کوئی کیا کرتا ہے۔ بس بیوی رہیں اور روٹی کھائیں، میں لونڈے کی زندگی تو یوں برباد نہ ہونے دوں گی؟ اللہ نے اسے کیا ہے بہن مرد کی صورت زندہ ہے تو انشاءاللہ ان ایسی دس لے آئے گا۔

القصہ اس قسم کی بیوی کا شوہر چوبیس گھنٹے اپنی بیوی کو روتا ہے مگر دس کی جگہ دوسری ڈیڑھ بیوی بھی نہیں کرتا۔ اس احساس سے کہ اپنے عیش کی خاطر وہ دوسرے متعلقین کے حقوق کو کیوں پامال کرے۔

ان حالات کے بعد جب اللہ پاک ایسی بیوی کو مبلغ ایک بیٹا عطا فرماتا ہے تو اس کے صاحبِ اولاد ہونے کا نخرہ آسمان سے اونچا ہو جاتا ہے۔ اب اس کی ہر حرکت میں وہ بڑھاپا نظر آتا ہے گویا ایک ہی بیٹے پر آپ دس بیٹوں کی والدہ ہو چکی ہیں۔

اب گھر بار اور شوہر کی ہر ذمہ داری سے آپ ڈھائی میل دور بیٹھی اپنے اس گندے اور قحط مدہ سے بیٹے کو لیے اس ادا سے کھلا رہی ہیں گویا کوئی سوا سو برس کی دادی اماں اپنے پوتے کو سنبھال

رہی ہیں۔ کہیں چھ پر اسے پیار فرماتے ہیں تو کسی کونے میں جا کر اسے کپڑے پہناتی ہیں اور جو کوئی محلے کی ان کے پاس آ جاتی ہے یا کوئی نند قریب بیٹھ جاتی ہے تو نہایت بوڑھے لہجے میں اسے اپنے لاڈلے کے خواص و عادات سناتی ہیں۔ حالانکہ ابھی وہ دس دن ہی کا ہے اور آپ خود چودہ برس کی لونڈیا مگر بہت زیادہ گہری سانس لے کر فرمائیں گی:

— ارے کیا پڑا ہے سلام کر پھوپھی اماں کو۔

— ادھر دیکھ ادھر یہ ہیں چھوٹی پھوپی تیری او الّو۔

— ذرا خدا تجھے عمر تو دے پھر بتاؤں گی تجھ کو اس وقت کے سلام نہ کرنے کا تماشہ۔

— کیا بتاؤں خالہ بی آپ کو کہ ابھی سے اس قدر شریر نکلا ہے یہ کہ بیان نہیں کر سکتی اور انھیں تو ایسا پہچانتا ہے کہ بس جہاں وہ گھر میں آئے اور اس نے ہاتھ پاؤں مارنا شروع کیا۔

— وہ کھانا کھانے بیٹھے اور اس نے انھیں گھورنا شروع کیا۔

— مگر قسمت کا ایسا خراب ہے یہ کہ انھیں اس سے محبت نہیں بلکہ خدا کی شان کہ یہ جتنا ان کی طرف بڑھتا ہے وہ اتنا ہی اس سے نفرت کرتے ہیں۔

— اری دیوانی ہوئی ہے تو۔ دنیا کے باپ اول تو ہوتے ہی ہیں بے رحم جلاد، یا پھر انھیں بچے سے اُس وقت محبت ہوتی ہے جب وہ کھیلنے کودنے اور باتیں کرنے کے قابل ہوتا ہے، ابھی اللہ اسے عمر دے وہ ہے کتنے دن کا؟

— خیر خالہ بی خدا آپ کو خوش رکھے کہ آپ نے مجھ بدنصیب کو اتنا سمجھا دیا ورنہ اس گھر میں (سسرال میں) تو مجھے کوئی اتنا سمجھانے والا بھی نہیں۔

— جب سے بیاہ کر آئی ہوں کیا بتاؤں کہ کیا کیا تماشے دیکھ رہی ہوں؟

— ہاں خالہ بی سچ ہے کہ میرے ہی میکے والے ایسے کہاں کہ میرے ہمدرد اور عاشق ہیں۔

— یہ ہی دیکھو آپ کہ ماشاءاللہ آج پورے چھ مہینے کا ہونے کو آیا مگر نہ تو وہ اس کے ماموؤں کو اس کے دیکھنے کا خیال آیا نہ کسی اور کو اور وہ جن کی اولاد ہے انہی کو خیال نہیں تو پھر شکایت کس کی؟

— خیر خالہ بی ابھی تو کچھ نہیں کہتی بس ذرا خدا ان میاں کو ہوشیار کر دے۔

مزاج میں وہ بلغم اور خشکی کہ اس کا ظریف ولطیف شوہر اسے جتنا خوش رکھنا چاہتا ہے یہ اتنا ہی خشک چہرہ بنائے رہتی ہے۔ نہ اس کے چہرہ پر تبسم نہ ہنسی، جب دیکھیے ماتمی چہرہ سامنے موجود ہے۔ صفائی کے عوض گندہ پن وہ کہ اگر شوہر ایک ہفتہ میں لباس بدلے تو یہ پندرہ دن میں۔ سستی اور کاہلی وہ کہ آٹھ بجے شب سے سوئے تو دوسرے دن کے آٹھ بجے صبح تک بھی اگر کوئی بیدار نہ کرے تو یہ بستر میں یوں نظر آئے گویا ابھی ابھی انتقال ہوا ہے۔ روٹی اور کپڑے کے معاملات کے سوا دنیا کے ہر کام اور ہر معاملے سے یکسر بے خبر۔ جمود بے حسی وہ کہ جس بات کو دس مرتبہ سمجھاؤ اسے بھی بھول جائے اور جسے ایک مرتبہ سمجھاؤ اسے بھی بھول جائے، اس پر بھی مزاج میں ضد، اکڑ، غرور، نخرہ اور خموشی ایسی کہ صورت سے خوف معلوم ہو۔ ایسی ہوا کرتی ہیں ملا رموزیوں کی بیویاں۔ یعنی دنیا میں نہیں تو کم از کم ہندستان میں بے مرضی شادی کے 99 فیصدی نتائج ایسے ہی موجود ہیں۔ بالخصوص اربابِ علم وفضل اور اصحابِ بصیرت وفراست کو ہمیشہ ایسی ہی بیویاں نصیب ہوئی ہیں اور یہ صرف اس لیے کہ ہندستان میں شادی کے ٹھیکدار دولہا دلہن کے ماں باپ اور رشتہ دار ہوا کرتے ہیں اور دولہا دلہن آخر وقت تک ایک دوسرے کی صورت، سیرت اور عام حالات سے قطعاً بے خبر رکھے جاتے ہیں۔ حالانکہ اتنی سختی نہ شریعت میں جائز نہ قانون میں، مگر جاہلانہ رسم پرستی ہے کہ 99 فیصدی بے مرضی شادی کے ذریعہ ہندستانیوں کی ''حیاتِ ازدواجی'' کو برباد کررہی ہے۔ ممکن ہے کہ آج سے پچاس برس بعد انسان کے طبعی اور تمدنی ارتقا کے باعث اپنی مرضی اور پسند کی شادیاں ہندستان میں رواج پاسکیں، اس وقت اگر موقع ملا تو آپ کے ملا رموزی صاحب بھی دوسری شادی فرمائیں گے انشاءاللہ۔

اس قسم کی بیوی کی شادی کی رسوم اور تفصیلات کو اگر ملاحظہ فرمانا ہو تو ملا رموزی کی لکھی ہوئی کتاب بنام ''شادی'' ''منیجر صاحبِ رسالہ ''عالمگیر'' لاہور سے طلب کیجیے یا ''ملا رموزی صاحب'' بھوپال سے۔ یہ کتاب 1930 میں شائع ہوچکی ہے۔

اب یہ آپ کی مرضی کہ آپ اس بیوی کو ملا رموزی کی بیوی قرار دیں یا محض فرضی بیوی۔

خدا حافظ۔

◆◆◆

کیسے لکھی؟

لِکُلِّ شَیْءٍ آفَۃٌ وَلِلْعِلْمِ آفَاتٌ

آپ کتاب پڑھ چکے۔ بظاہر تو محسوس ہوتا ہے کہ آپ نے اسے ایک حد تک مفید اور ایک حد تک لطیف پایا ہوگا، مگر مجھے بحیثیت مصنف ایک اور بھی خیال ہے اور وہ یہ کہ آپ نے اس میں بعض کمزوریاں بھی پائی ہوں گی، اس لیے فطرتاً یا ذوقاً آپ نے اس کے محاسن کو بھلا کر صرف انھی کمزوریوں کو سامنے رکھ لیا ہوگا، اس لیے ضرورت ہے کہ ان کمزوریوں کے اسباب بھی بیان کردوں۔ پس ظاہر ہے کہ ایک مصنف اور ایک دماغی کام کرنے والے انسان کے لیے سکونِ کامل اور نشاطِ خاطر اس کی پہلی ضرورت ہے، مگر ادبارِ نصیب ہندستانی اربابِ کار کو اگر یہ سب کچھ نہیں تو کم سے کم دو چیزوں کی ضرورت تو نہایت درجہ ضروری ہے۔ یعنی مالی فکرمندی سے اتنی فراغت کہ ان کا دماغ کام کرتے وقت گزارے کی فکر سے متاثر اور پریشان نہ ہو، لیکن اس کتاب کے لکھتے وقت ملا رموزی گزارے کی طرف سے جس درجہ پریشان اور فکرمند رہا ہے خدا دشمن کو بھی اتنا پریشان نہ کرے۔

ضابطہ مسلّم ہے کہ مصنف اور ذی ہوش اہلِ قلم کا گھر اس کے ذوقیات اور عمل کا موید و معاون اور حوصلہ بڑھانے والا ہو، لیکن بدقسمتی سے ملا رموزی کا گھر اس اعتبار سے جس درجہ بے

پروا، بے خبر اور بے تعلق واقع ہوا ہے الحمد للہ کہ اس کی تفصیلات اور جزئیات سے ملک کہ شہرۂ آفاق لیڈر، ایڈیٹر اور شاعر اپنے ذاتی اور عینی مشاہدہ کے باعث کافی طور پر خبردار ہو چکے ہیں۔ چنانچہ صوبۂ سرحد کے نامور لیڈر قبلہ مولانا محمد عرفان، سکریٹری سینٹرل خلافت کمیٹی بمبئی، برادرم خان شفاعت اللہ خاں بی۔اے، ایڈیٹر روزانہ اخبار ''پیغام دہلی''، شمالی ہند کے ممتاز شاعر مولانا ابوالاثر حفیظ جالندھری، ایڈیٹر مجلّہ ''مخزن'' لاہور، بذاتِ خاص ملّا رموزی کے حالات و موانع کو ملاحظہ فرما گئے ہیں اور خود میں نے کبھی اپنی اس بے چارگی کو چھپانے کی کوشش نہیں کی تاکہ زمانہ دیکھ سکے کہ اردو بولنے والوں کے اردو لکھنے والے اس 1931 میں بھی کس قسم کی پریشانی سے کام کرتے ہیں؟ لہٰذا ان حالات کے جو اثرات اس کتاب کے لکھتے وقت ظاہر ہوتے رہتے تھے، وہ یہ تھے کہ:

— چولھے میں ڈالو تمھاری کتاب کو وہ لو وہ یوسف خاں نے آج جواب دے، دیا کہ اگر کل تک میرے پہلے کے دام نہیں دیے تو اگلے مہینے گیہوں نہ دوں گا۔

— اور وہ تمھارے بھانجے صاحب کے ماسٹر صاحب کا بھی انتظام کرو کیونکہ تین مہینے سے اس غریب کو بھی تنخواہ نہیں دی گئی ہے، وغیرہ۔

بس یہ تھا ہمارا ماحول جس کے اندر ہم صبح سے شام تک تو پھرتے تھے اربابِ مقدرت کے دولت خانوں پر اور شب کے دماغ سوز اوقات میں اس کتاب کو لکھتے تھے، کاٹتے تھے، پھاڑتے تھے، جوڑتے تھے، ترتیب دیتے تھے اور ایک ایک مسودہ کو دس دس مرتبہ صاف کرتے تھے اور صبح کے نو بجے تک شب کی تھکن سے سوتے کیا تھے بے ہوش پڑے رہتے تھے۔ صبح اٹھے کہ پھر وہی چکّر، مگر میرے والدین کا احسان و کرم کہ انھوں نے میرے ہوش سنبھالتے ہی یہ آپ کی مڈل وڈل پاس ہونے والی تعلیم سے دور رکھ کر قرآنِ محترم کو جو حفظ یاد کرا دیا اور پھر جو کچھ ترجمۃ القرآن کی دولت نصیب ہوگئی تو الحمد للہ کہ معتقدات میں تزلزل نہ رہا جو اسلامیہ کالجوں کے ایم۔اے پاسوں میں نظر آتا ہے۔ اس لیے جب گھر کی یہ از سر تا پا مخالفت فضا ستاتی تھی تو جو چیز سب سے پہلے سامنے آتی وہ یہ کہ لاتقنطوا من رّحمۃ اللہ پھر اس کے بعد یہ خیال کہ اوالله کے بزدل اور بے صبر ملّا رموزی بندے تو ہی وہ ہے کہ آئے دن قوم کو ہمت، جفاکشی، اولوالعزمی، استقامت اور حوصلۂ عمل کی حیات آرا دعوت دیتا ہے اور تو نے ترکانِ مجاہد اور مصطفٰی غازی کی جنگ آزما اور خوں فشاں

جرأت وشہادت کو دیکھا ہے اور تو نے سرکارِ عرب وعجم صلی اللہ علیہ وآلہ واصحابہ وسلم کے غزوات و مجاہدات کی ایمان افروز تفصیلات کو پڑھا ہے اور تو نے خالد بن ولیدؓ اور ضرارؓ بن ازور کے ان صف شکن اور زلزلہ انداز حملوں اور مقابلوں کو سنا ہے، جن کی برق وش تلوار کی تڑپ کو نہ یہ فرانس کے نپولین صاحب پا سکے اور نہ جن کے کوہ شکن نیزوں کو یہ بی۔ اے پاس طبقے کے سردار واشنگٹن صاحب برداشت کر سکتے تھے، پھر کیا ہے جو تو فکرِ معاش کی شدت سے یوں گھبرا جائے کہ یہ ''عورت ذات'' نام کی ایک کتبیہ بھی نہ لکھی جائے اور پھر بھی تو ملاّ رموزی کہا جائے؟

بس اس وجد آفریں خیال کا طاقتور ہونا تھا کہ یہ آپ کا دُبلا پتلا سا ملاّ رموزی اس خدائے جاں آفریں کا نام لے کر لکھنے میں مصروف ہو گیا جس نے اسی ملاّ رموزی کے سامنے ان لوگوں تک کو لندن پہنچا دیا جن کے خاندان بھر میں یہ نہ سمجھا جاتا تھا کہ نہر سوئز افریقہ میں ہے یا کلکتے کے عجائب خانہ کا نام ہے۔

میرے مکرم ومحترم دوست مولوی سید سجاد حیدر یلدرم بی۔اے، رجسٹرار مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے ایک ملاقات میں فرمایا تھا اور برادرم ملک نصر اللہ عزیز بی۔اے، چیف ایڈیٹر اخبار ''مدینہ'' بجنور نے میری پریشانیوں کی تفصیل سن کر لکھ دیا تھا کہ ''ارباب کار'' واصحابِ خرد کے حق میں فطرت بہت زیادہ ظریف واقع ہوئی ہے۔ چنانچہ جوں ہی کہ کتاب کا کام شروع ہوا کہ فطرت نے منہ چڑانا شروع کر دیا۔ مثلاً اس کام میں جن مشکلات کا کبھی گمان بھی نہ تھا انھوں نے اب سر نکالا، مالی مشکلات اب انسانی برداشت کے قابل نہ رہیں، مگر حبذا ومرحبا میرے ان بہادر روزی حوصلہ متعلقین کو جنھوں نے مجھے اس اہم دماغی کام میں مصروف پا کر خود کو اس درجہ بھی خموش وصابر بنا لیا کہ واللہ ان کے اس احسان سے میں عمر بھر سبکدوش نہیں ہو سکتا۔ اس کے سوا مجھ پر اور میرے متعلقین پر امراض کے حملے شروع ہوئے جن کی مدافعت کے وزیرِ جنگ ملاّ رموزی ہی بنائے گئے۔ اس کے بعد محلے کے چند عجیب وغریب لوگوں نے مردم شماری کے سلسلے میں پھانس کر جھوٹے حلف کے ساتھ مجھ پر اور میرے دو حقیقی بھائیوں پر مقدمات دائر کرنے کے سامان کو درجۂ تکمیل تک پہنچا دیا۔ ابنائے شہر میں سے سہا بھوپالی اور محمد مہدی بھوپالی نے بے وجہ رسالہ ''نیرنگ'' دہلی میں میرے خلاف اس مقصد سے سلسلۂ مضامین شروع کر دیا کہ ملاّ کو جو معاوضہ رسالوں اور

اخباروں سے ملتا ہے وہ بند ہو جائے، مگران میں سے ایک کو بھی خبر نہ تھی کہ جو ملا رموزی اپنی روح اور خیال کی ہر قوت کو خدائے غالب و یکتا کے سپرد کر چکا ہے، جو رسول عرب وعجم کی غلامی کا حلقہ پہن چکا ہے بالآخر غلبہ اور کامیابی اسی کے لیے وقف ہوگی۔ چنانچہ اسی خدائے لایزال ولم یزل کا قول لاتقنطوا پورا ہوا اور بالآخر ظفر و کامرانی کی کرن اسی تیرہ و تار ماحول کے اُفق سے جلوہ گستر ہوئی اور اس دشواری نے آسانی کی ایک ہلکی سی صورت اختیار کی۔

اس لیے جن لائق احترام ہستیوں نے مجھے اس موقع پر نوازا ان میں عالی منزلت کیپٹن نواب زادہ محمد سعید الظفر خاں بہادر بالقابہ اور گرامی مرتبت کیپٹن نواب زادہ محمد رشید الظفر خاں بہادر بی۔اے کا مرتبہ سب سے عالی اور نمایاں ہے جب کہ ممدوحین نے مجھے اس دماغ سوز کام کے لیے کافی فرصت عطا فرمائی اور ایک نوکر کے لیے اس سے سوا کیا چاہیے کہ وہ آزاد کر دیا جائے۔

مگر مشکلات نے بھی مقابلے اور مجادلے کی خاصی تیاریاں کی تھیں، اس لیے ابھی سکونِ خاطر نصیب نہیں ہوا تھا اور عین اس وقت جب کہ میں اس کتاب کے (250) صفحات لکھ چکا تھا ان مہربان نے ''جوابِ خشک'' عطا فرما دیا، جنھوں نے اس کی طباعت کے مصارف کا وعدہ فرمایا تھا۔ اب پھر وہی وعدۂ لاتقنطوا تھا اور میں تھا۔ بارے وہی ہوا جو کسی آسانی اور خدائی وعدہ کا نتیجہ ہوا کرتا ہے۔ چنانچہ اس موقع پر میرا دل بڑھانے والے عالی جناب میجر کنور ممتاز علی خاں بہادر جی۔ایس۔او، افواج بھوپال ہوئے اور کچھ شک نہیں کہ میجر صاحب ممدوح کی اس ادب پرور حوصلہ افزائی نے مجھے بہت زیادہ آگے بڑھا دیا۔ اب جو یہ ہوا تو اس لیے نہیں ہوا کہ وعدۂ الٰہی اسی جگہ محدود ہو کر رہ جائے۔ چنانچہ میں نے ارادہ کیا کہ میں اس کتاب کی طباعتی تکمیل کے لیے زبانِ اردو کے ''بیت العلوم'' لاہور جاؤں۔ پس اس موقع پر صاحبۃ العظمت بیگم صاحبہ نواب احمد یار خاں صاحب دولتانے نے جس کمال علم دوستی کا اظہار فرمایا، اس پر بے ساختہ میرے منہ سے یہ دعا نکلی کہ اے خدا تو تمام مسلمان ماں بہنوں کو علم و ادب نوازی کے اسی رنگ میں رنگ دے۔ پھر خود گرامی جناب نواب احمد یار خاں صاحب رئیس دولتانہ ایم۔ایل۔سی نے جن پیہم نوازشوں کو ارزانی فرمایا ان کی تفصیلات کو میرے ''سفرنامۂ پنجاب'' الموسوم بہ ''پنجاب نامہ'' میں ملاحظہ

فرمائیے۔ پھر میری تصنیفی معاونت میں میرے عزیز ومحترم کرم فرما مولوی سید عبدالکریم صاحب بی۔اے، ایل۔ایل۔بی، سٹی مجسٹریٹ بھوپال و ڈاکٹر سید عبدالمجید صاحب افسر حفظانِ صحت بھوپال نے جو حصہ لیا اس کے لیے بھی ہدیۂ شکر پیش ہے۔

اس میں شک نہیں کہ میں نے اپنے ناقابلِ بیان مصائب وشدائد کا ایک حد سے سوا کم حصہ بیان کر دیا تاکہ اس سے تصنیفی کمزوریوں کے اسباب معلوم ہو جائیں۔ اب میں ان حالات پر بھی بفضلِ خدائے مستعان اپنے محسنین وقدر دان بہنوں اور بھائیوں کو اپنے ایک بالکل ہی نئے ادارے یعنی ''دائرۂ ادب'' کے قیام کی اطلاع دے دوں۔ چنانچہ جب میں نے ملک ومذہب اور قوم کی اصلاح وخدمت کی خاطر اپنی بیوی کے فرضی پردے میں خواتین ملّت پر مضامین لکھے تو بعض 308 قبل مسیح کے بنے ہوئے دماغوں نے اعتراض کیا کہ اماں لاحول ولا بھلا کوئی اپنی بیوی پر بھی مضامین لکھتا ہے۔ سُہا ایسے پست قامت بزرگوں نے بھی یہی کچھ فرمایا، مگر ان بے چاروں کو اگر ہندستان کے سب سے زیادہ ذی اثر وذی عزت رہنما جناب گاندھی کی خود نوشتہ سوانح عمری مل جاتی تو دیکھ لیتے کہ اس جلیل القدر انسان نے اپنی بیوی کے حالات کو کس طرح لکھا ہے؟

اسی طرح صوبۂ پنجاب وشمالی ہند کے سب سے ممتاز وسر بلند رہنما جناب مولانا ظفر علی خاں بی۔اے، ایڈیٹر اخبار ''زمیندار'' لاہور نے باوصف اپنے عدیم المثال ثبات عمل اور حوصلہ استقلال کے اپنے اخبار کی امداد کے لیے متعدد مرتبہ جو طویل سے طویل اپیلیں شائع فرمائی ہیں۔ قبلہ مولانا محمد علی رحمۃ اللہ علیہ نے باوجود کمال صبر وجفا کشی اپنے اخبار ''ہمدرد'' کی امداد کے لیے جو طویل تر مضامین لکھے ہیں اگر وہ سب آپ کے اور دنیا کے سامنے آج بھی موجود ہیں تو پھر اگر حقیر و بے بضاعت ملّا رموزی محض علم وادب اور اصلاح کی خاطر وخدمت کی خاطر کوئی ایسی ہی بات کہے تو اسے شرمانا چاہیے یا معترضین کو؟ اور کیا شک ہے کہ اگر آج ملّا رموزی بجائے ملّا رموزی ہونے کے اخبار ملّا رموزی ہوتا یا کوئی علمی وادبی رسالہ ملّا رموزی ہوتا یا کوئی کتاب ملّا رموزی ہوتا تو اس کی امداد کے لیے بے شمار اپیلیں اور مضامین شائع ہو چکے ہوتے مگر وہ بے چارہ دن بھر فکرِ معاش میں مبتلا رہ کر آج تک راتوں کو آپ کے لیے لکھتا رہا تو آپ نے یہ کیوں سمجھ لیا کہ اس کا

دل و دماغ چونکہ جرمنی کا بنا ہوا ہے، اس لیے وہ کبھی نہ ٹوٹے گا؟ اس لیے عرض ہے کہ اخبارات اردو اور رسائل اردو میں مسلسل پندرہ برس تک کام کرنے سے جو فائدہ پہنچا وہ یہ کہ اس جوانی کے عالم میں بڑھاپے کا لطف شروع ہو گیا ہے اور اب ہماری تفریح گاہ باغ و بہار کے عوض حکیموں او ڈاکٹروں کے مطب بنگئے ہیں اور جتنا کبھی ہم گل بنفشہ، عناب، تخم خطمی، گلِ نیلوفر، درآب تر کردہ بنوش سے واقف تھے آج اس سے زیادہ ''آپریشن'' اور ''انجکشن'' کی اقسام اور تاثیر سے واقف ہو چکے ہیں۔ پھر کیا آپ چاہتے ہیں کہ یہ آپ کے مشکل سے کوئی دس بارہ سیر وزن کے ملّا رموزی صاحب کسی ہلکے سے ملیریا اور زکام ہی میں مبتلا ہو کر اللہ میاں کے پاس یوں چلے جائیں کہ پھر آپ ان کے بکھرے ہوئے اور گم شدہ مضامین کو ڈھونڈتے پھریں اور کہتے پھریں کہ ارے ہائے رے لو وہ ملّا رموزی بے چارہ پرسوں صبح مر گیا۔

آپ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب ایم۔اے، پی۔ایچ۔ڈی، پرنسپل جامعہ ملیہ دہلی، ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب ایم۔اے، پی۔ایچ۔ڈی، ایڈیٹر رسالہ ''جامعہ'' دہلی، مولانا ابوالاثر حفیظ جالندھری، مولانا محمد عرفان، سکریٹری سینٹرل خلافت کمیٹی بمبئی، قبلہ میاں احسان الحق صاحب ایم۔اے سیشن جج کیمل پور پنجاب سے حلف کے ساتھ دریافت کیجیے کہ ملک وقوم کے یہ جلیل القدر اصحاب بچشم خود ملاحظہ فرما چکے ہیں کہ آپ کے ملّا رموزی کو ایک نہیں دو نہیں بلکہ متعدد اور ذی مرتبہ رؤسا، امرا، گرامی منزلت بیگمات، نوابوں اور والیانِ ملک کی کافی سے زیادہ ہمدردی، قربت اور نوازش حاصل ہے، مگر ان فیاض وقدرداں اصحابِ مقدرت کی فکرِ معاش سے ہمیشہ کے لیے آزاد بنا دینے والی قربت و آسودگی سے ملّا رموزی جو آج تک دور اور گریزاں رہا وہ محض اس لیے اور بخدائے لایزال اس لیے کہ کہیں ان بلند مرتبہ اور عالی وقار حضرات کی عطا کی ہوئی فرصتوں اور عیش سامانیوں میں گم ہو کر مضمون نگاری کی خدمت و قوت سرد نہ پڑ جائے، مگر ہماری اس قربانی پر کیا آپ چاہتے ہیں کہ ہم کسی انگریزی بیوی، ڈاکٹر بیوی اور بعض اور۔

یہ بھی نہ کہیے کہ وہ ملّا صاحب فلاں بیوی کے حالات میں آپ نے یہ تو لکھا ہی نہیں اور وہ تو چھوڑ ہی گئے کیونکہ اس قسم کے اعتراضات سے آپ کی ذہنی حالت کی پستی ثابت ہوگی۔ کیونکہ ''خاکہ کشی'' میں جزئیات کی جو تفصیل درکار ہے اس کے موافق کبھی آپ نے اپنے ملّا رموزی کو

فکرِ معاش سے آزاد کر کے مہلت بھی دی کہ وہ دنیا کی ہر عورت کی کافی نقل وحرکت کو اپنی "ذاتی آنکھوں سے" دیکھ سکتا؟

اچھا اب اگر یہی ہے کہ ہندستانی ہونے کے اثر سے ہمیں ہر چیز کے عیوب ہی عیوب دیکھنا آتا ہے تو پھر آج یہ بھی دیکھیے کہ اس کتاب کی خوبیوں پر آپ کی ادبی انجمنیں ہمیں کون سا خطاب عطا فرماتی ہیں۔ آپ کے دولت مند ہمیں کتنا انعام دیتے ہیں؟ کیونکہ ذرا انصاف تو فرمائیے کہ ایک غبار آلودہ جھونپڑے میں بیٹھ کر اتنی بیویوں کی زندگی کے جزئی سے جزئی حالات وخواص پر اتنا لکھ دینا خدائے فیاض ومنعم کی نوازش نہیں تو کیا ملّا رموزی کی تیراندازی ہے؟

آخر میں بکمالِ ادب و نیک نیتی عرض ہے کہ جن ماں بہنوں کے حالات سے اس کتاب کے حالات موافقت کریں انھیں چاہیے کہ وہ ٹھنڈے دل سے اپنے حالات کی اصلاح فرمائیں کہ اس کے سوا ملّا رموزی کی کوئی اور غرض نہیں۔

تالیف وتحریر کی نزاکتوں سے جو حضرات واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ کسی حجاب انگیز مفہوم کو شائستہ الفاظ میں ادا کرنا کس درجہ مشکل کام ہے، پس میں نے ایسے مقامات میں جو کوشش کی ہے اس میں اس حد تک تو احتیاط کو ملحوظ رکھا ہے کہ ایک جگہ امراض کی تفصیل لکھتے ہوئے ان امراض تک کے نام چھوڑ دیے ہیں جو عموماً اخبارات اور رسالوں میں بے تامل شائع ہوتے رہتے ہیں۔ اسی طرح ہر بیوی کے ایسے حصۂ زندگی کو ترک کر دیا ہے جسے پڑھتے وقت ادنیٰ سے حجاب پیدا ہونے کا اندیشہ تھا، اس پر بھی اسلامی آدابِ کلام کے موافق میں اپنے محترم ناظرین وناظرات سے اپنے ہر قسم کے سہوِ کلام پر معافی چاہتا ہوں۔ اب کہیے آپ کو وہ میرا امداد والا معاملہ یاد ہے؟

واللّٰہ المستعانُ علیٰ ماتصِفون

وصلی اللّٰہ علی نبی المصفطیٰ و آلہ اصحابہ اجمعین

مُلّا رموزی

◆◆◆

عورت ذات

ملّا رموزی کی غیر مطبوعہ تحریریں

فہرست

مقدمہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

والصلوٰۃ والسلام علی رسولہ الکریم و آلہ و اصحابہ اجمعین

عقلی اور فطری حیثیت سے عورت کے لیے ہر بیس برس کے بعد تہذیب و تمدن اور اصول و عقائد کا ایک انقلاب ہو جانا چاہیے جبکہ ہر نوخیز لڑکی اس عمر کو پہنچ کر سب کچھ سوچ سکتی ہے اور سب کچھ کر سکتی ہے۔ اسی طرح مرد کے لیے بھی تیس برس کا انقلاب ضروری ہے جبکہ جوان العمر لڑکے اس عمر میں تمام ذمہ داریوں کو قبول کر لیتے ہیں۔ پس عمر و عقل کا یہ انقلاب فطری ہے، لیکن انسانی قوئی اور خواص کی تربیت اور آرائش چونکہ ہمیشہ بزرگوں کے ذمہ رہی ہے اس لیے ایسے انقلابات میں بزرگوں کے اثرات کو بہت کافی دخل ہے۔ چنانچہ ہوتا ہے کہ بعض جودت فطرت اور تیز تر انقلابی دماغ بھی محض اپنے بزرگوں، اپنے خاندان اور اپنی برادری کے بعض قدیم اور ناپسندیدہ اطوار و اصول کی پیروی پر مجبور رہتے ہیں اور ایسے دماغ بہت کم مگر بہت بلند ہوتے ہیں جو صاحبِ فراست ہوتے ہیں خود اپنی جودت و جدت اور حکمت سے ناپسندیدہ اصول کے خلاف کھلم کھلا بغاوت کر کے اپنے لیے ایک نیا تمدن ایک نئی تہذیب اور ایک نئی تعلیم و تربیت کے اصول وضع کرتے ہیں اور ان پر عامل ہوتے ہیں۔

مگر ہندستان کے بزرگ اتنا ہی کر سکتے تھے جتنا کہ فطرت نے ان کو دماغ دیا تھا لہٰذا میرا یہ پختہ عقیدہ وانداز ہ ہے کہ جغرافیائی حیثیت سے ہندستان کے دماغ میں عقد کامل کے وہ اجزا ہی نہیں ہوتے جن سے یورپ کی قوموں کو مستفید کیا گیا ہے جس کا ثبوت یہ ہے کہ ہندستان کی ساری تاریخ میں موجد ومحقق دماغوں کا پتہ ہی نہیں، اس لیے یہاں جو قوم غالب آ گئی اسی کا فلسفہ لے لیا گیا اور اسی کا تمدن، اسی کی زبان اور اسی کی تہذیب جو نقصِ عقل کا بیحد روشن ثبوت ہے۔ یہی حال ہندستان کے سیاسی حکما کا ہے کہ انھوں نے آج سے کامل اکاون برس پہلے ایک انجمن کی بنیاد رکھی تھی جس کا مقصد سیاسی آزادی کا حصول تھا، مگر ان میں سے کسی ایک کو پوری نصف صدی میں بھی ایسی کامل ونایاب دماغی تدبیر نہ سوجھی جس سے وہ پرامن طریقے سے کامیاب ہو جاتے اور عقل کامل نام ہے اس تدبیر کا جو مخالف کو بغیر کسی تصادم کے رام کر کے رہے۔

پس جب زندگی کی ہر منزل میں ہندستانی عقل اس حد تک ناکام وناقص ثابت ہوتی چلی آئی ہو تو ایسے ملک میں عورت کے لیے بھی جو کچھ کیا جائے گا وہ ایجاد کے عوض نقل ہی ہو سکتا ہے اور بس۔

چنانچہ انیسویں صدیٔ عیسوی میں ہندستان میں عورت کے لیے جو کچھ سوچا گیا یا کیا گیا وہ خود ہندستانیوں کا سوچا ہوا اور ایجاد کیا ہوا نہیں ہے بلکہ یورپ کے اس نقشِ قدم کی پیروی اور لفظ لفظ نقل ہے جو ہندستان میں یورپ کی عورت کے ساتھ آیا ہے اور جو یورپ کی عورت اپنے ملک سے لائی ہے، لہٰذا ہندستان میں نہ میں عورت کے انقلاب کا قائل نہ اس کی ترقی کو ترقی مانتا البتہ اس کی ہر بیداری کو نقالی اور ہر ترقی کو تقلید کہتا ہوں۔

پھر شور بختی بالائے شور بختی یہ کہ اس منقول انقلاب کی حدود بھی اس درجہ کم اور مضمحل سی ہیں کہ ہندستان کی آبادی کے تناسب سے اس کا تذکرہ بھی وقت ضائع کرنے کے برابر ہے۔ مثلاً آج کل کی اصطلاح میں تعلیم یافتہ ہندستانی وہ لوگ کہے جاتے ہیں جنھوں نے ہندستان کے یورپی مدارس کے نصابِ تعلیم کو پڑھا ہو، لہٰذا اس نصاب کے پڑھتے ہوئے ہندستانیوں کی تعداد سرکاری حیثیت سے پانچ فیصدی بتائی جاتی ہے جو صرف مردوں سے متعلق ہے لہٰذا جب تعلیم یافتہ مرد پانچ فیصدی ہیں تو ''تا بہ عورت چہ رسد؟'' اس لیے چالیس کروڑ ہندستانیوں میں ایک فیصدی

بھی جب عورت تعلیم یافتہ نہ ہوتو اس میں کسی انقلاب و بیداری کی تلاش محض خیالی طور پر دل خوش کرنا ہے اور بس۔البتہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ یورپی قوموں کے میل جول سے پر جوش نو جوانوں میں نقل وتقلید کا جوایک بحرانی جذبہ بیدار ہوا ہے اور اس کے تحت جوحرکت تعلیم نسواں یا تحریک نسواں نام سے منظر پر آئی ہے اس کورواجی حیثیت سے بیداریٔ نسواں کہا جاسکتا ہے نہ کہ صحیح بیداری عقل نسواں۔

اب سوال یہ تھا کہ میں جب اصل تحریک ہی کو نقالی تسلیم کرتا ہوں تو پھر اس پر ضخیم تر کتاب کیوں لکھی؟ سو جواب یہ ہے کہ میری کتاب اس نقالی کی تائید نہیں بلکہ ماحول کے اثرات سے عورت کی اصلاح کے حامیوں اور محرکین کے لیے عورتوں کی ایک ایسی دنیا پیش کرنا ہے جو اصلاح طلب ہے۔اب یہ ذمہ داری مصلحین کی ہے کہ وہ اپنی عورتوں کی صحیح زندگی مجھ سے معلوم کر کے ان کے لیے کوئی تدبیر اصلاح وترقی سوچیں۔

آج سے پورے گیارہ برس پہلے میں نے کتاب ''عورت ذات'' کی جلد اول لکھی اور محض مالی مشکلات کی وجہ سے اس وقت اس کی دوسری جلد کا اعلان ہی کر کے رہ گیا ورنہ لکھنے کا جہاں تک تعلق تھا دوسری جلد بھی اسی وقت لکھ سکتا تھا اور الحمدللہ کہ ایک روزانہ اخبار کے لیے ستر صفحات روزانہ لکھنے کا عادی ہو کر میں ایسی دو جلدیں ہر ماہ لکھ سکتا تھا اور لکھ سکتا ہوں، لیکن ہندستان میں علمی شوق جہالت کی وجہ سے بمنزلہ صفر کے ہے اس لیے مجھ ایسے خدا جانے کتنے لکھنے والے اس مضمحل ہندستان میں ہمیشہ دولت مندوں ہی کے دست نگر رہے، گوان کی روح ، دولت مندوں کے دماغوں پر فرماں روا کرتی رہی لیکن عوام کی زبان میں یہی کہنا پڑے گا کہ ہر ایجاد واصلاح قوم کے معاملہ میں ہندستانی صاحبانِ دماغ وایجاد کو اس خودداری کو برباد کر دینے والی بیچارگی سے ضرور گزرنا پڑا اور اسی لیے ہندستان یا اس کے بے علم وہنر باشندے اپنے مصلحین کی اس بیچارگی کی ذلت سے کبھی اپنی تاریخ کو پاک نہ کرسکیں گے لہذا میں بھی اس علمی سرد بازاری کے ہاتھوں دوسری جلد کی لکھائی تک کے ارادہ کو ترک کر کے، ان بازاری خرافات کے لکھنے پر مجبور رہا جن سے پست اور بازاری طبقات خوش ہوتے ہیں، یعنی ظرافت، جو دراصل میری ذاتی پسند کی چیز کبھی نہیں ہوئی بلکہ مجھے ہمیشہ سنجیدہ ٹھوس اور بلند درجہ کی فلسفیانہ موشگافیوں اور نکتہ آفرینیوں سے شغف رہا،

جس کا وجود میرے ان ظریف مضامین میں بھی ہے جن کو عوام سر آنکھوں پر رکھتے ہیں اور میں ان کی قدر و شہرت پر دل ہی دل میں روتا ہوں، محض قوم میں بلند مضامین اور نادر کتابوں کے سمجھنے کے شوق کے فقدان پر اور اسی لیے اس عرصہ میں میں نے ''نفسیات جنسی'' اور شعر الہند پر خالص فلسفیانہ ایجاد و تحقیق کی دو کتابیں تصنیف کر لیں۔

بہر کیف پہلی جلد کی طرح دوسری جلد کے لیے بھی آسان تھا کہ کسی رئیس کا دروازہ کھٹکھٹایا جاتا، لیکن اب میری عمر کی پختگی نے احساس و خودداری کے ملکات فاضلہ کو بھی جوان و روشن بنا دیا تھا اس لیے بس کا نہ ہوا کہ ایک محقق و فلسفی ہو کر پھر بد نصیب اور بیگانہ قوم ہی کے بھلے کی بات کہہ کر بھی احسان لوں ان دولت مندوں کا جن کو خود میں درس تمیز و قابلیت دے سکتا ہوں اس لیے یوں سمجھیے کہ اس کتاب کی دوسری جلد کو میں نے دانستہ طور پر اپنے ہی ہاتھوں جہنم واصل کر کے بفضل خدا اپنے شرف و وقار کو بچا لیا ہے، جو کتاب ''عورت ذات'' کی ایسی دس جلدوں سے کہیں زیادہ بلند و برتر جوہر ہے اور ان تمام شکر گزاریوں سے بے حد ملول و رنجیدہ ہوں جو اس سے پہلے بعض سرمایہ داروں کے لیے مجھے اپنی خودداری کے خلاف مجبوراً لکھنا پڑا۔

چنانچہ خودداری اور شرافت خیال کی یہ حفاظت چونکہ میری فطری ہمت تھی اس لیے آج فطرت ہی نے میری سرپرستی کی اور محض خدائے حکیم و عقل آفریں نے بغیر کسی صحیح سبب، اور فراغت خاص کے میرے دماغ کو دوسری جلد لکھنے پر آمادہ کیا اور آج 5 اگست 1941 کو خدائے عرش و فرش کے کرم اور رسول مکی مدنی صلی اللہ علیہ وسلم کے غلامی کے صدقہ میں نے دوسری جلد کا اصل مسودہ پورا کر دیا۔

اب مجھے خود نہیں معلوم کہ یہ جلد کب شائع ہوگی اور کیوں کر شائع ہوگی؟ اور نہ کسی کتاب کی طباعت اور فروخت مصنف کتاب کے ذمہ کی جا سکتی، کیونکہ فطری اور عقلی اثرات کے تحت جو دماغ جس فن کا حامل ہوتا ہے وہ ہرگز ہرگز کسی دوسرے فن کا شریک و متحمل نہیں ہو سکتا، جس کا ثبوت میری اسی کتاب کی جلد اول کی وہ بیہودہ سی لکھائی چھپائی اور فروخت کی غلط کاریاں ہیں جو محض میرے فن طباعت اور فروخت کے اصول سے ناواقف ہونے کا سبب اور دلیل ہے۔ لہٰذا قوم کے لیے دماغ سے بہترین اصلاحی بات سوچ کر لکھ دینے کا جہاں تک تعلق ہے اللہ کا کرم ہے

کہ میں آج اس ذمہ داری اور امانت سے فارغ ہو گیا۔

اب رہا نفس کتاب کا معاملہ سو اس کتاب کو میں نے محض ہندستانی عورتوں کی اصلاح اور ان کے فائدہ کے جذبۂ نیک سے لکھا ہے، لیکن اس کی لکھائی میں مجھے جن مشکلات سے دوچار ہونا پڑا اس میں سب سے زیادہ عقل کو تباہ کرنے والی مشکل خود عورت کی میرت اور اس کے عقل کی نزاکت کا احساس تھا، یعنی مجھے معلوم ہے کہ عورت اپنی پیدائشی حیثیت ہی سے جسم کے ہر ساخت میں ایک ایسی نزاکت لیے ہوئے ہے جو مردوں میں نہیں، لہٰذا اس کے خیال و گمان اور اندازے کی قوت نہ فقط نازک تر بلکہ بعض جگہ غلط اندیش بھی ہو جاتی ہے اس لیے اگر اس کا کوئی واقعی اور نہایت سچا کردار بھی دکھایئے اور وہ واقعی قابلِ اعتراض و اصلاح بھی ہو تو بھی یہ اس کی قباحت اور واقعی لغزش کو برداشت نہیں کر سکتی، اس لیے اب میرے لیے مشکل بھی ہے کہ اگر میں اس کے واقعی کردار کو اس کے اصل حالت کے عین موافق لکھتا ہوں تو یہ اپنی فطری نزاکت کے اثر سے ناراض ہوتی ہے اور رنجیدہ اور جو ایسے کرداروں کو دوسروں پر ڈھال کر اور اشارات و تشبیہات میں لکھتا ہوں تو یہ اپنی اور اپنے مردوں کی جہالت سے اس کے صحیح مطلب و مقصد کو نہیں سمجھتی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا مثلاً میں نے جلد اول میں ''نارضامندی کی شادی'' کا کردار ''اپنی بیوی'' کے عنوان سے لکھا تو اس خالص فرضی بیوی کو اکثر کندۂ ناتراش عورتوں اور یکسر نااہل مردوں تک نے میری ہی بیوی قرار دیا۔ اسی طرح میں نے صاحبِ اولاد عورت کے کردار دکھانے کے لیے ایک اصطلاح ''ننھے میاں کی ماں'' وضع کیا تو اس کو میرے ہی ننھے میاں سمجھ کر رہ گئیں حالانکہ ان کرداروں سے نہ میری بیوی کو تعلق نہ میرے کسی بچے کی عرفیت تک ننھے میاں ہے۔

پس جہالت کے ماروں کی اس سمجھ کا حشر یہ ہوا کہ میں پچھلی جلد کی طرح اس دوسری جلد میں بھی عورت مرد کی بے شمار قابل اصلاح لغزشوں کو چھوڑ دینے پر مجبور ہوا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ گو پہلی جلد کی تعریف و توصیف میں متعدد بیگمات اور رئیس زادیوں نے میرے کمالِ قلم کی تعریف و توصیف کی اور اخباروں نے بے حد حوصلہ افزا تبصرے شائع کیے، مگر میں کتاب یا قوم کی اس نامستعد دماغی لعنت کے اثر سے کتاب میں وہ اکمل کردار نگاری نہ پا کر کڑھتا ہی رہا جو خدائے فیاض نے میرے ہمہ گیر قلم کو عطا فرمائی ہے اور جس کا کامل مظاہرہ اُسی وقت ہوتا جب کتاب پڑھنے والے نکتہ رس

اور اشارات فہم ہوتے اور مجھے تالیف وتصنیف کی جملہ سہولتیں حاصل ہوتیں۔

اس کتاب کا اصل مقصد یہ ہے کہ ہندستان میں عورت کی ترقی اور اصلاح کا جو احساس بیدار ہوا ہے اس کے پیش نظر ہندوستان کی ان عورتوں کو مقدم رکھا جائے جن کی حیثیت اجتماعی اثر رکھتی ہے۔یعنی پہلے ان کو سنبھالا جائے جو دوسروں کو سنبھالنے کی ذمہ دار ہیں اس لیے میں نے پورے اہتمام سے صرف انہی عورتوں کو دکھایا ہے جو کسی نہ کسی رشتہ اور تعلق سے عام انسانی برادری کو متاثر کرتی ہیں اور اسی حیثیت سے جن تفصیلات و جزئیات کو جمع کر دیا ہے۔ مجھے خدا کے فضل پر ناز ہے کہ اردو تو اردو ہندی، انگریزی، گجراتی، مرہٹی غرض ہندستان کی ایک زبان بھی ہندستانی عورت کے لیے یہ ذخائر پیش نہ کر سکے گی۔ البتہ ایک مسلمان ہونے کی حیثیت سے نیز مشرقی تہذیب کے بے حد شریفانہ قاعدہ کی رو سے التماس ہے کہ ممکن ہے کہ انبار انبار واقعات کے سلسلے سے بعض غلط یا حقائق سے دور واقعات بھی کم و بیش حیثیت سے آ گئے ہوں سو اس کے لیے میری تنہا جد و جہد اور بے یار و مددگار ماحول کو پیش نظر رکھتے ہوئے مجھے معاف فرمایا جائے۔

والسلام علی رسولہ الکریم و آلہ واصحابہ اجمعین برحمتک یا ارحم الراحمین۔

ملا رموزی

بھوپال 5 اگست 1941 / 11 رجب 1360 ہجری اسلامی

لیڈر بیوی

اس بیوی کا تعلق بھی کسی خاص قوم اور جماعت سے نہیں، بلکہ اس کا تعلق ان گھرانوں سے ہے جن میں یورپی تعلیم وتربیت کے مردوں میں قومی اصلاحی ورہنمائی کے جذبات اور قوم کے نام سے کچھ کرنے کی خواہش موجود تھی، اسی لیے انھوں نے اپنی عورتوں کو بھی ایسی تعلیم وعملیت کا موقع دیا، اور ایسے مردوں کا یہ شوق محض یورپی عورت کے اصل کی نقل میں تھا گویا ہندستان میں لیڈر بیوی بھی تقلیدی ہے ایجادی نہیں۔

ایسی لیڈر بیویاں امیروں سے زیادہ غریبوں میں پائی جاتی ہیں اور یہ چیز مردوں میں بھی موجود ملتی ہے یعنی قومی اصلاح ورہنمائی اور قومی صلاح وفلاح سے لے کر قومی ایثار وقربانی کے لیے وہ زیادہ تیار اور پُر جوش نظر آتے ہیں جن میں قومی اصلاح وقربانی کے لیے نہ درجہ اول کی دماغی استعداد نہ مالی استطاعت اور اصلاحی اصل میں ہندستانیوں کی یہی وہ عقلی کمزوری ہے جس کے اثر سے ان کی ہر تحریک ناقص وناتمام نظر آتی ہے۔ کیونکہ مسلمانوں کے مذہب نے قومی اصلاح ورہنمائی کا فرض صرف ان لوگوں پر عائد کیا ہے جن میں اصلاح وقربانی کی مقدرت ہو، یعنی اسلامی شرع کی رو سے قومی اصلاح ونگہبانی کے لیے امراءِ قوم مکلّف وپابند بنائے گئے ہیں نہ کہ نیم عاقل اور مفلس، لیکن ہندستانی دماغ کی عقلی بے بسی ملاحظہ ہو کہ اس ملک کے بیشتر امرا تو

محوِ عیش ولغویت ہیں اور قومی تحریکات میں مبتلا ہیں وہ جو علوم وفنون میں یکتائے روزگار نہ مالی حیثیت سے صاحبِ سکون وفراغت۔

اس لیے غریبوں میں ایسی لیڈر بیوی یورپی مدارس کی درسگاہوں، کلب، کی تقریروں، اخباروں، رسالوں اور باپ یا بھائی کی گفتگو سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ ان مقامات ومواقع اور حالات سے اپنے لیے لیڈری کا جذبہ فراہم کرتی ہے، لیکن دماغی بے بسی کے ہاتھوں کوئی جدید اور ہنگامہ گستر حرکت نہیں کرتی بلکہ اس ذوق کے والدین یا سہیلیوں کے مشورے سے ایک چھوٹی سی ''انجمن خواتین'' کی بنیاد رکھتی ہے جس کی سرپرستی اور کام چلانے میں اسی کے ماں باپ، بہن بھائی اور اس کے حلقے کی عورت ذاتیں زیادہ حصہ لیتی ہیں۔ ایسی بیوی فطرتاً بھی دوسری لڑکیوں سے قدرے تیز طرار ہوتی ہے اور اسی تیزی کے جوش سے وہ اس نوع کی تحریکات کی نقل کرتی رہتی ہے۔

ایسی انجمنوں کے مقاصد وہی عام مروجہ اور روزمرہ کی باتوں پر مشتمل ہوتے ہیں جو ذہن عام تقلیداً اختیار کرتا ہے۔ ان میں کوئی جدت اور فکری جودت نہیں ہوتی اور اسی لیے ایک ہی نوع کی ہزاروں انجمنیں ملتی ہیں جن کے بنیادی مقاصد یہ ہوتے ہیں:

1۔ نادار لڑکیوں کی تعلیمی امداد

2۔ عورتوں میں تعلیم کی تحریک (یعنی یورپی مدارس میں بھرتی) نہ کہ علوم صحیحہ کا حصول۔

3۔ عورتوں میں غلط، نقصان رساں اور بیہودہ رسوم کے رواج کی ممانعت۔

4۔ عورتوں میں تندرستی بڑھانے کے لیے انگریزی کھیلوں کا ورزش کے نام سے شوق پیدا کرنا۔

5۔ ظالم مردوں سے عورت کی آزادی کا مطالبہ۔

6۔ پردے کے خلاف جنگ۔

7۔ مذہب کی تعلیم پر زور حالانکہ آج تک ایک مسلمان لڑکی ایسی نہ ملے گی جس نے علوم مذہبی کو کاملاً حاصل کر کے سندِ تکمیل حاصل کی ہو۔

8۔ مسلم لیگ یا کانگریس کے کسی خاص مقصد کی تحصیل وتعمیل مثلاً عورتوں کو بھی لیگ کا رکن بنایا جائے یا عورتوں کو بھی پابند کیا جائے کہ وہ ملک کے لیے چرخہ چلائیں۔

9۔ انجمن کے مقاصد کی تبلیغ و تشہیر کے لیے ایک آرگن عرف رسالہ کا اجرا وغیرہ۔

یہ وہ عام مقاصد ہیں جن کے لیے ایسی لیڈر بیوی کے جھنڈے تلے اس کے مدرسے اور محلے کی نوخیز لڑکیاں بڑی تیزی سے جمع ہو جاتی ہیں اور اس انجمن کی ابتدا ماہانہ جلسوں اور تقریروں سے ہوتی ہے جن میں 99 فیصدی تقریریں مردوں کی لکھی ہوئی ہوتی ہیں اور خود لیڈر بیوی بھی ایسی تقریر پڑھتی ہے اور جلسہ میں تجاویز منظور کر کے زنانہ رسالوں اور بعض اخباروں میں شائع کرادی جاتی ہیں، مگر اس لیڈری کے آغاز ہی پر یہ تحریک اکثر اس لیے ٹھنڈی پڑ جاتی ہے کہ یہ تحریک لیڈر بیوی کے عنفوانِ شباب کے وقت رونما ہوتی ہے اور چند دن بعد ہی اس لیڈر بیوی کی شادی ہو جاتی ہے لہٰذا اصلاحِ قوم کے خیالات تو دونوں زندہ رہتے ہیں مگر عملاً انجمن کی ناظم کوئی اور صاحب مقرر ہو جاتی ہیں اور اصل بانی انجمن گھریلو ذمہ داریوں میں ختم۔

اس نوع کی لیڈر بیوی کا شوہر بھی اکثر ایسے ہی خیالات کا لڑکا ہوتا ہے۔ پس اگر دونوں متحد الخیال مل گئے تو شادی ہوتے ہی اس لیڈر بیوی کی لیڈری میں بہت کافی زنانہ پیدا ہو جاتا ہے۔ دولہا میاں فوراً بیوی کے نام سے رسالہ جاری فرما دیتے ہیں اور اس رسالے میں عموماً ''سماج کی خرابی'' کے نام سے بزرگوں کو گالیاں دی جاتی ہیں اور سال ڈیڑھ سال کے بعد نہ یہ لیڈر بیوی ملتی نہ ان کے ''سماج توڑ شوہر صاحب'' کا کہیں پتہ ملتا۔

یہ عوام کی ان لڑکیوں کا خاکہ ہے جن میں سے بعض کار آمد، مستعد اور مستقل عمل کی مالک بھی ہوتی ہیں اور بعض مفید کام بھی کر گزرتی ہیں لیکن عموماً ان کا حشر وہی ہوتا ہے جو کم علم اور بے بضاعت انسان کی تحریک کا ہونا چاہیے۔

اس کے بعد دوسرے درجہ کی لیڈر بیوی سے بلند ہمت زیادہ ذی علم اور زیادہ ٹھوس کام کی مالک ہوتی ہے، مگر اس کا سارا ٹھوس پن اس کی مالی استعداد کا بہتر ہونا ہے، یعنی یہ عموماً مالدار گھرانے کی ہوتی ہے اور اسی لیے اس کی تعلیم و آزادی کا معاملہ قدرے قابلِ ذکر ہوتا ہے، اس لیے یہ جس انجمن یا جس رسالے کی بنیاد رکھتی ہے اس میں قدرے جان ہوتی ہے، مگر مقاصد کی عمومیت اس کے ہاں بھی وہی ہوتی ہے جو اوپر بیان کی گئی۔ البتہ یہ بالعموم بے پردہ اور قدرے مقرر بھی ہوتی ہے اس لیے یہ بعض اوقات میونسپلٹی اور کونسل میں مردوں کی طرح عورتوں کے لیے بھی عہدے مانگنے میں حقوق طلب عورت سے مشارکت کر لیتی ہے اور عورتوں کی ملازمت کے

لیے بھی تجاویز پیش کر دیتی ہے، خصوصاً 1941 میں اس استعداد کی لیڈر بیوی، کانگریس اور لیگ کی متابعت کرنے والی زنانہ انجمنیں بناتی اور اپنی صنف کے لیے بے شمار اصلاحی کام کرتی ہے۔

اس کا خاندان متوسط درجہ کا ہوتا ہے اس لیے مالی تباہی کے رنج وغم اور رکاوٹ کی پے در پے مشکلات سے دماغ محفوظ ہوتا ہے اس لیے صحت اور تندرستی درجہ اول کی مصیبت زدہ لیڈر بیوی سے کہیں بہتر ہوتی ہے۔ لیڈری کا شوق خاندان کے مردوں کے قومی لیڈروں کے شوق سے پیدا ہوتا ہے جس کا ثبوت یہ ہے کہ ایک لیڈر بیوی بھی ایسی نہ ملے گی جس کے شوہر میں لیڈری کا شوق نہ ہو یا اس کے گھرانے کا کوئی مرد لیڈر نہ ہو۔ گویا ہر لیڈر بیوی کو لیڈری کی آزادی اس کے خاندان کے مردوں سے ہی دی جاتی ہے اور عرفِ عام میں رونا یہ کہ مرد عورتوں کی آزادی روکے ہوئے ہیں حالانکہ عورتوں میں آج تمام بیداری مردوں ہی کی لائی ہوئی ہے یعنی اگر وہ تعلیم وتربیت کے ایسے مواقع بہم نہ پہنچاتے تو عورتوں میں یہ بیداری آتی کہاں سے؟۔

بس ایسی بیوی کی شادی اکثر ایسے ہی شوہر سے ہوتی ہے جو اگر خود لیڈر بھی نہ ہو تو یورپی تعلیم وتربیت کے اثر سے وہ اپنی بیوی کی لیڈری کو روکتا نہیں بلکہ اپنی برادری میں اس بیوی پر فخر کرتا ہے۔

اس بیوی کی شادی میں کافی مقدار میں یورپی ضوابط کام میں لائے جاتے ہیں مثلاً شادی سے پہلے دولہا دلہن کی باہمی پسندیدگی کی سہولتیں، شادی کی تصویر کا انگریزی اخبار ٹائمس آف انڈیا بمبئی میں چھپوانا وغیرہ۔

اس شادی کے بعد مالی فراغت کے باعث یہ بیوی دو ہی کام کرتی ہے یعنی لیڈری اور گھر میں انگریزی وضع کے گلوبند، موزے، بنیائن، مفلر اور کرسیوں اور تکیوں کے پوش پر کشیدہ کاری اور کہیں کہیں انگریزی حروف میں تکیے کے غلافوں پر نام لکھ دینا۔ ایسی بیوی کے سسرال کی مالی حالت اس کے میکے کے برابر ہوتی ہے لہٰذا دونوں خاندانوں کی مالی فراغت کی وجہ سے اس بیوی کے ساس سسر بھی اس سے خوش رہتے ہیں اور لڑائی جھگڑا نہیں ہوتا۔

اس کی خدماتِ قومی میں اس کا مالی ایثار بھی شامل ہے جس کی وجہ سے غریبوں پر اس کے اثرات کافی ہو جاتے ہیں۔ اس کی بڑی دوڑ دھوپ عورتوں میں یورپی تعلیم کا رواج دینا ہوتا ہے یا قومی مدرسہ قائم کر کے اس میں دینی وملکی تعلیم پر غالب تعلیم انگریزی اور اسی نوع کی صنعت وحرفت

ہوتی ہے۔ یہ عورتوں میں اصلاحی تحریک کی محرک و موید بھی ہوتی ہے اور اخبار یا رسالے کے ایڈیٹر یا سر پرست یا نگراں بھی۔ یہ عورتوں کے مجالس میں تقریر بھی کرتی ہے اور اچھی تقریر کرتی ہے مگر ہندستان میں کام کے آدمیوں کا قحط ہونے کی وجہ سے چند مٹھی بھر لوگ ہی مشہور ہو سکے اور سر برآوردہ باقی کے جو تھے وہ اپنی اہلیت کی قلت کی وجہ سے مشہور نہ ہو سکے چنانچہ سارے ہندستان میں تقریر کرنے والی عورتوں میں صرف جناب نائیڈو صاحبہ ہی کا نام روشن ہوا اور بس۔ حالانکہ اور بھی عورتیں اچھی تقریریں کرتی ہوں گی مگر 40 کروڑ انسانوں کی بستی میں، جو نام مشہور ہے وہ صرف نائیڈو صاحبہ کا ہے۔ پس اس متوسط بیوی کے لیڈری سے متعلق حالات کا خلاصہ خود اسی طبقہ کے ایک رسالہ سے ملاحظہ کیجیے جو ایک لیڈر بیوی کے انتقال پر اس نے شائع کیے، چنانچہ لکھتا ہے کہ:

> ''ان کی شادی 13 برس کی عمر میں ہوئی، اس وقت کے زمانے کے لحاظ سے آپ کو اردو، انگریزی میں کافی لیاقت حاصل تھی۔ آپ کو قومی خدمت کا شوق بہت تھا۔ مسلم خواتین کی اصلاحی تحریکات کی آپ روح تھیں۔ عید پر قومی اجتماع انھی کے دم سے رونق پاتے تھے۔ خواتین کی مسلم لیگ کی صدر تھیں، لڑکیوں کے واسطے انھوں نے ایک مدرسہ قائم کیا تھا جس کے تمام اخراجات خود برداشت کرتی تھیں۔
>
> موسیقی، شاعری، بیت بازی اور چمن بندی سے خاص شوق تھا۔ عورتوں کی تحریکات کے ہر کام میں پیش پیش رہتی تھیں وغیرہ''۔

(رسالہ تنویر بمبئی، جون 1941، صفحہ:40)

فی الجملہ عوام کے لیے اس بیوی کی جد و جہد، محنت، دوڑ دھوپ اور اس کا ایثار بے حد قابلِ تعریف اور بعض اعلیٰ نتائج کے لیے شائستہ شکر و سپاس بھی ہے۔

اس کے بعد خواص کے طبقے کی وہ لیڈر بیوی ہے جو اپنے خاندان کے تمول اور یورپی ماحول کی سی تربیت کے زیر اثر یورپ ہی میں تعلیم پاتی ہے۔ وہیں کے احساسات لاتی ہے اور وہیں کی اصلاحات و مطالبات۔ چونکہ اس میں مردانہ ماحول کے جملہ اثرات و مشاہدات کامل ہوتے ہیں اس لیے یہ انگریزی زبان میں تقریر و تحریر پر قدرت رکھتی ہے اور ہندستانی خواتین کے لیے یورپ کی عورتوں کے حقوق طلب کرتی ہے، اس کی توجہات کا رخ اور زور ہندستانی عورتوں کی

عملی اصلاح سے زیادہ مطالبات کے حصول کی طرف ہوتا ہے مثلاً یہ گاؤں گاؤں اور قصبے قصبے پھر چل کر عورتوں کو ترقی وتبدیلی کی طرف مائل کرنے کے عوض شہروں میں میونسپل اور کاؤنسل کے حقوق پر زیادہ تقریر کرتی ہے اور عورتوں کے لیے مردوں کے شانہ بشانہ ملازمتیں اور عہدے زیادہ طلب کرتی ہے۔ گویا یہ تیار شدہ عورتوں کی کماندار ہوتی ہے اور میدان میں ڈٹ کر لڑتی ہے اگر چہ اس کی فوج ابھی حملہ کے قابل نہیں پھر بھی اس کی جدوجہد سے عورتوں کو بھی بعض مردانہ فرائض ملنے لگے ہیں جو معلوم نہیں فطرتاً ہندستان میں مستقل بھی رہیں گے یا نہیں؟

اس کے بعد بیگمات اور رانیوں کا طبقہ ہے جن میں سے چند انگلیوں پر گنے جانے کے قابل بیگمات اور رانیاں ہیں جو عورتوں کی اس دوڑ دھوپ میں کبھی کبھی نمایاں ہو جاتی ہیں اور یہ بھی وہی ہوتی ہیں جن کے مردوں کا ماحول بھی لیڈری کا شوق لیے ہوئے ہوتا ہے۔ ان کی ذہنی اور تعلیمی صلاحیت کا کوئی مسلّم معیار نہیں ہوتا چنانچہ بعض بیگمات اور رانیاں ایسی بھی ہیں جو قدیم تعلیم سے مزین ہیں مگر ذہنی صلاحیت سے وہ آج کل کی کیمبرج کی فاضلین سے بہتر تدبر وفراست کے مالک ہیں اور بعض وہ ہیں جو یورپ سے تعلیم پا کر آئی ہیں اور بعض ان دونوں کے درمیان کا درجہ رکھتی ہیں۔ بارے ان میں سے جو بھی قومی جدوجہد میں شریک ہوتی ہے اس سے روپیہ خاصا وصول کیا جاتا ہے اور بعض مرد ایسی خواتین سے قوم کے نام پر چندوں کی کافی مقدار وصول کرتے ہیں۔

ایسی لیڈر بیوی کی لمبی لمبی تقریریں بھی شائع ہوتی ہیں اور ان کے شکریے بھی۔ حاصل کلام! یہ لیڈر بیوی عورتوں کی جدوجہد میں ذاتی حیثیت سے بہت کم حصہ لیتی ہے البتہ اس کے دولت مندرانہ حوصلے کافی لائق شکر وستائش ہوتے ہیں اور عورتوں کی جدوجہد کی جان۔ یہی وجہ ہے جو ایسی لیڈر بیویوں کی اعلیٰ تدابیر وتجاویز اصلاح کے مقابل ان کے ناموں پر مدرسوں، انجمنوں، اخباروں اور رسالوں کو زیادہ منسوب پایا جاتا ہے۔

الحاصل ہندستان میں اگر عورتوں کی اصلاح کا کوئی ایسا لائحۂ عمل طے ہو جائے جو یورپی تقلید ونقل کے عوض خالص ہندستانی فطرت وضرورت کے عین موافق اور ضروری بھی ہو تو مذکورہ بالا اقسام کی عورتوں کا وجود ہندستان کی نئی نسل کے حق میں فالِ نیک ہے۔

(9اگست 1941)

حقوق طلب بیوی

اس بیوی کا وجود بھی ہندستان کے دماغ کی ایجاد نہیں بلکہ ہندستان میں یورپی تعلیم اور یورپی عورتوں کے دیکھا دیکھی یہ بیوی پیدا ہوئی ہے اور صرف انہی مردوں تک اس کے اثرات زیادہ ہیں جو خود غیر محقق اور یورپ کی ہر ادا کے نقال ہیں۔ اس بیوی کا خمیر، یہ یورپ کی حقوق طلب عورتوں سے ہندستان میں اٹھایا گیا ہے، اس لیے اس کی بھی کوئی خاص قومیت و مذہب نہیں۔ یہ ہندوؤں سے لے کر مسلمان، پارسی، سکھ اور دوسری ہندستانی قوموں میں یکساں پائی جاتی ہے۔ چونکہ اس کی پیدائش کسی خاص عقلی غور وفکر، شدید تفکر و تحقیق، کافی سوچ وچار اور کامل تدبر سے نہیں ہے بلکہ محض یورپ کی حقوق طلب عورتوں کی نقالی میں ہے اسی لیے اس کے مقاصد و مطالب بھی وہی ہیں جو یورپ کی عورتوں نے اپنے لیے وضع کیے ہیں اور جن کا خاکہ یہ ہے:

1۔ مثلاً عورت کو مرد کی طرح تفریحی آزادی حاصل ہو اور شوہر اس آزادی میں مخل نہ ہو۔

2۔ مرد کے برابر عورت خرچ اخراجات میں برابر کی حصہ دار ہو۔

3۔ مرد کی طرح عورت کو بھی تعلیم و ملازمت اور کاروبار کی آزادی حاصل ہو اور اس سلسلہ سے شوہر مانع نہ ہو۔

4۔ مرد کی طرح عورت کو بھی مجالس قانون ساز وغیرہ میں حق رائے دہی حاصل ہو۔

5۔ مرد کی درسگاہوں میں عورتوں کو بھی تعلیم حاصل کرنے کی سہولت ہو۔

6۔ امور مملکت میں بھی عورت کو مرد کی طرح عہدے اور ذمہ داریاں دی جائیں وغیرہ۔

کم وبیش یہ مطالبات یا مقاصد ہیں حقوق طلب بیوی کے۔

اب ان مطالب میں خاص بات یہ ہے کہ ان سے اس عورت کی حقوق طلبی ثابت نہیں بلکہ صرف مردوں کی نقالی مراد ہے اور یہی علمی نکتہ اس غریب کی غلط کاری کا ثبوت ہے۔ یعنی صنفی حیثیت سے اگر عورت بحیثیت عورت کے وہ حقوق طلب کرتی جو عورت کو فطرتاً بحیثیت عورت کے درکار ہیں تو کہا جاتا کہ اس نے اپنے واقعی اور واجبی حقوق طلب کیے، لیکن جو حقوق و واجبات صنفی حیثیت سے فطرتاً مردوں سے متعلق ہیں ان کا طلب کرنا عورت کا فطری حق نہیں بلکہ نقالی ہے۔ مثلاً تولید و توالد ہی کا ایک فریضہ عورت کے ذمہ ایسا ہے کہ وہ ہر سال مرد سے کم سے کم چھ ماہ علاحدہ اور پُرسکون رہ کر اس فریضہ سے سبکدوش ہو سکتی ہے۔ عام اس سے کہ وہ تعلیم پا رہی ہو یا ملازمت کر رہی ہو لہٰذا مرد کی ہر منزل میں وہ ہر سال پیدائش سے فراغت تک دنیا میں کسی کام ہی کی نہیں اس لیے مردوں کے فرائض و واجبات میں سے وہ جو کچھ بھی طلب کرے گی اس سے صرف چھ ماہ مستفید ہوگی اور بقیہ چھ ماہ وہ ایک بچہ کی ماں ہونے کے لیے گھر میں بیٹھی رہنے پر مجبور ہے اس لیے اگر وہ گھریلو زندگی کے واجبات میں سے کچھ طلب کرتی ہے تو ایک محقق اور ذی ہوش طبقہ اس کی ضرور تائید کرتا۔

ہارے دنیا میں اختلافِ عقل و فراست بھی بے حد ضروری چیز ہے لہٰذا جس طبقے میں اس کی شورش کا آغاز ہوا وہ طبقہ چونکہ غیر محقق ہے اس لیے اس طبقے میں اس کی پذیرائی اور جنگ دونوں شروع ہو گئیں۔ اب رہی حکومت سو وہ چونکہ یورپی ہے اور یورپ کی زندگی میں عورت کو مرد کی طرح کی اس لیے آزادی حاصل ہے کہ یورپی قوموں کو ہر پچیس برس بعد کسی قوم سے جنگ کرنا پڑتا ہے اور جنگی ضروریات کی مجبوری سے ان قوموں کو اپنی عورتوں سے مردوں کے کام بھی لینا پڑتا ہے اس لیے وہاں کے مرد بطریق تالیف قلب عورت کی ہر خواہش کو پورا کرنے پر اخلاقاً اور ضرورتاً مجبور ہیں۔ البتہ سوال تو ہے صرف عورت کی عقل و طلب کا کہ آیا جن حقوق کو وہ طلب کرتی ہے فطرتاً وہ حقوق اس کے ہیں یا مردوں کے؟ پس اگر کوئی ایسا حق جو فطرتاً عورت ہی کے لیے خاص ہے

22

اور مرد اس کو نہیں دیتا ہے تو یہ مرد کی زیادتی اور عورت کا واقعی حق ہے مثلاً زمانِ حمل میں عورت کو ہر اہم ذمہ داری سے علاحدہ ہو کر کافی آرام کرنا چونکہ اس کا فطری اور نسائی حق ہے اس لیے اس کی طلب کرنے والی عورت صحیح معنی کی حق طلب عورت ہے، لیکن مردوں کی ضروریات سے متعلق محکمات میں ملازمت طلب کرنے کے یہ معنی ہیں کہ اول تو یہ منصب ہی عورت کی سیرت کے خلاف ہے اور اگر اس مردانہ منصب کو عورت حاصل کر بھی لے تو پھر زمانۂ حمل میں اس منصب کی ذمہ داری کو وہ کس طرح ادا کرے گی؟ اسی لیے اگر حقوق طلب عورتوں کے کارناموں کی آج تک کی فہرست ملاحظہ کیجیے تو عقلی اور ریاضی کے حساب سے زیادہ تعداد میں ناقابل تذکرہ اور ناقابلِ اطمینان نتائج کی حامل ملے گی۔

اسی طرح انسانی فطرت و عادت کو بھی انسانی اعمال سے خاصا تعلق ہے بلکہ اعمال اصل میں فطرت و عادت ہی کی پیداوار ہیں لہٰذا ہندستان کے مردوں کو مردانہ ذمہ داریوں میں کبھی عورت کی شرکت و امداد کی عادت ہی نہ تھی نیز مردانہ فطرت کے اجزا عورت کی مداخلت کو ان امور میں برداشت ہی نہیں کر سکتی جن کا تعلق فطرت ہی نے صرف مردوں سے متعلق رکھا ہے مثلاً کوئی مرد اپنی ماں بہن اور بہو بیٹی کو مردانہ وضع کی آزادی اور مادر پدر قسم کی بے راہ روی میں فطرتاً ہی دیکھنے کا عادی نہیں اس لیے ہندستانی مردوں نے اس بیوی کے ایسے تمام مطالبات کی نہ فقط مخالفت کی بلکہ ان کے ایسے خیالات و مطالبات کا مذاق اُڑایا۔

لیکن میری ذاتی رائے میں اس بیوی کے متعلق کچھ کہنے سے پہلے خود اس کے دماغ و مزاج کے فطری اوصاف اور افتاد کو جانچنا بھی ضروری ہے۔ چنانچہ مجھے اعتماد ہے کہ حقوق طلب عورتوں میں بعض بے حد سنجیدہ، عاقل و ذی ہوش عورتیں بھی شریک ہیں اور ان کے مطالبات کی فہرست یقیناً سنجیدہ، درست اور کافی حد تک فطری ہے مثلاً ایسی عورتیں صرف ان شدائد سے رُستگاری کی طالب ہیں جو بعض جاہل اور کندۂ ناتراش قسم کے شوہروں نے بغیر کسی معقول دلیل اور وجہ کے ان پر توڑے ہیں مثلاً:

1۔ نااتفاقی کی صورت میں بھی محض انتقام کے طور پر بیوی کو طلاق نہ دینا۔

2۔ آمد و خرچ میں صرف مختار مطلق کی حیثیت سے شوہر کا خرچ کرنا اور بیوی کو حسبِ منشا تابع و

محکوم رکھنا۔

3۔ بیوی کے علم وآگاہی کے ساتھ دنیا جہان کی آوارگیوں اور غلط کاریوں میں مبتلا رہنا اور بیوی کوصرف قید وبند کی زندگی پر مجبور رکھنا۔

اس نوع کے شدائد چونکہ فطرتاً اور مذہباً عورت کے لیے نا قابلِ برداشت ہیں اس لیے عورت کے ایسے مطالبات وحقوق سے کوئی ذی ہوش مرد اختلاف وانکار نہیں کرسکتا لیکن ہندستان میں حقوق طلب بیوی کی پیدائش کی ابتدا ہی چونکہ غلط کاروں کے اثر سے ہوئی ہے اس لیے اس کے جملہ اجزا میں غلط کاریاں موجود ہیں۔ مثلاً یہ تحریک ان نوآموزوں نا تجربہ کاروں اور نوعمروں کی ہے جو عقل اور تجربے کی قلت کی وجہ سے یورپ کی ہر حرکت کی نقل عین عقل اور کمال عقل تصور کرتے ہیں حالانکہ خود ایجاد کرنے کے عوض دوسروں کی نقل کرنا ہی عقل کی خرابی اور نقص کی دلیل ہے، لہٰذا نتیجہ یہ نکلا کہ محرکین چونکہ خود غیر عاقل اور غیر مآل اندیش تھے اس لیے ان کی تحریک کا ہر پہلو ہندستان کی اجتماعی اور اخلاقی زندگی کا مخالف بن کر رہ گیا۔ مثلاً جن عورتوں کے نام سے اس تحریک کا آغاز ہوا اول تو ایسے ناموں کے پردے میں بعض یورپ زدہ مرد ہی پوشیدہ تھے یا پھر ایسی عورتوں میں غالب تعداد لڑکیوں کی نظر آتی ہے جو غریب عقل و پختہ کاری سے کوسوں دور ہوتی ہیں، لہٰذا ایسے غیر پختہ کار محرکین نے حقوق طلبی کے لیے جو حرکت کی وہ پختہ کار عورتوں تک کو ناگوار گزری چہ جائیکہ پختہ کار مرد، مثلاً حقوق طلب عورتوں کے حق میں جو تقریریں ہوئیں یا جو تحریریں شائع ہوئیں ان کی لکھنے والی چونکہ عموماً لڑکیاں ہوتی ہیں اس لیے ان کا طرزِ خطاب اس درجہ پست، بودا، غیر مدلل اور مردوں کو شدید اشتعال دلانے والا ہوتا ہے لہٰذا نتیجہ یہ نکلا کہ عورتوں کو واجبی حق دینے کے عوض مردوں میں بھی ایک جوابی جماعت پیدا ہوگئی جو عورتوں کی ہر حق طلب تقریر کے بدلے تقریر اور تحریر کے بدلے تحریر سے کام لینے لگی۔ چنانچہ ایک ہندو بھائی کے اخبار بنام ''وطن دہلی'' بابت 1940 کے ذخیرہ میں ایسے مقابلہ کے مضامین کا ایک انبار ملے گا جس میں ایک طرف سے عورت نے اور دوسری طرف سے مرد نے ایک دوسرے کے حقوق اوصاف مطالبات حتیٰ کہ خواص ہتک پر خوب خوب دادِ تحریر دی ہے۔

الحاصل اس بیوی کی پیدائش عموماً مالدار طبقات میں ہوتی ہے جہاں یورپی تعلیم وتربیت

کے جملہ لوازم فراہم ہوتے ہیں اور اسی لیے اس کے ذہن و دماغ میں جو کچھ ہوتا ہے وہ نیم ہندستانی اور نیم یورپی، اس لیے اس کی تعلیم وتربیت حسب حیثیت یورپی اصول پر ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ یہ عجیب وغریب عمل اسی بیوی میں دیکھا کہ اگر یہ مسلمان قوم کی بیوی ہوئی تو پردہ کے معاملہ میں بھی یہ نیم مسلمان اور نیم یورپی کا مزا دیتی ہے مثلاً ایک حقوق طلب گھرانے میں اس گھر کی سب سے بڑی لڑکی کی تعلیم کے لیے مجھے مقرر کیا گیا۔ چونکہ میں غیر اسلامی اصولِ زندگی کا شدید مخالف مانا گیا تھا اس لیے مجھ سے اس لڑکی نے پردہ کیا اور خود اس نے مجھ سے کہا کہ ''ہمارے ہاں پردہ کے متعلق یہ دستور ہے کہ ہم اپنے سے واقف مردوں سے پردہ کرتے ہیں اور ناواقف مردوں کے سامنے بے پردہ آتے ہیں''۔

پس اس نیم ہندی اور نیم یورپی طریق پردہ سے اس طبقے کی عقلی کمزوری کا اندازہ فرمالیجیے اس لیے ایسی ہی ناقص اور غیر عقلی تعلیم وتربیت اور ایسے ہی غیر عقلی مردوں اور یورپ زدہ رشتہ داروں میں پل کر جوان ہوتی ہے اور ایسے ہی کسی یورپ زدہ ہندستانی سے بیاہی جاتی ہے۔

چونکہ جانبین یورپ زدہ ہوتے ہیں اس لیے مسلمان ہونے پر بھی ایسے جوڑے کو اپنی مرضی کے موافق شادی کرنے کے لیے آزاد چھوڑ دیا جاتا ہے اور شادی سے قبل ایسے نوجوان لڑکا لڑکی پوری آزادی سے شادی کے بارے میں معاملات طے کرتے ہیں۔ چنانچہ خود میرے ذاتی مشاہدہ میں متعدد شادیاں ایسی ہی آزادیوں سے عمل میں آچکی ہیں جن میں منگنی تک سے قبل ہی ایک جوان لڑکی ایک جوان لڑکے کے ساتھ ایک تنہا باغ میں گھومنے جایا کرتی تھی اسی طرح اس طبقے کی ایک دو شادیاں بھی بالکل یورپی اصول پر ہوتے دیکھی ہیں جن میں صرف نکاح تو اسلامی ضابطہ سے ہوا لیکن نکاح کی مجلس اور دوسری تقریبات خالص یورپی ضابطہ کی تھیں۔

پس اس طرح شادی سے فارغ ہوتے ہی یہ بیوی چند دن کے لیے شوہر کی روح اور سر کی تاج اس لیے بن جاتی ہے کہ دونوں کی شادی پوری آزادی اور پسند سے عمل میں آتی ہے لیکن ابھی ہندستان کی غالب آبادی یورپی وضع قطع سے نفور ہے اس لیے ایسی بیوی چند دن بعد ہی سسرال سے محروم اور علاحدہ ہوجاتی ہے کیونکہ اس کے ساس سسر اس کی ہندستانی فطرت سے دور باتوں اور برادری کی مروجہ تہذیب کے خلاف حرکات کے سخت مخالف ہوتے ہیں اس لیے چند دن بعد ہی

یا تو یہ بیوی مع شوہر سسرال سے علاحدہ یا پھر شوہر تک علاحدہ اور بیوی اپنے میکے۔ اور اگر کسی گھر میں قدم جم بھی گئے تو پھر یورپی قاعدہ سے صبح وشام میاں بیوی میں حقوق پر جنگ اور اختلاف، جس کا غالب نتیجہ پھر وہی میکہ یا طلاق۔ اور اگر اس پر بھی خدا کا فضل شامل ہی رہا اور شوہر کافی سے زیادہ مطیع وفرماں بردار مل گیا تو پھر یہ بیوی یورپی قاعدے کے خرچ اخراجات سے شوہر کو ادموا کر کے چھوڑتی ہے کیونکہ ہر دن سہیلیوں کی ٹی پارٹی، کلب، فیشن، سنیما کے، مصارف، موٹر کا پٹرول، ساڑی کی قیمت اور اگر بچے ہو گئے تو ان کے یورپی لباس اور یورپی تعلیم وتربیت کے مصارف سے یہ شوہر کا کچومر نکالنے والی بیوی ہوتی ہے کیونکہ عقل کی قلت اور غیر قومی تقلید کے اثرات اس کے دماغ میں صحیح ہندستانی گرہستی کا نظام قائم نہیں ہونے دیتے اس لیے ان حالات کے اکثر نتائج اس کی گھریلو زندگی کی عافیت کو تنگ وتاریک بنا کر چھوڑتی ہے۔

ممکن ہے کہ حقوق طلب بیوی بعض گھرانوں میں بے حد مفید ومبارک ثابت ہوئی ہو لیکن وہ ایسے ہی گھرانے ہو سکتے ہیں جو عوام کی زندگی سے دور اور مفت کی دولت کے مالک۔ کیونکہ جن گھرانوں پر عوام تنقید واحتساب کر سکتے ہیں اول تو ان میں فضولی اور بے راہ روی کی جرأت ہی پیدا نہیں ہوتی اور اگر ہو بھی جائے تو وہ عوام کی تنقید وصلاح سے اصلاح پر بھی مائل ہو جاتے ہیں لیکن جو گھرانے عوام کی تنقید واعتراض سے دور ہیں ان میں حقوق طلب بیوی عافیت بخش ہونے کے عوض اکثر عافیت سوز پائی گئی ہے اور محض اپنی آزاد خیالی اور آزاد روش پر اس کو سوت کا صدمہ برداشت کرنا پڑتا ہے کیونکہ ہنوستانی مرد خواہ یورپ ہی میں پیدا ہو کر ہندستان میں پلا ہو مگر وہ اپنی بیوی کو اپنے اوپر مسلسل حکمراں یا بے روک ٹوک آزاد اور لغویات میں خرچ کرنے والا زیادہ دیر تک نہیں دیکھ سکتا، لیکن چونکہ حقوق طلب بیوی عموماً زبان وقلم کی دھنی واقع ہوتی ہے اور بحث وجرح کی عادی اس لیے وہ جس طرح عنفوانِ شباب کے دباؤ سے نیم خام شوہر کو اپنی مرضی پر ڈھال لیا کرتی تھی اب اولاد ہو جانے کے بعد وہ اپنی تقریر سے شوہر کو اپنے ڈھب کا نہیں بنا سکتی اس لیے کہ شاید وہ اس فطری فرق سے بے خبر رہتی ہے کہ مرد ہر حال میں یعنی عقل وفراست میں عورت سے بلند ہے اور یہ غریب اپنی فطری قلتِ عقل کی وجہ سے شوہر کے ہاں پرانی ہو کر بھی دلہن پن کے ناز ونخرہ اور نزاکت مزاج کی فرماں روائی برقرار رکھنا چاہتی ہے اس لیے شوہر صاحب اب اپنی عقلی

پختگی کے اثر سے اس کی ناز برداری سے تھک جاتے ہیں اس لیے اکثر حالات میں یہ شوہر صاحب اس حقوق طلب بیوی پر ایک غیر حقوق طلب بیوی کو لاتے ہیں۔ نتیجہ اس تمام روشن خیالی کا یہ نکلتا ہے کہ آج دولت مند گھرانوں سے ایسے تباہ شدہ میاں بیویوں کی تعداد اور فہرست طلب کر لیجیے۔

اس نوع کی بیوی عوام وخواص کے جلسوں میں تقریر کرتی ہے اور اپنے عقائد واصول سے اخباروں، رسالوں اور بعض وقت اشعار اور کتابوں کے ذریعہ بھی دوسروں کو متاثر کرتی ہے اس لیے اس کے حالات لکھنا ضروری قرار پائے۔

یہ عموماً صرف شوہر سے خوش اور پورے سسرال سے اس لیے ناخوش رہتی ہے کہ ابھی ہندستان میں اس کے عقائد اور یورپی ا؁ ـل زندگی کے ساس سسر کافی تعداد میں فراہم نہیں ہو سکے ہیں، اس لیے ان میں کی بعض محض سسرالی صدمات کے اثر سے دِق کے ہسپتالوں میں پائی گئی ہیں۔

بظاہر حالات کافی خوبصورت، کافی خلیق وملنسار، کافی بے جھجک مگر پھر بھی عورت قوم وملک کی زبردست غمخوار، مذہب سے ناآشنا، انگریزی داں، اخبار بین، شاعرہ، افسانہ نگار، ریڈیو پسند، سنیما خواہ، انگریزی کھانوں سے واقف، بینک میں روپیہ جمع کرنے سے آگاہ، مردانہ لباس کی شائق، موٹر اور کوٹھی کی طالب، حسبِ مرضی دولت سے محروم۔

(ملّا رموزی،
5 اگست 1941)

◆◆◆

رضا کار بیوی

اس بیوی کا تعلق گو کسی خاص قوم یا جماعت اور برادری سے نہیں پھر بھی یہ عموماً ہندو قوم سے زیادہ تعلق رکھتی ہے اور مسلمانوں میں شاید پردے کے رواج کی وجہ سے پیدا نہ ہو سکی ہو۔

رضا کار کے معنی ہیں بغیر کسی معاوضہ کے قومی خدمات انجام دینا، لیکن یہ خدمات عموماً محدود ہوتی ہیں اور ان کا دائرہ زیادہ وسیع نہیں مثلاً رضا کار عموماً قومی جلسوں اور جلوسوں اور دوسرے اجتماعات میں کام کرتے ہیں اور اس سلسلے سے ان کو مہمانوں اور شرکا کی خدمات، تواضع اور انتظامی امور سے تعلق ہوتا ہے جو ایک مرتبہ نظم اور ایک سردار کے احکام اور نگرانی میں سرانجام دی جاتی ہیں۔

اس بیوی کا خیال و تصور بھی ہندستانی نہیں بلکہ یہ بھی یورپی نقالی ہے جو یورپ کے اجتماعات میں عورتوں کے کام کرنے سے لی گئی ہے، اس لیے اس بیوی کے لیے کوئی مرتب و مسلسل سوانح عمری نہیں لکھی جا سکتی اور عموماً یہ مردوں کی پیدا کردہ ہوتی ہے۔ مثلاً جن مردوں کو قومی کاموں اور قومی خدمات سے تعلق ہے وہی ایسی خواتین کو آمادۂ کار کرتے ہیں اور بعض ایسی بھی ہیں جو اپنے ذاتی میلانِ طبع اور اپنے ہی احساس سے اس میدان میں آتی ہیں لیکن دونوں صورتوں میں یہ چیز مسلّم ہے کہ یہ بیوی انیسویں صدی عیسوی ہی کی پیداوار ہے اور مشرق و ہندوستان کی قدیم

تہذیب سے نفور یا دور، اس لیے اس کے اجزائے زندگی میں یورپی طور طریقوں کی نقل کو خاصا دخل ہے اور اس کی پیدائش میں انہی ہندستانیوں کا اثر کام کرتا رہا جو قومی مطالبات و قومی اصلاحات کو بھی یورپی طور طریقوں کے موافق ہی سرانجام دیتے تھے، اس لیے اس بیوی کے کاموں کے لیے کوئی ایجادی یا ہندستانی دماغوں سے سوچا ہوا نظامِ عمل نہیں دیا گیا بلکہ یورپ میں جو کام رضا کار عورتوں کو کرتے دیکھا وہی اس ہندستانی رضا کار بیوی کے سپرد کر دیا گیا اور ہندستانیوں میں ایجاد کرنے والی عقل کے اسی فقدان اور کمی کے باعث رضا کار بیوی کے لیے برسوں کوئی منضبط اور منظم زندگی پیدا نہ ہو سکی۔ البتہ ستمبر 1931 میں گاندھی جی کے وطن یا صوبۂ گجرات کاٹھیاواڑ کے دارالصدر احمد آباد سے ذیل کا اعلان ہوا:

"مجلس "خدام ہند" کی مرکزی تفتیشی جماعت نے جو رووداد رضا کار عورتوں کی تنظیم کے واسطے مجلس ملیہ عظمٰی ہندستان کی مجلس عاملہ میں پیش کی ہے وہ اخباروں کو اشاعت کے لیے دے دی گئی ہے۔ اس رووداد میں لکھا ہے کہ اس تجویز و رووداد کے مرتب کرنے کے لیے مجلس ملیہ عظمٰی ہندستان کی مجلس عاملہ نے چاہا کہ ایک تحقیقاتی جماعت رضا کار عورتوں کی تنظیم کے بارے میں بعد تحقیق اطلاع دے اور تدبیر بتائے۔

چنانچہ ہم لوگوں کو اس کام میں چند مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ یعنی ایک طرف یہ محسوس کیا گیا کہ جہاں تک ممکن ہو وہاں تک مجلس ملیہ عظمٰی ہندستان کی صوبہ جاتی مجالس کی آزادی میں مداخلت نہ کی جائے اور دوسری جانب یہ بھی محسوس کیا گیا کہ اگر یہ کام صوبہ جاتی مجالس کے ذمہ چھوڑ دیا گیا جن میں کہ زیادہ تر مرد ہیں تو عورتوں کی تنظیم میں بہت دیر لگے گی اور زیادہ ترقی نہ ہو سکے گی، لہٰذا یہ مناسب تصور کیا گیا کہ ان کی مجلس قائم کرنے میں خود انہی کو آزادی دی جائے تاکہ وہ جس طرح چاہیں اس کو اپنی مرضی کے مطابق قائم کریں۔ اس طریق کار سے اگر ان پر یہ ذمہ داری ڈالی جائے گی تو ان میں خود تنظیم کا مادہ پیدا ہوگا اور بعد ازاں وہ دیگر معاملات میں خوب دلچسپی لینے لگیں گی۔

چنانچہ فیصلہ کیا گیا کہ پانچ ارکان پر مشتمل ایک مرکزی مشاورتی مجلس بنائی جائے جو مجلس ملیہ عظمیٰ ہندستان کی صوبہ جاتی مجالس سے اشتراکِ عمل کرے۔ نیز یہ طے پایا کہ یہ مجلس عورتوں کی تربیت اور اصلاحات کے لیے بھی کوئی طریقہ تجویز کرے اور یہ تربیت تربیت یافتہ خواتین ہی دیں۔

اس مجلس میں یہ بھی اظہارِ رائے کیا گیا کہ جب تک مشاورتی مجلس مقرر نہ ہو تب تک ایک عورت مختلف مقامات پر عورتوں کی انجمنیں قائم کرنے کی کوشش کرے اور وہ مجلس ملیہ عظمیٰ ہند اور صوبہ جاتی مجالس اور مرکزی رضا کار مجلس کے ساتھ اشتراک عمل کرے۔ نیز وہ عورتوں کی انجمن سے مشورہ لے کر ان کی تربیت اور اصلاحات کے لیے مناسب طریق کار تجویز کرے۔ ارکان کا خیال تھا کہ ایسی عورت کے مقرر کرنے سے صورتِ حالات کی ضرورت رفع ہو جائے گی نیز دیگر مشکلات بھی رفع ہو جائیں گی لیکن اس کے ساتھ ساتھ طے پایا کہ یہ انتظام صرف تین ماہ کے واسطے یا جب تک کہ مجلس ملیہ عظمیٰ ہندستان کوئی فیصلہ نہ کرے تب تک رکھا جائے۔ اس کے بعد مجلس عاملہ اس بات پر غور کرے کہ آیا عورتوں کی مرکزی مجلس قائم کرنے کی ضرورت ہے یا نہیں؟ اب عورتوں کی مجلسِ خدام نے یہ طے کیا ہے کہ مجلس ملیہ کی مجلس عاملہ خود کوئی ناظم عورت مقرر کرے۔ مجلس خواتین کی ناظمہ نے بتایا ہے کہ اس وقت عورتوں کی مختلف انجمنیں موجود ہیں لیکن باہمی اتحاد کے لیے جہاں تک ہو سکے کوشش کی جائے''۔

(ملاحظہ ہو اخبار ہندو تیج روزانہ دہلی، مورخہ 14 ستمبر 1931، صفحہ:10، جلد 9)

یہ بیان نہایت مستند و معتبر بیان ہے رضا کار بیوی کے متعلق، اس سے ثابت ہے کہ رضا کار بیوی گو اس سے کچھ پہلے پیدا ہو چکی تھی مگر وہ ضابطہ میں لانے کے قابل یا اس کے وجود کو قومی حیثیت سے تسلیم کرنے کے لیے 1931 ہی میں احساس پیدا ہوا لہٰذا کہہ سکتے ہیں کہ میری اس کتاب کی لکھائی تک ہندستان میں رضا کار بیوی ابھی بچی کی حیثیت رکھتی ہے۔ نیز مذکورہ اعلان مجلس ملیہ عظمیٰ ہندستان سے متعلق ہے جس کے کارکنوں کی کافی تعداد ہندو قوم کے افراد پر مشتمل

ہے اور اس مجلس میں ہندو مسلمان، پارسی، سکھ غرض ہر ہندستانی شرکت کرسکتا ہے لیکن ہندوؤں کی بھاری اکثریت کے اثرات کے مقابلہ 1935 سے مسلمانانِ ہند میں پھر ایک زبردست مخالفت شروع ہوئی حتیٰ کہ اس مخالفت کے اثر سے تمام ہندستان کے مسلمانوں کی سیاسی مجلس ''مسلم لیگ'' پھر زندہ کی گئی اور اس کتاب کی تالیف کے وقت مسلمانوں کی اکثریت مجلس ملیہ عظمیٰ ہندستان سے کٹ چکی ہے، لہٰذا ثابت ہے کہ مجلس ملیہ عظمیٰ ہندستان کے اعمال کا زیادہ اثر ہندو برادری پر ہے اسی لیے ہندو رضا کار عورتوں کے مقابلہ مسلمان رضا کار عورت بمنزلہ صفر کے بھی نظر نہیں آتی، گو مسلمان خواتین کے مجامع میں مسلمان رضا کار بیویاں ہوتی ہیں مگر وہ ہندو رضا کار بیوی کی طرح مردوں کے شانہ بشانہ کام نہیں کرتی ہیں۔

بہر کیف ہندو قوم میں رضا کار بیوی پیدا ہوئی اور وہ مناظر عام پر مردوں کے شانہ بشانہ کام کرنے لگی، خصوصاً مجلس ملیہ عظمیٰ کے سالانہ اجتماع اور دوسرے قومی مظاہروں اور جلوسوں میں وہ پیش پیش نظر آنے لگی اور جس تحریک کو مجلس ملیہ عظمیٰ ہندستان نے منظور و نافذ کیا یہ بیوی اس کی تکمیل و تحصیل میں سرگرم کار نظر آنے لگی۔ البتہ اس کی پیدائش میں اخلاقی اور ہندستانی فطرت کے خلاف ایک غلط طریق کار ایسا بھی تھا جس نے اس کے سنجیدہ اثر کو کافی حد تک ناکام بنادیا اور وہ یہ کہ رضا کار عورتوں میں عموماً دوشیزہ اور نوخیز لڑکیاں لی گئیں۔ پھر ان کو بھی ایک خاص قسم کی وردی میں ملبوس کر کے مردوں کے اجتماع میں لایا گیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ مردان کے کام سے زیادہ خود ان کے تماشائی بن کر رہ گئے اور اگر ان کے عوض ضعیف اور بوڑھی عورتیں قومی تباہی کے مناظر اور قومی صدمات کے اشعار سناتیں تو ان کا اثر مردوں پر بے حد سنجیدہ اور دلنشیں ہوتا بلکہ دلگداز و اشتعال انگیز، لیکن محض نوخیز لڑکیوں سے مردوں کے جلسوں میں خوش آوازی سے نظمیں پڑھوانے سے مردوں پر فطرتاً کوئی سنجیدہ اثر نہ پڑا۔ البتہ مجلس ملیہ عظمیٰ ہند نے بعض تحریکات کی مخالفت میں رضا کار بیوی کی مہم تیاری کی، یعنی ان عورتوں کو کہا گیا کہ وہ فلاں فلاں امور سے مردوں کو روکیں۔ چنانچہ متعدد مقامات اور حالات میں ان کی یہ خدمت کار آمد اور نتیجہ خیز ثابت ہوئی، لیکن مذہب و اخلاق اور عادت عام کے اس قومی فرق نے مسلمانوں میں اس کے لیے جو مخالف اثر پیدا کیا اس پر ایک مؤقر و محترم مسلمان اخبار نے جو کچھ لکھا وہ یہ ہے۔ 1930 میں مجلس ملیہ عظمیٰ ہندستان کے

صدر المہام جناب گاندھی نے ہندستانیوں کو غیر ہندستانی کپڑے اور شراب نوشی سے منع کیا اور یہ کام قومی تحریک کی صورت میں زور پکڑ گیا یہاں تک کہ اس میں رضا کار بیوی نے بھی مردوں کو ان دونوں غلط کاموں سے روکنے میں سرباز ارحصہ لیا اور یقیناً بے شمار مردان کے روکنے اور بیچ میں آ جانے سے رُک گئے جو سراسر لائقِ احترام کامیابی تھی، لیکن مذہب واخلاق اور قومی عادت کے فرق کی وجہ سے مسلمانوں نے مردوں کے کاموں میں عورتوں کی شرکت کی مخالفت کی۔ مقصد یہ نہیں تھا کہ انھوں نے ہندوؤں کے کاموں یا ملکی کاموں میں ہندو عورتوں کی شرکت بھی مکروہ قرار دی البتہ انھوں نے ملکی کاموں میں اپنی عورتوں کو مردوں کے ساتھ عام مناظر پر بے پردہ کام کرنے سے جن وجوہ ودلائل سے باز رکھا اس کے لیے ایک کثیر الاشاعت مسلمان اخبار کا یہ مضمون ملاحظہ فرمایئے۔ چنانچہ اس نے لکھا کہ:

''اقوامِ عالم کی سیاسی تواریخ میں بے شبہ ایسے دور آئے ہیں جبکہ عورتوں کو بھی مردوں کے دوش بدوش کام کرنا پڑا ہے، مگر ہندستان کی تاریخ میں ابتدائے آفرینش سے آج تک کوئی زمانہ ایسا نہیں آیا جس میں عورتوں کے لشکر نے مردوں کی فوج کا مقابلہ کیا ہو، البتہ گزشتہ دو ہزار سال میں نصف درجن عورتیں ایسی ضرور ہندستان میں پیدا ہوئی ہیں جنھوں نے مختلف زمانوں میں بطور وارث تخت وتاج جرار مرد لشکروں کی سپہ سالاری کی اور کشت وخون کے دریا بہتے دیکھے۔ چنانچہ دورِ حاضرہ کی سروجنی نائیڈو ہیں، اگر عورتوں کی سپہ سالاری یا رہنمائی کسی قدر قابلِ فخر ومباہات ہوسکتی ہے تو اہلِ ہند سروجنی نائیڈو صاحبہ کے وجود باوقار پر مسرت کے نعرے بلند کرسکتے ہیں مگر مجلس ملیہ عظمیٰ ہندستان کے کھدر پوش اور چنے کھانے والے نبرد آزماؤں نے شراب اور کپڑے کی دوکانوں پر عورتوں کے پہرے لگانے کی جو مہم جاری کی ہے وہ اپنی شان میں بالکل نرالی ہے اور ہندستانی یا مشرقی روایات قدیمہ کے قطعاً خلاف ہے۔

جماعت میں جو درجہ عورتوں کو حاصل ہے اس کے متعلق مشرق ومغرب کے نقاط نگاہ بالکل مختلف ہیں یعنی اہلِ مغرب کا تمدن عورت کو جس احترام سے دیکھتا ہے اہلِ مشرق اس سے بالکل متضاد زاویۂ نگاہ سے عورت کا احترام کرتے ہیں۔ دنیا بھر کی

شجاع قومیں اپنی شجاعت اسی میں سمجھتی ہیں کہ عورت کی انتہائی عزت و توقیر کی جائے۔ چنانچہ دنیا کے سب سے بڑے مصلح یعنی رسول خدا (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) نے بھی عورتوں کے متعلق جو احکام جاری کیے وہ عورت کی شان واحترام کو بلند وبالا کرتے ہیں۔ عورتوں کا پردہ میں رکھنا بھی اس بات کی دلیل نہیں کہ ان کی تحقیر کی جائے بلکہ اس سے یہ مراد ہے کہ باغیرت اور شجاع مرد عورتوں کو جدال وقتال اور مردانہ کاموں سے الگ رکھیں۔ وحشی اقوام یا غیر مہذب اقوام کی عورتیں اگر مردانہ کاموں میں حصہ لیتی ہیں تو مضائقہ نہیں مگر مہذب اقوام کی عورتیں ہمیشہ مردانہ کاموں سے الگ رہتی ہیں اور جماعت میں جو فرائض فطرتاً عورتوں سے مخصوص ہیں وہ انہی کی سرانجام دہی میں مشغول رکھی گئی ہیں اور جو لوگ کہ عورتوں کو مردوں کے برابر درجہ دینے کے حامی ہیں وہ یہ نہیں کر سکتے کہ عورتوں کے بجائے خود بچے پیدا کریں، یا کم سے کم دو سال تک عورتیں بچے پیدا نہ کریں اور مردوں کے فرائض بجالائیں، پس اگر یہ ممکن نہیں تو تسلیم کرنا پڑے گا کہ جماعت میں مرد اور عورت کے فرائض مختلف ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ بعض سیاسی حالات کی وجہ سے اکثر قومیں اتنی کمزور اور بزدل ہو جاتی ہیں کہ وہ مجبور ہو کر اپنی قابلِ احترام بہنوں، ماؤں اور بیٹیوں کو میدانِ جنگ میں لے آتی ہیں تاکہ فاتح قوم کی شجاعانہ غیرت جوش میں آئے اور وہ مفتوح قوم پر رحم کھائے ورنہ کوئی قوم جس میں ذرا بھی شجاعت، بہادری اور تہذیب موجود ہو کبھی گوارا نہ کرے گی کہ اس کی عورتیں سیاسی جنگ میں حصہ لے کر فاتح قوم کا مقابلہ کریں۔

مجلس ملیہ ہند نے گزشتہ چالیس سال میں سیاسی حقوق کے حصول کے لیے ایسی جنگ نہیں لڑی جیسی کہ وہ گزشتہ دس سال سے لڑ رہی ہے مگر ان دس سالوں میں جس وقت تک مسلمان جیسی شجاع قوم نے مجلس مذکورہ میں ہندو بھائیوں کے دوش بدوش کام کیا اس نے کبھی گوارا نہ کیا کہ ہندستانی عورتیں میدانِ کارزار میں آئیں یہ اور بات ہے

کہ کسی تجربہ کار عورت نے کبھی یا کسی وقت جلسہ میں کھڑے ہو کر وعظ و نصیحت کے طور پر کچھ کہہ دیا ہو اور جنگ آزما مردوں کے حوصلہ کو ابھارا ہو مگر موجودہ تحریک ''نمک سازی'' اور حکومت کے کاموں سے انکار کی تحریک وغیرہ میں مسلمانوں کی مجلس ملیہ سے کنارہ کشی نے ہندو لیڈروں کو خدا جانے کس بات نے مجبور کیا کہ وہ شراب اور غیر ملکی کپڑے کی دوکانوں پر بجائے مردوں کے عورتوں کو چوکسی کے کام پر لگائیں؟

ہماری رائے میں اس کام کو قومی بیداری سے تعبیر کرنا قطعاً جہالت ہے۔ یہ تو ہندستانی قوم کی اعلانیہ بزدلی اور کمزوری کی دلیل ہے۔ ہماری عورتیں خواہ کتنی بھی بہادر ہوں مگر ان سے چوکسی کا کام لینا ہماری قومیت کی انتہائی تذلیل ہے اسی لیے ہمیں اس بات کے دیکھنے سے بے حد خوشی ہوئی کہ چوکسی کرنے والی عورتوں میں شجاع و بہادر مسلمانوں کی بہو بیٹیاں قطعاً حصہ نہیں لے رہی ہیں اور ان کے مرد بھی اتنے گئے گزرے نہیں ہیں کہ وہ اپنی عورتوں سے کسی اعانت کے لیے درخواست کریں گے بلکہ مسلمان عورتیں خود جانتی ہیں کہ جماعت میں ان کے فرائض کیا ہیں؟

جن مغربی ممالک کے قصے پڑھ کر مجلس ملیہ ہند کے جھنڈے تلے جمع ہو کر ہندستانی عورتیں سیاسی جنگ میں حصہ لے رہی ہیں انھیں یہ سمجھنے کی ضرورت ہے کہ مغرب و مشرق کی تہذیب میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ اگر مغرب اپنی تہذیب پر فخر کرے تو ہمیں اپنے تمدن پر ناز کیوں نہ ہو اور کس منطقی دلیل سے نہ ہو؟ لہٰذا ہم اپنی عورتوں کو مغربی عورتوں کی طرح اسی وقت سیاسی امور میں استعمال کر سکتے ہیں جس وقت ہم مشرق اور روایات مشرق کو یکسر خیرباد کہہ دیں اور ہم مغربی تمدن کے یکسر غلام بن کر رہ جائیں۔

پس اگر ہندستانی مغربی سیاسی غلامی سے آزاد ہونا چاہتے ہیں تو انھیں پہلے مغربی تمدن کی غلامی سے آزادی حاصل کرنا چاہیے۔ غرض عورتوں کا بازاروں میں کھڑے ہو کر مردوں کی چوکسی کرنا یہ معنی رکھتا ہے کہ ہندستانی شجاعت کا خاتمہ ہو گیا اور اب ہم تہذیب مغرب کے زبردستی غلام بن رہے ہیں۔

ہم چوکسی کے اثرات، نتائج اور فلسفہ پر سر دست کوئی بحث نہیں کرنا چاہتے البتہ ہم یہ ضرور کہیں گے کہ چوکسی کے لیے عورتوں کی فوج تیار کرنا تحریک کی مایوس کن حالت اور ہماری مردانہ کمزوری کی کھلی دلیل ہے، اس لیے جس قدر جلد ممکن ہو سکے عورتوں کو سیاسی نظامِ عمل کے اس حصہ سے فوراً خارج کر دینا چاہیے تا کہ اقوامِ مشرق کو ہنسی کا موقع نہ ملے۔

یہ یاد رہے کہ ہم عورتوں کو صرف چوکسی کے کام سے علاحدہ کرنے کے خواستگار ہیں باقی امور میں مثلاً وعظ و نصیحت اور دوسری ضروریات زندگی کی تیاری وغیرہ میں وہ ضرور کام کریں یعنی وہ جماعت میں وہی کام کریں جس کے لیے وہ فطرتاً موزوں ہیں''۔

(ملاحظہ ہو اخبار ''خاور'' لاہور، مورخہ 21 مئی 1930، صفحہ 3)

میرے خیال میں مذکورہ بالا مضمون میں جن خیالات اور دلائل سے کام لیا گیا ہے ان میں مسلمانوں کے عقائد و اصول کی نہایت درجہ صحیح اور کامل ترجمانی کی گئی ہے اور یہی وہ عقلی و فطری اصول ہیں جن کے تحت مسلمانانِ ہند نے اپنی عورتوں میں اس مغربی نقالی کو پھیلنے نہیں دیا۔

اب اس بیوی کے عام حالات یہ ہیں کہ چونکہ یہ مغربی تعلیم یافتہ خود بھی ہوتی ہے یا مغربی تعلیم یافتہ مردوں کے گھرانے کی ہوتی ہے اس لیے اس میں مغربی طور طریقوں کا اثر کافی ہوتا ہے۔ اس میں ذاتی آزادی، مردوں کے برابر آزادی اور مغربی اصول کے موافق مغربی عورتوں کی سی زندگی بسر کرنے کی خواہش بدرجہ کمال ہوتی ہے۔ لہٰذا جوان ہونے پر بیشتر حالات میں اس کی شادی بھی کسی ایسے ہی مغربی نقال سے ہوتی ہے جو شام کے وقت مغربی عورتوں کی نقل میں اپنی ہندستانی بیوی کو بھی بازاروں، سنیما اور تفریح گاہوں میں ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر گھمانے کو فخر و ترقی سمجھتا ہو۔ پس اگر ایسے مغربیہ زدہ مرد سے اس کی شادی ہو جاتی ہے تو یہ چند ابتدائی ایام نہایت فینسی آرام سے گزارتی ہے، لیکن ہندستانی فطرت اور افلاس کے ہاتھوں چند دن بعد یہ ہندستانی فطرت کے دباؤ سے ایک گئی گزری سی بوڑھی عورت ہو کر رہ جاتی ہے۔ پھر نہ اس میں قومی و ملکی تحریکات میں جوش و ولولہ نظر آتا نہ بات بات پر ''گاندھی جی کی جے'' کے نعرے لگاتی، نہ آزاد

تفریح کے لیے شوہر سے جنگ کرتی، بلکہ ماں بنتے ہی بجائے رضا کار عورت کے خالص عورت ہو کر رہ جاتی ہے۔ البتہ اگر کسی قدیم خیال و تعلیم کے مرد سے بیاہ دی گئی تو کچھ دن کے لیے شوہر شدید صدمات و مشکلات سے دوچار رہتا ہے محض اس وجہ سے کہ رضا کار بیوی ہر حال میں جدید اور مغربی طور طریقوں کی شائق ہوتی ہے اور آزادی پسند اور شوہر ہر حال میں قدامت پسند، اس لیے اس حد تک کے اختلاف خیال کے نتائج سے اکثر حالات و نتائج بھی نقصان دہ پیدا ہوتے ہیں۔

فی الجملہ اس کے وجود سے ہندو برادری کو ضرور کچھ فوائد حاصل ہوتے ہیں اور چونکہ ابھی اس کی پیدائش کا زمانہ بھی بے حد کم اور ابتدائی ہے اس لیے اس کے مستقبل کے لیے نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کتنا شاندار ہوگا؟ اور انسانوں کے لیے کتنا مفید؟

اس کے عام فرائض یہ ہیں:

1۔ کسی قومی جلوس کے ساتھ کسی خاص وضع کے لباس میں کوئی قومی گیت گاتے ہوئے بازاروں سے گزرنا۔

2۔ کسی قومی جلسہ میں مردوں کے مجمع میں کوئی خاص لباس پہن کر کوئی قومی گیت گانا۔

3۔ کسی قومی جلسہ کے انتظامی کاموں میں قومی منتظمین کا ہاتھ بٹانا۔

4۔ کسی قومی تجویز کی شہرت کے لیے گشت اور کوشش سے کوئی مقررہ کام کرنا وغیرہ۔

(1941-5)

◆◆◆

بنجارہ بیوی

اس بیوی کا وجود ہندستان میں بہت قدیم اور کار آمد ہے۔ یہ اکثر و بیشتر دیہاتی پیداوار کو بیلوں، اونٹوں، بھینسوں اور کبھی کبھار گاڑیوں میں ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچاتی ہے۔ گویا دیہاتی آبادی کے حق میں اچھی خاصی مال گاڑی ہے۔

اس پیشے کی وجہ سے اس کی جماعت ایک مستقل قومی حیثیت حاصل کر چکی ہے اور اسی لیے اس کی برادری ایک مستقل برادری تسلیم کی جاتی ہے، اس کے افراد غلہ لانے لیجانے کے ساتھ مٹی وغیرہ بھی بعض اوقات فروخت کرتے ہیں۔ ان میں ان کے بعض مرد اور بعض عورتیں دیہاتی آبادی ''میکانک انجینئری'' کے کمالات بھی دکھاتے ہیں۔ یہ دیہاتی آبادی کی بیل گاڑیوں کے آہنی سامان بناتے ہیں، چولھے، چکی کی اور دوسری ضروری چیز بھی بناتے ہیں۔ چنانچہ ان کے بعض کاموں کی تفصیل اور ان کی قدامت کے ثبوت میں ہندستان کے مشہور شاعر جناب میاں نظیر اکبرآبادی کی مشہور نظم ذیل میں درج ہے جو اردو کی بعض درسی کتابوں میں بھی پڑھائی جاتی ہے:

بنجارا

ٹک حرص وھوا کو چھوڑ میاں، مت دیس بدیس پھرے مارا

قزآق اجل کا لوٹے ہے دن رات بجا کر نقارا

یہ دھوم دھڑکا ساتھ لیے کیوں پھرتا ہے جنگل جنگل
اک تنکا ساتھ نہ جائے گا، موقوف ہوا جب ان اور جل
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا
مغرور نہ ہو تلواروں پر، مت پھول بھروسے ڈھالوں کے
سب پٹا توڑ کے بھاگیں گے، منہ دیکھ اجل کے بھالوں کے
ہو ڈھیر اکیلا جنگل میں تو خاک لحد کی پھانکے گا
اس جنگل میں پھر آہ نظیر اک بھنگا آن نہ جھانکے گا
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا

یہ جماعت خانہ بدوش زندگی کی عادی ہے اس لیے اس کی معاشی و معاشرتی تمدنی و اخلاقی زندگی میں جہل و بے ہنری، بے نظمی و بے ترتیبی اور کہیں کہیں جرائم پیشگی کے طور طریقے بھی اختیار کر لیے جاتے ہیں۔

ان کا وطن، ان کا دیس، ان کا شہر اور ان کا مکان عموماً انہی کے ہاتھوں کی بنائی ہوئی ''مکان نما بیل گاڑی'' دیہات کے راستوں کے درختوں کے نیچے تمبو اور کہیں کہیں پھوس کے چھپر ہوتے ہیں۔ ان کے سفر و حضر کی بیل گاڑی میری نظر میں بے حد دلچسپ اور غضب کی حکیمانہ صنعت کا نمونہ ہوتی ہے۔

اس گاڑی کے طول و عرض میں ایک شریفانہ طول و عرض کی چار پائی بچھائی جا سکتی ہے جس میں اس کا پورا مکان اور خاندان سوار ہوتا ہے اور پھر سفر میں راستہ سے خدا کا دیا ہوا جو بھی ملتا جاتا ہے وہ بھی اس جہازی گاڑی میں رکھ دیا جاتا ہے یا ٹھونس دیا جاتا ہے۔ چونکہ کاری گری گھر کی لونڈی ہوتی ہے اور انجینئری ہاتھ باندھے ساتھ رہتی ہے اس لیے بوجھ کی کثرت سے یہ گاڑی جس صحرا، جس لق و دق میدان، جس جنگل بیابان اور جس دامن کوہ میں ٹوٹ جاتی ہے وہیں اور اُسی وقت درست بھی کر لی جاتی ہے جس کے لیے شہر سے کسی خاص الخاص اور ترمیم شدہ لکڑی اور لوہے کی ضرورت نہیں کیونکہ اس گاڑی کی صنعت یہی ہے کہ لوہے کی جگہ لکڑی اور لکڑی کی جگہ بانس کا کام کرتے ہیں۔

گاڑی میں بھری ہوئی اشیا کی مختصری فہرست یہ ہوتی ہے:

سب سے نیچے چوری کا مال، بستر پر بستر، استعمالی کپڑے، غلے کی گٹھری، ضروریات کی مختلف اور بے شمار اشیا کی گھڑیاں، میاں بیوی، خالہ، چچی، بھانجی اور لنگور کی قسم کے دس بارہ برہنہ بچے، طوطے مینا کے پنجرے، مرغا مرغیوں کے پنجرے، بازوؤں پر گھاس، لوہا لکڑیاں، بجلی کے پاٹ اور گاڑی کے نیچے نہایت بے ہنگم شکل کے ایک دو کتے رواں دواں۔

یہی گاڑی مقام قیام میں دھوپ، بارش اور جاڑے میں چھت اور سائبان کا کام بھی دیتی ہے اور سوتے وقت دومنزل کوٹھی کا۔ اس میں سوار ہونے والے مرد اور عورتوں اور بچوں کا دستور یہ ہے کہ کوئی ڈیڑھ کوس تو پیدل تو کوس ڈیڑھ کوس میں پیدل۔ کوس ڈیڑھ کوس تو سوار تو کوس ڈیڑھ کوس میں لدا ہوا یا لٹکا ہوا سا کیونکہ اس گاڑی میں سوار ہونے کے لیے جگہ کی تعداد آج تک طے نہیں کی گئی اسی لیے کبھی کبھی ایک سے گیارہ تک مرد عورتیں اور بچے اس میں کھپے ہوئے، ٹھسے ہوئے، جمے ہوئے، لدے ہوئے، بھرے ہوئے اور ڈٹے ہوئے نظر آتے ہیں عام اس سے کہ اس جبری بھرتی سے کسی کا پاؤں دو میل تک دبا رہے یا ایک میل تک ایک ہی زانو ہو کر بیٹھنا پڑے۔ اس طرح اگر لق و دق صحرا اور خوفناک جنگل میں یہ گاڑی ٹوٹ جائے تو اس کے مسافروں کو نہ چور کا ڈر نہ پولیس کا اندیشہ۔ نہ موسم کی تیز و تند حالت سے خطرہ نہ شہر و قصبے سے دور ہونے کی پروا۔

پس انہی کسی مقامات میں سے ایک جگہ یہ بنجارہ بیوی بغیر کسی دایہ اور نرس کی امداد کے پیدا ہو جاتی ہے اور ایسی تندرست کہ نہ حکیم اجمل خاں صاحب مرحوم کے طبی مجربات کی ضرورت نہ حکیم راج نرائن وید کی گولیوں کی حاجت۔

پیدائش کے وقت سفری حالات جس طرح کی اجازت دیتے ہیں ویسی خوشی کا اظہار کیا جاتا ہے ورنہ اس کی پیدائش جیسی ہوئی ویسی ہوئی کے برابر بھی محسوس ہوتی ہے۔ زچگی کے قواعد میں نہ آپ کے سائنسی اصول اور آرام کی ضرورت نہ طبی نزاکتوں کا انتظام۔ یہ ادھر پیدا ہوئی اور اُدھر دشت و صحرا کی بے روک ٹوک ہواؤں نے اس کو پرورش کرنا شروع کر دیا۔ اسی طرح جنگل اور افلاس میں جو مل گیا کھلا دیا اور جس طرح ہو سکا پرورش کر کے جوان کر دیا۔ کہاں کا علم و ہنر اور کیسی "تعلیم نسواں" نہایت تلخ و تند اور خطرناک حالات میں پرورش پاتی ہے مگر اتنی تندرست کہ

جوانی سوسو بار خود قربان ہو جاتی ہے۔ کافی اونچی پوری چوڑی چکلی موٹی تازی اور غضب کی کالی اور بے ڈول۔

ٹھیک اسی طرح شادی کا عالم نظر آتا ہے یعنی جس گاؤں، جس قصبے یا جس جنگل میں پنچوں نے طے کر دیا اسی مقام پر شادی شروع ہو گئی۔ قافلے کے ساتھی اور براتی کچھ زیادہ فرق نہیں رکھتے اسی طرح بارات کے سجاؤ اور شان میں کسی خاص اہتمام کی ضرورت نہیں۔ بسا اوقات غلہ لادنے والے بیل پر دلہن سوار کر دی جاتی ہے جو ناف تک گھونگھٹ نکالے رخصتی کے وقت میلوں اس زور شور سے روتی جاتی ہے گویا دولہا نہیں بلکہ ڈاکو پکڑ کر لے جا رہے ہیں۔

اس موقعہ پر ایک روایت مشہور ہے کہ بنجارہ کی لڑکی بیاہ کے بعد عمر بھر اپنے ماں باپ کے گھر نہیں آتی اس لیے رخصتی کے وقت جس سواری پر وہ سوار کی جاتی ہے اس کا منہ اُلٹا رکھا جاتا ہے یعنی گھوڑے، ٹٹو، اونٹ اور بیل کی دُم کی طرف دلہن کا منہ ہوتا ہے تاکہ وہ آخر حد تک ماں باپ اور اپنے گھر کو دیکھتی جائے۔ اس موقع پر دلہن کا گھرانہ اور خاندان جس شدت سے روتے ہیں اس کا منظر بے حد دل شکن اور اثر انداز ہوتا ہے۔ جہیز اور زیورات میں اس لیے کچھ زیادہ خرچ نہیں ہوتا کہ زیور تک میں بعض چیزیں سونے چاندی کے عوض لوہے کی ہوتی ہیں۔

بیاہ کے بعد ناممکن ہے کہ اس کے ہاں سالانہ اولاد پیدا نہ ہو گویا شادی ہوتے ہی بچوں کا لام باندھ دیتی ہے اور جس کمالِ جفا کشی، مصائب شدائد اور خطرات میں خود پرورش پاتی ہے انہی خطرات میں اپنے بچوں کی پرورش کرتی ہے اور ساتھ ہی اب شوہر کی زندگی میں برابر کی حصہ دار ہوتی ہے۔ مثلاً شوہر کے روزی کمانے کے ہنر میں یہ بھی اس طرح ساتھ رہتی ہے کہ شوہر لوہے کے اوزار بناتا ہے اور یہ چولہا جھونکتی جاتی ہے۔ شوہر لوہے کے اوزار گرم کرتا ہے اور یہ ان پر گھن مارتی ہے۔ شوہر غلے کے جانور چراتا ہے یہ شوہر کے ساتھ خود بھی جانور چراتی ہے اور اس کمال ہمت سے ہر حال میں پاؤں سے لے کر گود اور کاندھے تک پر دو تین بچے بھی لادے رہتی ہے مگر سفر، موسم، بھوک، پیاس اور دوسری تکالیف کی نہ شکایت کرتی نہ سینما کے تماشہ کے لیے شوہر سے ''مساوات'' طلب کرتی بلکہ شوہر کے چوری اور ڈاکے میں گرفتار ہو جانے پر عین کوتوالی اور تھانے کے سامنے ڈٹ کر روٹی پکاتی ہے اور شوہر کے سزا پانے تک پیشی پر عدالت کے سامنے بھی ڈٹی

رہتی ہے اور کبھی کبھی خود بھی سزا پا جاتی ہے مگر شوہر سے نہ بنارس کی ساڑی طلب کرتی نہ موٹر کار میں شوہر کے سیدھے ہاتھ پر بیٹھ کر تفریح اور سیر کو جاتی بلکہ الٹا یہ ہوتا ہے کہ شوہر سے اختلاف پر اکثر بانس کے برابر لٹھ سے مار تک کھاتی ہے مگر عدالت میں ''بیویانہ توہین'' کا مقدمہ دائر نہیں کرتی۔ اس کی اور اس کے شوہر کی لڑائی میں فحش گالیوں میں البتہ ''مساوات'' اور ''آزادیٔ رائے'' کا دستور جاری ہے مثلاً اگر شوہر سیدھی سیدھی سنا سکتا ہے تو بنجارہ بیوی بھی اسی وزن و قافیہ کی سیدھی سیدھی سناتی ہے، جس کی وجہ سے یہ لٹھ کھانے کے قابل ہو جاتی ہے، مگر لٹھ بازی پر بھی یہ نہ بھنا کر ماں باپ کے گھر جاتی نہ شوہر کو زیادہ دن تک ناراض رکھتی اور یہ بھی نہیں ہوتا کہ ہندستانی بے عقلوں کی طرح یورپی قاعدے سے اس کا شوہر اس سے معافی چاہے بلکہ عورت مرد کی عین فطرت کے موافق یہ میاں بیوی ہوتے ہیں۔ چنانچہ مرد کو جو مردانہ طاقتیں اور فضیلتیں حاصل ہیں وہ اس کے ہاں لٹھ کے زور پر حاصل ہی رہتی ہیں اور عورت جن مردانہ سختیوں کو فطرتاً پسند اور گوارا کرتی ہے وہ بھی بنجارہ برادری کے مردوں میں موجود ملتی ہیں۔ نہ ان کی عورتیں گلاب کا مصنوعی پھول اور جنت کی حور بن کر رہتی ہیں نہ ان کے مرد ریشم و اطلس کی سی نسائی عادتوں اور بیوی کی غلامی کے عادی۔ یہ بیوی جب کسی شہر میں سودا فروخت کرنے آتی ہے تو اپنے اونٹ سے کچھ ہی کم قد و قامت، موٹے موٹے اور عجیب وضع کے آہنی زیورات سے عوام کی نظریں کھینچ لیتی ہے اور اس برادری کی بعض لڑکیاں کبھی کبھی ماہتاب کو بھی شرما دیتی ہیں۔

مزاج کی اکھڑ، اجڈ، لڑاکا، سیانی، جفاکش، محنتی، کثیرالاولاد، قلیل المعاش۔ شوہر کی صحیح معنی کی رفیقۂ حیات اور اپنے تجارتی کاروبار اور محنت کی وجہ سے عام انسانی زندگی کے لیے بے حد مفید اور قیمتی۔

تمام موسموں میں ڈٹ کر کام کرنے والی، کم بیمار ہونے والی، زیادہ کھانے والی، زیور، دولت، تماشوں اور تفریحات سے دور اور اولاد کی عاشق۔

(23 جولائی 1941)

◆◆◆

سودا فروش بیوی

اس بیوی کو کسی خاص برادری سے منسوب نہیں کر سکتے۔ مگر یہ کافی تعداد میں ہر شہر اور ہر قصبہ میں ملتی ہے۔ اس کے حساب سے اس کی برادری بہت زبردست مانی جاسکتی ہے اور چونکہ سودا فروش بیوی شہری اور قصباتی آبادیوں سے بہت قریب کا تعلق رکھتی ہے اور انسانی برادری کو متاثر کرتی ہے لہٰذا اس کے حالات زندگی اور اخلاقیات کو واضح کر دینا میری کتاب و تحقیق کے مقصد کے عین موافق ہے۔

پس واضح ہو کہ یہ بیوی زیادہ تعداد میں عام مزدوری پیشہ گھرانوں سے تعلق رکھتی ہے اور بعض بیوگی، مالی بیچارگی اور اچانک حوادث سے اس ذریعہ معاش کو اختیار کرنے پر مجبور ہو جاتی ہیں۔ اسی وجہ سے سودا فروش بیویوں میں بعض اچھے اور شریف گھرانوں کی عورتیں بھی نظر آتی ہیں، جو وارثوں کے باقی نہ رہنے کے صدمات و شوائد سے موذی پیٹ کو بھرنے کے لیے کسی نہ کسی نوع کا سودا فروخت کر کے اپنی اور اپنے بچوں کی شکم پری پر مجبور ہو جاتی ہیں۔ ایسی بدقسمت عورتیں چونکہ اچھے اور اعلیٰ گھرانوں کی پیداوار ہوتی ہیں اور مجبوراً سودا فروشی اختیار کرتی ہیں اس لیے ان کے مزاج میں تجارتی چالاکیاں مثلاً جھوٹ کی عادت اور بے مروّتی وغیرہ نہیں ہوتی جو گراں فروشی کے لیے بے حد ضروری سی چیز ہے اس لیے یہ سودا فروشی میں اکثر و بیشتر ناکام رہتی ہیں۔ اسی طرح ان

عورتوں کے اخلاق چونکہ بلند ہوتے ہیں اس لیے یہ نقد کے عوض قرض سودا دینے کی بلا میں بھی مبتلا ہو جاتی ہیں اور بعض ذلیل گھرانے کی چالاک اور بے ایمان عورتوں کے ہاتھوں یہ خاصا مال قرض پر دے دیتی ہیں جو بعد میں چالاک اور مکار خریدار عورتوں کے ہاتھوں سے وصول نہیں ہوتا اس لیے یہ عورتیں اکثر شدید نقصانات برداشت کر کے سودا فروشی کے اکل حلال سے محروم ہو جاتی ہیں۔ یہ گویا انسانی شہری آبادی کی وہ گھناؤنی فطرت ہے جس سے انسانی برادری کی بعض مجبور و بے ذریعہ عورتوں کی جائز روزی ماری جاتی ہے اور چونکہ ان بے کس عورتوں کے سودے کے دام وصول کرنے کے لیے ان کا کوئی "جوتا مار وارث" نہیں ہوتا اس لیے یہ غریب عزت سے روزی کمانے اور دام وصول کرنے کے قابل نہیں رہتی ہیں جو اصل میں شہری آبادی کے مظلوم عورتوں پر شدید ظلم اور ڈاکہ ڈالنے کے مترادف ہے۔ اس پیشہ کو بعض پردہ نشین اور ذی عزت گھرانوں کی مجبور عورتیں بھی اختیار کرتی ہیں اس لیے وہ فطرتاً شریف گھرانوں کی شریف عورتوں پر بھروسہ کرتی ہیں مگر ان شریف گھرانوں میں بھی بعض شریف زادیاں ان غریبوں پر ڈاکہ ڈالتی ہیں اور ان سے دھوکہ دے کر جھوٹی قسمیں کھا کر بازار کے فرضی اور جھوٹے نرخ بتا کر بے حد سستا مال خرید لیتی ہیں یا پھر قرض لے کر اس کے ادا کرنے میں کافی سے زیادہ تاخیر، ٹال اور جھوٹ سے کام لے کر آدھا قرض ادا کرتی ہیں اور پھر کہتی ہیں کہ عورت عورت کی بڑی غمخوار ہوتی ہے۔

ان کے مقابل بعض پست اور ارذل گھرانوں کی جو عورتیں یہ کام کرتی ہیں ان میں بعض پست خیال، بداخلاق اور آوارہ ذہن و عمل کی عورتیں بھی ہوتی ہیں اور تمام انسانوں کا جس طرح اعلیٰ اخلاق کا حامل ہونا ضروری نہیں اسی طرح یہ بھی ضروری نہیں کہ صرف مردوں ہی کی بداخلاقی سے کوئی عورت بداخلاق و بدکردار ہو سکتی ہے اور اسی لیے اسلام نے عورت کو مرد سے قریب ہوتے وقت جن شدید احتیاطوں کا پابند بنایا ہے ان میں عورت کی آواز تک کو مرد کے کان تک جانے سے روکا ہے، محض اس لیے کہ فطرتاً دونوں میں ایک دوسرے سے رغبت کے احساسات اور شوق موجود ہے جس کے قویٰ کو آواز اور سماعت کی قوت بھی بیدار و مشتعل کرتی ہے۔ پس ایسے کردار کی بعض سودا فروش عورتیں سودا فروخت کرتے وقت خود کو کافی رنگیلا اور رسیلا بناتی ہیں۔ یہ اپنے لباس، اپنی اداؤں اور اپنی بازاری ذوق کی بولیوں اور فقروں سے پست اخلاق کے مردوں اور عورتوں کو متاثر

اور متوجہ کرتی ہیں اور جس مرد خریدار کو یہ سودے کے عوض خود پر مائل و متوجہ پاتی ہیں اس کو اُلّو بنانے یا تباہ کرنے میں دقیقہ اٹھا نہیں رکھتی ہیں۔

ایسی پست اور بد کردار عورتوں کی خاص پہچان یہ ہے کہ یہ سودا فروخت کرتے وقت راستوں میں مرد خریداروں کو خود سے کچھ کہہ کر مخاطب کرتی ہیں اور پردہ دار گھروں میں بے بلائے خود گھس جاتی ہیں۔ انتہا یہ کہ ان کو دروازہ ہی پر اندر سے کہہ رو کیے کہ ہم کو کچھ نہیں چاہیے پھر یہ کہتی ہوئی گھس آتی ہیں کہ "دیکھ تو لو پھر چاہو تو نہ لینا" اور اس طرح یہ گھروں میں بیٹھے ہوئے مردوں کے سامنے اپنے جسم وحسن کا نظارہ کرتی ہیں اور اپنی رنگین گفتگو سے ان بے قصور مردوں کو سودے کے جھانسے میں لبھاتی ہیں۔

اس نوع کی سودا فروش بیوی جب گھر میں کسی مرد سے ہنس ہنس کر یا مسکرا کر گفتگو کرتی ہے تو مرد بھی فطرتاً مروت کے برتاؤ اور خاص توجہ پر مجبور ہو جاتا ہے مگر مرد کی اس جوابی توجہ پر اس گھر کے ننھے میاں کی والدہ کا یہ حال ہو جاتا ہے۔

استغفر اللہ! میں تو اس کمینی بازاری کو کبھی منہ بھی نہیں لگاتی ہوں مگر حضور تو آج اس پر نثار ہی ہوئے جاتے تھے، آخر اس کا سبب۔

خیر میں سب سمجھ گئی اب جھینپ مٹانے کو جو چاہے کہہ دو۔

لاحول واحول کیسی؟ صاف تو دیکھ رہی تھی میں بھی۔

اچھا تو یہ اتنے زیادہ دام کیوں دلوائے اس بدذات کو مجھ سے؟

کہیے تو اس سے آدھے داموں منگوا دیتی ہوں بازار سے ابھی۔

اے سبحان اللہ یہ تم کو ہو کیا گیا ہے۔ میں کہتی ہوں کہ خدا پاک کی قسم اپنا ننھا اس سے زیادہ ستا لے آئے گا ابھی۔

اور خدا رکھے اس کو وہ تو بیس مرتبہ لا یا دو آنے سیر۔

اچھا اچھا میں کب کہتی ہوں مگر ہاں مجھے خالی تمہارا دل لینا تھا اس بدذات کی طرف سے۔

بھلا اب کبھی تو قدم دھر لے میرے دروازے پر بدمعاش کہیں کی۔

تو میں یہ کہتی ہوں کہ آخر یہ مذاق کیسا؟

ایک بازاری عورت سے ایک شریف آدمی کا مذاق بھی کیا؟

اچھا اچھا میں جھوٹی میرا خاندان جھوٹا، زندہ ہوں تو بتادوں گی وغیرہ۔

گھریلو عورتوں کا کسی بازاری عورت سے مرد کے متوجہ ہونے پر مذکورہ بالا جھگڑے یا طنز و طعن عین عورت کی بھی وہی رقیبانہ فطرت اور خودداری کا کام کرتی ہے جو مرد میں اپنی مطلوبہ کو کسی غیر مرد سے گفتگو کرتے وقت مشتعل اور بیدار ہوا کرتی ہے البتہ اس فطری بدگمانی اور اشتعال میں ضرورت ہے کہ مرد اور عورت دونوں ہوش مند ہوں اور تحقیق حالات سے پہلے محض جوش میں کوئی غلط نہ کریں ورنہ ایسا بھی ہوا ہے کہ محض بدگمانی اور ظاہری یا وقتی توجہ پر معاملہ طلاق اور گھر بار کی تباہی تک جا پہنچا ہے۔

پس ایسی بدکردار بازاری سودا فروش بیوی کو گھر میں زیادہ پاؤں نہ پھیلانے دیے جائیں کہ یہی نسخہ بہت کارآمد نسخہ ہے کیونکہ اس نوع کی عورتیں یقیناً گھریلو عورتوں کی معصومیت اور سادگی سے بہت غلط فائدے اٹھالیتی ہیں جن کے نتائج واثرات بعد میں بے حد تکلیف دہ اور نقصان رساں ہوتے ہیں۔ مثلاً ان میں کی بعض عمر و مزاج کے لحاظ سے بڑی ''طرارہ'' و ''جرآرہ'' و ''کرآرہ'' ہوتی ہیں۔ دانستہ طور پر گھر کے نوجوان مردوں سے اس طرح از خود گفتگو اور مخاطبت شروع کر دیتی ہیں جس سے عورتیں یہ باور کرلیں کہ اس عورت سے گھر کے باہر ہی سے شناسائی ہے حالانکہ ایسا نہیں ہوتا بلکہ یہ ان کی بدکردار فطرت کی ایک ایسی مشقی شیطنت ہوتی ہے جس کو اچانک مرد بھی نہیں سمجھ سکتے۔

اسی نوع کی سودا فروش لڑکیاں ہوتی ہیں جو گھروں میں سودا لے جا کر آپ سے آپ بڑے دیرینہ، بے تکلف تعلقات کے انداز میں گھر کی عورتوں سے بعض سودے ضد کر کے فروخت کرتی ہیں، بعض خود سے قرض دینے پر تیار ہو جاتی ہیں اور بعض بازاری اشعار دھیمے دھیمے گنگناتی جاتی ہیں جن سے گھر کی نوخیز لڑکیوں کے کانوں میں رس پڑتا ہے اور وہ کام کاج چھوڑ کر اس سے لپٹ جاتی ہیں اور اصرار کرتی ہیں کہ:

ذرا زور سے تو گا

کیا گا رہی تھی تو ابھی

ہٹ جھوٹی کہیں کی

اے تیرے سر کی قسم ابھی میں چولھے کے پاس سے دیر تک سنتی رہی تو وہ کیا نام ہاں ہاں وہ جگر مرادآبادی صاحب ہیں کہ وہ کون انہی کا شعر تو گنگنا رہی تھی۔

کیوں جمیلہ تم نے بھی سنا تھا نا ابھی جو یہ "جامن والی کی بچی" گا رہی تھی؟

اب جو میں کہہ رہی ہوں کہ ذرا زور سے گاؤ تو نخرے کر رہی ہے شریر کہیں کی۔

اری تو کہہ تو ہم سیدھا کر لیں گے اس کو تجھ کو تو جیسا آتا ہو ویسا ہی گادے بس ایک دفعہ۔

بس اس طرح کی ترکیبوں سے اس سودا فروش بیوی کا حلقہ خاصا ترقی کر جاتا ہے اور یوں سمجھیے کہ خاصے خریدار پیدا ہو جاتے ہیں۔

اب جیسا کہ میں اوپر عرض کر چکا ہوں کہ سودا فروش بیوی کو کسی خاص قبیلے اور جماعت سے تعلق نہیں اسی طرح یہ ایک ہی قسم کا سودا بھی فروخت نہیں کرتی بلکہ مختلف سودے اور مختلف عورتیں اور لڑکیاں ہوتی ہیں البتہ پیشے، کاروبار اور اخلاق اور اطوار میں کافی یکسانیت ہوتی ہے۔ چنانچہ اس بیوی کو جن حالات اور کیفیات کے ساتھ اردو کے دو مشہور شاعروں نے دیکھا ہے وہ انہی کے قلم اور الفاظ میں ملاحظہ فرمایئے:

گھاس والی

(از احسان بن دانش)

گرمی کی دوپہر تھی تمازت کا دور تھا
گونجی ہوئی تھی دشت میں تپتی ہوئی ہوا
چھایا ہوا تھا وسعتِ صحرا پہ اک جنوں
مٹی سے اٹ رہا تھا رخِ چرخِ نیلگوں
عنوان اضطراب جبینِ جہاں پہ تھا
بادل کا نام تک نہ کہیں آسماں پہ تھا
اٹھتے تھے جو بلند بگولے اِدھر اُدھر
تیار آتشیں کا گماں تھا ہر ایک پر

سمٹے ہوئے تھے گرد سے پتے اٹے ہوئے
چکرا رہے تھے ڈار سے آہو کٹے ہوئے
غش کھا رہی تھیں لو کے طمانچوں سے ٹہنیاں
تھے جانکنی میں پھول سسکتا تھا گلستاں
لو سے ہر ایک شاخ کا سر تھا جھکا ہوا
سائے میں تھا ہر ایک مسافر رُکا ہوا
جھلسے ہوئے درخت تھے جنگل تپا ہوا
شیشے میں دوپہر کے تھا دوزخ ڈھلا ہوا
چکرا رہا تھا دھوپ سے کھولا ہوا دماغ
پکسے ہوئے تھے موج نفس سے جگر کے داغ
بپھرا ہوا تھا چار طرف بحر آتشیں
تانبا سا تپ رہی تھی پسینے سے تر جبیں
جائے اماں نہ تھی کہیں کوسوں اُجاڑ میں
نظریں بھی چھپ رہی تھیں درختوں کی آڑ میں
انسان نہ دور دور سرِ رہ گزار تھا
گرمی کی دوپہر تھی کہ طغیان ناز تھا
تھی زندگی کشاکش امید و بیم میں
عالم تھا غرق جوش نارِ حمیم میں
سوکھے ہوئے درخت کے نیچے کنوئیں کے پاس
اک رشک حور غیرت سلمیٰ مگر اداس
جو جا رہی تھی گھاس کی گٹھری لیے ہوئے
بیٹھی تھی رُخ پہ ہاتھ سے سایہ کیے ہوئے
آثارِ غم شباب کی زندہ نگاہ میں
رستے کی ریت کوچۂ زلفِ سیاہ میں

آنکھوں میں اک تبسم رنگیں کا انتشار
چادر خزاں کے دوش پہ ڈالے ہوئے بہار
نکھرے ہوئے شباب پہ میلا سا پیراہن
رنگِ بہار صبح مگر کشتہ محن
ہونٹوں پہ موج نور تھی مقہور خامشی
موسیقی شباب تھی مجبور خامشی
آئینہ دار گردشِ دوراں تھا برملا
روئے گلاب گون پہ پسینہ بہا ہوا
اٹھی جگر میں ٹیس مرے دل کو غم ہوا
سو بار سر بھی بارِ ندامت سے خم ہوا
دل نے کہا کہ قابلِ رحمت کبھی نہیں
یہ ہند کی گناہ میں ڈوبی ہوئی زمیں
تُف اس اصولِ زیست پہ لعنت شعور پر
حسن اور سر بہ خم در کبر و غرور پر
نرغے میں دھوپ کے ہے نزاکت ستم ستم
مٹی میں مل رہی ہے لطافت ستم ستم
روحِ بہار، خار مغیلاں کو دے خراج
خورشید اور شبنم لرزاں کو دے خراج
عورت جو کردگار محبت جہاں میں ہے
اس کی یہ قدر خطۂ ہندوستاں میں ہے

(ملاحظہ ہو کتاب ''چراغاں'' مصنفہ احسان دانش، صفحہ 40)

جامن والیاں

(از جوش ملیح آبادی)

روحِ شاعر آج پھر ہے وجد میں آئی ہوئی
آم کے باغوں پہ ہے کالی گھٹا چھائی ہوئی
مست بھونرا گونجتا پھرتا ہے کوہ و دشت میں
روح پھرتی ہے کسی وحشی کی گھبرائی ہوئی
غنچہ غنچہ اپنے فطری رنگ میں ڈوبا ہوا
پتی پتی اپنے اصلی رنگ پر آئی ہوئی
خارِ صحرا فیضِ ابر و باد سے نکھرے ہوئے
خاکِ گلشن موجِ رنگ و بو سے اترائی ہوئی
بہہ رہی ہیں ندیاں ساون کے نغموں کی طرح
گا رہی ہیں کوئلیں موسم کی تڑپائی ہوئی
آ رہی ہیں ناز سے نوخیز جامن والیاں
انکھڑیوں میں اجنبیت چال اٹھلائی ہوئی
عمر کے نشہ سے کچھ کچھ نیند میں ڈوبی ہوئی
برق کی ہلچل سے کچھ کچھ ہوش میں آئی ہوئی
ابر میں لچکے ہوئے پودوں کا دست و پا میں لوچ
دھوپ کے تپتے ہوئے کھیتوں کی سنولائی ہوئی
پھر رہی ہیں تر بتر گلیوں میں سوتی جاگتی
منہ اندھیرے ہی سے بوچھاروں کی چونکائی ہوئی
دونوں ہاتھوں سے سنبھالے ہیں سروں کے ٹوکرے
ہاتھ انگڑائی کی صورت آنکھ شرمائی ہوئی
ہائے یہ بکھری ہوئی زلفیں یہ کالی جامنیں
ہائے یہ گلشن یہ ساون کی گھٹا چھائی ہوئی

پائے نازک راہ کے پانی سے یہ بھیگے ہوئے
پنڈلیاں زورِ جوانی سے یہ بل کھاتی ہوئی
ہائے یہ بھنچی ہوئی نو عمر جامن والیاں
عاقبت اندیش دہقانوں کی سمجھائی ہوئی
یہ جھجک اٹھنا جوانوں کی نظر سے بار بار
یہ نگاہیں شہر کی گلیوں میں گھبرائی ہوئی
ہائے یہ کافر مناظر ہوش میں رکھتے نہیں
جوش ان فصلوں میں اکثر اپنی رسوائی ہوئی

(نقش ونگار،صفحہ:26)

ان نظموں میں صرف شوخ وشنگ لڑکیاں دکھائی گئی ہیں لیکن امر حقیقت یہ ہے کہ سودا فروش عورتوں میں زیادہ مقدار بوڑھی اور ضعیف العمر عورتوں کی ہوتی ہے جو اپنے مالی حالات کی بے بسی سے یہ کام کرتی ہیں، لیکن ان کی اس کاروباری حالت سے کاہل مردوں اور پردہ نشیں عورتوں کو اس لیے آرام پہنچتا ہے کہ یہ سودا فروش بیوی ہر قسم کا سودا ان تک پہنچا دیتی ہے لہٰذا انسانی آبادی کے لیے اس کا دم بھی غنیمت ہی ہے۔

(22 جولائی 1941)

◆◆◆

نرس بیوی

یعنی شفاخانوں اور مکانوں پر مریضوں کی خدمت کرنے والی عورت کو نرس کہتے ہیں۔ یہ عورت یورپ کی پیداوار ہے اس لیے اس کا نام بھی انگریزی ہے۔

ہندستان کی تاریخ میں ''نرس بیوی'' کی تاریخ بہت مختصر اور جدید ہے۔ یہ اس یورپی علاج کا ایک حصہ ہے جس کو ایشیا میں مقبول، ہر دلعزیز اور مرغوب بنانے کے لیے یورپ کی وسیع ذرائع والی حکومتیں اور کافی دولت مند تاجرانِ ادویہ اپنا خاصا روپیہ، ذرائع اور فراست صرف کر رہے ہیں۔ یہ بیوی یورپ میں جن محترم عقائد اور جن اونچے اور اثر ڈالنے والے الفاظ سے پکاری جاتی ہے اس کا تازہ نمونہ یہ ہے جس کو یورپ کی مشہور خبر رساں ایجنسی نے 9 جولائی 1941 کو ہندستان میں ان الفاظ میں نشر کیا ہے:

''واشنگٹن 9 جولائی۔

امریکن انجمن صلیب احمر نے بیان دیا ہے کہ جرمنی نے ایک نرس لانے والا جہاز غرق کر دیا، اس میں دس نرسیں جا رہی تھیں۔ ان میں سے چھ نرسیں لاپتہ ہیں۔ نارمن صاحب صدر انجمن صلیب احمر نے بیان کیا کہ یہ نرسیں انگلستان کی طرف نیک کاموں میں امداد دینے کے لیے جا رہی تھیں جب انھیں جرمنی کی اس بربریت کا

سامنا کرنا پڑا۔

ہم نے بہت سی نرسیں رضا کار بنائی ہیں تا کہ وہ سمندر پار جا کر خدمتِ خلق کریں۔
انھیں ڈبو دینا کوئی بہادری کا کام نہیں، مگر آج تمام امریکہ فخر کر رہا ہے کہ ان عورتوں
کی زندگی خدمتِ انسانی کے لیے ختم ہوئی''۔

(ملاحظہ ہو اخبار ''خلافت'' بمبئی مورخہ 12 جولائی 1941ء صفحہ:3)

نرس کے متعلق یہ عقیدہ و نقطۂ نظر تو ہے یورپ و امریکہ کے مردوں کا، لیکن چونکہ ایشیا خصوصاً ہندستان میں عورت ''پردہ کی چیز'' مانی گئی ہے اور ہندستانی نوجوان مردوں کے سامنے کنواری اور نوجوان لڑکیوں کا آنا یا رہنا یا ان سے باتیں کرنا معیوب، مکروہ اور خطرناک مانا گیا ہے۔ ادھر یورپ کی نرس خوبصورت، دوشیزہ اور بالعموم نوجوان ہوتی ہے اس لیے یورپ کے مذکورہ بالا عقیدۂ احترام و نقطۂ خیال کے مقابلے ایک ہندستانی نوجوان شاعر نے اس بیوی کو جس نقطۂ نظر سے دیکھا ہے وہ ملاحظہ ہو:

فلک سے نرسوں کی معرفت آ رہے تھے پیغامِ زندگانی
دل و نظر کے لیے تھا ان کا جمال، انعامِ زندگانی
وہ ان کے گلگوں جمیل چہرے وہ ان کا ضوبار مسکرانا
مریض سو بار بے مزا ہو تو آ کے سو بار مسکرانا
طریق محبوبیت میں یکتا، علاجِ روحِ حزیں میں کامل
لب شکر ریز پر تبسم ادائے جان آفریں میں کامل

(ملاحظہ ہو کتاب ''آتش خموش'' مصنفہ احسان دانش کاندھلوی، صفحہ: 33-32)

مذکورہ بالا اشعار کے بعد ایک دوسرے ہندستانی شاعر نے ''نرس بیوی'' کو جس نظر سے دیکھا ہے وہ اس لیے بے حد خاص ہے کہ یہ شاعر اسی یورپی تعلیم و تربیت کا سند یافتہ ہے جس کی پیداوار نرس بیوی ہے۔ چنانچہ جناب اسرار الحق صاحب مجاز بی۔ اے علیگ ارشاد فرماتے ہیں کہ:

وہ نوخیز نورا اور وہ اک بنت مریم   وہ مخمور آنکھیں وہ گیسوئے پرخم
وہ ارض کلیسا کی اک ماہ پارہ   وہ دیر و حرم کے لیے اک شرارہ

وہ فردوسِ مریم کا اک غنچۂ تر — وہ تثلیث کی دخترِ نیک اختر
وہ اک نرس تھی چارہ گر جس کو کہیے — مداوائے دردِ جگر جس کو کہیے
جوانی سے طفلی گلے مل رہی تھی — ہوا چل رہی تھی کلی کھل رہی تھی
وہ پُر رعب تیور، وہ شاداب چہرہ — متاعِ جوانی پہ فطرت کا پہرہ
وہ حکمرانی ہے اہلِ زمیں پر — یہ تحریر تھا صاف اس کی جبیں پر
سفید اور شفاف کپڑے پہن کر — مرے پاس آئی تھی اک حور بن کر
وہ اک مرمریں حور خلد بریں کی — وہ تعبیر آذر کے خواب حسیں کی
وہ تسکین دل تھی سکونِ نظر تھی — نگاہِ شفق تھی جمالِ سحر تھی
وہ شعلہ، وہ بجلی، وہ جلوہ، وہ پرتو — سلیمان کی وہ اک کنیز سبک رو
کبھی اس کی شوخی میں سنجیدگی تھی — کبھی اس کی سنجیدگی میں بھی شوخی
گھڑی چپ، گھڑی کرنے لگتی تھیں باتیں — سرہانے مرے کاٹ دیتی تھی راتیں
عجب چیز تھی وہ عجب راز تھی وہ — کبھی سوز تھی وہ کبھی ساز تھی وہ
نقاہت کے عالم میں جب آنکھ اٹھتی — نظر مجھ کو آتی محبت کی دیوی
وہ اس وقت اک پیکرِ نور ہوتی — تخیل کی پرواز سے دور ہوتی
وہ انجیل پڑھ کر سناتی تھی مجھ کو — ہنساتی تھی مجھ کو رُلاتی تھی مجھ کو
دوا اپنے ہاتھوں سے مجھ کو پلاتی — ''اب اچھے ہو'' ہر روز مژدہ سناتی
سرہانے مرے ایک دن سر جھکائے — وہ بیٹھی تھی تکیے پہ کہنی لگائے
خیالات پیہم میں کھوئی ہوئی سی — نہ جاگی ہوئی سی نہ سوئی ہوئی سی
جھپکتی ہوئی بار بار اس کی پلکیں — جبیں پر شکن بے قرار اس کی پلکیں
وہ آنکھوں کے ساغر چھلکتے ہوئے سے — وہ عارض کے شعلے بھڑکتے ہوئے سے
لبوں میں تھا لعل و گہر کا خزانہ — نظر عارفانہ ادا راہبانہ
مہک گیسوؤں سے چلی آ رہی تھی — مرے ہر نفس میں بسی جا رہی تھی
مجھے لیٹے لیٹے شرارت جو سوجھی — جو سوجھی بھی تو کس قیامت کی سوجھی

ذرا بڑھ کے کچھ اور گردن جھکالی — لب لعل افشاں سے اک شے چرالی
وہ شے جس کو اب کیا کہوں کیا سمجھیے — بہشت جوانی کا تحفہ سمجھیے
شراب محبت کا اک جام رنگیں — سبوزار فطرت کا اک جام رنگیں
میں سمجھا تھا شاید بگڑ جائے گی وہ — ہواؤں سے لڑتی ہے لڑ جائے گی وہ
میں دیکھوں گا اس کے بپھرنے کا عالم — جوانی کا غصہ بکھرنے کا عالم
ادھر دل میں اک شور محشر بپا تھا — مگر اس طرف رنگ ہی دوسرا تھا
ہنسی اور ہنسی اس طرح کھلکھلا کر — کہ شمع حیا رہ گئی جھلملا کر
نہیں جانتی ہے مرا نام تک وہ — مگر بھیج دیتی ہے پیغام تک وہ

یہ پیغام آتے ہی رہتے ہیں اکثر
کہ کس روز آؤ گے بیمار ہو کر

(ملاحظہ ہو اخبار ''خیام لاہور'' مورخہ 24 مئی 1939 صفحہ: 5)

ان ہندستانی شعرا کے الفاظ سے محسوس ہوتا ہے کہ ہندستان 1941 تک بھی ''نرس بیوی'' کے لیے وہ نقطۂ نگاہ و عقیدہ نہیں رکھتا جو یورپ نے اس کے لیے وضع کیا ہے اور ہندستانیت کے فطری و طبعی یا تہذیبی خواص میں وہ عورت اس یورپی اعتماد کو حاصل نہیں کرسکتی جو عنفوانِ شباب میں کامل، آزاد، بے باک اور بے حجاب ہو، اسی لیے ''نرس بیوی'' میں خواہ ہیرے اور جواہرات ہی کیوں نہ ٹکے ہوں لیکن طبعی حیثیت سے یہ مردوں کے لیے راحت ہونے کے عوض زیادہ مقدار میں مصیبت ہو کر رہے گی۔ البتہ ہندستان کے ان طبقات میں اس کی کھپت ہوگی اور ہوتی بھی ہے جنھوں نے عقلی کمزوری کے باعث بغیر ذاتی اور فطری موافقت کے یورپ کے اصولِ زندگی کو اپنالیا ہے اور اسی لیے یورپ کی نرس ہندستان کے ایسے ہی ''بے تحقیقے'' فیشن زدہ طبقوں میں نظر آتی ہے اور بس، اور ہندستان کے یہ مرعوب فطرت نقال اور مقلد طبقے عقل وفراست عالی سے چونکہ کوسوں دور ہیں اسی لیے میں نے بعض ''امرا'' کے گھرانوں میں دیکھا ہے کہ یہ یورپی نرس گو ایک خادمہ کی حیثیت سے آتی ہے مگر یہ بے علم اور نقال گھرانے اس کے سفید رنگ اور یورپی وضع قطع سے مرعوب ہو کر اس کے ساتھ وہ برتاؤ کرتے ہیں گویا یہ خادم عورت اس گھر کی ملکہ اور مالکہ ہے

اور ایسے نقال گھرانوں کی عورتیں گو لاکھ رواجی لفظوں میں تعلیم یافتہ ہوں مگر وہ اس عورت سے بے حد متاثر ہوتی ہیں اور بھاری مزدوری اور بیش قیمت تحائف سے اس کی خدمت کرتی ہیں اور یورپی نرس سے مراسم اور تعلقات کو اپنے خاندان کی توقیر وعزت تصور کرتی ہیں جو ان کی قلتِ عقل و فراست کی دلیل اور ان کے مردوں کے فیشن زدہ ہونے کا صدقہ ہے۔ چنانچہ عجب اتفاق کہ جس وقت میں مقالہ لکھ رہا تھا عین اسی زمانے کے ہندستان بھر کے اخبارات نے ذیل کا عجیب وغریب معاملہ شائع کیا تھا جو یہ ہے:

مغربی تعلیم کا تباہ کن اثر

ہندستانی عورتوں کی اخلاقی پستی

یہ عنوان ہندستان کے مرکز یا دارالملک دہلی کے ایک اخبار "چنگاری" نے مدیر ونگارندہ نے قائم کیا ہے جس سے میرے مذکورہ بالا خیالات کی تائید ہوتی ہے یعنی یہ کہ ہندستان کے ذی عزت اور ہوش مند دماغ "نرس بیوی" کے لیے وہ عقیدہ نہیں رکھتے جو یورپ نے مشتہر اور وضع کیا ہے۔ اب اس عنوان کے بعد اس اخبار نے جو کچھ لکھا ہے وہ حرف حرف یہ ہے:

> "صوبۂ پنجاب کے دارالملک لاہور میں سید اعجاز حسین صاحب منصف شہر کی عدالت میں ایک عجیب وغریب اور شاید اپنی نوعیت کا سب سے پہلا مقدمہ چل رہا ہے۔ اس مقدمہ میں "سرگنگارام شفاخانے" کی ایک نرس لیلا عرف برکتے ملزمہ ہے اور ایک وکیل کی لڑکی شکنتلا مستغیثہ کی حیثیت رکھتی ہے۔
>
> واقعہ اس طرح بیان کیا جاتا ہے کہ مس لیلا نرس نے شکنتلا کے مکان کے قریب ہی ایک مکان کرایہ پر لیا اور آہستہ آہستہ دونوں میں دوستی ہوگئی۔ چند روز کے بعد ملزمہ نے شکنتلا سے کہا کہ میں لڑکا ہوں اور میرا نام پیارے لال ہے، قوم کھتری ہے۔ شکنتلا نے کہا کہ تم لڑکا کس طرح ہو سکتی ہو تو ملزمہ نے جواب دیا کہ میں محکمۂ جاسوسی میں انسپکٹر ہوں اور میں نے دواؤں کے ذریعہ اپنے آپ کو ایسا بنالیا ہے اگر میں چاہوں تو یہ سب علامتیں دور ہو سکتی ہیں، مجھے ایک سو پچاس روپیہ تنخواہ ملتی ہے اور

مجھے سرکاری طور پر ایک کوٹھی اور دو نوکر حاصل ہیں۔ میری پانچ اور کوٹھیاں بھی ہیں اور پچیس مربع زمین ہے۔ اس پر شکنتلا نے یقین کرلیا۔ اس کے بعد ملاقات جاری رہی اور ہم دونوں میں شادی کا معاملہ طے ہوگیا اور باضابطہ شادی ہونے سے پہلے ہی شادی کا برتاؤ ہونے لگے اور اس نے مجھ پر مردوں ایسا رعب ڈالا جس سے میں مرعوب ہوگئی۔ ایک دن ملزمہ نے کہا کہ آؤ اب باضابطہ شادی بھی کرلیں اس پر شکنتلا تو پہلے ہی راضی تھی اس نے اپنی ماں سے کہا تو ماں ہنسی اور کہا کہ کہیں لڑکیاں بھی لڑکیوں سے شادی کرتی ہیں؟ اور شادی سے انکار کردیا اس کے بعد ملزمہ شکنتلا کو اغوا کرکے مقام ننکانہ صاحب لے آئی، وہاں جا کر شکنتلا کو معلوم ہوا کہ ملزمہ واقعی لڑکی ہے۔ ادھر شکنتلا کی والدہ نے پولیس میں رپٹ لکھادی۔ اب جو شکنتلا نے ملزمہ سے سوال کیا کہ اس نے کیوں یہ دھوکہ کیا تو ملزمہ نے شکنتلا کو ڈرایا اور قتل کیے جانے کی دھمکی دی۔

اس کے بعد اتفاق سے ملزمہ بیمار ہوگئی اور حالت خراب ہونے پر اس کو شفاخانے پہنچایا گیا جہاں ملزمہ نے اقرار کیا کہ وہ واقعی لڑکی ہے اور وہ شکنتلا کے ساتھ ربڑ کا آلہ استعمال کرتی تھی اور اس حرکت سے اس کا منشا یہ تھا کہ وہ شکنتلا کو یہاں لاکر اس کی شادی اپنے بھائی کے ساتھ کردے۔

اس اقرار کے بعد ہی پولیس شکنتلا کی تلاش میں وہاں پہنچ گئی اور ملزمہ کو گرفتار کرکے لاہور لے آئی''۔

مذکورہ بالا بیان شکنتلا کا ہے جو اس نے عدالت میں قلمبند کرایا۔ اب اس بیان پر مدیر و نگارندہ اخبار ''چنگاری'' لکھتا ہے کہ:

''اس بیان سے آپ اندازہ لگاسکتے ہیں کہ مغربی تعلیم کا ہمارے ملک کی لڑکیوں پر کیا تباہ کن اثر پڑ رہا ہے اور پڑھائی کے دوران میں یا اس کے بعد اس قسم کے واقعات اور اعمال سے بھی دریغ نہیں کرتیں جو اخلاقی مذہبی اور قانونی اعتبار سے قابلِ صد ملامت اور عبرت ہیں۔ دراصل اب ہماری اخلاقی پستی اس حد کو پہنچ گئی ہے اور ہم

دنیاداری میں اس قدر منہمک ہیں کہ ہمیں اپنی اولاد کی صحیح تربیت کا خیال بھی نہیں آتا۔ پنجاب کا صوبہ تعلیم نسواں میں ہندستان کے دوسرے صوبوں سے بہت آگے ہے اور غالباً یہی وجہ ہے کہ پنجاب میں جہاں اور عجائبات کا انکشاف ہوتا رہتا ہے وہاں یہ بدعت بھی ادھر ہی سے شروع ہوئی ہے۔ اب دیکھیے اس کا اثر اور صوبوں پر کیا پڑتا ہے۔ پھر پنجاب کے اخبارات کو ملاحظہ کیجیے کہ وہ اس قسم کی خبریں موٹے موٹے عنوانات سے بڑے مزے لے لے کر شائع کرتے ہیں اور لعنت کے دو چار فقرے بھی اس سلسلہ میں سپرد قلم نہیں فرماتے اور نہ مغربی ذہنیت کی اس گندگی کو دور کرنے کی طرف کوئی توجہ کرتے۔ یورپ والے تو اب اس زندگی کے عادی ہو گئے ہیں۔ وہاں ایسی چیزیں نہ اخلاقی جرم ہیں اور نہ قانون بھی اس معاملہ میں کوئی باز پرس کرتا۔ رہا مذہب کا معاملہ سو اس سلسلہ میں سارا یورپ دہریہ ہے اور اس کو مذہب سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔ چنانچہ یورپ میں اس قسم کے زچہ خانے میں جہاں غیر شادی شدہ اور دوشیزہ لڑکیاں جا کر بچے جن آتی ہیں۔ پس جن ممالک کی اخلاقی پستی کا یہ عالم ہو اس کی نقل اور تقلید ہم ہندستانیوں کے لیے سم قاتل سے کم نہیں، مگر ان مغرب زدہ گدھوں کو کون سمجھائے جو اپنی اولاد اور ملک وقوم کے لیے بدترین لعنت بن کر رہ گئے ہیں''۔

(ملاحظہ ہو اخبار ''چنگاری'' دہلی، مورخہ 13 جولائی 1941، صفحہ: 7، کالم نمبر 3-2)

واضح ہو کہ یہ واقعہ ہندوقوم کی دو لڑکیوں کا ہے جس پر ایک مسلمان قوم کے اخبار نے مذکورہ بالا خیالات کا اظہار کیا ہے اور اس کا یہ اظہار خیال ہندستانی خودداری، ہندستانی شرافت اور ہندستانی فطرت رکھنے والے انسانوں کی تائید حاصل کرنے والا ہے۔

اسی طرح اس اخبار کے مسلمان مدیر و نگارندہ نے ہندوقوم کی لڑکیوں کی اخلاقی تباہی پر مسلمان ہو کر جو کچھ لکھا اس سے مسلمان قوم کی شرافت خیال اور فیاض فطرت ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔ خبر کا یہ مطلب ہے کہ ہر مسلمان کو انسانیت کے فرائض ادا کرتے وقت اتنا ہی بلند خیال اور عالی حوصلہ ہونا چاہیے۔

یہ ہندستانی نرس کا ایک حادثہ ہے جو اس لیے نہیں واقع ہوا کہ یہ لڑکی نرس تھی بلکہ یہ اس آزادی سے پیدا ہوا جو نرس کے بھیس میں یورپ اپنی لڑکیوں کو عطا کرتا ہے اور ہندستان کی اکثریت کسی طرح بھی ایسی آزادی کو برداشت نہیں کر سکتی جو لڑکیوں کو مردوں سے قریب ہو جانے کی اجازت عطا فرماتی ہے اور چالیس کروڑ ہندستانیوں میں وہ ہندستانی چند لاکھ سے زیادہ نہیں ہیں جن کو تمام ہندستانی ''مغرب زدہ'' کہتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے یورپ کی لفظ لفظ نقل کی ہے محض اس وجہ سے کہ ان کے عقلی قویٰ یا تو فطرتاً ضعیف تھے یا جوانی کی عمر ہونے کی وجہ سے ان میں عقلی قویٰ ابھی پختہ نہیں ہیں اور اگر سچ پوچھیے تو عورت مرد کے بداخلاق ہو جانے یا غلط کار ہونے کی نازک منزل کو تو وہ بھی نہیں سمجھ سکتے جو رواجی حیثیت سے عقلمند مشہور ہیں کیونکہ یہ مرد اور عورت کی فطرت، احساس اور فطرتِ اشتعال کے نازک اور پیچ در پیچ مواقع کو کیا خاک سمجھیں گے جبکہ یہ یورپ کی نقالی ہی کی ذلت اور عذاب کو نہ سمجھ سکے کہ مرد اور عورت کے قرب میں ایک ایسی غیر محسوس بجلی اور مقناطیسیت کارفرما ہے جو دو متعلقہ مرد اور عورت کو بھی محسوس نہیں ہوتی اور بے اختیار بنا دیتی ہے جس کے بے شمار حوادث خود اپنی فطری بے بسی پر بعد میں روتے نظر آتے ہیں۔

بارے ''نرس بیوی'' یورپ برادری میں کتنی ہی قیمت رکھتی ہو، لیکن ہندستان میں یہ ابھی نہ قیمتی ثابت ہوتی ہے نہ عام اور مقبول ہو سکی۔ بجز اس کے کہ یوں کہیے کہ ابھی تو اس کے، تجربے اور تماشے ہو رہے ہیں۔ چنانچہ یہی راز ہے کہ ابھی ہندستانی نوجوان اس کی قدر کرنے کے عوض اس سے عشق کرنے میں مبتلا ہیں جس کا ثبوت یہ ہے کہ ہندستانی رسالوں میں ''نرس'' کے عنوان سے اتنے ہی افکار و افسانے شائع ہو چکے ہیں جتنے افسانے کہ لیلیٰ مجنوں ایسے رسوائے عالم عنوان پر شائع ہو چکے ہیں، جن میں سے ایک خلاصہ یہ ہے۔ اس خلاصہ سے میرے مذکورہ بالا خیال کی تائید ہوتی ہے کہ یہ عورت ہندستان میں ابھی ''نظرنوازی'' اور ''دلکشی'' کی منزل میں ہے اور صرف ان حلقوں میں مفید و محترم ہے جن میں یورپی ذہنیت سما چکی ہے۔

اب ہندستان میں جن لڑکیوں نے ''نرس'' کا پیشہ اختیار کیا ہے ہر آئینہ ان کو بھی وہی طور طریقے اور اصول کا حامل ہونا پڑا یا ہونا پڑے گا جو یورپ کی نرس بیوی اپنے ساتھ لائی ہے لہٰذا اس

کے نرسی ضوابط سے قطع نظر ذیل کے حالات اور طور طریقے اس کے لیے ضروری ہیں:

1۔ بے پردگی۔

2۔ حسب ضرورت مرد مریض اور مریض کے مرد رشتہ داروں سے قرب اور گفتگو۔

3۔ اجنبی گھرانوں میں وقت ضرورت جانا اور مرض کے سلسلہ سے وہاں قیام و خدمت۔

4۔ لباس میں ایک خاص وضع کی وردی استعمال کرنا جو کافی لطیف و نظیف ہو۔

5۔ مریض اور اس کے متعلقین سے بے حد نوازش اور لطف سے پیش آنا۔

6۔ مرد مریض کی عریاں اور غیر عریاں حاجتوں کے اوقات میں مریض کی مجبور عریانیوں کو برداشت کرنا۔

7۔ اسی طرح مریضہ کی بیماریوں کی عریاں کیفیات کو مرد ڈاکٹر سے بے حجاب طریق سے بیان کرنا۔

8۔ مریض کی خدمت کے حالات کے پیش نظر مریض کے پاس تنہا رہنا اور تنہائی کے اوقات میں بھی اس سے مرض پر گفتگو کرنا۔ وغیرہ۔

یہ وہ حالات ہیں جن سے ایک نوجوان، ادھیڑ اور بوڑھی نرس کو گزرنا پڑتا ہے۔ اب جس طرح یہ ضروری نہیں کہ نرس صرف مردوں ہی کے لیے نہیں، اسی طرح یہ بھی حد بندی نہیں ہے کہ وہ مرد مریض یا اس کے مرد تیمارداروں سے یکسر دور رہے گی۔ اس لیے عورت مرد کے فطری تاثرات اور ان کی برقیت کے لحاظ سے جس طرح مذکورہ بالا خدمات و حالات لائق شکر و احترام ہیں اسی طرح خطرے سے بھی خالی نہیں۔ اسی لیے ہندستان میں اس پیشہ کو صرف وہ عورتیں قبول کرتی ہیں، جو معاشرے میں کسی نہ کسی طرح ''مجبور'' کی تعریف میں آسکتی ہیں۔

چنانچہ ایک واقعہ خود میرے ایک عیسائی دوست ڈاکٹر جوہری کی لڑکی کے نرس ہو جانے کا ہے جو اس طرح صورت پذیر ہوا کہ اس لڑکی کا باپ کافی دولت مند تھا، یہ لڑکی بیاہ دی گئی۔ چند سال کے بعد اس کے باپ، ماں اور اس کے شوہر کا انتقال ہو گیا اور چار بچوں کو اس لڑکی کے سر چھوڑ گیا جن کی پرورش اور تعلیم وغیرہ کی ذمہ داریوں کے لیے اس لڑکی کے پاس کافی اثاثہ نہ تھا اس لیے اس لڑکی نے پہلے انٹرنس کے امتحان کی کوشش کی مگر جب اس میں بھی ناکام ہو گئی تو اس نے نرس کا نصاب لے کر نرس کے فرائض سیکھے تاکہ اس سلسلہ سے اپنی اور اپنے بچوں کی زندگی کی

ضروریات کوفراہم کرسکے۔

پس ان حالات کے تحت یہ بیوی ہندستان میں نمودار ہوئی ہے اس لیے میرے ذاتی خیال میں اس کی خدمات کا تعلق جہاں تک عورت مریض سے ہے وہاں تک یہ ممکن ہے کہ ہندستان کی ذی مقدرت عورتوں کے لیے مفید ہو، لیکن چونکہ ہندستان مفلس ترین ملک ہے اور یہاں کے باشندوں کی مالی مقدرت 99 فیصدی اس حد تک ابتر ہے کہ اس کے اعداد پیش کرنے سے شرم آتی ہے لہٰذا غریب عورتوں کے لیے نرس کی خدمات کا معاوضہ دشوار اور نا قابلِ برداشت ہے اور اسی لیے ہندستان میں نرس بیوی عمر بھر کوئی امتیازی ترقی نہیں کرسکتی بجز اس کے کہ وہ اس ذریعۂ معاش سے صرف گزر بسر کرسکتی ہے اور کسی نرس کی یہ توقع کم سے کم ہندستان میں غلط ہے، کہ وہ کسی دولت مند ہندستانی کی کافی خدمت کر کے اس سے کوئی بھاری انعام ایسا حاصل کرسکتی ہے، جس سے اس کو تمام عمر ملازمت کی ضرورت نہ رہے اور یہ اس لیے غلط ہے کہ ہندستان کے دولت مندوں نے عمومیت کے ساتھ یورپی زندگی اختیار کرلی ہے اور مالی ذرائع کو یورپ کے برابر ترقی نہیں دے سکے اس لیے ان کی زندگی خود خرچ زیادہ اور آمدنی کم کے مرض میں مبتلا ہے اس۔لیے ان کے ہاں سے صاحبانِ کمال بھی جو کچھ پاتے ہیں خدمت کر کے پاتے ہیں اور حساب کے قاعدوں سے زیادہ نہیں پاتے۔

بظاہر حالات یہ مریض کے لیے بے حد خلیق، مونس، ہمدرد، فداکار اور مہربان ہوتی ہے جس سے بھولی بھالی ہندستانی عورتیں اس کی بے حد گرویدہ ہو کر اس کو بعض اوقات اپنی بہن بھی بنا لیتی ہیں اور حبِ حماقت یا حبِ تعلق اس کو بعض وقت ضرورت سے زیادہ بھی دے دیتی ہیں اور بعض اوقات شفاخانوں میں نرس بیوی کی احتیاط یا کافی سختی سے ایسی مریض عورتیں اس سے ناخوش بھی ہو جاتی ہیں اور اس کی شکایتوں کے دفتر لے کر بیٹھ جاتی ہیں۔

چنانچہ ہندستان کے عین دارالحکومت کا واقعہ ملاحظہ ہو جو یہ ہے اور وہ بھی بلدیۂ دہلی ایسی معزز و مستند مجلس کے رکن کا بیان کردہ۔ چنانچہ نامہ نگار لکھتا ہے کہ:

> ''دہلی میں 17 جولائی 1941 کو جناب ایچ۔جی۔ای ونز صاحب کی صدارت میں بلدیہ کا جو جلسہ ہوا گردودھر لال میٹرنٹی شفاخانے کے متعلق استاد رام سنگھ صاحب نے [illegible] کی کہ شفاخانے میں ایک ایسی زچہ کے ساتھ بدسلوکی کی گئی جو وہاں وضع

حمل کے لیے گئی تھی درد کی حالت میں اس کے شور کرنے پر اس کے منہ کو زور سے بند کیا گیا اور اس کو دھمکایا گیا تھی کہ مسز ڈی وڈسن نامی ایک نرس نے اس زچہ کو گھاس پر دھکا دے دیا، جب اس نے اس کی شکایت کی تو اس کو دبا دیا گیا۔ ایک اور عورت کو بچہ پیدا ہونے سے پہلے اٹھا دیا گیا حالانکہ حاملہ عورت برابر کہتی رہی کہ بچہ پیدا ہونے میں اب دیر نہیں ہے مگر اس کی کسی نے پروانہ کی آخرکار بچہ پاخانہ کے برتن ہی میں پیدا ہو گیا اور کوئی نرس یا میٹرن وہاں موجود نہ تھی۔ ایک اور عورت کے بچہ پیدا ہوتے وقت اتنی بے پروائی کی گئی کہ بچہ آدھا باہر آ گیا اور آدھا ماں کے پیٹ ہی میں رہا اس پر اس عورت سے ایک نرس نے کہا کہ اس کے 13 بچے پیدا ہو چکے ہیں مگر پھر بھی یہ ہر بار یہیں آ جاتی ہے۔

نرسوں کی ان شکایات پر ناظم بلدیہ نے کہا کہ ان شکایتوں کی تحقیق کریں گے اگر صحیح ثابت ہوئیں تو متعلقہ نرسوں کو قرار واقعی سزا دی جائے گی۔

(ملاحظہ ہو اخبار ''وطن'' دہلی، مورخہ 20 جولائی 1941، صفحہ 4، کالم 4 و 5)

بدقسمتی سے مذکورہ بالا اطلاع میں جس نرس کی شکایت کی گئی ہے وہ اپنے نام کے اعتبار سے یورپی یا اینگلو انڈین ہے اور ان دونوں قسم کی نرسوں سے ہندستان کی خالص دیسی وضع قطع کی عورت فطرتاً بھی خوش نہیں ہو سکتی جبکہ ایسی نرسوں کی یورپی زبان، یورپی لہجہ اور یورپی وضع قطع ہی ان دیسی عورتوں کی گفتگو کرنے والی شگفتگی کو مرعوب کر دیتی ہے۔

ہمارے یورپ زدہ طبقے کی نقالی اور انہی کی کوشش سے اب ملکی اور وطنی چیزیں برباد اور غیر مقبول ہوتی جا رہی ہیں اس لیے ہندستان میں نرس بیوی بھی اب ترقی پر ہے، لیکن یہ عورت چونکہ کسی خاص قبیلے اور جماعت وقومیت سے تعلق نہیں رکھتی اس لیے اس کی پیدائش اس کی تعلیم و تربیت، اس کی شادی بیاہ اور اس کی گھریلو زندگی پر کوئی خاص روشنی نہیں ڈالی جا سکتی البتہ اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ اس پیشہ کو اختیار کرنے سے ہندستانی نرس بھی نصف یورپی وضع کی ضرور ہو جاتی ہے اور بس۔

(21 جولائی 1941)

◆◆◆

نٹ بیوی

یہ بیوی ہندستان کے خانہ بدوش قبائل سے تعلق رکھتی ہے اور انسانی آبادی کو خاصا متاثر کرتی ہے۔ پیدائشی حیثیت سے یہ نہایت پست، تاریک اور کند ذہن گھرانے میں پیدا ہوتی ہے اس لیے اس کے ذہن ودماغ کا فطری رجحان نہایت محدود اور پست رغبتیں قبول کرتا ہے۔

ماں باپ خانہ بدوش زندگی سے گزرتے ہیں اس لیے اس کی پیدائش اور کنجر بیوی کی پیدائش کے اکثر حالات اس سے ملتے جلتے ہیں۔ یعنی دشت وصحرا اور اول فول سے جھونپڑوں، بھیک اور بھوک پیاس کی زندگی میں پل کر جوان ہوتی ہے اور ماں باپ کی زندگی قبول کرنے پر مجبور۔ لہٰذا اگر نٹ باپ بھیک پر گزر کرتا ہے تو اس کو بھی بھیک کی تکالیف سے گزرنا ہی پڑتا ہے اور اگر ماں باپ چوری کی راہ سے گزر کرتے ہیں تو اس کو بھی ان کا معاون بننا پڑتا ہے۔

یہی عمر اس کی تعلیم وتربیت کی ہوتی ہے جس میں اس کے باپ اور بھائی کا حصہ زیادہ ہوتا ہے محض سوجھ بوجھ سے اس کو اچھل کود کی ترکیب سے زیادہ کام لینا پڑتا ہے جس کے لیے مردوں کے قویٰ میں استعداد زیادہ دیر تک رہتی ہے۔ اگر چہ فن کی حیثیت سے اس کی ماں بھی اس کی تربیت میں حصہ لیتی ہے مگر باپ بھائیوں کے اثرات کو یہ زیادہ دباؤ کے ساتھ قبول کرتی ہے۔ اس کا یہ فن بے حد محدود اور خاص ہوتا ہے جس میں اس کو دو تین بانسوں پر بندھی ہوئی رسی پر اپنے جسم

کو سادھ کر چلنا ہوتا ہے اور انہی رسیوں کے پیچ و خم پر سے یہ مختلف قسم کی قلابازیوں کے کرتب دکھاتی ہے۔

1941 میں اس کی قیمت بہت گھٹ چکی ہے محض اس وجہ سے کہ غیر محقق اور غیر عاقل ہندستانیوں نے بغیر تحقیق اور وطنی مناسبت کے یورپ کی جملہ تفریحات کو قبول و اختیار اور پسند کر لیا ہے اس لیے اب ہندستان کی تفریحات خود ہندستانی فرزندوں کے ہاتھوں قبر میں پہنچ گئی ہیں، اس لیے اب نٹ بیوی کے کرتب دیکھ کر خوش ہونے والے اور تفریح کرنے والے ان نقال ہندستانیوں کی نظر میں بے وقوف اور تاریک خیال ہیں۔ حالانکہ علمی اور تحقیقی ضابطہ سے خود وہ بے وقوف اور غلط کار بلکہ وطنیت کے غدار و باغی ہیں اس لیے نٹ بیوی اب شہروں سے سمٹ کر دیہات میں بند ہو چکی ہے اور دیہات کے بڑے بڑے چودھری، پٹیل، مقدم، جاگیردار اور رئیس اب بھی نٹ بیوی کے قدردان اور شائق ہیں۔ چنانچہ اس کے کرتب دیکھنے کا یوں انتظام ہوتا ہے کہ نٹ قافلے کے گاؤں یا قصبے میں داخل ہوتے ہی یہاں کی آبادی اس کے کھیل تماشوں کے شائق ہو جاتی ہے اور بہت جلد اس کے تماشہ دیکھنے اور اس کے معاوضہ ادا کرنے کی ایک مرکزی جماعت بن جاتی ہے جو مشترکہ معاوضہ جمع کر کے اس کے کھیلوں کے عوض دے دیتی ہے۔ بعض جگہ اس گاؤں یا قصبہ یا تعلقہ کے رئیس صاحب اپنی طرف سے اس کے مصارف کا بوجھ برداشت کر کے اپنی ''دیہاتی رعایا'' کو اس کے کھیل ''بمراحم تعلقہ دارانہ'' دکھادیتے ہیں۔

ایک بڑے میدان میں اس کے کرتب شروع ہو جاتے ہیں جہاں پولیس کے لاٹھی چارج کا اندیشہ، نہ جگہ کی تنگی کی شکایت، جس نے چاہا چارپائی بچھا کر بیٹھ گیا جس سے ہو سکا چبوترے پر بیٹھ گیا۔ اگر تماشائیوں کا ہجوم واقعی کافی ہو گیا تو دس بارہ درختوں پر بھی چڑھ گئے ورنہ کھلے میدان میں جس طرف سے چاہا دیکھنے لگے۔ گاؤں کی عورتوں کو ایک خاص سمت میں بٹھادیا گیا جو گاؤں کے بزرگوں اور رئیس کی طرف گھونگھٹ تانے تماشہ میں محو ہو گئیں اور تماشہ شروع ہو گیا۔

پرانی وضع کے ایک ڈھول، ایک آدھ بانسری اور ایک آدھ پیتلی طشت کی آواز پر نٹ نے کوئی واہی تباہی سی غزل، ٹھمری، دادرہ یا مسدس کا اشعار شروع فرمادیے اور چھوٹی عمر کے نٹ زادوں نے اچھل کود قسم کے کھیل اور کرتب شروع کر دیے۔ اس موقع پر چند بانسوں پر ایک یا بعض

اوقات دو تین رسّیاں تنی ہوتی ہیں ان پر چڑھ کر، بعض چھوٹے نٹ بچے بھی قلابازی کے جوہر دکھاتے رہتے ہیں مگر تمام جلسہ اور مجمع خاص کر ''رئیس صاحب'' اصل نٹ بیوی کے کرتبوں کے انتظار میں غیر نمایاں طور پر مست و منتظر رہتے ہیں۔ ابتدائی حصہ میں نٹ بیوی نٹ کے اونچی اونچی تانوں سے گانے میں مصروف رہتی ہے، کچھ منظوم اور غیر منظوم سے اقوال دہراتی ہے اور اس کے بعد ایک خاص وضع کے لباس میں بانس پر چڑھنے کے لیے جب آتی ہے تو مجمع مارے مسرت کے باغ باغ ہو جاتا ہے۔ بانس پر چڑھنے اور صرف ایک رسّی پر سے گزرنے یا مختلف قسم کی قلابازیوں کے موقع پر فنّی کمال کے ساتھ ساتھ نہایت چالاکی سے یہ اپنے جسم کا مظاہرہ بھی کرتی ہے اور یہی چیز گاؤں کے رئیس صاحب کے لیے بے حد جاذب و دل پسند ہوتی ہے اور بدقسمتی سے ویسے بھی دولت مند دماغ لطافت پسند کے عوض کثافت پسند زیادہ ہوتے ہیں اور ہونا بھی چاہیے جس کی محققانہ اور طبی تفصیل میں نے اپنی کتاب ''ملکات جنسی'' میں دی ہے۔

بس اس جگہ اس کے وہ کرتب اور تماشے ختم ہو جاتے ہیں جن کی وجہ سے یہ ''نٹنی'' کے نام سے ہندستان میں مشہور ہے اور جس کی شہرت کا یہ عالم ہے کہ اس زمانے کی خوش نصیبی سے اور اس زمانے کی بدقسمتی سے حضرت اکبر الٰہ آبادی مغفور بھی اس قبیلے سے متاثر ہوئے ہیں۔ چنانچہ ارشاد عالی ہے کہ:

کرکٹ، جمناسٹک ٹریننگ کالج
مولنا سیکھتے ہیں بالفعل یہ نٹی
(ملاحظہ ہو کلیاتِ اکبر)

اس درجہ ہنر مند ہونے کے بعد اس کی شادی کا زمانہ شروع ہوتا ہے اور یہاں سے یہ بعض دولت مند گھرانوں کی زینت بھی بن جاتی ہے۔ دولت مند گھرانوں کی اس لیے کہ دولت مند دماغوں کا فطری میلان بھی کچھ پست واقع ہوا ہے جیسا کہ میں اوپر عرض کر چکا ہوں اور ایسی ہی بیویوں کے وہ ہولناک نتائج برآمد ہوتے ہیں جنھوں نے بعض بے حد اونچے گھرانوں کو خاک و خون اور بے عزتی و رسوائی کے غار میں ملا کر چھوڑا ہے۔ مراد یہ ہے کہ جب مسلّم ہے کہ پست طبقات اپنے اعضائے خواص میں فطرت ہی کی طرف سے پستی اور عقلی افسردگی لے کر آئے ہیں تو

کیسے ہوسکتا ہے کہ ایسے دماغوں کے نتائج عمل بھی پست نہ ہوں، اس لیے ایسی بیویوں کے وجود سے جو اولاد پیدا ہوتی ہے عام اس سے کہ وہ کتنے ہی اونچے اور دولت مند گھرانے میں ہو مگر اپنے وقت پر پہنچ کر وہ اپنے ماں باپ کے نسلی اثرات سے بچ نہیں سکتی ہے اس لیے وہ گھرانے کی وجہ سے ذی عزت ہونے پر بھی بے عزتی کے کام کرنے پر مجبور ہوتی ہے اور عقلمندانہ ذمہ داریوں میں بے خردی و بے عقلی کا ثبوت بہم پہنچا کر عوام و خواص میں موردِ طعن و سزا ہو جاتی ہے۔ اسی لیے اسلام نے شادی کے مواقع پر حسب و نسب کی صحت و تحقیق کو روا رکھا ہے اور حسب نسب کے غلط غرور سے منع کیا ہے۔ چنانچہ نٹ بیوی کے گھر میں آتے ہی پہلا اثر تو گھر کی پہلی بیوی پر پڑتا ہے اور معاملہ طلاق و تباہی پر ختم ہوتا ہے اور دوسرا اثر خود اس کے اعلیٰ خاندان نام کے شوہر پر پڑتا ہے اور رفتہ رفتہ وہ تباہی اور رسوائی کے غار میں دھکیل دیا جاتا ہے کیونکہ قدرتاً اس بیوی کے خیالات، ارادوں، اعمال اور گفتگو تک میں جو فطری اور عقلی پستی ہوتی ہے اس کے اثرات و نتائج بھی ہمیشہ پست، غیر شائستہ اور ناقابلِ برداشت ہوتے ہیں۔

اب جس طرح یہ اپنے جسم اور اعمال یا حسن سے دیہاتی رؤسا یا شہری امرا کو اپنا غلام بنا لیتی ہے ٹھیک اسی طرح شہری عوام بھی اس سے متاثر ہوتے ہیں اور ان میں نٹ بیوی وہی حالات پیدا کر دیتی ہے جن کا مختصر خاکہ میں نے اوپر پیش کیا اور جس کے ثبوت میں عوام کی یہ ضرب المثل ملاحظہ ہو دستر خوان پر چٹنی اور... پر نٹنی۔ ترجمہ یہ ہے کہ عوام کے نزدیک نٹ عورت بے حد دلچسپ، دلکش اور دلنواز ذات ہے۔ اب اگر اس کی شادی اسی کی برادری میں ہو تو اس کا خلاصہ یہ ہے کہ جس طرح دوسرے خانہ بدوش قبائل کی لڑکیوں کی شادی بیاہ کے نمونے میں پیش کر چکا ہوں اس کی شادی بھی انہی نمونوں کے مطابق ہوتی ہے۔ پس اگر دیہات میں، کسی گاؤں یا قصبہ میں ہوتی ہے تو اس کی برادری کے افراد اپنی حیثیت اور رتبے کے موافق اس میں شرکت کرتے ہیں اور مالی بے بضاعتی کے باعث نہایت معمولی مصارف سے یہ تقریب اختتام کو پہنچتی ہے البتہ شراب کے ذریعہ اس مفلس بارات میں ''باراتیوں کے شور'' اور ناچ رنگ کی ہڑبونگ کسی شہر کے مزدوروں کی بے پناہ ہڑتال کے ہنگاموں اور ہندو مسلم فسادات کے بے تک سے غدر نما ماحول سے کسی طرح کم نہیں ہوتی۔ اور جو شہر میں ہوتی ہے تو اس کی مالی حیثیت میں کوئی ''خفیہ رئیس'' یا کم سے کم کسی ''خفیہ

داروغہ صاحب'' کا ہاتھ میں کبھی کبھی کام کر جاتا ہے اور شادی ذرا ''شاندار'' اور ''دھوم دھام'' کی منزل تک جا پہنچتی ہے۔ مثلاً اس کی بارات میں شہر، محلے اور حلقے کے کچھ پست وارذل ذوق کے پیشکار، محرر، چودھری، داروغہ، سپاہی اور میل جول والے غنڈے بھی مدعو کیے جاتے ہیں۔ یہاں مدعو سے مراد صرف باراتیوں کے ''نٹ وانہ کرتبوں'' کا ملاحظہ ہے یعنی اس نٹ بیوی کے وارثوں کی طرف سے مذکورہ بالا قسم کے لوگوں کو جو اذن دیا جاتا ہے وہ ان الفاظ میں ہوتا ہے:

''ہجور، کل ولیا کی سادی ہے، جلا نجھر نگر سے آئے گی۔''

''دیکھیے ہجور تما سے میں جرور آیئے گا''

جی ہجور میں بھی تماسہ دکھاؤں گا جرور ہجور کو''

اس اذن کی شان دکھانے کے لیے کرتب کے میدان کے کناروں پر چار پائیاں بچھادی جاتی ہیں اور جب مذکورہ بالا افراد شہر وحلقہ جمع ہو جاتے ہیں تو باراتی نٹ بھائیوں کے کرتب شروع ہو جاتے ہیں جن کے ساتھ بارات کی بعض ''فقید المثال''، ''عدیم النظیر'' اور ''لاجواب'' قسم کی نٹنیاں بھی اپنے اپنے کرتبوں سے ان ''معزز شرکا'' کی تواضع فرماتی ہیں اور شہر کے یہ بدمذاقے ان نٹ نٹیوں کے کرتبوں کو امتیازی فخر حاصل کرنا سمجھتے ہیں اور اسی موقع پر یہ ''محترم شرکا'' شادی والی نٹ بیوی کو ''خاص انعامات'' بڑے نخرے اور رئیسانہ تمکنت کے ساتھ پیش فرماتے ہیں جس پر نٹ بیوی کے ماں باپ ہاتھ جوڑ کر ان ''معززین شہر'' کا شکریہ ادا کرتے ہیں اور انہی ''معززین'' میں سے بعض نٹ بیوی کی شادی اور رخصتی پر آہیں بھرتے ہوئے بھی واپس ہوتے ہیں۔

فی الجملہ نٹ بیوی انسانی آبادی کی ''عشرتی زندگی'' اور ''تفریحی ذوق'' کی سیرابی کا ایک جز ہے اور یہ اس کی اہمیت ہی ہے جو حضرت آتش مرحوم بھی اس سے اتنے متاثر ہو کر گئے ہیں کہ:

چڑھے جو بانس کے اوپر یہ کام ہے نٹ کا

(دیوانِ آتش)

شادی کی رسوم 'چڑھاوا'' اور جہیز بے حد کم، سادہ اور کم ہوتا ہے اس کے جہیز میں بھی تماشوں اور کرتبوں کے حاصل کردہ انعامات دیے جاتے ہیں۔ شادی کے ساتھ ہی یہ اپنے شوہر

کے کاموں میں برابر کی حصہ دار بن جاتی ہے اور سفر و حضر میں بلا کی جفاکش رفیقۂ حیات، حتیٰ کہ جرائم اور بلا و سزا میں بھی یہ اپنے مرد سے پیچھے نہیں رہتی۔

بے علم، بے عقل، بداخلاق، کہیں کہیں بداطوار، جفاکش، محنتی، نڈر، بے باک، بے حجاب، گٹھیلی، رنگیلی اور کم سے کم نصف درجن بچوں کی ماں شوہر سے برابر سے لڑنے والی، مارنے والی اور مار کھانے والی، گالی دینے والی اور گالی کھانے والی، جوئے باز اور شراب نوش مگر کبھی کبھی۔

(9 جولائی 1941)

◆◆◆

افسانہ نگار بیوی

افسانہ نگار بیوی کا وجود کافی قدیم ہے مگر اردو اور ہندی زبان میں اس کی عمر ابھی بچپن سے زیادہ نہیں۔

انگریزی تعلیم کے اثر سے انگریزی داں طبقے میں اخبار اور رسالے کا جو ذوق پیدا ہوا اور ہندستان میں ہر چیز یورپ کی دیکھا دیکھی اختیار کی جانے لگی تو ہندستان میں بھی بے شمار چیزیں اس کورانہ تقلید و نقل میں وجود پا گئیں۔ اسی طرح انگریزی تعلیم کے سلسلہ سے ''تعلیم'' اور ضرورت تعلیم پر جو ہڑ بونگ ہوتی ہے اور ویسے بھی ملازمتی طبقات کے لیے بے انگریزی تعلیم کے روزی ملنا محال تھا اس لیے اس نے ہندستانیوں کی ذہنی و دماغی قوتوں کو متاثر کیا۔ ان حالات نے یہاں کے باشندوں میں ایک نیم یورپی اور نیم ہندستانی احساس پیدا کیا جس کے تحت اب زندگی کی ترقی اور زندگی کی زینت بھی وہی چیزیں قرار پائیں جو یورپ والوں نے اپنی زندگی کے لیے قرار دی تھیں اور اسی لیے ہندستانیوں کو بجز تقلیدی اور نقلی زندگی کے بہت کم اندازہ ہو سکا کہ وہ یورپ کے علمی و ادبی زندگی کی جس طرح نقل کرنے چاہیں وہ ان کے لیے مفید اور موزوں بھی ہے یا نہیں۔

بارے جن ہندستانی گھرانوں نے انگریزی تعلیم حاصل کی انہی میں ''قومی احساس'' نے زیادہ جگہ حاصل کی اور انہی میں کے اٹھے جنھوں نے قومی اصلاح، قومی خدمت اور قومی ادبیات پر

زیادہ توجہ کی۔ گویا قومیت کا یہ پہلا احساس تھا جس نے قوم کے عورت مرد کو گھر سے، نکال کر میدان میں کام کرنے پر آمادہ کیا، مگر اس مسئلہ پر غور نہ کیا گیا کہ ہمارے اندر میدان میں کام کرنے کی صلاحیت اور قابلیت ہے بھی یا نہیں البتہ کام شروع کر دیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ کام کی ایجاد کی مقدرت تو تھی نہیں اس لیے یورپی کاموں کی نقل شروع ہوگئی۔

مثلاً ایک اخبار ایسا ہی نکالا جائے جیسا کہ انگریزی میں نکلتا ہے اور اس اخبار میں وہی لکھا جائے جیسا کہ انگریزی کے اخبارات اپنی قوم کے لیے لکھتے ہیں۔ بالکل اسی جگہ اور اسی جذبہ سے ہندستان میں افسانہ نگار بیوی پیدا ہوگئی یعنی جب یورپ کی لڑکیاں اپنی جوانی، اپنے عشق اور اپنے معشوق اور ہونے والے شوہر کے لیے بے حجابانہ انداز سے اخباروں و رسالوں اور شعروں میں کامل عریانی اور بے حجابی سے سب کچھ کہہ سکتی اور لکھ سکتی ہیں تو بالکل اسی طرح ہندستانی لڑکی کو بھی کہنا اور لکھنا چاہیے۔

پس اصولی طور پر یہ بیوی ایسے گھرانے میں پیدا ہوئی جس کے مرد انگریزی تعلیم یافتہ اور یورپی طور طریقوں کے محقق نہیں بلکہ محض مقلد تھے، اسی لیے وہ یورپی لڑکی کی بیباکی اور ہندستانی لڑکی کی بے حجابی کے نتائج پر غور نہ کر سکے اور نہ اس کی افسانہ نگار زندگی کے مستقبل کو سمجھ سکے۔ انھوں نے تو صرف یورپی لڑکی کی زندگی کو ''ترقی یافتہ زندگی'' سمجھ کر اپنی لڑکی کو اس سے لفظ لفظ اور حرف حرف مشابہ کر دینے کو اپنے دماغ کا کمال سمجھا اور اس کو ''افسانہ نگار'' بنا دیا۔ اس پر طرفہ غضب یہ کہ جن لوگوں نے ایسی افسانہ نگار بیوی کی عزت کی، تعریف کی، اس کا دل بڑھایا اور اس کے افسانے چھاپے اگر وہ تحقیق اور اعلیٰ غور وفکر والے ہوتے تو زندگی سنور جاتی مگر خیر سے وہ بھی وہی تھے یعنی تقلید یورپ کے مارے ہوئے نتیجہ یہ کہ ''جیسی روح ویسی فرشتی'' پیدا ہوگئی۔

چنانچہ یہ بیوی عموماً کھاتے پیتے گھرانوں میں پیدا ہوتی ہے۔ اس کی ابتدائی تعلیم وتربیت سے لے کر آخر تک یورپی آدابِ زندگی زیادہ کارفرما رہتے ہیں مثلاً لفظ ''آزادی'' اور ''مساوات'' کا اس کے ہاں استعمال زیادہ ہوتا ہے اس لیے یہ لڑکپن میں بھی دادی اور دادا کے برابر آزادی اور مساوات کی مالک ہوتی ہے۔ چونکہ مالی فراغت کے ہاتھوں مشکلات کے عوض آسانیاں زیادہ ہوتی ہیں اس لیے ہر تفریحی شغل میں لڑکی بھی آزادی اور مساوات سے فائدہ اٹھاتی ہے۔ مثلاً اگر

والدہ یا والد یا بھائی جان شعر کہتے ہیں تو یورپی مساوات کا حق ہے کہ لڑکی بھی شعر کہے۔ یا اگر گھر کے مرد سنیما جا کر حسن و عشق کے افسانے کامل بیبا کی سے دیکھ سکتے ہیں تو لڑکی کا بھی مساواتی حق ہے کہ وہ بھی ان بے حجابانہ افسانہ ہائے عشق و حسن کو سنیما میں جا کر دیکھے وغیرہ۔

مجھے ذاتی طور پر ایسے بے ہوش اور احمق گھرانوں کا علم ہے جن کے یورپ زدہ بزرگ دوشیزہ بیٹیوں سے آزادانہ حسن و عشق کے مقامات کی گفتگو لڑکی کے لکھے ہوئے عشقیہ اشعار اور عشقیہ افسانوں کو کامل استغراق شوق اور بیبا کی سے نہ فقط سنتے بلکہ ان میں اصلاح و مشورے بھی عطا فرماتے تھے۔

اب افسانہ نگار بیوی کی پیداوار میں سنیما کے تماشوں نے کافی کثرت پیدا کر دی ہے جس کا خلاصہ کلہم اتنا ہے کہ لڑکی جو کچھ سنیما میں رات کو دیکھتی ہے دن کو اسی کو اپنے اول فول سے قلم سے نقل کر کے اس کو اپنے طبع زاد افسانہ کہنے لگتی ہے۔

اس کی تعلیم خصوصیت سے ادھوری، ناقص اور جس زبان میں یہ افسانہ لکھتی ہے وہ بے حد غلط، کمزور اور مذاق کے قابل ہوا کرتی ہے، ایسی بیوی کے اشعار اور افسانوں کی اصلاح فرمانے والے یا تو اسی کے کچے اور کم عمرے یورپ زدہ بھائی، چچا، باپ اور والدہ ہوا کرتی ہیں یا اس کے وہ نیم بڑے ماسٹر صاحب جو اس کی تعلیم کے لیے اس کے گھر آتے ہیں لہٰذا ان کی اصلاح میں بھی وہی ہوا کرتا ہے جو کم عقلوں کی اصلاح میں ہونا چاہیے یعنی غیر عقلی واقعات، عریاں جذبات، دوسروں کے چرائے ہوئے الفاظ، غیر فطری اور دور از عقل حالات و کیفیات۔ ایسی بیوی کے افسانے میں ایک چیز ضرور صحیح ہوتی ہے اور وہ اس کے عاشقانہ جذبات اور ہجر و فراق اور ارمانوں کا نقشہ۔ یہ نقشہ اس لیے بے حد صحیح ہوتا ہے کہ اس میں لڑکی اپنے ہی صحیح جذبات کا خاکہ اس لیے بے دھڑک کھینچ دیتی ہے کہ وہ سمجھتی ہے کہ پڑھنے والے سب بیوقوف ہوتے ہیں لہٰذا میرے ان صحیح جذبات کو میرا نہیں سمجھیں گے بلکہ افسانے کی فرضی لڑکی کے جذبات ہی سمجھ کر رہ جائیں گے۔

اس بیچ میں ایک خاص الخاص افسانہ نگار بیوی کو اور لکھ دوں تا کہ یہ کردار مکمل ہو جائے یعنی یہ افسانہ نگار بیوی اردو کی بد قسمتی سے مرد ہوتا ہے اور یہ وہ مرد ہیں جو اپنے عقلی قویٰ اور فہم و فراست کے لحاظ سے ناقص تر احساس اور ضعیف ذکاوت کے مالک ہیں، اس لیے یہ مرد ہو کر

عورت کے فرضی نام سے افسانے لکھتے ہیں۔ چنانچہ ایسے بدحواس مرد افسانہ نگار بعض افسانوں میں اس لیے پکڑے گئے اور بے حد ذلیل ہوئے کہ وہ اپنی فطری رفتار وگفتار کو چھپا نہ سکے اور عورت کی ''ضمیر تانیثیت'' لکھتے لکھتے کسی جگہ ضمیر تذکیر بھی لکھ گئے اور محقق ناظرین میں سے کسی نے اس حماقت کو بھانپ لیا۔ اسی طرح بعض جگہ وہ عورت کے صحیح اور فطری جذبات کو مردانہ انداز سے بیان کر گئے اور پکڑے گئے۔ اس نوع کے نیم بیوقوف مرد وہ ہوتے ہیں جو اپنی بیٹی یا بیوی کے نام سے افسانے لکھتے ہیں اور دوستوں میں بھی اپنی بیٹی یا بیوی کو افسانہ نگار ثابت فرمانے کی کوشش فرماتے ہیں۔ ایسے حمقا کی تعداد نصف کے قریب شاعر بھی ہوتی ہے اور چونکہ اردو میں شعر گوئی کے لیے علم و فضل اور جدت و صحت کی کوئی پروا نہیں کی جاتی لہٰذا ان لوگوں کو اپنی بیٹی یا بیوی کے نام سے غزل یا نظم کہہ دینا کچھ مشکل نہیں۔ اسی طرح ایسے نیم جاہل چھچھورے اور نوعمرے بھی پیدا ہوئے جنھوں نے اپنی ذہنی پستی کے اثر سے بعض چند روزہ رسالے بھی ایسے جاری کیے جن میں ایسی ''افسانہ نگار بیوی'' نے کافی جگہ پائی۔ ان دونوں قسم کے لکھنے اور چھاپنے والوں کی متحدہ محنت کا نتیجہ یہ نکلا کہ زبانِ اردو بہ لحاظ صحت انشا اور اخلاق بلند کے نہایت درجہ غلط، بھونڈے، غیر شائستہ، عریاں اور جاہلانہ الفاظ و واقعات کے ذخائر سے گندہ ہوگئی یا ہوتی جارہی ہے۔ چنانچہ اس تباہی پر ہوشمند اخباروں نے جو مضامین لکھے ان میں سے بعض یہ ہیں۔

یہ افسانہ نگار بیوی اپنی ادھوری، ناقص اور بے ربط سی تعلیم اور آزادی کے زور سے نوخیزی ہی میں پک جاتی ہے اور لڑکپن ہی نہیں سو برس کی پختہ کار عورت کی سی متین و سنجیدہ گفتگو کرنے کی کوشش کرتی ہے اور پختہ کاروں کی نظر میں مذاق بنتی جاتی ہے مثلاً وہ دنیا کے ہر بڑے قومی مسئلہ پر اپنی اول فول سی گفتگو شروع کر دیتی ہے جس کی تعریف میں اس کے اول فول سے ماں باپ اور بھائی محو ہو جاتے ہیں اور اپنے ملنے والوں تک اس کی یہ بے مغز سی گفتگو پہنچاتے ہیں مثلاً یہ اپنے ملنے والوں سے فرماتے ہیں:

رات کو جمیلہ نے غضب کر دیا۔ کہنے لگی کہ جرمنی کی لڑائی پر میں بھی مضمون لکھوں گی۔

واقعہ یہ ہے کہ جمیلہ بڑی تیز ہے وہ چاہے تو لکھ سکتی ہے۔

اجی اس نے تو آپ کے ملا رموزی صاحب تک کے ایک مضمون پر سخت تنقید لکھی تھی

مگر وہ تو خالو میاں نے اس کو شائع کرانے سے منع کر دیا وغیرہ۔

پھر طرفہ مصیبت یہ کہ اس نوع کی گفتگو گھر میں جا کر اس نوخیز افسانہ نگار کو بھی فخریہ سناتے ہیں مثلاً کہیں گے کہ:

''جمیلہ سنتی ہو رات کو سنیما میں ملا رموزی صاحب سے تمھارے بارے میں خوب خوب بحث ہوئی۔ وہ تمھاری نظم کی بہت تعریف کرتے تھے اس کے بعد وہ تمھارے مضامین کے بھی قائل ہو گئے۔ وہ کہتے تھے کہ اگر جمیلہ اور محنت سے لکھیں تو اپنے وقت کی لاجواب ادیبہ ہو جائیں گی۔''

اس قسم کی بے ہودہ حوصلہ افزائی سے اس افسانہ نگار بیوی کا دماغ اور خراب ہو جاتا ہے اور وہ بے ہنگم مضامین کے انبار لگا دیتی ہے۔

اس کی گفتگو میں بے حد بناوٹ اور نا قابلیت کی وجہ سے خاصی لکنت ہوتی ہے۔ اس کی دوسری بدبختی یہ ہوتی ہے کہ یہ لاڈ پیار اور دولت مندی کی وجہ سے محنت اور لگاتار جد و جہد سے کسی علم اور کسی ایک ہنر میں کمال حاصل نہیں کرتی بلکہ تعلیم میں ادھوری رہ کر عورتوں کی مصلح بھی بن جاتی ہے اور اس شوق میں وہ ایک ''انجمن اصلاحِ نسواں'' ضرور بناتی ہے جس کی ارکان ایسی ایسی صاحبزادیاں ہوا کرتی ہیں۔ ان کی ایسی انجمن کے موئد اس کے افسانوں کے مداح ہوا کرتے ہیں اور یہ انجمن بڑے بڑے مصنوعی اعلانوں کے ساتھ ظہور میں آتی ہے۔ بڑے ٹھاٹھ کے جلسے ہوتے ہیں، جن میں قابلیت سے صحیح کام کے عوض اس انجمن کے ارکان زیورات، فینسی لباس اور دوسروں سے لکھائی ہوئی تقریروں کا خاصا مظاہرہ کرتی ہیں۔ بعض اول فول سے اخباروں میں اس انجمن کی کارروائی بھی شائع ہوتی ہے اور چند دن بعد یہ انجمن جہاں سے آتی ہے وہیں چلی جاتی ہے۔

اس کی شادی عموماً کافی عمر گزر جانے پر ہوتی ہے، کچھ تو اس لیے کہ والدین یورپی اصول ازدواج کے نقال ہوتے ہیں اور نہیں سمجھتے کہ ہندستان کی مٹی کی پیداوار کو اس کے فطری و ملکی ضوابط صحت ہی راس آئیں گے بلکہ محض نقالی میں لڑکی کو بوڑھا کر کے بیاہتے ہیں اور کچھ اس لیے کہ ایسی چٹاخ پٹاخ لڑکی کے لیے دولت مند شوہر کی تلاش میں کافی عمر گزر اری جاتی ہے۔ شادی میں امکانی ٹھاٹھ اور شان و شوکت سے کام لیا جاتا ہے۔ اس کا شوہر بیشتر حالات میں بی۔ اے ہی ہوتا ہے اس لیے شادی کے بعد ہی شوہر بھی افسانہ نگار بن جاتا ہے گو افسانہ نگار خاتون کے شوہر بہت کم

افسانہ نگار ہوتے ہیں لیکن اگر مل جاتا ہے تو پھر چند دن کے لیے رسالوں پر مصیبت آجاتی ہے یعنی جب ایک گھر کے ''پورے میاں بیوی'' افسانہ نگار ہوں تو بے چارے رسالہ کی گنجائش ہی کیا۔ وہ وہ انوکھے افسانے لکھے جاتے ہیں کہ سوال ہوتا نہ جواب۔ چنانچہ بعض افسانہ نگار بیویوں نے اپنے افسانہ نگار شوہر پر اور بعض افسانہ نگار شوہروں نے اپنی افسانہ نگار بیویوں پر جن الفاظ میں فخر کرتے ہوئے ان الفاظ کو اخباروں ورسالوں میں شائع کرایا ہے ان کے چند نمونے یہ ہیں:

شادی کے بعد اس کی افسانہ نگاری کی مدت ایک سال ہے اور اس کے بعد یہ پھر اس منزل میں داخل ہوجاتی ہے جہاں افسانہ نگاری، روشن خیالی، آزاد خیالی، ترقی، ٹینس کلب، انجمن، لیڈری، ایڈیٹری سب دھری رہ جاتی ہے اور فطرت اس کو اصل عورت اور صرف گھر میں بچے پالنے کی ایک سست اور کامل مشین بنا کر رکھ دیتی ہے، پھر ڈھونڈیے تو یہ نہ اخباروں میں ملتی نہ رسالوں میں نہ انجمن میں اور نہ کلب میں۔

البتہ افسانہ نگار بیوی بچے پالنے کی خدمت سے فارغ ہوکر جب پوپلی عمر میں داخل ہوتی ہے تو افسانہ نگاری، ایڈیٹری اور لیڈری کی ہانڈی میں پھر ایک اُبال سا آتا ہے جو چند دن کے لیے اسی ناقص انداز میں ابھر کر ہمیشہ کے لیے مرجاتا ہے۔ یہ ابال اکثر خود کی جوان اولاد کی اصلاح و ترقی کے لیے کبھی کبھی بڑھاپے میں آجاتا ہے اور اس کے بعد یہ اصلاح وترقی اور روشن خیالی کی ہر تجویز کو ادھورا چھوڑ کر ایسی غالب ہوتی ہے کہ پھر کسی افسانہ نگاری کے تذکرہ ہی میں اس کے افسانوں کے نمونے بطریق تبرک شائع ہوتے ہیں۔

یہاں تک اس افسانہ نگار بیوی کا تذکرہ تھا جو عوام اور زبانِ اردو کو کافی تعداد میں متاثر کر رہی ہے لیکن اس کے بعد اردو یا افسانہ نگاری میں بعض ایسی افسانہ نگار بیویاں بھی ہیں جو صحت زبان تو خیر البتہ صحت افسانہ میں ضرور قابلِ تذکرہ ہیں مگر افسوس کہ ایسی بیویوں کی تعداد بے حد کم ہے اس لیے ان کے لیے کچھ لکھنا میرے ضابطہ تالیف حالات سے باہر ہے۔ اسی طرح اگر ان میں کی بعض افسانہ نگار بیویوں کے حالات لکھے بھی جاتے تو بجز ان کے افسانے کے بے شمار حالات مشابہ ہوتے اس لیے افسوس کے ساتھ ایسی بعض پختہ کار اور لائق ذکر افسانہ نگار بیویوں کو میں نہ لکھ سکا۔

◆◆◆

کنجرِ بیوی

یہ بیوی انسان کے ان قبیلوں، ٹولیوں، فرقوں اور جماعتوں سے تعلق رکھتی ہے جو طویل تر جہالت اور بعض پیدائشی کمزوریوں کے باعث گو انسانی زندگی کا ایک جز ہیں مگر بے حد کمزور اور موردِ عذاب و تحقیر۔ پس اس جگہ اگر میں پست اقوام کا ایک محققانہ، علمی اور خالص فلسفی تجزیہ کروں تو وہ اس بیوی کی زندگی کا کردار بے شمار اجزائے زندگی کو واضح کر دے گا۔

مثلاً یہ کہنا سراسر جہالت اور غیر محققانہ عقیدہ ہے کہ انسان محض جہالت اور علم کی روشنی سے محروم رہنے کے باعث پست زندگی یا قعرِ مذلت میں رہتا ہے کیونکہ فطری حقائق اور فطری قویٰ کی ''استعداد'' اس سے انکار کرتی ہے اس لیے میں نے پست اقوام کی جسمی ساخت اور ان کے پیدائشی قویٰ کی استعداد پر غور کیا تو قرآن محترم کا یہ اعلان صاف صاف سمجھ میں آ گیا کہ ''شعوباً و قبائل لتعارفوا'' یعنی خدا نے انسان کو پیدائشی اختلاف ہی کے ساتھ دنیا میں بھیجا ہے یعنی خود اسی نے مختلف الحیثیت انسان پیدا کیے ہیں تاکہ انسانی زندگی کے بے قیاس و بے اندازہ حالات، ضروریات اور مقاماتِ زندگی کے مختلف النوع تاثرات کی تکمیل بے شمار انسانوں کے تعاون اور تائید سے ہوتی رہے اور اس لیے زمین پر بے تعداد انسانوں کے آنے اور رہنے کا ایک قاعدہ سمجھ میں آ جائے ورنہ اگر ایک ہی نوع کے انسانوں میں زندگی اور نظمِ انسانی کی تمام مقدرتیں،

صلاحیتیں، قابلیتیں اور استعدادیں دے دی جائیں تو پھر انسانوں کی کثرت بے کار یا مضحمل اور مہمل سمجھی جاتی۔

اسی طرح اگر علم کا نور ہر دماغ قبول کر لیتا تو پھر تمام انسان بیک وقت ایک خاص قسم کی اعلیٰ زندگی میں سمانے کی کوشش کرتے اور حقدار ہوتے اور اس طرح ایک وقت آتا کہ تمام متحرک انسان ایک طرح کا جامد کرہ بن کر ساکت ہو جاتے، اس لیے فطرت ہی نے دماغی اور جسمی استعدادوں میں فرق باقی رکھا۔ اسی لیے گو انسانوں میں کافی تعداد میں انبیا و ملہمین تک نے تبلیغ علم و عقل کی مگر بجز مخصوص تعداد کے عام انسان ان ملہمانہ پیغامات کو بھی قبول نہ کر سکے، کیوں کہ ان میں پیدائشی ذکاوت و احساسِ علم کم تھا اور دماغ کے فطری قویٰ ان بلند کر دینے والی صلاحیتوں کو قبول نہیں کر سکتے تھے لہٰذا انسانوں میں پست و بلند گروہ آدم سے این دم موجود ہیں۔

بالکل اسی علمی اثر و ضابطہ سے پست اقوام میں کنجر کا وجود ہے۔ اس نام کی نسبت جن انسانوں سے کی جاتی ہے ان کے خواص و اعمال کو اگر سامنے کیا جائے تو کافی فرق ملے گا۔ مثلاً ایک علاقہ میں کنجر صرف اس شخص کو کہتے ہیں جو صرف رسّی یا چارپائی کے بان بنانے کا پیشہ کرتا ہے، لیکن دوسرے علاقہ میں کنجر اس شخص کو کہتے ہیں جو خانہ بدوش قبائل کی سی زندگی کا مالک ہوتا ہے اور اس کا شمار بالعموم جرائم پیشہ انسانوں سے سمجھا جاتا ہے۔ اسی طرح بعض علاقوں میں وہ لوگ بھی کنجر کہے جاتے ہیں جو ہر پست اور قابلِ نفرت کام سے روزی کماتے ہیں مگر نہیں چوکتے۔ بارے میری لکھائی کا معیار یہ ہے کہ ہر اس عورت کا مکمل کردار لکھدوں جو کسی نہ کسی طرح انسانی جماعت کو اپنے وجود سے متاثر کرتی ہے اور گھر میں بند نہیں رہتی اس لیے انسانی برادری میں کنجر بیوی کا دم بھی غنیمت اور بعض کے نزدیک تو بڑا غنیمت ہے جیسا کہ میں آگے بیان کروں گا۔

صوبوں اور علاقوں کے اختلاف کی نسبت سے اس کی برادری اور اس کے کاموں میں گو اختلاف سہی لیکن اس کے ہر علاقے اور ہر صوبے میں پست ماحول، گندہ زندگی اور بے حد بے مایہ اور تنگ دست گھرانے میں کوئی اختلاف نہیں۔ یہ لوگ عموماً خانہ بدوش اور بعض آبادیوں میں مستقل مکانوں اور بعض جگہ مستقل کاروبار کے بھی مالک ملتے ہیں لیکن کام اور دماغی ساخت کے اکثر اعتبارات نہایت درجہ متحد اور برادری کا رشتہ مضبوط ملتا ہے اس لیے کہہ سکتے ہیں کہ کنجر بیوی کی

پیدائش نہایت درجہ تنگ وتاریک اور بے قاعدہ و بے قانون سے حالات میں ہوتی ہے۔ بے قانون سے مراد یہ ہے کہ خانہ بدوشی کے عالم اور دیہات گردی کے سلسلے سے اس کی پیدائش جنگل، لق ودق صحرا، کف دس میدان، فلک بوس پہاڑ اور ندی نالوں کے کناروں پر بھی ہوتی ہے اور آبادیوں میں نہایت درجہ تنگ وتاریک مکان، جھونپڑے، کھنڈر اور پختہ مکان میں بھی ہو سکتی ہے اور ہوتی ہے۔

پیدائش کی تقریب یا خوشی کا اظہار اگر حالات موافق ہوئے تو محلے کے چند برادری کے مردوں اور عورتوں کی اچھل کود قسم کی محفل، رقص وسرود سے ہوتا ہے اور جو سفر یا جنگل میں یہ شاعرانہ حادثہ واقع ہو جائے تو پھر اس کی پیدائش کی خوشی صرف ماں کی مسکراہٹ اور باپ کی شدید ہمدردی اور فکر مندی سے ہوتی ہے، یعنی جنگل اور سفر کی پیدائش میں ماں تو صرف اس کی پیدائش سے سفری شدائد اور تکالیف کو چند لمحوں کے لیے یکسر بھول کر اس کو گلے لگانے اور پیار میں مصروف ہو جاتی ہے اور باپ مردانہ عقل کی تیزی کے ہاتھوں زچہ اور بچہ کو سفری حوادث اور مشکلات سے بچانے کی فکر میں مبتلا۔

لیکن میرے خیال میں چونکہ ان لوگوں کی زندگی کو سائنس کی مشینی خرافات کے عوض فطرت کی سادگی اور موافقت زیادہ حاصل ہوتی ہے مثلاً ان کی غذائیں مصالحوں کی کثرت سے زیادہ پاک ہوتی ہے۔ اس لیے غذائی دھاتیں خالص مقدار میں انہی لوگوں کو حاصل ہوتی ہیں جو شہری اور علمی زندگی سے زیادہ دور ہیں۔ اسی طرح کھلی ہوا اور چشموں کے پاکیزہ پانی کی سنہری اور روپہلی دھاتیں اور نمکین اجزا انہی کو کافی مقدار میں ملتے ہیں اس لیے ان کی جسمی ساخت میں مضبوطی اور حسن فطرت بھی اس حد تک نمایاں ہوتا ہے کہ بعض کنجر عورتیں اور خود کنجر مرد اس قدر حسین اور رعب والے ہوتے ہیں کہ دیکھیے اور متاثر ہو جائیے۔ لہٰذا دیہات اور کوہ وصحرا میں اس کی پیدائش کے وقت اگر حالات مناسب ہوئے تو قبیلے کی ساتھی عورتوں اور مردوں نے اپنے ساتھ کے ڈھول اور خاص قسم کے چھوٹے باجے بجا کر اور اچھل کود قسم کے ناچ سے اس کی پیدائش کی خوشی کا اظہار کر دیا ورنہ زچہ جانے اور بچہ۔

خانہ بدوش اور مفلس زندگی کے ہاتھوں یہ سائنٹفک ادویہ اور اعلیٰ غذائی اجزاء سے محروم رہ کر صرف ماں کے دودھ پر پلتی ہے اور بچپن سے عنفوانِ شباب تک سینکڑوں خطرات اور امراض

سے گزر کر یوں جوان ہو جاتی ہے کہ بعض حالات میں تو قاف کی پری بھی دیکھے تو شرمائے۔ اسی طرح اپنے ماں باپ کی بے ہنر اور مفلس زندگی کے ہاتھوں یہ اچھے لباس، عمدہ غذا اور اعلیٰ تعلیم و تربیت سے یکسر محروم رہ کر اپنی برادری کے کسی فرد سے بیاہ دی جاتی ہے۔ اس کی شادی کی رسوم واصول اور مذہبی ضوابط اتنے ہی تاریک ہوتے ہیں جتنا کہ جرائم پیشہ اور اُجڈ انسانوں میں قیاس کیے جاسکتے ہیں۔ پھر بھی برادری کے محترم چودھری اور سردار اس میں شرکت کرتے ہیں اور بارات بھی حسب حیثیت شاندار ہوتی ہے، جس میں سرِ راہ برادری کے محترم سرداروں، چودھریوں اور خسر تک کی واہی تباہی انداز کی اچھل کود اور بھوت پریت سے ملی جلی آواز کے گانے خاص ہوتے ہیں۔ ان میں سے جو گھرانے شہروں میں آباد ہیں ان میں سے بعض کی شادیوں کے سجاؤ اور ٹھاٹھ پر تو شہر کے اچھے اچھے داروغے، ہیڈ صاحبان اور محلے کے پیش کار صاحبان بھی شرکت پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح شادی کا کھانے پکانے کے لیے باورچی کا کام برادری ہی کے لوگ انجام دیتے ہیں جن میں دونوں طرف کے ساس سسر بھی محو و مست رہتے ہیں اور اگر باراتیوں کو گانے کا شوق چرااٹھے تو کم سے کم ایک رات تو محلے کے لوگوں کی نیند حرام کر کے چھوڑتے ہیں اور ان حالات میں یہ امکانی حد تک کا جہیز دے کر رخصت کر دی جاتی ہے۔

کنجر بیوی شادی سے کچھ قبل اور شادی سے پانچ سال بعد تک دوسری آبادیوں میں ڈٹ کر کام کرتی ہے اور خاصا خطرہ بھی بنی رہتی ہے۔ اس کی چال ڈھال اور گفتگو میں غضب کی بجلی اور کڑک و چمک ہوتی ہے۔ چالاکی، مکاری، عیاری، مکر، دغا، فریب، جھوٹ، مطلب براری اور گھروں میں گھس کر اپنا مطلب حاصل کر لینے کی بے باکی میں شاید ہی کوئی بیوی اس کا مقابلہ کر سکتی ہو کہ یہ خواص اس کے فطری کمالات ہیں اور ذریعۂ معاش۔

اب جس طرح انسان جماعتوں اور طبقوں میں تقسیم ہے ٹھیک اسی طرح علاحدہ علاحدہ ذوق و رغبت اور خیال وعقیدے کے انسان بھی ہوا کرتے ہیں جن میں بازاری ذوق، پست مزاج، پست اخلاق اور آوارہ زندگی کے خوگر انسان بھی ہیں عام اس سے کہ یہ دولت کے حساب سے رئیس ہی کیوں نہ ہوں لیکن عقل بلند اور ذوق شائستہ اور چیز ہے اور دولت وعہدہ اور۔

اس لیے کنجر بیوی چونکہ یکسر بے ہنر اور پست ذہنیت کی عورت ہوتی ہے اس لیے ان میں

کی بعض شریفانہ حجابات و آداب عزت سے بھی دور ہوتی ہیں اس لیے وہ عہد شباب و بیخودی کی بے حجابانہ آرائشوں سے "بازاریوں" کی آرزو بن کران میں سے بعض کی بیوی اور گھر بار کی مالک بھی بن جاتی ہیں اور اپنی پست و سفلی حرکات سے بعض گھرانوں اور بعض یکسر بازاری فطرت کے مردوں کی تباہی کا باعث۔ مگر کنجر بیوی سے عشق و محبت کرنے والے مرد وہی ہو سکتے ہیں جو شریف گھرانوں میں پیدا ہو کر مزاج و دماغ کے کنجر ہی ہوتے ہیں کیونکہ صحیح ہے کہ اعلیٰ نسل اور اعلیٰ اخلاق کا انسان کسی ادنیٰ اخلاق اور ادنیٰ نسل کی عورت کی موانست قبول کرے بجز اس کے کہ اس کے فطری اجزا میں پستی قبول کرنے کی صلاحیت ضرور ہوتی ہے اور اسی لیے محترم و معزز تاریخ نگاروں نے ان بلند گھرانوں کو بلند ہونے سے انکار کر دیا جن میں ایسی عورتوں کو پایا ہے۔

اس بیوی کا عرفی پیشہ چار پائیوں کے بان بنانا اور فروخت کرنا ہے لیکن بعض جگہ یہ دوسری ضرورتوں کے لیے رسّی بھی تیار کرتی ہے اور اس کے کافی مقدار میں فروخت کرنے کے لیے اور خریداروں کو مائل کرنے کے لیے یہ مختلف قسم کے جملوں اور فقروں سے کام لیتی ہے اور لباس کی بیشتر آرائش اور بے حجابی سے بھی اس کی غرض خریداروں کا لبھانا ہوتا ہے، مگر بلند خیالات و بلند مذاق لوگ اس سے سوا حسن کو بھی اپنی خاندانی وجاہت اور آبرو مندانہ خودداری کے سامنے ٹھکرا دیتے ہیں۔ یہ بعض خریداروں کا بازاری رنگِ مذاق دیکھ کر ان سے سرِ بازار نہایت پست اور بازاری ناز و نخرے اور غمزے و کنایہ سے بھی کام لیتی ہے۔ دید کے قابل وہ بازاری مرد ہوتے ہیں جو کنجر بیوی کے بے تکلف مذاق پر فخر کرتے ہیں اور اپنے اشاق اور گھسیٹا پرشاد قسم کے دوستوں سے اس کا تذکرہ فخریہ کرتے ہیں۔

بان اور رسّی فروخت کرتے وقت اس کی زبان قینچی کی طرح چلتی ہے اور خریدار کے سوالوں کے بڑی تیزی سے جوابات دیتی جاتی ہے۔ نفسیاتی اعتبار سے اس کی چٹاخ پٹاخ قسم کی گفتگو ہی خریدار کو اُلّو بناتی ہے۔ اسی طرح یہ گلی کوچوں اور سڑکوں پر گھومتے ہوئے اپنے جسم کی بعض عریانیوں اور مصنوعی حرکات سے بھی کام لیتی ہے جن پر اس کو اعتماد ہوتا ہے کہ مرد میری ان حرکات سے ضرور متوجہ ہوگا اور بدقسمتی یا خوش اتفاقی سے یہ حرکات اکثر عورتوں کی مشترک فطرت ہے جس کو ہوشمند مرد نہایت حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں اور بازاری مرد شوق سے۔ معاشی یا

روزی کمانی کے معاملہ میں یہ اپنے شوہر کی قوتِ بازو بلکہ بعض حیثیتوں سے اپنے شوہر کی سرپرست ہوتی ہے۔ غضب کی محنتی، جفاکش، لگاتار کام کرنے والی، بے باک، بے حیا، بے حجاب، بے جھجک، بے دھڑک، بے پروا اور جوانی میں کہیں کہیں بے پناہ البتہ اس کی مالی اور معاشی حالت بے حد قابلِ رحم ہوتی ہے اور بے حد مفلس اور اس کی اسی مالی ابتری اور ظاہری بے چارگی اور مصیبت زدگی سے متاثر ہو کر امام الشعرا حضرت میر تقی میر نے یہ شعر کہا ہے کہ:

میر اس طرح گھر کو آتے ہیں
جیسے کنجر کہیں کو جاتے ہیں

یہ بان اور رسّی کی فروخت کے سلسلہ سے پردہ نشین گھروں میں بھی بے دھڑک اور بے بلائے بھی گھس جاتی ہے اور اپنی بازاری بے باکی اور تیز تر گفتگو اور ترشے ترشائے اور مخصوص جملوں اور فقروں سے آن کی آن میں عورتوں کو بان اور رسّی وغیرہ فروخت کر کے رفو چکر ہو جاتی ہے۔ بعض گھروں میں اس طرح عورتوں کے سامنے بیٹھ جاتی ہے گویا اسی گھرانے کی قدیم ملازمہ ہے اور ہر عورت کو حضور سرکار کہہ کر کبھی کوئی کپڑا مانگ لیتی ہے اور کبھی روٹی، روپیہ۔ ایسے گھروں میں یہ بعض فرضی اور بعض اصلی قصے اور شہر میں پھیلی ہوئی افواہ بھی سناتی ہے۔ غرض ہر طریقہ سے اپنی روزی کمانے میں مستعد رہتی ہے۔

غربت، افلاس، تنگ دستی، مصائب، مشکلات، وحشت، گھبراہٹ، شدید مشقت اور شبانہ روز کی فکرمندی سے چونکہ جسم و اعضا پر کی چربی پگھلتی رہتی ہے اس لیے اولاد کے معاملے اور اولاد کی کثرت کے اچھا خاصا جرمنی کا کارخانہ یا مشین ہوتی ہے، مگر غضب یہ ہے کہ زچگی کے دو چار دن ہی گزار کر پھر شدید محنت و مشقت اور روزی کمانے میں اسی برق رفتاری سے کام لینے لگتی ہے جس طرح کہ عنفوانِ شباب میں اس کا فطری خاصا تھا۔

جرائم کے سلسلے سے بھی یہ اپنے شوہر کی ''خوں ریز رفیقۂ حیات'' ثابت ہو چکی ہے اور بعض داروغہ صاحبان نے گرفتاری کے سلسلہ سے اس کے ہاتھوں اذیت اور ذلت بھی برداشت کی ہے۔ یہ وقت پڑنے پر شریفوں کے گھرانوں کی آوارہ خیال لڑکی کے اغوا سے لے کر نقب، ڈاکے، چوری اور شب کے وقت چوری والے گھر میں کود جانے سے بھی نہیں چوکتی۔ سادہ معمولی اور

روزمرہ کی چوری میں تیرے میرے گھر سے جو ہاتھ لگے وہ لے بھاگنے سے نہیں چوکتی۔

پولیس کے ہاتھوں گرفتار ہو جانے پر ہر شدید سزا پر اقبالِ جرم سے گریز کرتی ہے اور پولیس کے حکام کو بعض جگہ ایسا فریب بھی دے دیتی ہے کہ ان کا سارا ''پولیس پن'' دھرا رہ جاتا ہے۔ شوہر کے گرفتار ہونے پر از عدالت و کوتوالی تا جیل اس کی ''وکیل سرکار'' بنی رہتی ہے اور بچوں کی خبرگیری سے بھی غافل نہیں رہتی۔ اگر خود سزا پا جائے تو کافی عالی ہمتی سے اس کو برداشت کرتی ہے اور خاص بات یہ ہے کہ سزا کے بعد بھی جرم سے باز نہیں رہتی جس کا سبب فطری خواص کا وہ اثر ہے جس کو میں اوپر بیان کر چکا۔

آخری مصیبت یہ ہے کہ اتنے تمام حوادث و مشکلات سے گزر کر بھی اس کی گرہستی کافی حد تک مکمل ہوتی ہے اور اولاد کے لیے برتن جہیز اور اتنا روپیہ نکل ہی آتا ہے کہ اولاد برادری کے قواعد کے موافق بیاہ دی جائے اور اس کامیابی پر ملّا رموزی اور ان کی چاروں انگریزی داں بیویاں اپنی فضول خرچ اور غیر منتظم زندگی سے کنجر بیوی کے سامنے شرماتی رہیں۔

بدووانہ اور خانہ بدوش زندگی کے اثرات سے یہ چانٹا مار دینے سے لے کر تلوار، چھری اور بندوق تک سے نہیں چوکتی ہے اس لیے گرفتاری کے وقت پولیس والے ہوشیار رہیں۔

دراز قد، مضبوط جسم، گوری زیادہ کالی کم، آہو چشم، برق رفتار، گولہ گفتار، مکار، عیار، بے وفا، دلیر، باہمت، خوش پوشاک، بدغذا، عمر 80 تا100۔

◆◆◆

دایہ بیوی

یہ بیوی، بیوی ہوتے ہی شوہر ہو جاتی ہے یعنی دایہ کی خدمت چونکہ مرد سے متعلق نہیں اس لیے یہ شادی کے بعد ہی سے کام شروع کر دیتی ہے اس لیے اسی کا کام اور اسی کا نام مشہور ہو جاتا ہے اور شوہر صاحب بیٹھے اس کی کمائی کھاتے ہیں اور دندناتے ہیں۔

دایہ کا کام اپنی طبی اور فطری نزاکت کے لحاظ سے اس قابل تھا کہ اس کو اعلیٰ تعلیم یافتہ اور نازک احساس کی عورتیں اختیار کرتیں، مگر ہندستان کے نرالے باوا آدم کی نرالی اولاد کی ہر حرکت چونکہ نرالی ہے اس لیے شروع ہی سے یہ کام پست اور جاہل طبقات کی عورتوں کے ہاتھوں میں چلا آ رہا ہے اور پست بھی اتنے کہ بعض اوقات روزی اور روٹی تک کی محتاجی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

اس عورت کے مرد بے حد معمولی پیشوں کو اختیار کرنے والے ہوتے ہیں، اس لیے ہر آن شدید افلاس تنگ دستی، عسرت اور شدید تکالیف سے دوچار رہتے ہیں، اس لیے دایہ بیوی کی پیدائش کے وقت اپنی حیثیت کے موافق دھوم دھام ہوتی بھی ہے اور نہیں بھی ہوتی یعنی اگر عقیقے میں ڈھول بجا تو ولیمہ میں غائب اور اگر نکاح میں باجہ بج گیا تو رخصتی میں غائب۔ اسی طرح اس کی پرورش تنگ و تاریک گلی کوچوں کی تنگ و تاریک کوٹھریوں اور قارون کے بے چھت ایسی قبر سے مشابہ دالانوں میں ہوتی ہے، اس لیے یہ نہ صورت نہ سیرت بلکہ زیادہ مقدار میں کالی اور کم مقدار

میں نیم سفید، کہیں چیچک سے چہرہ مصالحہ کی سل اور کہیں ناک اونچی تو کان چھوٹے، نہ قسم اول کے نرم و گرم کپڑے میسر نہ درجہ اوسط کا بستر۔ دو رسیوں کے کپڑے والے جھولے میں پڑی بچپن گزارتی ہے اور گندہ کوٹھری کی دھواں دھار قسم کی فضا میں سسک سسک کر پاؤں چلتی ہے۔ دنیا جہان کی بیماریوں کا شکار اور بھونڈی ماں کے بم کے گولے کی طرح گھونسے کھا کر روٹی چکی کا کام سیکھتی ہے اور پھٹے پرانے کپڑوں میں جوانی کا حسن پاتی ہے۔

بارہ تیرہ برس کی عمر سے دایہ کا کام سیکھتی ہے، سووہ بھی اگر ماں زندہ ہے تو اس سے ورنہ خالہ چچی کی غلامی کر کے۔ اس کی تعلیم کا نصاب صرف ماں یا خالہ کی زبانی گفتگو ہوتی ہے یا بے تصویر کے چند علامات ونشانات کو ذہن نشین کیے رہنے کی ہدایات۔ اس کا یہ مطلب ہے کہ جو بات جب تک یاد رہی رہی ورنہ خدا حافظ۔ برادری کے دستور کے موافق جب اور جس عمر میں والدین نے چاہا منگنی کردی اور جس کس کے ساتھ چاہا کردی۔ عمر، عشق ومحبت اور استعداد دماغی کا جب اچھے اچھوں میں انتظام اور تلاش نہیں تو اس غریب کو یہ نعمتیں کہاں سے حاصل ہوں اس لیے اس کو عشق وانتخابِ شوہر اس وقت ہوش آتا ہے جب بقلم خود دو ڈھائی بچوں کی والدہ محترمہ ہو جاتی ہیں اسی طرح اس کی شادی پر کچھ زیادہ خرچ نہیں آتا بلکہ قدیم اور تاریک تر دستور کے موافق دو ڈھائی رسمیں ہو گئیں، برادری کے ایک سے لے کر ڈھائی تین سو افراد کی شرکت اور اگر کہیں قسمت سے قصبے یا گاؤں میں ہوئی تو دس بارہ باراتی اور پندرہ بیس روپیہ کا خرچ البتہ جہیز سے زیادہ برادری کا کھانا کیا جاتا ہے ولیمہ کی ضیافت بے حد ضروری چیز ہے جس کے بغیر شادی کا ہونا محال اور لڑکی کا بیاہا جانا حرام۔

جہیز میں موٹے موٹے زیورات جس کے وزن سے نازک عورتوں کے ہاتھ پاؤں ٹوٹ جائیں اور فیشنی عورتیں مارے شرم کے کھانا نہ کھائیں، اسی طرح پیتل تانبے کے دس بارہ برتن اور تین چار ٹوکریوں کے ساتھ گیہوں صاف کرنے کا بانس کا سوپڑا، ایک ٹین کی چھلنی اور تمام عمر کے لیے صرف ایک جوڑ شادی کا جوتا۔

بارات کا یہ حال کہ اگر بے فرش کے گلی کوچے میں براتیوں کو بٹھا دیا تو بیٹھ گئے اور اگر سڑک کنارے روک دیا تو رک گئے۔ نہ بارات کے لیے فرش کی ضرورت نہ شامیانہ کی حاجت۔ اسی

طرح نہ بارات میں ڈپٹی کلکٹر نہ تعلیمات کے انسپکٹر، نہ آپس میں فرق مراتب نہ گفتگو میں ادب و تہذیب۔ بیٹے باپ کے سامنے ماں کی سیدھی بک دیں اور باپ تو بہر حال باپ ہی ہوتے ہیں۔ ایک ہی حقہ سے باپ بھی لطف اندوز اور اسی حقہ سے بیٹے بھی مست و مخمور۔ اسی طرح ولیمہ کے کھانے کے لیے نہ واجد علی شاہی باورچی کی ضرورت نہ مرغ و تنجن کی فکر و پروا۔ چاول، دال اور ڈیڑھ ڈیڑھ چھٹانک کی نیم پختہ پوریاں اور خود باراتی باورچی۔ بعض اوقات ولیمہ کا کھانا پکانے میں سمدھی صاحب بھی شریک اور سمدھن صاحبہ بھی مستعد۔ ایک اس قسم کا باجہ جس کے تال اور سُر اور بے ڈھنگی آواز سے بھلے مانس کو رونا تو آ جائے مگر لطف نہ آئے اس طرح بجتا رہتا ہے کہ نصف باراتی سوتے رہیں اور یہ بجتا رہے۔ البتہ بارات کا حشم و خدم، شان و شوکت اور اثر و اظہار اس وقت ہوتا ہے جب باراتیوں میں شراب کا دور چلتا ہے۔ اس موقع پر باراتیوں میں شدید قسم کی بے ہنگم اچھل کود شروع ہو جاتی ہے جس کو یہ مظلوم ناچ کہتے ہیں اور سمجھتے ہیں۔

رخصتی کے وقت دلہن کی ڈولی کے ساتھ محلے کے باہر پورا کنبہ دھاڑیں مار مار کر روتا ہوا نکل آتا ہے اور بس۔ اس طرح اس کی رخصتی ہوتی ہے اور سسرال جانے کے بعد اگر میکے آنا ہوا تو آ گئے ورنہ سسرال ہی میں کفن اور سسرال ہی میں دفن۔ بظاہر حالات اس کی زندگی اس درجہ کم مایہ اور بے اثر سی معلوم ہوتی ہے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس کی خدمت یا اس کا ہنر بے حد و بے اندازہ مفید اور قیمتی ہے کیونکہ اس کی دماغی قابلیت ہی سے بیک وقت دو انسانوں کی زندگی موت کے خطرہ سے باہر آتی ہے۔ یہ عورت زچہ اور بچہ کی قیمتی جانوں کی سب سے پہلی محافظ ہوتی ہے اور زچگی کے بعض ایسے اصول و قواعد کی ماہر کہ بغیر اس کی امداد کے زچہ اور بچہ خطرہ سے باہر نہیں آ سکتے۔ اگر چہ پیدائش ایک خالص فطری و قدرتی کام ہے پھر بھی جانور اور انسان میں عقل و مزاج کا جو فرق ہے اس کے اثر سے بغیر دایہ کی امداد کے پیدائش کا کام تکلیف اور خطرہ سے خالی نہیں اسی لیے دایہ نہ فقط پیدائش کے اہم قاعدے جانتی ہے بلکہ زچہ اور بچہ کی چند موقع کی غذاؤں اور دواؤں سے بہترین واقفیت رکھتی ہے۔ اس لیے اس کا وجود ہر انسانی گھرانے کے لیے بے حد قیمتی اور ضروری ہے، لیکن افسوس کہ ہندستان میں دایہ کی جو بے قدری ہے اس کے اسباب یہ ہیں:

1۔ خود ہندستانی عورت مرد اعلیٰ دماغ اور اعلیٰ تعلیم اور ہنرمندی سے دور ہیں اور کسی ہنر کی قدر

بغیر خود ہنر مند ہوئے سمجھی ہی نہیں جاتی۔

2۔ زچگی کا تعلق عورت سے اور عورتیں بے تعلیم و بے ہنر ہیں اس لیے دایہ کی صحیح قدر و عزت نہیں کی جاتی۔

3۔ خود دایہ عام طور پر غریب گھرانوں اور تیسرے درجے کے طبقے کی پیداوار ہوتی ہے اس لیے اس کی گفتگو، لباس، طریق معاشرت اور دماغی حیثیت میں خود کافی پستی ہوتی ہے اس لیے اس سے اونچے گھرانے اس کے ساتھ اسی کی حیثیت کا سلوک کرتے ہیں حالانکہ اس کی خدمات کا سلسلہ تقریباً تین ساڑھے تین ماہ اس طرح رہتا ہے کہ وہ پیدائش سے دو ماہ پیشتر سے زچہ کی دیکھ بھال اور فنی مشوروں کو شروع کر دیتی ہے اور پیدائش سے چالیس دن بعد تک یہ زچہ اور بچہ کی بے حد قیمتی خدمات انجام دیتی ہے بلکہ زرچہ کا گھرانا جتنا غریب ہوتا ہے اتنی ہی گندہ اور ذلیل خدمات تک غریب دایہ ہی کو انجام دینا پڑتا ہے۔

لیکن محض دایہ کی غربت اور غیر تعلیم یافتہ ہونے کی وجہ سے بعض دولت مند اور رئیس گھرانوں میں اس کے ساتھ نہایت فرعونیت اور کمتر درجہ کا سلوک کیا جاتا ہے اور بے حد قلیل معاوضہ دیا جاتا ہے۔ اس کا قدرتی اثر یہ ہوتا ہے کہ ایسی دایہ امیر اور رئیس گھرانوں کی اس اخلاقی اور مالی بدسلوکی سے متاثر ہو کر غریبوں کے گھروں میں بیٹھ کر ایسے امیروں اور رئیسوں کے عورت مرد اور ان کے عیبوں کا خوب خوب بھانڈا پھوڑتی ہے اور غریبوں کو ایسے رئیسوں کے عیوب معلوم کر کے ان سے سینہ تان کر مقابلہ کرنے کی ہمت ہوتی ہے۔

عموماً دایہ کی خدمات کا کوئی مقررہ معاوضہ نہیں ہوتا بلکہ تخمینی قیمت رسمی طور پر ''حق'' کے نام سے ادا کی جاتی ہے اور لفظ ''حق دستور'' کی اصطلاح سے دایہ بچے کے ماں باپ، دادا، دادی، نانا نانی، چچا چچی اور پھوپھا پھوپھی سے جھگڑ جھگڑ کر یا دعائیں دے دے کر یا مبارکباد کے بے شمار الفاظ استعمال کر کے کچھ رقم بنام ''انعام'' یا حق طلب کرتی ہے جو کافی تاخیر اور مشکل سے وصول ہوتی ہے۔ غریبوں میں چونکہ عقلی اور فطری زندگی کافی ہے اس لیے دایہ کے حق کو خود اپنے ہاتھوں سے ادا کرنا مبارک شگون سمجھا جاتا ہے اس لیے دایہ حق طلب کرنے کے لیے زچہ اور بچے کے تمام بزرگوں تک آزادی سے خود جاتی ہے اور جو چاہتی ہے ان سے کہتی ہے، مگر امیروں میں چونکہ

غیر عقلی، نقلی، مصنوعی اور فرعونیت کی زندگی کافی ہے اس لیے ایسے گھرانوں میں دایہ کی نہ کوئی وقعت نہ قیمت۔ یہ اہم سے اہم خدمات کے وقت تو زچہ کے باوا کے سر تک پر سوار ہو سکتی ہے لیکن پیدائش کے بعد یہ زچہ کے کمرہ میں بھی مشکل سے ٹھہر سکتی ہے البتہ دایہ کی عظیم الشان خدمات کا سب سے بلند، واجبی اور صحیح مرتبہ بڑھایا ہے اسلام اور مبلغ اسلام یعنی رسول اللہ ﷺ اور حضور اقدس کے جلیل القدر خاندان نے جیسا کہ مسلمانوں میں ''قصہ حلیمہ دائی'' کی گھر گھر عزت و مقبولیت سے ثابت ہے انتہا یہ ہے کہ پورے اسی کروڑ مسلمانوں میں سے ایک مسلمان نہیں جو حضور کی دایہ حضرت بی بی حلیمہ کا نام نامی پورے ادب سے نہ لیتا ہو۔

حضرت بی بی حلیمہ رضی اللہ عنہا رسول اللہ ﷺ کی وہ دایہ ہیں جنھوں نے حضور اقدس کی پرورش میں بھی کافی حصہ لیا اور خود حضور اقدس کو بی بی حلیمہ رضی اللہ عنہا سے ماں کی سی محبت تھی اور حضور اقدس کو اپنی دایہ کی عظمت و توقیر کا بے حد لحاظ تھا اور یہ حضور اقدس ﷺ کے عزت کرنے کا اثر ہے کہ مسلمانوں نے حضور انور ﷺ کی دایہ کی مکمل سوانح عمری لکھی جس میں ہندستان کا وہ سوانح نگار بے حد خوش نصیب تھا جس نے ''حلیمہ دائی'' کے نام سے اس محترم دایہ کے حالات کو اردو میں بصورتِ نظم لکھا۔ خوش قسمت اس وجہ سے کہ اول تو اسلام کی اتنی محترم شخصیت اور بے حد مقدس عورت کے حالات نظم کیے دوسرے اس لیے خوش قسمت تھا کہ اس کی یہ نظم اس کافی مقدار میں مسلمانوں میں مقبول ہوئی کہ نہ جناب شبلی نعمانی کی کتاب مقبول ہو سکی نہ جناب سرسید کی۔

ہندستان میں ''قصہ حلیمہ دائی'' بہت ابتدائی نظم ہے اس لیے اس کے اصل اور پہلے مصنف کا مجھے علم نہیں کیونکہ اس نظم کو کئی مطابع نے کئی ہزار بار شائع کیا ہے اور مصنف کا نام غائب کر دیا۔ البتہ نظم کی شعریت بتاتی ہے کہ اس کا کہنے والا کوئی بہت ہی قدیم وضع کا غریب مسلمان مولوی تھا اور بس۔ چنانچہ اس نظم کے چند اشعار یہ ہیں جو آج 1941 میں بھی تمام غریب گھرانوں کی بچیوں اور عورتوں کو پڑھائے اور سنائے جاتے ہیں یہاں تک کہ خود میری بھانجی ملکہ فیروزہ کو اس نظم کے متعدد اشعار حفظ یاد ہیں جو یہ ہیں:

ایک عاشق تھی حلیمہ دائی ۔۔۔ جس نے گھر بیٹھے یہ دولت پائی
وہ کچھ اس رمز سے آگاہ نہ تھی ۔۔۔ اس کی قسمت میں یہ دولت تھی لکھی

یعنی اس شاہ کو لائی گھر میں | نوراللہ کو لائی گھر میں
واہ کیا طالع بیدار ملے | جس کو کونین کے سردار ملے
نور سے کیوں نہ ہو معمور وہ گھر | جلوہ افزا ہو جہاں پیغمبر
کس طرح گھر نہ وہ نورانی | جس کی جبریل کرے نگرانی
آستانہ ہوا وہ شام و سحر | سجدہ گاہ ملک و جن و بشر
درو دیوار سے آتی تھی صدا | کہ حلیمہ پہ ہوا فضل خدا
شکر کرتی تھی خدا کا پیہم | کہ نہ تھے مستحق اس فضل کے ہم
حق نے بخشی مجھے دولت یہ عجیب | مجھ حلیمہ کے کہاں تھے یہ نصیب
دودھ اس گل کو پلاتی تھی وہ | گل سے پھولے نہ سماتی تھی وہ
کبھی مکھڑے کی بلائیں لیتی | صدقے ہو ہو کے دعائیں دیتی
کبھی صورت کا تماشہ کرتی | ٹکٹکی باندھ کے دیکھا کرتی
چومتی تھی کبھی پیشانی کو | پانی پیتی تھی قدم دھو دھو کر

وغیرہ۔

اس سلسلہ سے میں نے اب تک ہندستان کی جس دایہ کا خاکہ پیش کیا وہ بیشتر غریب طبقے کی ہندو دایہ تھی، لیکن کہیں کہیں یہ کام مسلمان عورتیں بھی کرتی ہیں اور دوسری قوموں کی عورتیں بھی، لیکن ہندستان میں چونکہ ہندو قوم ہی کی کثرت ہے لہٰذا اکثر پیشوں میں انہی کی زیادتی ہے۔

مسلمان عورتوں میں بھی یہ کام غریب گھرانے اور غریب حالات کی عورتوں میں ہے اس لیے ان کے عام حالات بھی مذکورہ بالا قسم کی دایہ سے زیادہ مشابہ ہوتے ہیں بجز چند چیزوں کے مثلاً:

مسلمان دایہ عموماً پردہ میں رہتی ہے اس لیے یا تو یہ برقع استعمال کرتی ہے یا پھر ڈولی یا تانگہ وغیرہ۔

اسی طرح اپنے گھرانے کی صفائی اور مزاجی کیفیات کے اثر سے یہ ہندو دایہ سے خاصا فرق لیے ہوئے ہوتی ہے اور اسی لیے مسلمان گھرانوں میں اس کے ساتھ قدرے قلیل اچھا برتاؤ

کیا جاتا ہے، لیکن فن اور ہنر کے اعتبار سے یہ ہندو دایہ سے نہ نیچی ہوتی نہ اونچی۔

البتہ انگریزوں کے ہندستان میں رہنے کی وجہ سے بغیر سوچے سمجھے ہندستانیوں نے ان کی زندگی کی جونقل کی ہے اس میں ''نئے فیشن کی دایہ'' بھی پیدا ہو چکی ہے۔ اس دایہ میں اور ہندستان کی دایہ میں زبردست فرق بتایا جاتا ہے لیکن یہ فرق صرف وضع وقطع، لباس، گفتگو، تعلیم، سند یافتہ اور اجرت تک ہے لیکن فن کا جہاں تک تعلق ہے ان سند یافتہ دائیوں نے کوئی امتیاز حاصل نہیں کیا ہے بلکہ ہندستان کے قدیم تہذیب والے گھرانوں کے حق میں یہ ''فینسی دایہ'' ایک طرح کا عذاب بن گئی ہیں:

1۔ مثلاً ڈاکٹر کے نخرہ سے ان کا تشریف لانا۔
2۔ چھچھورپن کی وجہ سے غریب گھرانوں کی زندگی سے ان کا نفرت کرنا۔
3۔ زچہ کے گھر کی عورتوں کو جاہل سمجھ کر ان کے ساتھ اپنی نیم انگریزیت لیے ہوئے تہذیب کو استعمال کرنا۔
4۔ بھاری معاوضے اور کم کام کا معاملہ کرنا۔
5۔ خود درجہ سوم کی ہندستانی ہو کر میم صاحب کی سی حرکات کا اختیار کرنا۔

یہ وہ اسباب ہیں جن کی بنا پر یہ ''تعلیم یافتہ دایہ'' ابھی ہندستانی گھرانوں میں جگہ حاصل نہیں کر سکی ہیں، بجز اس کے چند انگریزوں کی نقل کرنے والے غیر محقق اور نقال گھرانوں میں ان کی آمد ورفت شروع ہوئی ہے، اس لیے ان کے مستقبل کے لیے کوئی صحیح فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ قدیم وضع کی دایہ چونکہ خالص ہندستانی زندگی کی مالک ہے اس لیے صحیح الفطرت ہندستانی گھرانوں میں اس کا وجود تا دیر رہے گا۔ دایہ کے فن میں تعلیم سے زیادہ زکاوت اور ہوشمندی کی ضرورت ہے کیونکہ پیدائش کے کام غور وفکر کی قوتوں کو عمل کی قوتوں سے زیادہ دخل ہے اسی لیے قدیم اور تجربہ کار دایہ آج بھی یورپی دایہ کے کان کاٹ لیتی ہے۔ ہندستانی زندگی میں ہندستانی وضع کی دایہ کی چند آسانیاں بھی ہیں جو فینسی دایہ کے ہاں نہیں۔ مثلاً:

1۔ رات کے جس خوفناک حصہ میں اس کو طلب کیجیے یہ بغیر انگڑائی لیے ہوئے پیدل ہی ساتھ ہو جاتی ہے۔

2۔ جتنی رقم چاہو دے دو اور اوپر سے ایک آدھ گالی بھی مگر یہ ''ان سلٹ'' کا مقدمہ دائر نہیں کرتی۔

3۔ جتنی رقم چاہو رکھ لو یہ تقاضے ضرور کرتی رہے گی مگر قرقی کا وارنٹ جاری نہ کرائے گی۔

4۔ اس کے آنے پر آپ کو اپنے گھر میں نہ کرسی لگانے کی ضرورت نہ برقی پنکھا چلانے کی حاجت۔

5۔ یہ جو ہدایات دے گی وہ آپ کی ہماری ماں بہنوں کی سمجھ کے عین موافق، جو دوائیں بتائے گی وہ سب کی سمجھی بوجھی ہوئی۔

اور یہی وہ فطری آسانیاں ہیں جن کے اثر سے یہی دیسی دایہ زندہ رہے گی۔ البتہ ہوشمند ہندستانیوں میں اس کی حوصلہ افزائی اور عزت بڑھانا ہمارا وطنی اور شریفانہ فرض ہے۔

◆◆◆

ملازم بیوی

یورپ میں عقل و ہنرمندی کی ترقی نے وہاں کے عورت مرد میں آسائش کی زندگی کا جو جذبہ ابھار دیا ہے اس کا لازمہ یہ ہے کہ اب وہاں "ملازمہ" بھی تربیت یافتہ پیدا ہونے لگی ہے۔ بعض خاص گھریلو خدمات کی تعلیم کی تربیت گاہیں بن گئی ہیں جن میں "تربیت یافتہ ملازمہ" تیار کی جاتی ہے اور جس طرح ہم آپ ہندستان میں کسی اخبار کو فرمائش بھیج کر اپنے نام سے سال بھر کے لیے جاری کرا لیتے ہیں اسی طرح یورپ میں "ملازمہ کمپنی" کو آپ اطلاع دے کر ہر عمر اور ہر نمونے یا ہر ضرورت کی ملازمہ حاصل کر سکتے ہیں۔

ہندستان میں بعض یورپ زدہ ہندستانی گھرانوں میں بھی محض نمود و نمائش اظہار کر و فر یورپی آداب طعام و کلام یورپی، آرائش مکان و مکین اور بچوں کی پرورش کے لیے ایسی ملازمہ رکھی جاتی ہیں۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ہندستانی فطری مرعوبیت کے اثر سے ایسی ملازمہ ایسے ہندستانی گھرانوں کی مالکہ محسوس ہوتی ہے اور اس گھر کی ہندستانی مالکہ اس یورپی ملازمہ کی ملازمہ نظر آتی ہے۔

ہندستان میں جس گھر میں ایسی یورپی تربیت کی ملازمہ ہوتی ہے اس گھر سے ساری بستی اس لیے نفرت کرتی ہے کہ ابھی ہندستان میں 99 فیصدی گھرانے یورپی زندگی سے دور ہیں یہ تو

صرف وہ گھرانے یورپ کی زندگی پر دم دے رہے ہیں جن کے مردوں میں عقلی اور تحقیقی قابلیت کی نہیں البتہ دولت کے بل پر وہ اپنی بستی میں امیر ورئیس مشہور ہیں لیکن عوام میں ان کی بدعقلیوں، ناعاقبت اندیشیوں اور غلط کاریوں کا خوب مذاق اڑایا جاتا ہے۔ انتہا یہ ہے کہ ایسے گھرانوں کے نوکر چاکر تک عوام میں اپنے یورپ زدہ آقا اور مالکہ کے چھچھورپن اور دوسری کمزوریوں کو تفصیل وار سناتے ہیں۔

ہندستان میں ''زرخرید لونڈی غلام'' کا دستور اب نہیں، پھر بھی بعض دولت مند گھرانوں میں ایسے لونڈی غلام موجود ہیں جو اولاد در اولاد کے سلسلے سے ایک ہی خاندان کے چاکر ہو کر رہ گئے ہیں اور اب ان کی اولاد میں جو ہوشیار ہوتا ہے وہ بھی اسی خاندان کا چاکر اس لیے ہو کر رہ جاتا ہے کہ ہندستانی دولت مند جدید تعلیم و ہنرمندی سے دور ہیں اسی لیے خود ان کی اولاد کامل علوم اور بلند تر حقائق علمی سے محروم اور لہو ولعب اور آوارگی سے آراستہ ہے اس لیے کیسے ہو سکتا ہے کہ ایسے چاکروں کے آقا اپنے ملازم طبقہ کی اولاد کو تعلیم و ہنرمندی سے آراستہ کر کے انسانی دیانت و شرافت کا ثبوت دیں، اسی لیے بس ملازمہ کا بیٹا بھی ان کا عمر بھر کا غلام اور ملازمہ کی بیٹی بھی ان کی زرخرید خادمہ۔

حقیقت واقعہ یہ ہے کہ ہندستانی گھرانوں میں علوم و مذاہب کی صحیح روشنی نہ ہونے کے باعث ملازم بیوی کی اخلاقی زندگی بے حد مصائب و معائب کی زندگی ہے۔ ایسے گھرانوں میں ملازمہ کی لڑکی آقا کی جائیداد سمجھی جاتی ہے۔ وہ پیدائش کے بعد ہی سے اپنی جاہل اور ملازمہ ماں کی غلامانہ ذہنیت کا شکار ہو جاتی ہے۔ وہ جیسے جیسے ہوشیار ہوتی ہے خود کو آقا کی اولاد کا غلام پاتی ہے۔ وہ آقا کے گھر میں پیدا ہو کر بھی آقا کے بچوں کے ساتھ کھیل نہیں سکتی۔ وہ ہاتھ پاؤں میں جان آتے ہی اپنی ملازم ماں کے کاموں میں ہاتھ بٹانے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ اب تعلیم و ہنرمندی کہاں سے آئے۔ وہ صبح سے شام تک آقا اور آقا کی اولاد کی غلامی میں رہتی ہے۔ وہ آنکھ کھولتے ہی اپنی ماں کو بے چارہ، بے بس، عاجز، پابند اور جھک کر سلام کرنے اور بات بات پر آقا اور مالکہ کو دعائیں دینے کا عادی پاتی ہے اس لیے اس کے دماغ میں خودداری، انسانی شرافت نفس، بلند خیالی، اعلیٰ شائستگی اور کسب ہنر کی تمام فطری قوتیں سڑ کر رہ جاتی ہیں۔ نتیجہ یہ کہ وہ ایک ملازمہ کی

بیٹی ہوکر ایک بے ہنر ملازم ہی کی بیوی بننے پر مجبور ہوتی ہے۔

اس کے والدین چونکہ خود بے علم و بے ہنر ہوتے ہیں اور آقا بے پروا و بے درد اس لیے اس لڑکی کی شادی کا مرحلہ بھی بے حد دردناک اور لائق صد ہمدردی ہوتا ہے۔ مثلاً ملازمہ کی بیٹی کی شادی کا مسئلہ چونکہ آقا اور مالکہ کے رحم وکرم پر موقوف ہوتا ہے اس لیے ملازمہ کی لڑکی شادی کی کٹھن منازل سے گزرتی رہتی ہے مگر آقا اور مالکہ کو اس کی شادی کی پروانہیں ہوتی کیونکہ اول تو ملازمہ کا تصور ہی ایک بے چوں و چرا غلام کا تصور ہے اس لیے غلام زادی کا ڈر ہی کیا۔ دوسرے جب سے کہ ہندستانی دولت مندوں میں یورپی زندگی کی بے سوچی سمجھی نقالی شروع ہو چکی ہے اس وقت سے لڑکی کی شادی کی وہ عمر مقرر کر دی گئی ہے جو آب و ہوا کے مقامی اثرات سے یورپ میں مقرر کی گئی ہے۔

یعنی یورپ چونکہ سرد علاقہ ہے، اس لیے وہاں کی جسمیت اور ہندستان ایسے جہنم کی جسمیت میں کافی فرق ہے۔ یورپ کے قوی الجثہ مرد وعورت کے تمام قوئ دیر سے پختگی حاصل کرتے ہیں اس لیے وہاں معیارِ بلوغ وشعور 18 اور 22 برس عمر رکھا گیا ہے جو وہاں کے طبعی اور فطری اثرات کے عین موافق ہے لیکن غیر محقق ہندوستان کے دولت مندوں نے چونکہ یورپ کی ہر چیز کو بے تحقیق اختیار کیا ہے اس لیے وہاں کا معیارِ بلوغ بھی ان سادہ لوح ہندستانیوں نے اپنا لیا جیسا کہ امیروں کی اولاد کی شادی بیاہ کی عمر سے ظاہر ہے۔ لہٰذا ان کے اس غیر عقلی اور غیر فطری شادی کے معیار سے ملازمہ کی لڑکی بھی گویا بائیس برس کی عمر تک شادی کے قابل ہی نہیں ہوتی حالانکہ ہندستان کی فطرت ایک ہندستانی لڑکی کو 14 برس ہی کی عمر میں وہ سب کچھ عطا کر دیتی ہے جو اس کو شادی کے لیے چاہیے۔ پس ہندستانی آقا کی اس یورپی نقالی سے ملازمہ کی لڑکی چونکہ فطری وقت و زمانے میں شوہر کو نہیں پاتی اس لیے وہ بے شمار بلاؤں میں گھر جاتی ہے۔ خصوصاً برادری میں اس کی اخلاقی برتری کو شدید نقصان پہنچ جاتا ہے اور بستی کے لوگ ایسی لڑکیوں کو بیاہنے سے انکار کرتے ہیں جو خواہ کتنی خاندانی اور بلند اخلاق کی ہو مگر کسی امیر گھرانے کی پروردہ ہو ملازمہ۔ پس اس موقع پر مجھ کو خواہ مخواہ اسلام اور خلفائے اسلام کا وہ سلوک یاد آتا ہے جو انھوں نے اپنے زرخرید غلاموں اور ان کی معصوم اولاد کے ساتھ روا رکھا اور وہ کچھ بھی نہ تھا مگر مساوی یعنی خلفائے اسلام نے

اسلامی تعلیمات کے عین موافق اپنے خدام کی زندگی کو اپنی طرح کی زندگی قرار دیتے ہوئے ان کے اور ان کے بچوں کے لیے وہ تمام رعایتیں بحال رکھیں جو وہ خود اپنے یا اپنے بچوں کے لیے روا رکھتے تھے اور جن کی تفصیل کتب اسلامی میں کھول کھول کر بیان کردی گئی ہے، مگر خلفائے اسلام کے بعد خادم و مخدوم کا جو سلسلہ دراز آج تک ملتا ہے اس میں خود پسند و خود غرض دولت مندوں نے اپنے اپنے جذبۂ نفس کے موافق ترمیم و اضافہ سے کام لینا شروع کردیا اور انتہا یہ کہ آج اسلام ایسے خالص فطری اور عقلی مذہب کے ماننے والوں کی کتابوں تک میں خادم و مخدوم دو علاحدہ علاحدہ قسم کی مخلوق نظر آتے ہیں۔ مثلاً ملازم اور ذاتی چاکر کی خدمت گزاری کے معاوضہ سے لے کر اس کے اور آقا کے آداب و القاب اور الفاظ تک میں وہ غیر فطری اور غیر منصفانہ الفاظ اور ضابطے موجود ملتے ہیں جن کی تائید نہ مذہب کرتا ہے نہ اخلاق انسانی کی شرافت اور پچھلے خود غرض بزرگوں نے نوکر چاکر کے جو جابرانہ قاعدے وضع فرما دیے تھے یہ انہی کے غیر عقلی ہونے کا اثر ہے کہ آج چاکر آقا کے خلاف ہر بے دیانتی اور ہر بے ادبی کے لیے تیار ہے اور اسی لیے بعض بے عقل و بے شعور خاندانوں میں بدھو قسم کے آقا چالاک چاکر کے فرماں بردار بنے ہوئے ہیں اور چالاک چاکر ان کے پورے گھرانے پر حکومت کر رہے ہیں اور خاندان کے ایک رکن کی ہمت نہیں کہ ایسے چالاک چاکر کے خلاف کوئی حرکت کر سکے۔

الحاصل یہ ملازم بیوی اگر کسی ملازم ماں کی گود میں پل کر جوان ہوئی ہے تو کافی عمر گزر جانے پر یہ آقا کے کرم سے کسی بدھو چتو قسم کے گنوار کے ساتھ باندھ دی جاتی ہے عام اس سے کہ خود لڑکی کتنی ہی ذہین، ہوشیار اور لکھی پڑھی ہی کیوں نہ ہو۔ کیونکہ موجودہ دولت مند طبقہ میں ملازم اور ملازمہ کے لیے کوئی شرف و وقار مسلّم نہیں، اس لیے ایسی ملازمہ کی لڑکی کا بھی کوئی وقار نہیں جس کی وجہ سے اشرافِ شہر ایسی لڑکیوں کو بیاہنے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ اسی طرح خود آقا کو اپنی ملازمہ کی ہوشمند اور ذہین لڑکی سے کوئی صحیح اور شریفانہ ہمدردی نہیں ہوتی اس لیے اس غریب کو اعلیٰ درجہ کا شوہر ملے تو کس طرح، اس لیے بے شمار ملازم لڑکیاں ہیں جو خود نہایت ذہین اور ہنرمند ہیں، لیکن محض کسی امیر کی ملازمت کا داغ لگ جانے سے وہ آج بدعقل و بے آبرو شوہروں کی غلامی میں زندگی کے تلخ دن گزار رہی ہیں اور اپنے آقا اور بے ہوش و بے خبر مالکہ کو کوس رہی ہیں

جنھوں نے اس لڑکی کی تندرستی اور جوانی سے خاصا آرام اٹھایا مگر خود اس کے آرام کی قطعاً پروانہ کی، اس لیے اس کی شادی کسی چتو بدھو سے طے ہو جانے پر اس کے آقا صاحب معمولی سا سرمایہ عطا فرما دیتے ہیں اور اس کے ملازم و چاکر ماں باپ معمولی درجہ کے اسباب و حالات سے اس کی شادی کرتے ہیں۔ البتہ تقریبات میں محض نام و نمود کے لیے آقا اور مالکہ صاحبہ بھی شرکت فرماتی ہیں، لیکن اس غریب کے باراتیوں کے سامنے بھی آقا صاحب اور مالکہ صاحبہ اسی فرعونی و قارونی انداز سے تشریف لاتے ہیں جس طرح وہ اپنے گھر میں اس کے ساتھ رہا کرتے ہیں۔ البتہ مجھے آپ کو دکھانے کے لیے بارات اور تقریبات میں اس چاکر یا اس لڑکی سے اس طرح کے مصنوعی خلق اور پیار سے باتیں کرتے ہیں جس سے باراتی یہ سمجھیں کہ بڑے شریف آقا ہیں، مگر اب باراتی لوگ بھی اتنے بی۔اے اور ایم۔اے ہو چکے ہیں کہ وہ دولت مندوں کی ان تمام چالاکیوں کو بارات سے پہلے ہی بھانپ لیتے ہیں اور آقا کی تمام حرکات پر خاصی تحقیر کی نظر ڈالتے رہتے ہیں۔ اس قسم کی لڑکی کی بارات میں آقا کی نسبت کی کوئی بلندی نہیں ہوتی بلکہ رسوا کن اسباب و حالات ہوتے ہیں مثلاً کسی بڑے دولت مند کی ملازمہ کی لڑکی کی تقریب جس حقیر انداز سے ہوتی ہے اسی سے باراتی آقا کے برتاؤ کا انداز کر لیتے ہیں البتہ آقا کے ہاں کی ایک آدھ متوسط درجہ کی سواری، تھوڑا سا فرش اور ایک ڈیڑھ جوڑا لباس اور دو چار برتن اور بس۔ کیونکہ مصیبت یہ ہے کہ ہندستانی دماغوں میں بے ہنر دماغ فیاض ہونے کے عوض تنگ دل اور تنگ نظر ہوتے ہیں اس لیے ایسی ملازمہ کی لڑکی کی شادی میں یہ لوگ اگر لڑکی کو ایک ساڑی دے دیں تو خود یہ سمجھتے ہیں گویا خزانہ دے دیا۔ اگر لڑکی کو ایک ڈیڑھ جوڑا کپڑا دے دیں تو سمجھتے ہیں مانچسٹر اور لیور پول کے تمام پارچہ باف کارخانہ دے دیے۔ اسی طرح آقا اور مالکہ اس لڑکی کی صرف بڑی تقاریب میں شرکت فرماتے ہیں جس کو آقا کا بڑا کرم کہا جاتا ہے لیکن صرف غلاموں میں۔

بعض جگہ دستور ہے کہ گھر ہی کی ملازمہ کی لڑکی اور گھر ہی کا کوئی اول فول سا لڑکا، لہٰذا ایسے حالات میں اس بیوی کو عمر بھر نہ شوہر کا احساس ہوتا ہے نہ گرہستی کی آزادی، دلہن پن سے ہی حسب دستور آقا کے گھر کا کام کرتی رہتی ہے اور ساری عمر اسی تنگ و تاریک اور غلامانہ زندگی میں بسر کر کے خدا گنج چلی جاتی ہے۔

یہ ہندستان کے درجہ اول کے گھرانوں کی ملازمہ کی لڑکی یا ملازم بیوی تھی اس کے بعد ہندستان کے دوسرے درجہ کے گھرانوں کی ملازم عورت کی لڑکی ہوتی ہے۔اس طبقے کے گھرانوں میں جو عورتیں کام کرتی ہیں وہ نسلی یا خاندانی اعتبار سے ملازمت پیشہ عورتیں نہیں ہوتیں بلکہ یہ بیوگی اور بے روزگاری کے فاقہ کش عذاب کے ہاتھوں پیٹ بھرنے کے لیے ملازمت کرتی ہیں اور چونکہ ذاتی طور پر خود بےعلم و بے ہنر ہوتی ہیں اس لیے یہ قدرتی طور پر روٹی ترکاری پکانے، مکان صاف رکھنے، بچے کھلانے یا بازار سے سودا سلف لانے کی خدمت پر مقرر ہوتی ہیں۔اسی متوسط گھرانے کے کسی تاریک گوشہ میں نہایت بے سروسامانی کے ساتھ رہتی ہیں اور دماغ کی تاریکی کی وجہ سے دنیا کی ہر بلند حرکت سے یکسر بےخبر ہوتی ہیں۔انہی حالات میں لڑکی پرورش پاتی ہےاور جوانی کی عمر تک بے حد معمولی درجہ کے سینے پکانے کے قاعدوں سے خبردار ہو جاتی ہے۔اور بس۔

ملازمت اور بیچارگی سے اس کے اخلاق و عادات پر بھی بے حد خراب اور تباہ کن اثرات پڑتے ہیں اور بستی کی شریف آبادی میں اس کو بھی کوئی معقول شوہر نصیب نہیں ہوتا بلکہ یہ اپنے آقا کے غلط، ذلیل اور بعض تباہ کن اثرات کو معصومیت کی وجہ سے قبول کرتی ہے۔تعلیم و تربیت ندارد، مال و زر ندارد، عقل و ہوش ندارد، ہنرمندی و صنعت گری ندارد۔غرض سب کچھ ندارد ہونے کی وجہ سے شوہر صاحب بھی ندارد قسم ہی کے میسر آتے ہیں۔بے حد معمولی درجہ کے ساز و سامان سے شادی بیاہ، معمولی درجہ کا جہیز اور معمولی درجہ کی تقریبات کے ساتھ شوہر صاحب کے ساتھ کر دی جاتی ہے۔البتہ معمولی درجہ کے گھرانوں میں جب ملازمہ کی لڑکی کی شادی ہوتی ہے تو متوسط درجہ کے آقا اور مالکہ کی طرف سے بہترین سلوک کیا جاتا ہے، جس کی وجہ یہ ہے کہ متوسط طبقہ ان عذابوں سے گزرتا رہتا ہے جو انسانی عقل و شرافت کی قوتوں کو بیدار و پختہ کار بنانے کے لیے قدرت کی طرف سے مقرر کیے گئے ہیں، اس لیے اس طبقے کے مردوں اور عورتوں میں اصل فطرت سے اتنی دوری نہیں ہوتی جتنی کہ دولت مند گھرانوں میں دولت کی فراغت سے پیدا ہو جاتی ہے۔ مثلاً ایک دولت مند کے عیب کو کوئی اس لیے بیان نہیں کرتا کہ وہ دولت کے زور سے نقصان پہنچا سکتا ہے لیکن متوسط طبقے کے عیب بیان کرنے میں کسی کو خطرہ نہیں ہوتا لہٰذا متوسط طبقہ اپنے عیوب سے خبردار رہتا ہےاور ان کی اصلاح کرتا رہتا ہے۔اسی طرح متوسط طبقہ کاروباری حیثیت

سے بھی ادنیٰ درجہ کے طبقے سے قریب رہنے پر مجبور ہے اس لیے متوسط طبقے کے لوگوں میں ادنیٰ طبقے کے لوگوں کے ذوق، عقیدت اور مزاج کا انداز ہوتا رہتا ہے اور متوسط طبقہ ادنیٰ درجہ کے طبقے کے خواص سے متاثر ہوتا ہے، اس لیے ملازم بیوی کی شادی میں متوسط طبقے کے آقا و مالکہ عین وہی دلچسپی لیتے ہیں جو وہ اپنی اولاد کی تقریبات میں لے سکتے ہیں، اس لیے بسا اوقات ایسی لڑکی کی شادی خاصی دھوم دھام اور شان سے ہو جاتی ہے، ایسے گھرانے کے آقا کی تمام عورتیں اور نوجوان لڑکیاں خصوصیت سے اپنی ملازمہ کی شادی میں حصہ لیتی ہیں۔ اس کی تقاریب کا تمام کام خود کرتی ہیں، خود گادی ہیں اور خود بجاتی ہیں۔ رسوم ادا کرتی ہیں اور حق دیتی ہیں اور آخر میں رخصتی کے وقت لڑکی کی ماں کی طرح آقا کی لڑکیاں اور خود مالکہ بھی اس لڑکی کو گلے لگا کر روتی ہے جو اصل انسانیت اور لازمۂ فطرت ہے۔ اسی طرح متوسط طبقہ کا آقا اپنی ملازمہ کی شادی میں سچی ہمدردی اور واقعی خلوص سے شریک ہوتا ہے، خود متاثر ہوتا ہے اور اپنی حیثیت سے زیادہ خرچ کرتا ہے۔

اس بیوی کی باقی عمر اولاد کی کثرت کی مصیبت میں کٹتی ہے اور اسی جگہ سے یہ بعض اوقات دوبارہ ملازمت کی زندگی میں داخل ہو جاتی ہے۔

ملازم بیوی کی تیسری قسم بے حد تاریخی خطرناک اور حکیمانہ ہے۔ یعنی یہ ملازمہ وہ ہوتی ہے جو کسی گھرانے میں ملازمت کرتے کرتے مرنے کے عوض صرف بوڑھی ہو کر رہ جاتی ہے۔ پس عمر کی اس منزل میں پہنچ کر اب نہ وہ پنشن دے کر گھر سے نکالی جا سکتی نہ صحیح خدمات کی اہل رہتی ہے اس لیے اس کا کام اب تمام گھرانے پر دندنانا اور بے تک اعتراضات کرنا رہ جاتا ہے۔ اب چونکہ گھر کی نئی نسل کے حق میں یہ باپ دادا اور نانا نانی کے وقت کی ملازمہ ہوتی ہے اس لیے گھر کا ہر نرم و گرم شخص اس کے ساتھ رعایت کرنے پر مجبور ہوتا ہے اور یہ خود بھی اپنے سابقہ حقوق کی جنگ میں بے حد تیز ہوتی ہے، کیا مجال جو اس کا کوئی حق رہ جائے اور یہ گھر بھر کو چین کی نیند سونے دے بلکہ یہ گھر کے جس گوشے میں رہتی ہے اس گوشے سے آقا اور مالکہ کو بیٹھی وہ وہ سناتی رہے گی کہ آخر کار اس کو خوش رکھنے کے لیے گھر بھر کو اس کا واجب یا ناواجب حق و مطالبہ پورا کرنا ہی پڑے گا۔

اس کا دم گھر کے نوجوانوں کے لیے کبھی غنیمت اور کبھی خطرناک ہوتا ہے۔ غنیمت تو بس اتنا کہ یہ اپنی مالکہ کے دکھ درد میں برابر کی مونس اور شریک ہوتی ہے۔ جہاں مالکہ نے اپنے شوہر کے

مظالم کی داستان شروع کی کہ اس نے مالکہ کے ساتھ آنسو گرا گر کر ہاں میں ہاں ملانا شروع کیا اور مشوروں کا طول طویل سلسلہ شروع کر دیا جس سے مالکہ کا اُمڈا ہوا طوفان تھم گیا، لیکن اس کے بعد یہ نوجوان لڑکوں کی چغل خور اور نوجوان لڑکیوں کی رازدار بن کر وہ وہ غضب ڈھاتی ہے کہ خود سمجھ لیجیے۔

◆◆◆

ڈاکٹر بیوی

ہندستان میں انیسویں صدی عیسوی کی یہ نقلی پیداوار ہے جو محض یورپی قوموں کے دیکھا دیکھی پیدا کی جارہی ہے۔ اس کا کام وہی ہے جو مردوں میں حکیم ڈاکٹر کرتے ہیں اور عورتوں میں پہلے بعض بوڑھی عورتیں کرتی تھیں اور کچھ دائیاں مطلب یہ ہے کہ عورتوں کے علاج معالجے کی یہ قدرے چمکیلی صورت ہے اور بس ورنہ یہی "ڈاکٹرنی پن" ہندستان میں بوڑھی تجربہ کار عورتیں اب بھی کرتی ہیں اور کچھ دائیاں۔

ہندستان میں جو ہندستانی غیر محقق طور پر یورپ کی ہر حرکت کی نقل کو فضیلت سمجھتے ہیں ان میں سے کچھ ہندستانی وہ ہیں جنھوں نے قدیم ہندستانی طریق علاج کے مقابلے یورپی طریقِ علاج کو ہندستان میں رواج دینے میں اس حد تک کوشش فرمائی کہ خود اپنے ملکی طریقِ علاج کو خاصا ذلیل و رسوا اور بے کار کرنے میں کسر نہیں اٹھا رکھی اور ہندستان کے موافق مزاج علاج کو تباہ کردینے میں انھی ہندستانیوں کو امتیاز حاصل ہے جو اپنے دماغی ضعف سے یہ نہ سوچ سکے کہ ہر ملک کے باشندوں کے لیے وہی جڑی بوٹی مفید ہوگی جو خود انہی کے علاقے کی زمین اور آب و ہوا کے اثرات اور اسی علاقہ کے آفتابی شعاعی اثرات کو لیے ہوئے ہوں۔

ڈاکٹرنی کی پیدائش میں اس کے وارثوں کا تخیل اور جذبہ کاروباری ہوتا ہے نہ کہ قومی

خدمت کا جس کا ترجمہ یہ ہے کہ اگر لڑکی ڈاکٹرنی ہوگئی تو مالی مشکلات سے محفوظ رہے گی اور بس۔
اس کا نسلی رشتہ کسی خاص قوم کی خاص قبیلے اور فرقے سے نہیں بلکہ ہندستان کے اکثر ان گھرانوں سے اس کا تعلق ہے جنھوں نے سب سے پہلے اور سب سے زیادہ یورپی اثرات کو قبول و اختیار کیا اور ساتھ ہی آسودہ حال بھی تھے یا ہیں کیونکہ لڑکی کو ڈاکٹری پڑھانے کا خیال تو محض ڈاکٹرنی کی آمدنی دیکھ کر ہوا، مگر یہ خیال پورا نہ ہوتا اگر اس گھرانے میں ڈاکٹر کی بھاری مصارف والی تعلیم کے لیے روپیہ کافی نہ ہوتا، اس لیے اس بیوی کا خاص تعلق ایسے ہی گھرانوں تک ہے جن کے ہاں یورپ کی تقلیدی زندگی اور دولت بھی تھی یا ہے، اس لیے اس کے خواص وخصائص میں زیادہ مقدار ان اطوار کی ہوسکتی ہے جو دولت مندوں کے اطوار وخواص مانے جاتے ہیں۔

یعنی اس کی پیدائش کے وقت عقیقے اور بسم اللہ کی قسم کی تقاریب خاصی دھوم دھام اور نیم یورپی انداز کی ہوتی ہیں۔ اسی طرح اس کی پرورش میں نصف کے قریب یورپی آداب استعمال کیے جاتے ہیں مثلاً اس کی کھلانے والی عورت ساڑی پوش اور فینسی آرائش اور صفائی کی عورت ہوتی ہے۔ اس کے ہوش سنبھالتے ہی یہ خود کو انگریزی تعلیم گاہ میں پاتی ہے۔ ادھر ہندستان میں انگریزی درسگاہوں میں جو ہندستانی استاد طبقہ کام کررہا ہے بدقسمتی سے وہ بھی یورپی آداب زندگی سے مرعوب ہے اس لیے اس غریب کے سامنے استادوں کا طبقہ بھی نیم یورپی اور خاندان بھی نیم یورپی ہوتا ہے لہٰذا تعلیمی زمانے ہی سے اس کے اخلاق وخواص نیم ہندی اور نیم یورپی ہوتے جاتے ہیں اور ڈاکٹری کا کام شروع کرنے پر ان اخلاق واطوار کے نمایاں اثرات اس میں موجود ملتے ہیں۔

ڈاکٹرنی ہونے کے بعد یہ کسی شفاخانے کی ملازمت میں داخل ہو جاتی ہے یا ذاتی شفاخانہ قائم کر کے علاج شروع کر دیتی ہے۔ اس کے بعد ہندستان کے یورپ زدہ طبقے میں اس کو دولت اور قیمت اچھی ملتی ہے مگر چھوٹے طبقوں میں اس کے وجود کو حیرت ووحشت سے دیکھا اور سمجھا جاتا ہے اور ان چھوٹے طبقات کے کاموں سے خود اس ڈاکٹرنی کو اس لیے تکلیف ہوتی ہے کہ اس کو ان طبقات میں بے شمار غلط کاریاں اور ڈاکٹرانہ کمزوریاں نظر آتی ہیں اور یہ دیسی عورتوں کو ڈاکٹری مشورے دیتے دیتے ہلاک ہو جاتی ہے مگر کوئی ان پر اس کی مرضی کے موافق عمل نہیں کرتا، جس کی

بڑی وجہ یہ ہے کہ دیسی طبقے اپنی ملکی وضع وقطع اور ملکی خواص کی دیسی فطرت کے صحیح اور مناسب خواص اصول پر عامل ہوتے ہیں اور یہ ڈاکٹرنی ان کو یورپی آداب زندگی کی تلقین وہدایت کرتی ہے جو کسی طرح ان کے بس کے نہیں۔ اسی طرح جب علاج کے طریقے یورپی اور مریض کا جسم ہندستانی ہوتا ہے تو علاج کے نتائج بھی خاطر خواہ برآمد نہیں ہوتے۔ اسی لیے برسیں گزر جانے پر آج بھی طبقۂ عوام ہندستانی طبی علاج سے فائدہ اٹھا رہا ہے۔

گویا دیسی ڈاکٹرنی صاحبہ عین اسی وقت کام میں لائی جاتی ہیں جب کسی غریب گھرانے میں دیسی علاج یکسر قاصر رہے اور فوری علاج کی ضرورت لاحق ہو، اس لیے فی الحال ڈاکٹرانیوں کی مشکلات میں آسانی پیدا نہیں ہوئی ہے۔ ہندستان میں 1941 تک جو دماغی احساس جواں ہوا ہے اس کے حساب سے دیسی تحریکات کو خاصی کامیابی ہوئی ہے۔ مثلاً دیسی لباس کا استعمال۔ دیسی مصنوعات کی ترقی۔ دیسی زبانوں کی ترقی۔ دیسی علوم کا دوبارہ احیا۔ دیسی تمدن سے دلچسپی وغیرہ ۔ سو اس فطری رجحان اور میلان طبع کے اس قوی احساس کا لازمہ یہ ہوگا کہ نصف صدی کے بعد یہ ڈاکٹرنیاں ہندستان میں ڈھونڈے نہیں ملیں گی۔

ڈاکٹری علاج کا زبردست نقصان یہ ہے کہ اس کے علاجی آلات اور ادویہ کی بھاری رقم ہندستان سے باہر جاتی ہے اس لیے ہندستان کے ہوشمند خیرخواہ اس علاج کے مخالف ہیں اور ویسے بھی ہر ملک کی اصل آبادی عوام ہی ہوا کرتے ہیں اور عوام میں آج تک دیسی علاج یعنی گل بنفشہ، تخم خطمی، کاہوا جوائن اور جوشاندہ ہی مقبول وکامیاب ہے۔

ادھر دیسی حکیموں اور ویدوں نے خود ان تمام کارآمد اصول کو اب اپنا لیا ہے جو یورپ کے طریق علاج میں ان کو نظر آیا ہے لہٰذا یورپی علاج والے لاکھ اپنی سائنس کی ترقی کا شور کریں ملک کی صحیح فطرت اس کو رد کردے گی اور فطرت کا مقابلہ توپ اور بم سے بھی نہیں کیا جا سکتا۔

اسی طرح نسائی رجحان طبع کی رفتار اپنی فطری آزادی کی طرف مائل ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اب پرانی حیا اور نسائی تہذیب بھی کافور ہوگی اس لیے عورت سے عورت کے علاج کرنے کی ضرورت یوں بھی نہ رہے گی۔

◆◆◆

اُستانی بیوی

اس کی پیداوار کسی خاص خاندان کی خاص کنبے اور کسی خاص ملک اور قوم سے متعلق نہیں بلکہ یہ ''ضرورت سے پیدا ہوتی ہے'' مثلاً ایک لڑکی نے محض اپنے خاندان کی تعلیمی عادت کے موافق اعلیٰ یا ادنیٰ تعلیم حاصل کی لیکن بدقسمتی سے اس کے مالی حالات موافق نہیں رہے اس لیے وہ استانی کی ملازمت پر مجبور ہوئی۔

بعض نے اپنے خاندانی حالات کی مالی مشکلات کا اندازہ کر کے اپنی لڑکی کو پہلے ہی سے استانی کی تعلیم اس لیے دلائی کہ وہ اپنی روزی کے لیے آئندہ مجبور نہ ہو جائے لیکن اس موقع پر لڑکی کے وارث ایسا سوچ سکتے ہیں خود لڑکی اس وقت لڑکی ہی ہوتی ہے لہٰذا استانی کی سوانح عمری اس وقت سے شروع ہو جاتی ہے جب سے کہ وہ استانی کا رتبہ حاصل کر لے اور استانی کی خدمت پر مامور ہو۔ البتہ یہ ہوسکتا ہے کہ اس کی وہ چند اقسام بیان کر دی جائیں ہندستان میں پائی جاتی ہیں۔ چنانچہ ہندستان میں جن لوگوں کے ہاں دولت ہے بدقسمتی، خوش قسمی سے یہی لوگ ''طبقۂ اعلیٰ'' مشہور ہیں حالانکہ انسان اعلیٰ و اشرف عقل کی بلندی سے ہوتا ہے نہ دولت سے۔ بہر حال مقصد کو سمجھانے کے لیے وہی الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں جن سے مقصد سمجھ لیا جا سکے۔ لہٰذا ہندستان کے تعلیمی مدارج میں جو درجۂ اول کی استانی مانی جاتی ہے وہ یورپ کی عورت ہوتی ہے یا پھر کم سے کم

وہ عورت جس کو نصف ہندستانی اور نصف یورپی کہتے ہیں۔اس کا ''استانی پن' مستند و مسلم ہونے سے سوا یہ ہے کہ جس گھر کا ہندستانی باپ اس کا اثر قبول کر لے بس اس گھر کی یہ استانی ہو جاتی ہے۔ اسی لیے ان استانیوں میں بعض سند یافتہ اور بعض ''بے سندی'' بھی ہوتی ہیں۔

چونکہ ہندستانی کافی مقدار میں غیر محقق ہوتے ہیں اور ہر چیز کو بغیر اس کی صحیح اصلیت معلوم کیے قبول و اختیار کرتے ہیں اس لیے اپنے دماغ سے ہر اونچی چیز سے کافی ڈرتے بھی ہیں اور اس چیز کو بے حد عجیب و نادر چیز سمجھتے ہیں اس لیے جس گھر میں یہ یورپی استانی تعلیم دینے جاتی ہے اصولاً یہ اس گھر کی ملازمہ ہوتی ہے مگر گھر والوں کی ناقابلیت کی وجہ سے یہ اس گھر کی دادی بنا دی جاتی ہے۔ایسی عورت کو ہندستانی گھرانے ''مس صاحبہ'' یا ''میم صاحبہ'' کہہ کر پکارتے ہیں۔جس گھر میں یہ تعلیم دیتی ہے اس گھر کی تمام عورتیں لڑکے اور لڑکیاں اس کے سامنے اس طرح آتے ہیں گویا یہ سب کے سب اس کے غلام اور زرخرید ماتحت ہیں۔ان کے اس غلامانہ انداز کو دیکھ کر قدرتاً یہ استانی بھی اپنے لب و لہجہ کو شاہانہ بنا لیتی ہے مثلاً یہ اچھی خاصی اردو بولنے پر قادر ہوتی ہے مگر اپنے آس پاس گدھوں کو جمع دیکھ کر یہ دانستہ طور پر ''دوغلی اردو'' بولنے لگتی ہے اور اس گھر کی ہر چیز سے انجان اور ناواقف بن جاتی ہے مثلاً اس سے کہیے کہ ہم لوگ دن کو نو بجے کھانا کھاتے ہیں تو بڑی وحشت سے کہے گی:

''اوہو آپ لوگ دن کو نو بجے کھانا کھاتا ہے''

''ہم لوگ کو تیرہ بجے کھانا کھاتا ہے''۔

گویا اس کو تمام عمر میں آج ہی معلوم ہوا ہے کہ بعض ہندستانی نو بجے دن کو بھی کھانا کھاتے ہیں۔اس حرکت سے اس کا یہ مقصد ہوتا ہے گویا یہ آج ہی یورپ سے ہندستان میں آئی ہے اور یورپ چونکہ آسمان پر ہے اس لیے یہ غریب زمین کی باتیں کیا سمجھے کہ زمین کے لوگ کب کھانا کھاتے ہیں۔ادھر ہندستانی عورتیں عقل و تعلیم سے کافی دور ہیں اس لیے یہ غریب میم صاحب کے ان کرشموں کو کیا سمجھیں۔نتیجہ یہ کہ ہندستانی عورتیں اور لڑکیاں مارے رعب اور جہالت کے چند میں اپنی ہر خاندانی، ملکی اور قومی چیزوں کو خود ہی ذلیل سمجھ کر ان استانی صاحبہ سے چھپانے لگتی ہیں اور گھر کی والدہ صاحبہ تک میم صاحبہ کے سامنے ملازمہ بنی بیٹھی رہتی ہیں۔

اب چونکہ ابتدا ہی سے اس کے اور اس کی شاگرد لڑکیوں کے درمیان زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے اور وہ ہندستانیوں کی غیر محقق اور جاہلانہ طبیعت کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے اس لیے قدرتاً اس استانی کے اونچے اخلاق، اونچے کمالات کی نقل تو ایسی نااہل لڑکیوں کے بس کی نہیں ہوتی البتہ وہ اس استانی کے پست اطوار اور نقصان رساں طریقے جلد قبول کر لیتی ہیں۔ مثلاً:

اس کی طرح کا یورپی بناؤ سنگھار۔

اس کی طرح کا یورپی لباس۔

اس کی طرح کی صفائی کے قاعدے۔

اس کی طرح کے اصولِ زندگی۔

اس کی طرح کے تفریح وغیرہ۔

اب چونکہ ہندستانیوں کو اپنی غلامی اور بے ہنری کی وجہ سے یورپ والوں کے برابر دولت نہیں ملتی اس لیے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کے اثر میں آئے ہوئے گھرانے کی لڑکیاں بھی "میم صاحب" بننے پر مرنے لگتی ہیں اور دولت نہ ہونے کی وجہ سے پھر اپنی برادری میں اس نصف یورپی "میم پن" کی وجہ سے ذلیل ہوتی ہیں۔ گویا مجموعی حیثیت سے اس استانی کے نتائج تعلیم کی طرح نتائج اخلاق بیحد مختلف اور نقصان رساں ہوتے ہیں۔ نقصان رساں اس طرح کہ ہندستانی لڑکیاں اس کا سا لباس پہن کر یورپین تو ہو نہیں سکتی ہیں اس لیے ہندستانی برادری میں مذاق بن جاتی ہیں۔ اسی طرح ایسی استانیوں کے نتائج تعلیم بھی اس لیے کامیاب نہیں ہوتے کہ یہ استانیاں خاص طور پر اونچے گھرانوں میں پڑھاتی ہیں اور اونچے یعنی دولت مندوں میں عقل سلیم کی مقدار کم ہوتی ہے اس لیے اونچے گھرانوں میں جب تک جی چاہتا ہے پڑھتے ہیں اور جب جی گھبراتا ہے تو تعلیم وعلیم کو لات مار کر سنیما اور سیر وشکار کو چلے جاتے ہیں اور تعلیم اپنی استانی ہی کی جیب میں پڑی رہ جاتی ہے، اس لیے اس غریب کی عمدہ تعلیم کا کوئی ایسا اندازہ نہیں ہو سکتا جس کو کامیاب اندازہ کہا جائے۔

البتہ اس کی صحبت سے ہندستانی لڑکیاں یورپی لباس، یورپی کھانوں، یورپی نفاست اور یورپی گفتگو کے چند اول فول سے ضابطے ضرور سیکھ لیتی ہیں جن کے آزمانے کا ان کو زیادہ موقع اس لیے نہیں ملتا کہ آخر کار ہوتی تو ہیں ہندستانی لہٰذا روز روز نہ ڈنر کھا سکتی ہیں اور نہ روز روز اردو بگاڑ کر

بول سکتی ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دس بارہ بچوں کی ماں ہو کر مس صاحبہ کی تمام لکھائی پڑھائی طاق میں دھری رہ جاتی ہے اور خود خالص ہندستانی دادی اماں بن کر کھانسی اور دمہ میں مبتلا ہو جاتی ہیں۔ جنازہ میں جانا پڑتا ہے ہم آپ کو۔

ہندستان میں دوسری قسم کی استانی وہ ہے جو انگریزی تعلیم کی کثرت اور یورپی تمدن اختیار کر لینے کے افلاس سے پیدا ہوئی ہے یعنی یہ استانی بھی اس مقصد سے اپنی تعلیم کا آغاز نہیں کرتی کہ وہ محض خدا کے لیے اپنے ملک کی لڑکیوں کو لکھا پڑھا کر انسان بنائے گی، بلکہ اس کے ماں باپ اس کی بیوگی اور روزی کی مشکل سے محفوظ رکھنے کے لیے جو انگریزی تعلیم دلاتے ہیں یہ اس تعلیم کے سہارے جب خود مختار ہوتی ہے تو روزی کی کسی خاص مشکل میں مبتلا ہو کر اس خدمت کو اختیار کرتی ہے۔ کیونکہ خود استانی کے حصول علم و کمال کا زمانہ پندرہ برس کی عمر تک یا بیس برس کی عمر تک ہوتا ہے اور پندرہ بیس برس کی عمر میں اپنے مستقبل کے لیے کوئی صحیح راستہ نہ لڑکی سوچ سکتی نہ لڑکا، ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ 25 کی عمر کے بعد ایک عورت استانی کی خدمت کو محض قوم کے نفع کے لیے اختیار کر لے، لیکن اس سے قبل وہ ایسا نہیں سوچ سکتی لہٰذا ثابت ہوا کہ یہ خاندانی یا پیشہ ور استانی نہیں ہوتی بلکہ کسی وجہ سے استانی بن جانے پر مجبور ہو جاتی ہے۔

بعض انگریزی درسگاہوں میں استانی کی خدمت کی تعلیم دی جاتی ہے، یعنی وہاں استانی کو اس کے فرائض تعلیم و تربیت سکھائے جاتے ہیں، اس کے بعد اس کی دماغی فضیلت یقیناً کس قدر بہتر ہو جاتی ہے اور بعض ہندستانی استانیاں یقیناً مایۂ ناز بھی ہیں اور بعض ایسی بھی ہیں جو بغیر کسی روزی کمانے کے مقصد کے محض قومی خدمت کے جذبے ہی سے استانی کے فرائض انجام دیتی ہیں اور کوئی معاوضہ قبول نہیں کرتی ہیں۔ ایسی استانیوں کی تعداد ہندو قوم کے زیادہ ہونے کی وجہ سے ہندوؤں میں زیادہ ہے اور مسلمانوں کے کم ہونے کی وجہ سے مسلمانوں میں کم، لیکن یہ ضرور ہے کہ اس فرقہ میں کامل اور قابلِ احترام استانیاں بھی موجود ہیں جو فطرتاً اپنی قومی بچیوں کو سنوارنا چاہتی ہیں۔ ایسی مسلمان استانیوں میں مشہور ''پیسہ اخبار'' لاہور کی مالک فاطمہ بیگم صاحبہ ایڈیٹر اخبار ''خاتون لاہور'' کا ''اسلامیہ زنانہ کالج لاہور'' اور علی گڑھ میں مولوی عبداللہ صاحب کی صاحبزادی، جالندھر میں ''مدرسۃ البنات'' کے بانی مولوی عبدالحق صاحب کی صاحبزادی اور

ریاست گوالیار میں بلقیس فاطمہ بیگم کے نام مجھے معلوم ہیں اور میں خود جانتا ہوں کہ یہ اور ان ایسی بے شمار ہندو مسلمان استانیاں ہیں جو اپنی قومی لڑکیوں کو زیور علم و ہنر سے سنوارنے کے لیے بغیر کسی معاوضے اور مقصد کے استانی کے فرائض انجام دیتی ہیں۔

اب رہیں وہ جو زنانہ درس گاہوں میں استانی کی خدمات انجام دے رہی ہیں تو ان میں سے اکثر میں عمر و تجربے اور تحقیق کی کمی سے ایسی بھی نہیں جو ہندستانی ہو کر یورپ کا اثر بہت قبول فرما چکی ہیں اور غریب عورتیں کیا جبکہ ہندستان کے 99 فیصدی مرد ہی یورپی زندگی کے نقال بن چکے ہیں تو ان کے گھرانے ان اثرات سے کس طرح محفوظ رہ سکتے تھے، لہٰذا ایسی استانی ہندستانی لڑکی کی تعلیم کے لیے یقیناً نقصان رساں ہے۔ مثلاً:

ایسی ہندستانی استانی کی بھاری یا سادہ قسم کی ساڑی۔

اس کی اونچی ایڑی کی جوتی یا جوتا۔

اس کے سر میں انگریزی وضع کے پھول۔

اس کا نیم عریاں لباس۔

اس کا ہر وقت انگریزی میں بات کرنا۔

اس کا انگریزی قاعدہ سے چائے پینا۔

اس کا انگریزی اصولِ زندگی کی تعریف میں مبتلا رہنا۔

اس کا سنیما دیکھنے کا شوق۔

اس کا عریاں مضامین اور جذبات انگریزی رسالوں کا اسکول میں لے کر جانا یا ایسے مضامین نظموں یا رسالوں کی تعریف مدرسہ کی لڑکیوں سے کرنا۔ یا بات بات پر لڑکیوں کو ٹی۔ پارٹی پر بلانا یا ان کے ہاں جانا اور پیانو یا گراموفون خود بجانا۔

یا ان کے سامنے پردہ کی رسم کو غلط اور بے ہودہ کہنا۔

یا ان کو یورپی کھیلوں اور یورپی وضع کی ورزشوں پر آمادہ کرنا وغیرہ۔

یہ اس قسم کے مشاغل، اطوار اور عقائد جس ہندستانی استانی کے ہوں سمجھ لیجیے کہ وہ استانی کے محققانہ اور علمی فرائض کی انجام دہی کے قابل اس لیے نہیں ہے کہ وہ خود مرعوب ہو کر اپنا ملکی اور

قومی وطیرہ کھوبیٹھی ہے اور دوسروں کے غیر مناسب اطوار اختیار کر چکی ہے لہٰذا اس میں جب خود صحیح اور غلط کی تمیز نہیں ہے تو وہ دوسروں کو صحیح راستہ کیا خاک بتائے گی۔

بدقسمتی سے بعض درسگاہوں میں بعض نوجوان اور کنواری لڑکیاں بھی استانی مانی گئی ہیں۔ شک نہیں کہ ایک نوجوان کنواری لڑکی اپنے ذمہ کا علم و ہنر پڑھا سکتی ہے اور سکھا سکتی ہے مگر عمر اور تجربے کے لحاظ سے استانی کے اثرات پیدا نہیں کر سکتی اور شاید ایسی ہی نیم خام ہندستانی استانیوں کے نتائج اثر ہیں جو کالے خاں، بدھو خاں، کشوری پرشاد اور پرماتم کے غریب گھرانوں کی مفلس لڑکیاں بھی مدرسہ کے لیے اعلیٰ درجہ کا لباس اور فینسی سامانِ آرائش طلب کر کے اپنے مفلس ماں باپ کا ناطقہ بند کرتی رہتی ہیں اور تعلیم سے زیادہ وہ اپنی ''فینسی استانی'' کی نقل پر مستعد رہتی ہیں۔

اسی طرح نوجوان کنواری استانی سے نوجوان کنواری لڑکی کا قرب بھی صحیح نہیں۔ کیونکہ یہ سن و سال لڑکی کے لیے یکسر بحرانی اور طوفانی سن و سال ہے، اس میں لاکھ احتیاط پر بھی ''شادی بیاہ'' کے عنوان سے گفتگو چھڑ ہی جاتی ہے۔ استانی بیوی کی چونکہ کوئی قسم و قوم نہیں اس لیے اس کی پیدائش اور اس کی شادی بیاہ کے مسائل پر روشنی نہیں ڈالی جا سکتی۔ البتہ اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ استانی بیوی کا شوہر قدرے خطرہ میں رہتا ہے کیونکہ بہر حال اس کی بیوی بھی تعلیم یافتہ اور ملازم ہے گویا ملازمتی حیثیت سے بعض اوقات میاں ہو کر یا دونوں کے دونوں شوہر ہو کر رہ جاتے ہیں یا دونوں کے دونوں ایک دوسرے کی بیویاں محسوس ہوتے ہیں۔

ایسے میاں بیویوں کی مالی فراغت قابلِ ذکر نہیں ہوتی بلکہ یورپی زندگی کی نقل کے ہاتھوں بعض جگہ دونوں کی اور بعض جگہ ایک کی تنخواہ قرضہ میں ضرور کٹتی رہتی ہے۔ اخلاقی تعلقات میں ان کے ہاں ''مساوات'' کا بڑا لحاظ رہتا ہے پھر بھی اولاد کم اور مصارف زیادہ۔ ہندستانی استانیوں میں ہندستان کی قدیم وضع کی استانی کا دم بھی بے حد غنیمت ہے۔ یہ استانیاں بھی خاندانی اور پیشہ ور قسم کی نہیں ہوتیں بلکہ اکثر بیوگی اور غربت کے اثر سے پیدا ہوتی ہیں اور بعض بعض اللہ کے واسطے بھی۔ ان کی تعلیم گاہیں خود ان کے گھر ہوتے ہیں اور ان کی شاگرد لڑکیاں بس انہی کے محلے کی لڑکیاں۔ ان استانیوں میں مذہبی تعلیم معمولی درجہ کی سینے پرونے کی تعلیم اور معمولی درجہ کی قصہ حاتم طائی اور قصہ حلیمہ دائی پڑھنے کے قابل اردو یا ہندی قابلیت ہوتی ہے۔ یہ کافی عمر رسیدگی اور

بڑھاپے کے سن میں لڑکیاں پڑھانے کا ''دھندا'' اختیار فرماتی ہیں۔ ان کے گھر زیادہ مقدار میں کم عمر لڑکیاں مذہبی تعلیم کے لیے جاتی ہیں۔ اب رہی ان کی سینے پرونے اور گرہستی کی تعلیم سو اگر استانی بی کو اس کا کسی دن ہوش آ گیا تو کچھ اوندھا سیدھا بتا دیا ورنہ گھر کے کام کاج میں مصروف اور مذہبی کتابوں کی زبانی تعلیم جاری۔

ان کا مکتب ان کا درجہ سوم کا گھر ہوتا ہے جس میں لکھائی پڑھائی اور رہنے سہنے کی جگہ میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ بعض اوقات لڑکیوں کو بیٹھنے کا صحیح فرش بھی نصیب نہیں ہوتا اس لیے کبھی کبھی ایک پیسہ کا ٹیکس وصول کر کے ایک ڈیڑھ آنے کی چٹائی منگالی جاتی ہے، مگر احتیاط یہ کہ پھر جس لڑکی کے ہاتھ سے اس چٹائی کا ایک تنکا بھی ٹوٹ جائے تو اول تو بھینس کی طرح وہ لڑکی استانی صاحبہ کی مار کھاتی ہے اور اس کے بعد اس چٹائی کے دام بھی ادا کرنا اسی ''چٹائی پھاڑ لڑکی'' کے ذمہ ہے۔

ان استانی صاحبہ کا معاوضۂ خدمت لڑکی کی ماں باپ کی مالی استطاعت پر موقوف ہے۔ یہ چار آنے مہینے سے ایک روپیہ مہینہ تک پر راضی ملتی ہیں۔ ان کے مکتب کے اوقات میں بھی کوئی ترتیب نہیں ہوتی اور بجز تہوار اور مذہبی دن کے نہ گرمی کی بڑی تعطیل نہ سردی کی چھوٹی تعطیل۔ اسی طرح صبح چھ بجے سے دس بجے دن تک بھی پڑھایا جا سکتا ہے اور دو بجے دن سے چار بجے دن تک بھی اور بعض کے مکتب کے اوقات رواں دواں قسم کے ہوتے ہیں مثلاً آتی جاؤ اور سبق لے کر جاتی بھی رہو۔ اس طرح صبح سے شام تک بغیر سانس لیے مکتب بھی جاری اور تعلیم بھی جاری۔ ان کے مکتب کی لڑکیوں میں پڑھائی کا وہی پرشور قاعدہ ہوتا ہے یعنی سب مل کر اور ہل ہل کر زور شور سے پڑھتی ہیں اور محلے والوں میں سے ایک شخص بھی اس ''ہڑتالی قسم کے شور'' سے ناراض نہیں ہوتا بلکہ اگر کسی دن مکتب کی چھٹی ہوتی ہے اور یہ صور اسرافیل سا شور بند ہوتا ہے تو محلے کی معصوم عورتوں کو شک ہوتا ہے کہ شاید استانی بی یا مغلانی صاحبہ کہیں مہمان چلی گئی ہیں اس لیے آج بچیوں کے پڑھنے کی آواز نہیں آتی اور بعض تو بیماری کا شک کر کے اپنے مردوں کو استانی صاحبہ کی خیریت دریافت کرنے ان کے گھر بھیج دیتی ہیں۔ ان استانیوں کو لڑکی کو سزا دینے کے تمام دنیا کے اختیارات حاصل ہوتے ہیں اور اسی لیے استانی صاحبہ کی سزا کی اقسام یہ ہیں:

1۔ گنوار کے لٹھ کے ٹوٹنے والی آواز سے ملا ہوا لہجہ۔

2۔ شدید اور ہولناک بددعاؤں میں سے جو فوراً زبان سے جاری ہو جائے۔
3۔ بامعنی اور بے معنی گالیوں میں سے جو زبان سے ادا ہو سکے۔
4۔ چاہیں لڑکی کا سیدھا کان کھینچ لیں، چاہیں بال نوچ ڈالیں، چاہیں معقول قسم کے بید سے ماریں، چاہیں چولہا جلانے کی پھکنی سے، چاہیں صرف ایک طمانچہ ماریں چاہیں پانچ منٹ تک تار ہی نہ ٹوٹنے دیں، چاہیں مارتے مارتے لڑکی کی ناک سے خون جاری کریں، چاہیں کان کھینچنے میں بالیاں مروڑ دیں، چاہیں کھاٹ پر سے نیچے دے ماریں، چاہیں نیچے سے کھاٹ پر دے ماریں۔

مختصر یہ کہ جس دن چاہیں مکتب سے عمر بھر کے لیے خارج بھی فرما دیں، مگر ان تمام سزاؤں پر الٹا یہ ہوتا ہے کہ رات کو لڑکی کی ماں آ کر استانی صاحبہ سے الٹی ہاتھ جوڑ کر معافی مانگتی ہے، اور لڑکی دوسرے دن سے پھر استانی صاحبہ کے گھر کا مصالحہ پیستی نظر آتی ہے۔ اسی طرح استانی صاحبہ کو حق ہے کہ وہ اپنی شاگرد لڑکیوں سے چاہیں اپنے ہاتھ پاؤں دبانے کی خدمت لیں، چاہیں چولہے چکی اور بکرا بکریوں کی البتہ ایسی استانیوں کی تعلیم و تربیت کا یہ اثر بے حد قابلِ احترام ہے کہ لڑکی میں ہندستانی شرافتِ نفس، غیرت، خودداری، حجاب و حیا اور خدائی احکام کی تعمیل کی وہ روح پیدا ہو جاتی ہے جو کسی جلیل القدر انسان کی جلیل القدر ماں میں ہونا چاہیے۔ اب یہ آپ کو اختیار ہے کہ اخلاقی اصلاح ایسی استانیوں کے سپرد فرمائیں یا اوپر والیوں کے۔

◆◆◆

چوڑی والی بیوی

کسی زمانے میں اس کا حلقۂ اثر بھی غریبوں سے لے کر امیروں اور رئیسوں کے گھرانوں تک یکساں تھا مگر جب سے انگریزی تعلیم کا الو بنا دینے والا نصاب رائج ہوا اس وقت سے ہندستان کے اونچے گھرانوں میں عقلی کمی اور تحقیقی فراست کی قلت کے باعث یورپی طور طریقے نقل ہونے لگے پس اس نقالی کے ہاتھوں ہندستانی عورت کی وہ نسائی فطرت بھی فنا ہوگئی جس کے ایک ایک عشوے اور جس یک ایک ایک زیبائش پر کسی ہندستان کے مردخزانے اور تاجداریاں نثار کرتے تھے۔ اب تو ایسے نقال گھرانوں کی عورتیں اپنی فطری بلندیاں کھو کر مردانہ کردار کی نقل میں مبتلا ہیں یا فرنگی عورتوں کے طور طریقوں کی غلام اس لیے اب چوڑی والی ان گھرانوں سے دور ہو چکی، پھر بھی کبھی کبھار جب یورپی نقالی کے بالکل بیچ میں ہندستانی فطرت طمانچہ رسید کرتی ہے تو ہندستان کے یہ نقال گھرانے بھی چوڑی والی کے ناز اٹھانے پر مجبور ہو ہی جاتے ہیں۔

چوڑی عورتوں کے ہاتھ کا ایک معمولی زیور ہے جو لاک، سونے چاندی، شیشے اور ربر کا ہوتا ہے۔ اس میں لاک، شیشے اور ربر کی چوڑی زیادہ مستعمل ہے۔ عام حیثیت سے اس کی تجارت لاکھوں روپیہ کی ہوتی ہے مگر پیشہ ور حیثیت سے یہ ہر شہر کی آبادی پر موقوف ہے اسی لیے انفرادی

حیثیت سے یہ کچھ زیادہ نفع بخش نہیں۔اسی لیے یہ تجارت بجز خاندانی پیشہ ور لوگوں کے تجارتی کاروبار کرنے والے دوسرے طبقات نے اختیار نہیں کی۔

چوڑی والی بیوی دو طبقوں پر منقسم ہے۔ایک وہ جس کے گھر میں چوڑی بنائی جاتی ہے۔ دوسری وہ جو بنی ہوئی چوڑی لے کر بازار اور مکانوں میں خود جا کر فروخت کرتی یا پہناتی ہے۔ چونکہ عام اور خاص مکانوں میں خود جا کر چوڑی پہنانے والی کے اثرات ہی عام ہو سکتے ہیں اس لیے میں اسی چوڑی والی کا ذکر کروں گا۔

قدیم، بےعلم، بے ہنر اور تاریک تر گھرانے میں اس کی پیدائش عمل میں آتی ہے،جس کے بزرگوں میں بجز چوڑی فروخت کرنے کے کوئی دوسرا ہنر اور ذریعۂ معاش ہی نہیں ہوتا اسی لیے ان کے خاندان اور برادری کے افراد میں کافی سے زیادہ جہالت اور قناعت پسندی ہوتی ہے،اور دماغی پستی، اسی لیے ان کی برادری کی محدود آمدنی کو ترک کر کے کوئی دوسری اور کامیاب تجارت آج تک اختیار نہ کی۔

ایک تیرو تار مکان میں ایک کافی تنگ دست اور بے ہنر گھرانے میں اس کی پیدائش عمل میں آتی ہے۔ پیدائش کے وقت قدیم تر رسوم تعویذ، گنڈے، جاہل عالموں اور پرانے بزرگوں کے اثرات واصول سے کام لیا جاتا ہے۔سیدھی سادی گانے بجانے والی تقریبات سے اس کی ابتدائی رسوم ادا کر دی جاتی ہیں، وہ بھی اگر بے استطاعت ہوئی تو۔ پیدائش سے شادی تک ابتدائی مذہبی تعلیم تک نہیں ہوتی اور یہ نہایت گندہ، بے ہنر اور مالی مشکلات والے گھرانے میں پل پلا کر جوان ہوئی نہیں کہ شادی بلکہ بعض خاندانوں میں تو باپ دادا کی رسم کی پیروی میں نو دس برس ہی کی عمر میں شادی۔

شادی البتہ دھوم دھام سے ہوتی ہے اور وہ بھی برادری کے دباؤ اور قاعدے سے۔یعنی اس بستی کے تمام چوڑی والے اس کی برادری مانے جاتے ہیں اور ان لوگوں کے سوا کسی دوسری برادری اور طبقے کے لوگ اس کی تقاریب میں شرکت تو کر سکتے ہیں مگر برادر نہیں کہے جا سکتے۔

برادری میں ایک شخص کو چودھری کی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔گویا یہ چودھری اس پوری برادری کا ناخدا، فرماں روا اور لال بوجھکڑ مانا جاتا ہے اور اس کی حرکات بھی کچھ اسی قسم کی ہوتی

ہیں۔ اب شادی کی مجلس میں اس چودھری کی حکومت ہوتی ہے اور اسی کے احکام اور مشوروں پر شادی کی تمام رسوم انجام کو پہنچتی ہیں۔ یہ اگر دن کہے تو سب برادر دن کہیں۔ یہ اگر رات کہے تو سب برادر رات کہیں۔ اس چودھری میں سرخاب کا پر صرف یہ ہوتا ہے کہ یہ مالی حیثیت سے دوسروں سے قدرے بلند ہوتے ہیں اور ٹھ انٹ۔ اس کے مشورے چاہے عقل وضرورت کے حساب سے کتنے ہی بھونڈے ہوں مگر چوڑی والی برادری میں بڑی عزت سے اس لیے دیکھے جاتے ہیں اور سنے جاتے ہیں کہ دوسرے برادروں میں ان کے مشوروں کی کمزوریوں کو بھانپ جانے والے یا تاڑ جانے والے تک نہیں ہوتے لہٰذا بس ہر طرف انہی کی چودھراہٹ کا طوطی بولتا ہے۔

لڑکی اور لڑکے کا انتخاب کسی خاص حسن، کسی خاص ہنر اور کسی خاص دولت مندی کی بنا پر نہیں ہوتا بلکہ صحیح معنی میں صرف عورت مرد کا جوڑ ملا دیا جاتا ہے جس کی شکایت اور گرانی عمر بھر نہ میاں کو ہوتی نہ بیوی کو۔ یعنی اگر دلہن حد سوا کالی ہے تو ہو، بھونڈی ہے تو ہو، پھوہڑ ہے تو ہو۔ اسی طرح شوہر اگر محض کندۂ ناتراش ہے تو ہو اور گنوار کا لٹھ ہے تو ہو، بحث تو کلھم شادی سے ہے۔

اسی طرح مہر وجہیز میں بھی فطری سادگی یعنی جو وقت پر مل جائے جہیز اور جتنی رقم سمجھ میں آجائے مہر۔ یہ نہیں کہ دولت مندوں کی طرح محل بھی جہیز میں اور کوٹھی بھی جہیز میں۔ اپنا روپیہ بھی جہیز میں اور رعایا کی دولت بھی جہیز میں۔

اسی طرح اس کی بارات کی دھوم دھام کا حال ہے۔ یعنی جس بستی میں یہ آباد ہے اس بستی میں جتنے چوڑی والے ہیں وہ سب باراتی چاہے وہ کلھم دس ہوں یا ایک ہزار، خاص فائدہ کی بات یہ ہے کہ کم سمجھ ہونے کے باعث یہ طبقہ اپنی ہر ویران تقریب کو بھی شاداب ولاجواب سمجھتا ہے اور ارات کی ہر کمزوری کو طاقت مثلاً اگر بارات میں باراتی صرف ایک تیسرے درجہ کا باجا لا سکتے ہیں ز دلہن والے اس کو بھی شاہی بینڈ سمجھتے ہیں اور اگر وہ بے باجے کے آتے ہیں تب بھی دلہن والے ر باراتی کو پورا ایک بینڈ سمجھ کر مطمئن رہتے ہیں۔ اسی طرح اختیار ہے کہ دولہا چاہے ہاتھی پر سوار و کر آئے یا شیخ سدّو کے بکرے پر۔ یہی حال دلہن کے مکان کا ہوتا ہے اگر مقدرت ہے تو پوری رات کو تین منزل مکان میں بھر دیا اور اگر مقدرت نہیں ہے تو سرکاری سڑک کے نصف عرض تک

چار پائیاں والے باراتی چوڑی والے ہی بیٹھے نظر آئیں گے۔ہم آپ ہی اپنے اپنے موٹر اور سائیکلیں بچا بچا کر نکالیں گے مگر چوڑی والی بارات کے ولیمہ کی دیگیں تک سرکاری سڑک کے نصف عرض میں چڑھی ہوں گی جن کو نہ پولیس ہٹا سکتی نہ میونسپل کمیٹی۔

یہی حال شادی کی رسوم کا ہے اگر قبر پر جا کر پلاؤ تقسیم کرنا رسم تو کی جائے گی اور اگر عورتوں کو سرخ چاول کھلانا ہے تو کھلانا ہی پڑے گا۔اگر دلہن کے سامنے باجا بجانا رسم ہے تو بجانا ہی پڑے گا اور اگر سسر کا ہاتھ جوڑ کر برادروں سے گفتگو کرنا رسم ہے تو ہاتھ جوڑنا ہی پڑے گا۔اسی طرح اگر لڑکی اور لڑکے پر دس روپیہ نچھاور کرنا رسم ہے تو کرنا ہی پڑے گا اور کھاتے وقت مردوں کو گا گا کر سیدھی گالیاں دینا رسم ہے تو گالیاں گانا ہی پڑیں گی۔

اس قسم کے حالات میں اس کی شادی ہوتی ہے اور دلہن پن ہی سے اس کو چوڑی کی تجارت سنبھالنا پڑتا ہے یعنی دوکان اگر ہے تو یہ دوکان پر کام کرے گی اور اگر گھر گھر جا کر چوڑی پہنانا ہے تو گھر گھر ہی جائے گی۔اس حیثیت سے شوہر صاحب مزے میں رہتے ہیں۔یعنی کمائے بیوی اور کھائیں میاں۔لیکن اس معاملے میں میاں کو کمائی سے اس لیے قدرے فرصت نصیب ہے کہ چوڑی خریدنے اور چوڑی پہننے کا کام عورت ذات سے متعلق ہے اور عورت میں مرد کے مقابل ہونے کی بجلی چونکہ بے حد کم ہے اس لیے وہ مرد کے ہاتھ سے چوڑی پہننے سے چونکہ برقی کمی کے باعث مسلوب الحواس ہوتی ہے جس کو غیر محقق طبقہ عور کی حیا کہتا ہے اس لیے مرد سے عورت کا چوڑی پہننا مشکل ہو گیا جس کو غیر محقق طبقہ معیوب کہتا ہے لہٰذا اس منزل میں چوڑی والی، اپنے شوہر سے زیادہ ضرور کماتی ہے مگر محض اس مجبوری سے وہ اپنے شوہر پر کوئی فوقیت نہیں پا سکتی اسی لیے اس کا شوہر مکان اور دوکان پر ان کسان اور مزدور عورتوں کو خود چوڑیاں پہناتا اور فروخت کرتا ہے اور چونکہ گنوار یا کسان عورت کے احساس کی قوت زیادہ بلید اور غیر حساس ہوتی ہے اس لیے وہ مرد چوڑی والے کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر بھی سمجھتی ہے کہ مرد کے عوض وہ کسی سخت مشین کے ذریعہ چوڑی پہن رہی ہے۔

چوڑی والی کا رسوخ اب عوام تک زیادہ ہے پھر بھی شادی بیاہ کے مواقع پر ہندستان کے وہ رئیس گھرانے بھی اپنی دیسی فطرت سے شکست کھا کر اپنی بیٹی کو چوڑیاں پہنانے کے لیے اس دیسی

2

چوڑی والی کی دست نگر ہوکر ہی رہتے ہیں، جنھوں نے اپنی عقلی قوت کے ضعف سے یو پی طور طریقے اختیار کر لیے ہیں۔ البتہ ہندستان کے رئیس وامیر گھرانوں میں غریب اور ادنیٰ طبقات کے انسانوں سے جو غیر انسانی برتاؤ کیا جاتا ہے چوڑی والی چونکہ اپنی جہالت سمجھ کر کمی اور احساس کے بلند نہ ہونے کے باعث ان گھرانوں میں کافی ذلیل ہوتی ہے۔ مثلاً وہ ایسے گھرانوں میں پہلے تو خود ہی بے حد مسکین بوریہ نشین، حقیر فقیر کمترین، فدوی خادمہ اور بے یار و مددگار سی ہوکر جاتی ہے پھر ایسے گھرانے کی پاؤں دبانے والی ملازمہ سے لے کر ایک ایک کو جھک جھک کر سلام کرتی ہے۔ اسی طرح بغیر گھر کی ''بیگم صاحبہ'' کے حکم وارشاد کے یہ خود سے کچھ عرض نہیں کر سکتی، گھر پہنچ کر بھی گھنٹوں حضور بیگم صاحبہ کی یاد فرمائی کے نہ بیگم صاحبہ تک جا سکتی ہے نہ انتظار کی تکلیف سے تھک کر گھر ہی واپس آسکتی ہے۔ بیگم صاحبہ کو چوڑی پہناتے وقت مارے عرب اور دبدبہ کے نہ اس کی زبان صحیح کام کرتی نہ اس کے ہاتھ، اگر بولتی ہے تو بے وجہ بات بات پر حضور اور دعا کا استعمال زیادہ کرتی جاتی ہے اور بعض رئیس وامیر گھرانوں میں چوڑی کی قیمت اگر ''پرائیویٹ سکریٹری صاحب'' کے بس میں چلی جائے تو دنوں ماری ماری بھی پھرتی ہے۔

البتہ متوسط اور غریب گھرانوں میں اس کا طوطی خوب بولتا ہے اور جن گھرانوں میں اس کے تعلق ''بے تکلف'' ہوتے ہیں وہاں تو یہ ''بلبل ہزار داستان'' کا کام کرتی ہے اور ایسے ہی گھر کی عورتوں میں بیٹھ کر اس گھر کا خوب خوب بھانڈا پھوڑتی ہے جس گھر سے یہ ناخوش یا ناراض ہو۔

اس کا چوڑی پہنانے والا لباس خاص ہوتا ہے جو صرف چوڑی پہنانے کے لیے اس وقت تک استعمال ہوتا ہے جب تک کہ یہ چوڑی پہنا کر گھر واپس نہ جائے گویا یہ لباس نہیں بلکہ چوڑی پہنانے کا ڈریس یا مکلّف خلعت ہوتا ہے جس کے ہر انداز سے ''چوڑی والی پن'' ٹپکتا ہے۔ یہ چوڑی پہنانے بڑے ٹھاٹھ سے نکلتی ہے، سر سے پاؤں تک شاید ہی کوئی بدنصیب حصۂ جسم ہوگا جو موٹے موٹے زیورات سے آراستہ نہ ہو۔ زیورات میں بیشتر زیورات 308 قبل مسیح کی وضع کے ہوتے ہیں۔ اسی طرح لباس بھی اپنی برادری کے قدیم انداز کا ہوتا ہے۔ البتہ مہدی سُر سے پان اور شوخ رنگ کے لباس کے حساب سے یہ قابو سے باہر نظر آتی ہے اور جب یہ گھر میں ذرا پھیل کر بیٹھ جائے تو مارے واہی تباہی قصوں کے صبح سے شام بھی کر سکتی ہے اور شام سے صبح بھی۔ خاص

بات یا خاص ہنر اس وقت دکھاتی ہے جب کوئی چوڑی تنگ ہو اور اس کو ہاتھ میں پہنانا ضروری ہو۔ لہٰذا عورت یا لڑکی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر رسیلے عبرت خیز یا وحشت خیز قسم کا کوئی قصہ یا گفتگو شروع کر دیتی ہے اور تنگ چوڑی کو آہستہ آہستہ ہاتھ میں پہناتی جاتی ہے۔ چوڑی پہننے والی کہیں کہیں تنگ چوڑی کی گرفت سے ''اوئی توبہ'' یا ''اف'' یا ''ارے کیا ہاتھ توڑتی ہے'' کہتی ہے تو یہ چوڑی کا دباؤ روک قدرے تشفی دلاتی ہے اور پھر تکلیف زدہ عورت کو اپنے قصے میں محو کر لیتی ہے اس طرح جگہ جگہ ''اف'' اور ''اوئی مری'' کی دو چار آوازوں کو یہ قصہ کے دباؤ سے کلائی پر فٹ کر دیتی ہے اور چوڑی والی کو تنگ چوڑی کی اصل تکلیف اس وقت محسوس ہوتی ہے جب قصہ گو چوڑی والی قیمت لے کر اپنے گھر پہنچ جاتی ہے۔

ہندو مسلمانوں کے جو گھرانے بلند ترین عزت و آبرو اور شرافت کے لیے ساری بستی میں ممتاز ہوتے ہیں اور غریبوں کے عام گھرانے جنکا خلاصۂ زندگی اور عزت پر جان دے دینا ہی مقصدِ زندگی ہے ان کے گھرانوں میں نوجوان اور بے بیاہی لڑکیوں کو باہر پھرنے والی ہر عورت کے پاس تنہا نہیں بیٹھنے اور بولنے دیا جاتا خواہ وہ قدیم گھرانے کی چوڑی والی ہو یا کوئی دوسری اور نوجوان لڑکیوں کو انہی احتیاطوں میں رکھنے کا صدقہ ہے کہ آج ایسے عزت دار غریب گھرانوں کے ذی عزت وقار سے امرا اور رؤسا بھی لرزتے ہیں۔

چوڑی والی چونکہ بے علم اور بلند گھرانوں کے اصولِ تہذیب سے یکسر نا آشنا ہوتی ہے اس لیے اس کی اخلاقی سوانح عمری کچھ زیادہ قابلِ ذکر نہیں البتہ اس کے ہاں اولاد کے بے پناہ طوفان آتے رہتے ہیں اور بچوں کی وہ کثرت ہوتی ہے کہ یہ بیس برس کی عمر میں پچاس سال کی دادی بن جاتی ہے اور اسی لیے اولاد اور افلاس کی کثرت سے اس کا شوہر عام طور پر پہلے مر کر ہی رہتا ہے اور اس کو بقیہ عمر بیوگی اور بچوں کے پالنے کی مشکلات اور شدتوں میں گزارنی پڑتی ہے۔ البتہ بڑے شہروں کی بعض بڑی دوکانوں پر بعض چٹاخ پٹاخ قسم کی چوڑی والی بھی نظر آجاتی ہے، مگر ایسی چوڑی والی کی تعداد بقدر قسم ہوتی ہے۔

◆◆◆

ڈومنی بیوی

ہندستان میں اس بیوی کے وجوداور اس کے اثرات کے کارنامے آج 1941 سے تقریباً پچیس برس پہلے بہت خاص اور خاصے تھے لیکن ہندستان کے کم عقل باشندوں نے جب سے یورپ والوں کی زندگی کی نقل کی اور کچھ شعوری ترقی کے تحت اس بیوی کا وجود بمنزلہ عدم کے رہ گیا، پھر بھی عوام کے گھرانے اس کے وجودواثر سے خالی اور دور نہیں۔

ڈومنی کے خاندان نے اپنے پیشہ کی قدامت کے اعتبار سے ایک ایسے مخصوص و محدود گھرانے یا قبیلے کی حیثیت اختیار کر لی ہے جس میں کوئی دوسری برادری اور قومیت والا شرکت نہیں کر سکتا اور تعلیم و ہنر سے محروم رہنے کا جو دور گزشتہ ہندستان پر گزر گیا ہے اس نے ایسے سینکڑوں روزی کمانے کے طریقے ایجاد کر دیے تھے جن میں علم و ہنر کا اثر نہ تھا اس لیے ایسے بے علم و ہنر پیشے آج ذلیل ہو کر رہ گئے اور ایسے ذرائع معاش رکھنے والے بھی گویا خاندانی ذلیل انسان مانے جاتے ہیں اور چونکہ ان لوگوں میں علمی روشنی بھی نہیں اس لیے ان کے خواص بھی ارذل اور کردار بھی پست ہے اسی لیے ڈومنی یا اس کے خاندان کو دوسرے خاندانوں سے ذلیل ثابت کرنے کے لیے اردو میں ''ڈوم دھاڑی'' ایک ایسا محاورہ بن گیا جس کا مطلب صرف ذلیل اور پست انسان ہے۔

پھر بھی یہ بیوی آج بھی زندہ ہے اور عوام اور غربا کی جان۔ اس کے ذریعۂ معاش کے دو

حصے ہیں ایک شادی بیاہ کی محفلوں میں ناچ گانا دوسرا شادی بیاہ کا پیغام پہنچانا اور دولہا دلہن کی رسمیں ادا کرنا۔ شادی بیاہ کی رسمیں ادا کرانے اور پیغام لانے لے جانے کے کردار کو میں ''عورت ذات'' کی جلد اول میں ''مشاطہ بیوی'' کے نام سے درج کر چکا ہوں۔ ڈومنی کو ''میراثن'' بھی کہا جاتا ہے۔ یہاں میراثن کا مقصد وہ میراث ہے جو عوام خصوصاً دیہاتی گھرانوں سے اس کو بطریق حصہ سالانہ ادا ہوا کرتا ہے جیسے بعض جگہ پٹواری وغیرہ کی خدمات کا صلہ سالانہ ادا ہوا کرتا ہے۔ اس طرح ڈومنی کی خدمات کا صلہ سالانہ میراث کے طور پر ادا ہونے سے اس کو میراثن یا اس کے شوہر کو میراثی کہا گیا ہے۔ کیونکہ لفظ میراثی مرثیہ کے کسی طرح بھی متعلق نہیں اس لیے لفظ مراثی کی مذکورہ بالا تعریف خود میں نے وضع کی ہے۔

بارے اس کی پیدائش نہایت تنگ و تاریک، مفلس اور بے ہنر گھرانے میں ہوتی ہے اس لیے پیدائش سے شعور کی عمر تک یہ سیدھی تاڑ کے درخت کی طرح صرف لمبی ہوتی جاتی ہے۔ نہ تعلیم کا کوئی بندوبست نہ تربیت میں کوئی خاص چیز، بجز اس کے کہ اپنی روزی کمانے کے لیے اپنے خاندان کے رواجی گانے بجانے کی وہ بھونڈی مشق شروع کر دیتی ہے جو اس کے ماں باپ اور خالہ خالو سے اس کو حاصل ہوتی ہے۔ یہ تعلیم بھی کچھ زیادہ اہم اور مشکل علمی اصول وضوابط پر مشتمل نہیں ہوتی بلکہ نہایت درجہ غلط، بھونڈی اور اول فول سی غزلوں کے غلط سلط تلفظ کے ساتھ یاد کرنے اور اسی طرح کے غلط بھونڈے اور بے تک سے سہروں اور مبارکباد کے اشعار کے رٹنے اور چند نیم فحش سے گانوں اور اچھل کود قسم کے چند نقلوں اور واہی تباہی سے چند مختصر سے قصوں، افسانوں، اقوال، اور اسی طرح کے بے مزا اور خشک سوانگ بھرنے اور روپ لینے پر مبنی ہوتی ہے جس سے عوام کے گھرانے کی جاہل اور بھونڈی عورتوں کو خوش کرنا مقصود ہوتا ہے مگر میں نے بعض رئیس گھرانے کی نیم تعلیم یافتہ عورتوں تک کے متعلق علم حاصل کیا تو مجھے شدید تکلیف پہنچی کہ یہ رئیس نام کے گھرانے کی بھونڈے دماغ کی عورتیں بھی ڈومنیوں کی اس واہی تباہی اچھل کود سے بے حد بھونڈی نقلوں اور نیم فحش گانوں سے بے حد خوش اور محظوظ ہوتی ہیں۔ یہ گویا خدائے منتظم کی روزی رسانی کا ایک طریقہ ہے جس کے اثر سے ان ڈومنیوں کی بھونڈی نقلیں اور غلط غزلیں اور نیم عریاں و نیم فحش گانے بھی رئیس گھرانے کی عورتوں میں مقبول ہوتے ہیں اور ان کی اس مقبولیت سے

ڈومنی غریب کو رزق ملتا ہے۔ چنانچہ میں نے خود بعض ڈومنیوں سے دریافت کیا کہ رئیس گھرانوں میں تم اپنے کس کمک کے ذریعہ مقبول ہوتی ہو تو انھوں نے یہ جواب دیا:

''اللہ رکھے اب تو ہماری شہزادیاں خود گانے بجانے میں طاق ہو چکی ہیں۔ ہارمونیم اور انگریزی باجے اب وہ خود ایسا عمدہ بجا لیتی ہیں کہ ہم ڈومنیوں تک نے کبھی نہ سنے تھے۔ اسی طرح یہ شہزادیاں گانے میں بھی ہم ڈومنیوں کے اب کان کاٹتی ہیں، مگر وہ ان گھرانوں میں اب ہم خود بے غیرت بن کے کہیں جاتے ہیں اور لڑ جھگڑ کر اپنا حق مانگ لیتے ہیں تو حق کی قیمت وصول کرنے کے لیے ہمیں بھی ناچ گانے کا حکم مل جاتا ہے ورنہ اب ہمارا ناچ گانا ان شہزادیوں کو پسند نہیں۔ اللہ کی شان اور اس زمانے کا تماشہ ہے کہ اب ڈومنیوں کا کام بڑے گھرانے کی شہزادیاں کرتی ہیں''۔

ڈومنیوں کے یہ خیالات ان ہندستانی گھرانوں کی لڑکیوں کے لیے ہیں جن کے مردوں نے اپنی نوخیز لڑکیوں کو یورپی نقالی کے سلسلہ سے ناچ گانے میں طاق فرما کر سارے ہندستان میں اپنے گھرانوں کو ذلیل و رسوا کیا جس کا سب سے گھناؤنا اور کبھی نہ بھولنے والا مظاہرہ پنجاب کے دارالسلطنت لاہور میں ہوا جس کا ثبوت ذیل کے اخباروں کے یہ مضامین اور نظمیں ہیں۔

ان مضامین اور نظموں میں شریف گھرانے کی بہو بیٹیوں کے ناچ گانے میں حصہ لینے پر جو لے دے ہوئی ہے اس سے یہ اندازہ کر لینا آسان ہے کہ ہندستان ہر اس چیز کو قبول نہیں کر سکتا جو اس کے طبعی اور پیدائشی خواص کے منافی ہو۔ عام اس سے کہ یورپی مبلغین یورپی اخباروں، یورپی نصابِ تعلیم، یورپی اخباروں اور یورپی مقررین نے ہندستان میں کسی یورپی ہنر کی کتنی ہی تعریف کیوں نہ کی ہو اور کچھ بے عقل و بے شعور ہندستانیوں نے اس کو قبول ہی کیوں نہ کر لیا ہو اس لیے طے شدہ چیز ہے کہ ہندستان اپنی عورت کے بلند تر احترام اور وقار کا عادی ہے اور ہر ہوشمند ہندستانی مرد کے نزدیک عورت کے ناچ گانے میں کامل ہونے کو کبھی اچھی نظر سے نہیں دیکھتا، اسی لیے یہ کام بعض دوسری نوعیت کی عورتوں کے ہاتھوں میں ہے اور شریف زادیاں اس بلا سے ہنوز محفوظ ہیں۔ اور یہ اشراف کے گھرانوں میں ناچ گانے کی تعلیم شروع ہی سے ممنوع قرار پانے کا ہی صدقہ ہے جس کی کمی سے خوشی کی تقاریب کو رنگین بنانے کے لیے ڈومنی پیدا ہوئی ورنہ شریف

زادیوں میں بھی ناچ گانے کا کام جائز اور رائج ہوتا تو ڈومنی پیدا ہی کیوں ہوتی؟

بارے ڈومنی پہلے تو شادی کا پیام اور شادی کی رسوم ادا کرانے میں ایک باقاعدہ ''افسر متعلقہ'' کا کام کرتی تھی، مگر اب یہ سلسلہ جدید تمدن کے ہاتھوں اور کچھ دماغی انقلاب و ترمیم کے ہاتھوں مضمحل سا ہو گیا ہے، اس لیے اب ڈومنی تقاریب میں صرف گانے ناچنے کے زیادہ کام آتی ہے۔ اس کے ساتھ اس کے خاندان کی متعدد لڑکیاں اور بوڑھی عورتیں بھی ہوتی ہیں۔ یہ بچپن میں خود ایسی جماعت کے ساتھ رہ کر محفلوں میں گانے ناچنے کا کام کرتی ہے اور جوان ہو کر دوسری ڈومنیوں کی صدر ہو جاتی ہے اور بڑھاپے میں تو اس جماعت کی حاکم اعلیٰ۔ بعض پرانی، کھوسٹ اور خرآنٹ قسم کی ڈومنیاں شہر میں بے حد مشہور ہو جاتی ہیں حتٰی کہ مجھے ان کے نام کی ایک نہایت مقدس یادگار بھی ملی یعنی بھوپال میں ایک نہایت سنگین اور دلفریب مسجد کا نام ''مدار ڈومنی کی مسجد'' ہے جو آج بھی بھوپال کی کثیر جماعت والی آباد مساجد میں شمار ہوتی ہے۔

اس کی شادی اسی نوع اور جنس کے مرد سے ہوتی ہے جو اسی کی برادری کا ہوتا ہے اور یکسر لٹھ نہ تعلیم و تربیت نہ ہنر صرف اپنے خاندانی پیشہ سے جو مل جاتا ہے کھا لیتا ہے اور کھلا دیتا ہے۔ برادری کی تاریک تر رسوم اور شدید جاہلانہ عقائد و اصول کے ساتھ اس کی تقاریب انجام پاتی ہیں۔ البتہ اس کی شادی کا روشن پہلو یہ ہے کہ جہیز کے سامان میں اکثر رئیسوں، امیروں کے ہاں سے حاصل کیے ہوئے کپڑے اور بعض زیورات بڑے غرور اور اطمینان سے دیے جاتے ہیں اور اس کی تقریبوں میں ناچ گانے کے مختلف اور قسم قسم کے مناظر یوں پیدا کیے جاتے ہیں کہ یہ سب چیزیں خاندانی اور برادری کی ہوتی ہیں۔ اس کی تقاریب میں گھر کے گانے والے گھر کے بجانے والے اور گھر کے بھانڈ ہوتے ہیں۔

بھانڈ کسی جگہ ڈومنی کے شوہر ہی کو کہتے ہیں اور کسی جگہ بے ڈومنی کا بھانڈ بھی ہوتا ہے۔ اس میں اور ڈومنی میں صرف عورت اور مرد کا فرق ہوتا ہے یعنی یہ پردہ دار گھرانوں کی عورتوں کے سامنے اپنا ہنر نہیں دکھا سکتا اس لیے یہ اکثر جگہ صرف مردوں کی محفلوں کو اپنے کمالات سے محظوظ و رنگین بناتا ہے۔ اسی طرح اس کی قابلیت، اس کی خاندانی حیثیت اور واس کے ہنر میں ڈومنی سے زیادہ اور علاحدہ کوئی فرق نہیں اس لیے اس کے ہنر کا ایک خاکہ ذیل میں اس لیے پیش کرتا ہوں

تا کہ ملک میں اس کے وجود اور اس کے ہنر کی قدامت ثابت ہو جائے۔ چنانچہ صاحبِ فسانۂ آزاد نے اس کا کردار ان الفاظ میں پیش کیا ہے کہ:

''ایک طرار بھانڈ کودتا ہوا سامنے آیا۔ ہیں، ہیں، ہیں، ہیں، ہیں اور یہ بچھیرے تو ماں کے پیٹ ہی سے سرپٹ دوڑتے نکلے تھے، میرے گھوڑے کی کچھ نہ پوچھو۔ ایک بھانڈ بڑھ کر بولا اپنی اپنی قسمت اور اپنے اپنے نصیب۔ ہم ایسے اور ہم ایسے حضور کہ دربار میں جگہ پائیں ایسے تیسے لالہ نے جھلا کر کہا کلمات لفظ زبان پر نہ لاؤ۔ بھانڈ بولا اس لب ولہجہ کے صدقے۔ واہ لالہ پکوڑی مل۔ لالہ جھلائے۔ ایک بھانڈ نے دوسرے بھانڈ سے پوچھا۔ بھلا تشخیص تو کرو کہ یہ بن مانس یہاں کیوں کر آیا۔ کسی نے کہا چڑی مارلایا ہے۔ کسی نے کہا راستہ بھول کے بستی کی طرف نکل آیا ہے۔ ایک نے بڑھ کر بہ آواز بلند کہا واہ یوں نہیں کہتے کہ سرکس کا کٹہرا توڑ کے بھاگ آیا ہے۔ اس پر لالہ اور جھلائے تو اور بنائے گئے۔ الغرض شہزادے نے ایک بھانڈ کو بلا کر کہا تم لوگوں نے آج واقعی بے وقت کی شہنائی بجائی، بس چلتا تو شہر سے نکلوا دیتا۔ بھانڈ نے کہا کہ ارے سبحان اللہ ریاست کے معنی بھی یہی ہیں۔ ایک اشرفی دے کر بھانڈوں سے نجات ملی۔

اب سنیے کہ شہر بھر میں دھوم مچ گئی کہ مرزا ہمایوں فر کے ہاں بھانڈ گئے ہیں۔ ایں شادی کے بعد جاتے ہیں یا قبل؟ اجی حضرت آپ تو نصیر الدین حیدر کے وقت کی باتیں کرتے ہیں بھوکوں مرتے ہیں کوئی ٹکے کو بھی نہیں پوچھتا اب وہ ضرورت کو دیکھیں یا قبل اور بعد کو۔

عباسی مہری نے کہا حضور کچھ سنا ہمایوں فر بہادر کے ہاں کشمیری بھانڈ آئے ہیں۔ ایک بھانڈ نے تو ند مٹکا کر کہا میرے گھوڑے کی کچھ نہ پوچھو یہ ماں کے پیٹ ہی سے کودتا اچھلتا نکلا تھا۔ اس پر حسن آرا بیگم اور ان کی بہنیں کھلکھلا کر ہنس پڑیں''۔

یہ کام اور ہنر ہے بھانڈ کا مگر ''فسانۂ آزاد'' کے اس حصہ کو نقل کرتے ہوئے ایک فقرہ سے میرے اوپر کے لکھے ہوئے کردار کی تائید ہوتی ہے اس لیے ذیل کی چند سطریں اور ملاحظہ فرمالیجیے

یعنی میں نے اوپر لکھا ہے کہ ڈومنی کی بھونڈی غزلوں، بھونڈی نقلوں اور بھونڈی حرکات سے جو امیر زادیاں خوش ہوتی ہیں تو اس کا یہ مطلب ہے کہ اللہ روزی رسا ہے اس لیے ڈومنی کے بھونڈے کرتوت بھی مقبول ہیں اس لیے ان کو امیروں سے انہی بھونڈے کرتوت پر انعام ملتا ہے حالانکہ عقلاً ایسے کرتوت سے نفرت کرنا چاہیے مگر مذکورہ بالا قصہ کے نقل کرنے سے معلوم ہوا کہ امیروں میں دولت کی خواہ کتنی ہی بلندی ہو مگر اخلاق وعلم کی بلندی نہیں ہوتی اسی لیے صاحب ''فسانۂ آزاد'' بھی اونچے گھرانے کی بیگمات کا یہ کردار لکھ گئے کہ:

''ایک بھانڈ کے یہ کہنے سے حسن آرا اور ان کی بہنیں کھلکھلا کر ہنس پڑیں کہ میرا گھوڑا ماں کے پیٹ ہی سے کودتا اچھلتا نکلا تھا''۔

حالانکہ تہذیب وشائستگی والوں میں اگر عورتوں کے سامنے ایسا فقرہ کہہ دیا جاتا تو بھانڈ کو شدید سزا دی جاتی مگر وہاں بیگم صاحب کو الٹا لطف آ گیا!!

الحاصل ڈومنی شادی کی تقریب میں مع اپنی جماعت کے بڑے کرّ وفر اور ٹھاٹھ سے جاتی ہے اور 1941 میں اس نے اتنی ترقی کر لی ہے کہ یہ پرانی ڈھولک کے عوض ایک ہارمونیم باجا بھی ساتھ لے جاتی ہے جس کو خود بجاتی ہے۔ رئیسوں اور امیروں میں تو یہ غریب کچھ زیادہ بار نہیں پاتی بلکہ بے حد ذلت اور بے عزتی کی جگہ بٹھا دی جاتی ہے۔ گھر کی ملازم عورتیں ہی اس کا گانا وانا سن لیں تو سن لیں ورنہ ایک دو غزلوں کے بعد ہی ''بیگم صاحب'' کے حکم سے نکال کر باہر کر دی جاتی ہیں یا کبھی کسی گھرانے کی بیگم صاحب بڑے نخرہ سے ان کی ایک دو غزلیں سن لیتی ہیں اور پھر ان کو رخصت کر دیا جاتا ہے اور بعض رئیس گھرانوں میں آج بھی ڈومنی ہی رسمیں ادا کرتی اور ادا کراتی ہیں۔ فی الجملہ ڈومنی کے لیے اگر کوئی کامیاب گھرانا ہے تو وہ غریبوں ہی کا ہے۔

پس غریبوں کی شادی بیاہ میں یہ بڑے نخرے اور تمکنت سے نہ فقط جاتی بلکہ کافی معاوضہ پر بلائی بھی جاتی ہے اور بعض اچھی گانے والی ڈومنیاں تو بالکل طوائف کی طرح کی مقررہ فیس وصول فرماتی ہیں جب تشریف لے جاتی ہیں۔ غریبوں کے گھر چونکہ عقل، فہم وفراست، ترقی، تبدیلی، غرض ہر بلند چیز اور بلند احساس سے محروم ہوتے ہیں اس لیے ایسے گھرانوں میں ڈومنی بیوی ایک چھوٹی موٹی ریاست کی بیگم اور ملکہ بن کر جاتی ہیں یعنی اس کے لباس میں نیم انگریزی پن اور

یورپی وضع کے فیشن کی اول فول ترتیب وترکیب ہوتی ہے۔ مثلاً ساڑی کے آنچل میں یہ چھوٹی گھڑی تعویذ کی طرح لٹکا لیتی ہے۔ ایک ریشمی رومال بے ضرورت اور بے قاعدہ طور پر ہاتھ میں رکھتی ہے جس سے محض نخرہ دکھانے کے لیے ہر دوسرے منٹ پر چہرہ صاف کرتی رہتی ہے۔ ریشمی بنیائن اگر نصیب ہوجائے تو جاڑے کے موسم میں بھی اس کو دکھانے کے لیے روئی کا کپڑا اس پر نہیں پہنتی۔ سرخ مصالحہ سے ہاتھ پاؤں کے ناخن رنگتی ہے۔ پانوں کا ڈبہ اس شان سے اٹھائے پھرتی ہے جیسے کوئی بڑی نازنین ملکہ یا بیگم گلوریوں کے خاص دان استعمال فرما رہی ہیں۔ جوتے اونچی ایڑے کے جن پر ڈھائی تین آنے کا موزہ عام اس سے کہ موزہ کا رنگ چاہے کچھ بھی ہو اور لباس سے تو موزہ کا رنگ اکثر بے جوڑ او بھڑک والا ہی ہوتا ہے۔ اب سر کے بالوں میں بھی دو چار خواہ مخواہ ہی کلپ بھی ہوتے ہیں اور دیسی چوٹی کے عوض دولت مندوں کے گھرانوں کی بے حجاب لڑکیوں کی طرح یا تو چوٹی سر سے کھلی ہی ہوتی ہے یا پھر جوڑے میں ہار اور ایک آدھ واہی تباہی سا پھول۔ خوشبو میں کوئی زناٹے کی خوشبو والا انگریزی تیل اور اگر سونے کا ایک آدھ زیور ہو تو وہ سب سے ابھرا ہوا۔ ہاتھوں میں سیاہی کی حد تک مہندی، مگر اس تمام بناؤ سنگھار کو خاک میں ملا دینے والا ایک آدھ بچہ اس کے دودھ سے ضرور لٹکا ہوا ملتا ہے جس کو دودھ پلانے کے بہانے سے یہ خاصی دیر گئے گانا بجانا ترک کرتی رہتی ہے۔

محفل میں اس کی چودھراہٹ کے بھرم کو قائم رکھنے کے لیے اس کے ساتھ ایک آدھ بیحد غریب ڈومنی بھی ہوتی ہے جو گاتے بجاتے وقت اس کے دودھ پیتے بچے کو اس احتیاط اور دلداری سے لیے رہتی ہے جس طرح امیر گھرانوں کی عورتوں کے بچے ملازم عورتوں کے پاس رہا کرتے ہیں۔ یہ بچہ کھلانے والی ڈومنی یا تو اسی کی بیٹی بھانجی اور بھتیجی ہوتی ہے یا اس کی برادری کی بیحد بے ہنر، بدرونکٹی، چپٹی، کانی اور لنگڑی سی اپاہج اور محتاج عورت ہوتی ہے جس کا نام اکثر ان ناموں سے مشابہ ہوا کرتا ہے مثلاً پیاری، چھوٹی، گلاب، بھوری نوری۔

پس اس ٹھاٹھ کے ساتھ جب یہ کسی غریب گھرانے میں داخل ہوتی ہے تو اس گھر کی عورتیں تو ایک طرف مرد تک اس کے ناز بردار بن جاتے ہیں اور جب سے یہ ہارمونیم پر خاصی چہک چہک کر گانے لگی ہے اس وقت سے تو اچھے اچھے پیشکار صاحب اور داروغہ جی تک اس کے

گانے پر مرنے لگے ہیں۔ اس کے اسی نخرہ کے اثر سے جس حصۂ مکان میں یہ اپنی جماعت کے ساتھ بیٹھتی ہے اس میں گھر کی ایک آدھ عورت اس کے احکام کی تعمیل کے لیے ضرور موجود رہتی ہے ورنہ یہ غریب گھرانہ دیکھ کر بات بات پر غصے اور نخرہ سے کام لیتی ہے۔ اسی طرح بعض مرد بھی اس کے احکام کی تعمیل میں حاضر رہتے ہیں۔

یہ کافی نخرے اور اپنی دانست میں نہایت درجہ علمی قاعدے سے گانا شروع کرتی ہے۔ حالانکہ کمبخت ایک حرف بھی قاعدے سے ادا نہیں کرتی بجز اس کے کہ کسی مشہور طوائف کے گانے کی نقل کرتی ہے یا کسی قوال کی۔ اور اب تو یہ بھی سنیما کے تماشے میں جانے لگی ہے، اس لیے، وہاں کے تال سر سے کام لیتی ہے مگر اس کے قدر دان چونکہ سب کے سب گانے بجانے کے قاعدوں سے بے خبر ہوتے ہیں اس لیے اس کے اول فول سے تال سُر ہی پہ سر دھننے لگتے ہیں، جھومتے ہیں، مست ہو جاتے ہیں اور وجد میں آ کر انعامات تک عطا فرمانے لگتے ہیں۔

گانوں میں اس کو ایک غزل بھی پوری اور صحیح تلفظ کی مشکل ہی سے یاد ہوتی ہوگی ورنہ بیشتر بازاری مذاق کی بعض مشہور شعرا کی غزلوں کے تین سے پانچ تک اشعار ایک آدھ ٹھمری اور ایک آدھ نعت اور بس۔

اس کے گانے میں اس کے ساتھ کی ڈومنیاں بھی شریک ہوتی ہیں اور اصل میں انہی سب کے مل کر گانے سے یہ آوازیں قدرے دلکش ہو جاتی ہیں لیکن وہ بھی صرف پیش کاروں، پٹواریوں، عرائض نویسوں، داروغہ اور انسپکٹر کی قابلیت کے لوگوں کے لیے نہ کہ خوش ذوقوں اور ذی علم لوگوں کے لیے۔

یہ کلھم دو چار گیت مسلسل گا کر ایک لمبا آرام لیتی ہے اور اس عرصہ میں گھر کی بیبیاں اس کے گانے کی تعریف میں مبتلا ہو جاتی ہیں اور چائے پان سے اس کی تواضع شروع ہو جاتی ہے۔ اس تقریب کی بعض شوقین عورتیں ڈرتے ڈرتے اور بڑے خوشامدانہ انداز سے اس سے جناب جگر مراد آبادی یا فانی بدایونی قسم کے شعرا کی کسی غزل کی فرمائش کرتی ہیں جس کو یہ بڑے ٹھاٹھ سے گا کر یہ جتاتی ہے کہ دیکھا گانا اس کو کہتے ہیں۔

اسی عرصے میں یہ اس گھر کی بے خبر عورتوں کو یہ ضرور جتاتی ہے کہ اب کی خواجہ غریب نواز

کے عرس میں میں نے بھی حاضری دی تھی۔ میری ایک نعت شریف سن کر کراچی کے ایک بڑے سیٹھ صاحب مجھے اپنے ہمراہ بھاری تنخواہ پر لے جا رہے تھے مگر میں نے کہہ دیا کہ آپ ایسے میرے قدر کرنے والے خدا رکھے میری بھی بستی میں بہت ہیں اور یہی حال وہ راجہ ملا رموزی کا ہے۔ بڑی ریاست کے مالک ہیں وہ بھی فرماتے تھے کہ ''خورشید'' اگر تم ہماری ریاست میں رہنا چاہو تو ہم تمھارے آدمی کو بھی اپنی ریاست ہی میں اچھی جگہ دے دیں گے اور کیا خدا کی قسم وہ راجہ ملا رموزی بھی تمام رئیسوں میں ایک ہی ہے اس نے ریاست کے لاکھوں روپیہ ناچ گانے والوں پر خرچ کر دیے۔ خواجہ صاحب کے مزار پاک پر ہر سال خود آ کر چادر چڑھاتے ہیں اور سارے اجمیر شریف میں دھوم ہے، مگر میں کیا کروں کچھ وہ راضی نہ ہوئے اور کچھ آب ودانے کی بات تھی کہ میں نے کسی سے بھی حامی نہ بھری۔ غریب راجہ صاحب کے تو میرے نام کئی خط بھی آئے۔ اب اگر خدا نے چاہا تو ان کے ولی عہد صاحب کی شادی میں ضرور جاؤں گی کیونکہ ابھی کوئی چار چھ دن ہی تو ہوئے کہ ان کے دیوان صاحب آئے تھے اور انھوں نے مجھ سے بہت بہت کہا ہے کہ ولی عہد صاحب کی شادی میں ضرور ضرور آنا۔ بہن میں آپ سے کیا کہوں کیسا لائق آدمی ہے یہ دیوان اور اس کی لڑکیاں تو اس غضب کی گویا ہیں کہ میں آپ سے اور کیا کہوں وہ بات اصل یہ ہے کہ راجہ صاحب ہی نے ان لڑکیوں کو چوری سے گانے کی وہ تعلیم دلائی ہے کہ بس آپ سنیں تو کہیں۔ اور ہے بھی کیا، بہن اب تو رئیسوں کے گھر کا ماٹ ہی بگڑ گیا ہے اب بعض بیگمات کے لچھن تو بیان نہیں کر سکتی اور بیوی ہم تو ہیں ڈومنی ہمارا کام تو دس گھر جانا پھر کیا کہیں کہ جب خلاف چلن کوئی بات دیکھتے ہیں تو رہا بھی نہیں جاتا۔

ڈومنی کے مذکورہ بالا بیان میں میں نے تو اونچے گھرانوں کے کرتوت کا صرف خاکہ کھینچا ہے مگر جاہل اور غیر مآل اندیش ڈومنیاں محض اپنی حیثیت کو اونچا دکھانے کے شوق میں ایسے رئیسوں اور امیروں کے اور ان کی لڑکیوں کے نام تک بتادیتی ہیں، جس کا تجربہ عوام کو کافی ہوگا۔

بعض ڈومنیاں بے حد نمک مرچ ہوتی ہیں جو نوجوان لڑکیوں کو بہت جلد اپنا لیتی ہیں اور ایسی لڑکیاں ان سے ان غزلوں کو لکھ دینے کی فرمائش بھی کرتی ہیں جو ان کو پسند آجاتی ہیں۔ اس لیے ہوشمند گھرانوں میں نوجوان لڑکیوں کو ڈومنیوں سے دور رکھا جاتا ہے۔

بعض معمولی درجہ کے گھرانوں میں یہ شادی کے پیغام لے جانے کا کام بھی کرتی ہے جس کا یہ معاوضہ لیتی ہے۔ عموماً اس کا ضابطہ یہ ہے کہ یہ شادی والے لڑکے کا پیار لے جاتی ہے اور اپنی قابلیت بھر اس لڑکے اور اس کی آمدنی چال چلن اور اس کے گھرانے کی تعریف میں زور لگاتی ہے۔

بے ہنری کی وجہ سے اس کے عام مالی اور اخلاقی حالات بے حد پست، افسردہ اور قابلِ رحم ہوتے ہیں اور انہی وجوہ سے بڑے گھرانوں سے اب اس کا کاروبار ختم ہو گیا پھر بھی عوام میں اس کی زندگی کے اثرات اور نشانات موجود ہیں۔

◆◆◆

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

اردو سفرناموں میں ہندوستانی تہذیب و ثقافت

مرتب : خواجہ محمد اکرام الدین

صفحات:494

قیمت :-/166 روپے

کلیاتِ سجاد ظہیر

مرتبین: نجمہ ظہیر باقر، علی باقر

صفحات:388

قیمت :-/146 روپے

کلیاتِ ماجدی

ترتیب و تدوین: عطاء الرحمٰن قاسمی

صفحات:666

قیمت :-/196 روپے

حسن نعیم اور نئی غزل (تجزیہ و تنقید)
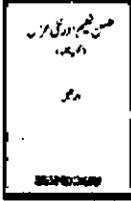
مصنف: احمد کفیل

صفحات:284

قیمت :-/104 روپے

پیروڈی: نقد و انتخاب (جلد اول)

مرتبہ : امتیاز وحید

صفحات:354

قیمت :-/118 روپے

پیروڈی: نقد و انتخاب (جلد دوم)

مرتبہ : امتیاز وحید

صفحات:368

قیمت :-/133 روپے

₹ 140/-

ISBN: 978-81-7587-982-9

9 788175 879829

राष्ट्रीय उर्दू भाषा विकास परिषद्

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

National Council for Promotion of Urdu Language

Farogh-e-Urdu Bhawan, FC- 33/9, Institutional Area,
Jasola, New Delhi-110 025